قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 25 ❖ شمارہ 03 ❖ فروری 2015ء

ماہنامہ
کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

16 دسمبر ہماری تاریخ کا ایک المناک دن۔ اسی تاریخ کو 1971ء میں ہمارا ایک بازو قطع ہوا اور اسی تاریخ کو 2014ء میں ہمارے مستقبل پر حملہ ہوا۔ ننھے ننھے پھولوں کو بے رحمی سے انتہائی ظالمانہ انداز میں گولیوں سے بھون ڈالا گیا۔ ایسے انداز میں ان پھول جیسے بچوں کو شہید کیا گیا ہے جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان معصوموں کی شہادت نے ہر محبِ وطن کو مجبور کردیا ہے کہ وہ دشمنانِ وطن کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور الحمدللہ یہی جذبہ نظر آرہا ہے۔ 1965ء میں دشمن نے حملہ ہماری سرحد پر کیا تھا اور اس حملے نے ہمارے جذبوں کو بیدار کردیا تھا۔ وہی جذبہ ایک بار پھر سے بیدار ہوگیا ہے۔ اس بار دشمن ہماری صفوں میں اہلِ وطن کا ملمع اپنے چہرے پر چڑھا کر سامنے آیا ہے۔ دہشت گردی کا سہارا لے کر ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہتا ہے مگر وہ بھول رہا ہے کہ ہماری محافظ فوج جو اقوام عالم میں اپنی تیزی و طراری کے لیے مشہور ہے، پوری طرح جاگ رہی ہے، دہشت گردی کے خلاف عزم کا اظہار کیا ہے۔ ہم خود بھی اپنی فوج سے یہی توقع رکھتے ہیں کیوں کہ ہر کڑے وقت پر فوج نے ہی ملک کو عزم و استقلال سے بھرا ہے۔ سزا یافتہ دہشت گردوں کو دھڑا دھڑ پھانسی پر لٹکایا جارہا ہے۔ ایسے وقت میں کچھ ملزموں کی سزا کے التوا اور تعطل نے ابہام پیدا کردیا ہے۔ یاد رہے کہ عدلیہ کو شکایت رہی ہے کہ تفتیشی ادارے جس طرح کیس بنا کر بھیجتے ہیں وہ ناقص ہوتا ہے۔ ورنہ عدلیہ نے ہی سزائے موت کے منتظروں کو سزائیں سنائی ہیں۔ پھر یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ جج صاحبان و دیگر متعلقہ عملے کو دہشت گردوں کی طرف سے شدید خطرات لاحق رہے ہیں۔ اس لیے عدلیہ کو اپنا کردار ادا کرنے کے لیے تحفظ بھی فراہم کیا جائے۔ ہمارا کہنا یہی ہے کہ اس اتفاق رائے کو لاحاصل بحث و مباحثے میں ضائع نہ کر کے ملک دشمن قوتوں کی جڑیں ہمیشہ کے لیے کاٹ دی جائیں ورنہ دوبارہ اتفاق رائے پیدا کرنا بہت مشکل ہوگا۔ بقول کیفی اعظمی

اٹھ بھی سکتی ہیں دفعتاً لاشیں
جن پر مسند سجا کے بیٹھے ہو

معراج رسول

شعبۂ اشتہارات

نیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمایندہ کراچی	محمد عفان خان	0333-2168391
	رانا محمد حمید	0323-2895528
نمایندہ لاہور	افراز علی ہرش	0300-4214400

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرسالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ○ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com
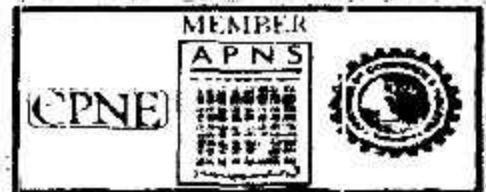
بابائے فارسی

سرگزشت

ابھی وہ گریجویشن کی تیاری کررہے تھے کہ سیاسی افق گدلا گیا اور دیگر بہت سے مسلمانوں کی طرح انہوں نے بھی ہجرت کرنے کی ٹھان لی۔ یہ کوئی چھوٹا موٹا خاندان تو تھا نہیں کہ سامان لپیٹا اور چل پڑے۔ تیاری تیاری میں ہی کئی سال گزر گئے۔ پاکستان آنے کے راستے میں حادثات رونما ہوتے تھے ان میں بھی کمی آگئی۔ بالآخر 1951ء میں خاندان کے منتخب افراد کا قافلہ تیار ہوا اور انہیں میرِ کارواں کی ذمّے داری سونپ دی گئی۔ اس کارواں میں ان کے والدین، ماموں، ممانی، خالائیں اور بہن بھائی تھے۔ سب کی اولادیں بھی تھیں۔ خود ان کا رشتہ بھی طے ہوچکا تھا۔ ان کے ساس سسر و دیگر سسرالی رشتے دار بھی ساتھ ہوگئے تھے۔ اس طرح پوری ٹرین اس قافلے میں شامل افراد سے بھر گئی تھی۔ یہ قافلہ براستہ کھوکھراپار پاکستان میں داخل ہوا۔ اس قافلے میں نوعمر لڑکیاں بھی تھیں۔ حالات اب بھی کشیدہ تھے۔ اس لیے ان لڑکیوں کا جلدی جلدی اسٹیشنوں پر ہی نکاح کرادیا گیا تاکہ لڑکیاں کنواری نہ کہلائیں پھر ٹرین سے یہ قافلہ جانب کراچی بڑھا۔ کراچی پہنچ کر ان لڑکیوں کی رخصتی کی تیاری ہونے لگی۔ کچھ لوگ کراچی پہنچ کر حیدرآباد، سکھر اور کوئٹہ کی طرف قسمت آزمانے کو چل دیے۔ ''میرِ کارواں'' جو ابھی فقط تیس چوبیس سال کے تھے مگر ان پر ذمے داریاں ڈھیروں ڈھیر تھیں، اپنے منجھلے بہنوئی آغا محمد حیدر (احمد میاں) کی تین کم سن بھانجیوں کو اپنی بیٹیاں بنا کر لائے تھے۔ ان کی ذمے داری، سسرالیوں کی ذمے داری۔ دو برادرِ نسبتی آغا اصغر مرزا اور آغا الیاس مرزا جو ابھی کم سن تھے، ان کی ذمّے داری 'ایک سالی صاحبہ مع کم سن بچوں کے ہمراہ تھیں ان کی ذمے داری' گویا ذمے داریوں کا سمندر تھا اور وہ تھے۔ ان کی ایک بہن زوجہ مہدی حسین پہلے سے ہی راولپنڈی میں رہ رہی تھیں۔ سب سے بڑی بہن اور ان کے شوہر مرزا اسد رضا بھی پہلے آچکے تھے اور میو اسپتال لاہور میں ملازمت کررہے تھے۔ کبھی سوچا راولپنڈی منتقل ہوجایا جائے اور کبھی لاہور جانے پر غور کیا پھر سکھر چلے گئے۔ 1951ء میں پاکستان آئے اور 1952ء میں ازدواجی زندگی کی ابتدا ہو گئی۔ 1955ء میں پہلی اولاد ہوئی۔ گھر خوشیوں کا گہوارہ بن گیا۔ فارسی ادب میں خاصہ دخل تھا۔ اس استطاعت کو وہ بڑھانے لگے۔ پاکستان پہنچ کر زندگی میں ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ اسے مہمیز کی ضرورت تھی۔ اسی سلسلے میں وہ ایران کا دورہ بھی کر آئے تھے اور پی ایچ ڈی کی تیاری بھی کرتے جارہے تھے۔ سکھر جیسے چھوٹے شہر میں رہ کر وہ اپنی منزل کو پانہیں سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے کراچی منتقل ہونا زیادہ مناسب سمجھا اور دیگر رشتے داروں سے آملے۔ کراچی آکر ایرانیان ٹیکنیکل اسکول کھارادر کی بنیاد رکھی۔ آغا مرتضیٰ پویا کے والد آغا پویا کی سرپرستی میں انہوں نے جہدِ مسلسل کا آغاز کردیا تھا۔ تدریسی امور کے ساتھ ساتھ ریڈیو اور ٹی وی پر بھی علم کی ترویج جاری رکھی۔ P.T.V پر عرصہ دراز تک بصیرت اور فرمانِ الٰہی کے پروگرام کرتے رہے۔ ریڈیو پاکستان پر Talkes بھی لکھیں اور صداکاری بھی کی۔ پاکستان نیشنل سینٹرز میں فارسی کی کلاسز کا اجراء کیا۔ خانہ فرہنگ ایران میں بھی فارسی کی تدریس میں مشغول رہے۔ فارسی کی ترویج و اشاعت میں انہوں نے انتھک محنت کی۔ ان کی کاوشوں کو مدِنظر رکھ کر صاحبِ مقتدر ایرانیوں نے انہیں ''بابائے فارسی پاکستان'' کے خطاب سے نوازا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے اردو اور انگلش کے ساتھ فارسی میں مقالوں کا انبار لگا دیا تھا۔ تراجم کے ذریعے فارسی ادب کو اردو میں اور اردو ادب کو فارسی میں منتقل کرنے میں شب و روز لگے رہتے تھے۔ وہ علم کے سپاہی تو تھے ہی اور اہلِ علم کی قدر بھی خوب کرتے تھے۔ سو ادبی و سماجی شخصیات کے جلسہ ہای تحلیل و پذیرائی کا خوب خوب اہتمام کرتے۔ دبستانِ انیس و دبیر کے ذریعے اردو ادب کی خاص الخاص صنفِ سخن ''مرثیہ'' سے نئی نسل کو روشناس کرانے کے لیے محافل منعقد کراتے۔ ہر اتوار کو اہلِ فکر و ادب کے ہاں باری باری نشست رکھواتے۔ دیگر شہروں سے بھی شعراء کو بلواتے۔ گویا وہ فکر و فن کی قد آور شخصیت مشہور ہوچکے تھے۔ علم کی آبیاری کے لیے ان کی قائم کردہ درسگاہیں آج بھی ان کی یاد دلاتی ہیں۔ فارسی ادب کے اس پاکستانی معمار کا نام پروفیسر ڈاکٹر سید سبط حسن رضوی ہے۔

شہر خیال

☆ رانا محمد سجاد کا مکتوب خاص۔ ''السلام علیکم، دسمبر کی تاریخیں .... بہت سے حادثات، واقعات اپنے ساتھ لیے ہم سے بچھڑ چکا ہے۔ نئے سال کی آمد ہو چکی ہے۔ دسمبر کا مہینا اپنے وسط میں ایسا دکھ دے گیا جو تا حیات ہر حساس، دردمند پاکستان کو تڑپاتا رہے گا، رلاتا رہے گا۔ صراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے چند آدم خور انسانیت کا روپ بدلے معصوم بچوں پر ٹوٹ پڑے۔ خدا انہیں غارت کرے، نہ جانے کیا کیا کچھ کہنے کو دل کر رہا ہے۔ بس اللہ تعالیٰ ان معصوم پھولوں کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ ''شہر خیال'' میں اس المناک سانحے کے شہر باسی شاہد جہانگیر صاحب صدارت پر فائز تھے۔ حکومت کو اپنے ہدف پر لیے تھے۔ جامع تبصرہ تھا۔ فلموں کے حوالے سے آپ بیتی پر ان کا تبصرہ واقعی قابلِ غور ہے۔ سدرہ بانو ناگوری صاحبہ کراچی سے آئیں۔ سلور جوبلی نمبر کی خوش خبری آپ کے خط کے توسط سے ملی۔ شدت سے انتظار رہے گا۔ ملک رحمت میانوالی سے آئے۔ جناب ہم آپ کے شہر کچھ دن پہلے ہو کر آئے ہیں۔ شہر خیال کی دیرینہ قاری بشریٰ افضل بہاولپور سے آئیں۔ اتنی غیر حاضری کیوں؟ قیصر عباس کافی دنوں بعد حاضر ہوئے۔ محمد سلیم قیصر اللہ تعالیٰ آپ کی مشکلات کو دور فرمائے، آمین۔ اعجاز حسین سٹھار صاحب کا تبصرہ پڑھنے کو ملا، جناب، آپ نے سلطان راہی کے لیے دہشت زدہ چہرہ کہا، معذرت ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ بہرحال مجموعی طور پر تبصرہ بہترین تھا۔ عمران جونانی آپ کو بھی نیا سال مبارک ہو۔ فواد خان کی مقبولیت کے بارے میں آپ نے کہا۔ ''زندگی گلزار ہے'' کیا انہی کا ڈراما؟ (جی ہاں)۔ سید انور عباس کا تبصرہ بھی خوب تھا۔ پسند آیا۔ طاہرہ گلزار پشاور سے حاضر تھیں۔ وحید ریاست بھٹی صاحب، تجزیے لے کر آئے۔ آپ نے تو ہمایوں دین پوری خان پور کٹورا کی یاد دلا دی۔ کیا زبردست تجزیہ لے کر آئے۔ ہمارے پاس تو الفاظ بھی نہیں کہ کس منہ سے تعریف کریں، بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ شاندار، جوں جوں پڑھتے گئے ان کی سرگزشت سے محبت کے قائل ہوتے چلے گئے۔ میرے خیال میں جہاں تک سرگزشت کے حوالے سے ہے یہ اعزاز یعنی تجزیہ، کا اعزاز کسی اور کو حاصل نہیں۔ بہت خوب بھئی۔ آئندہ اپنے پسند کے کسی مضمون کو پڑھنے کے لیے آپ کے تجزیے کی طرف دیکھنا پڑے گا۔ ڈاکٹر ساجد امجد ''شکوہ سخن'' میں میر شکوہ آبادی کا تذکرہ لے کر آئے۔ بہت اچھا لگا۔ ہم جیسے ادب کے قارئین کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا تحفہ ہو سکتا ہے۔ ''ہم پلہ'' خوب صورت تحریر تھی۔ آپ سے گزارش ہے کہ ''مسٹر بین'' پر بھی کوئی تحریر دیں۔ جیمز بونڈ کے حوالے سے راجر مور ایک اچھا انتخاب ہے۔ ''آکٹوپس'' انتہائی فضول تحریر تھی۔ صفحات ضائع کیے۔ منظر امام کی تحریر بھی کسی حد تک ٹھیک تھی۔ ''الوداع'' جہاز رانی کے حوالے سے کافی معلوماتی تحریر ہے اگر کوئی بہت غور سے پڑھے تو کافی حد تک جہاز اور اس کے تکنیکی مسائل سے واقف ہو سکتا ہے۔ ''لی مان'' ایک در فضول تحریر ثابت ہوئی۔ پتا نہیں کیا سوچ کر آپ نے یہ تحریر شائع کی۔ ''اشتہار اجل'' بے وقوفی سے اپنے لیے ایسے راستے کا انتخاب کر لیا جو اسے زندگی سے دور لے گیا۔ ''فلمی الف لیلہ'' میں اب کی بار علی سفیان آفاقی صاحب جالب کو لے کر آئے۔ قبرستان کے حوالے سے آفاقی صاحب سے ہم پوری طرح متفق ہیں لیکن پھر وہی بات جب زندوں کو وہ سہولیات حاصل نہیں تو قبرستان کو خاک حاصل ہوں گی۔ ''سراب'' انتہائی شاندار طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ سچ بیانی ''مایا'' بہت خوب صورت تحریر تھی۔ ایاز نے اللہ کی مخلوق پر احسان کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کے دل میں اس کے لیے رحمت ڈال دی۔ واقعی اہلِ زمین پر مہربانی کی تو عرش والا بھی مہربان ہو گیا۔ ''فاصلوں کا کرب'' آج کے جدید دور کے حالات کی عکاسی کرتے ہوئے نظر آتی ہے۔ ماں باپ کے جھگڑوں کا اولاد پر کتنا اثر ہوتا ہے۔ ''آخری ملاقات'' میں حریم نے انتہائی غلط طریقہ اختیار کیا اور پھر اس کی سزا بھی پائی۔ علی کی خوشیاں تو اسے مل ہی گئیں لیکن تمام عمر کی معذوری اس کا مقدر بن گئی۔ اس کا مداوا کیسے ہوگا؟ ''فساد عشق'' علی ایک ایسے مسئلے کا حصہ بن گیا جو

اس کا نہیں تھا۔ رمشا بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ محض ایک احمقانہ انتقام کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ''جیسے کو تیسا'' ہنسی ہنسی میں ایک تلخ اور سنجیدہ بات کہنے کی کاوش ہے۔ ایسے لوگوں کی فطرت کو بے نقاب کیا گیا ہے جو اپنے ہی خیالات کا پرچار کرتے ہیں اور انہیں اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ دوسروں کو کتنی تکلیف ہوگی۔ ''پُراسرار حویلی'' ایک انتہائی خوب صورت تحریر ثابت ہوئی۔ ''اکیلی عورت'' میں ہمارے آج کے معاشرے کی عکاسی ہے۔ شاہینہ کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی ذمہ دار خود اس کے والدین ہیں جنہوں نے بغیر دیکھے بھالے اپنی بیٹی کو فیصل کے حوالے کردیا۔ اس پر بہتر تبصرہ طاہرہ گلزار ہی کرسکتی ہیں۔ ''غمِ دل'' پر بالکل تبصرہ نہیں ہوگا کیوں کہ یہ کہانی آپ پہلے کسی شمارہ میں شائع کرچکے ہیں اور اب پھر دوبارہ شائع کی ہے۔ (حیرت انگیز انکشاف ہے۔ پلیز اس کہانی کی فوٹو کاپی ارسال کردیں نوازش ہوگی)۔''

(ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ شہرِ خیال کے ہردل عزیز باسی بورے والا کے رانا محمد شاہد کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا۔ ان کے غم میں ہم سب شریک ہیں۔ تمام احباب سے التماس ہے سورۂ فاتحہ کی تلاوت کردیں۔)

☆ ملک محمد ظفر اللہ نے راجن پور سے لکھا ہے۔ ''میری سمجھ کے مطابق ماہِ دسمبر 2014ء میں شائع شدہ کہانیوں میں سے اوّل، دوم اور سوم آنے والی کہانیاں درج ذیل ہیں۔ پہلی ''کرب''، دوسری ''آزمائش''، تیسری ''دوسری موت'' باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔''

☆ محمد انور، باڑی چم ہوتی، مردان سے رقم طراز ہیں۔ ''لکھنا مجھ جیسے نالائق اور کند ذہن کو زیب نہیں دیتا کہ من آنم من دانم لیکن آڑی ترچھی لکیر کھینچنا تو بازیچۂ اطفال میں اکثروں کا وتیرہ ہوتا ہے۔ اس ملک سموچا خراب کی کون سی شے ہے۔ کون سی قدر ہے جو اپنی جگہ پہ ہے۔ وہ چند گھڑیاں اور لمحے اچھے گزرتے ہیں جب آپ کا سرگزشت، جاسوسی یا سسپنس ہاتھوں میں ہو ورنہ بہت حبس ہے، بہت ناگفتنی ہے۔ سراب واقعی سراب ہے۔ شہباز خان جاوباز ثابت ہو رہے ہیں۔ سچ بیتاں پڑھ کر بچپن کی یادیں ہی یاد آجاتی ہیں۔ آپ کے شہرِ خیال کے سب باسیوں کو سلام و دعا۔ خصوصاً ڈاکٹر روبینہ نفیس، شاہد جہانگیر اور طاہرہ گلزار۔ ان کی شمولیت بہت اچھی لگتی ہے۔ اداریہ پسند آتا ہے، اسے جاری رہنا چاہیے۔ کچھ ڈھارس بندھتی ہے کہ ابھی اچھے اور بھلے لوگ موجود ہیں۔''

☆ سہیل احمد عباسی کی تشریف آوری ساتھی، پنوں عاقل سے۔ ''دسمبر کا سرگزشت اپنی روایتی خوبیوں اور سلسلوں کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اس دفعہ جس چیز نے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ ناصر حسین رند کی محبت بھری آواز تھی ''کہاں گم ہو آ بھی جاؤ''۔ اب اس طرح کوئی محبت سے بلائے تو اپنے دل کو کوئی کیسے روکے۔ سرگزشت سے اپنے تعلق کو ربع صدی ہوگئی اب سوچتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کیوں کہ ہم خود بھی ابھی 40 سال کے ہوئے ہیں۔ اتنی چھوٹی عمر میں ایک سنجیدہ رسالے کی محبت سرگزشت کے معیار کی نشانی ہے اور ہمارا سب سے پہلا خط 1991ء کے خودکشی نمبر میں شائع ہوا تھا۔ پھر یاد پڑتا ہے کہ ہمایوں دین پوری صاحب کے سالانہ تذکرے میں تب تک سرگزشت کو مجموعی طور پر سب سے زیادہ خطوط لکھنے والوں میں ہم بھی شامل ہوا کرتے تھے لیکن پھر آہستہ آہستہ مصروفیات بڑھتی گئیں اور ہم اس کے گلاب آگہی لمس سے بھی محروم ہوتے گئے۔ دیکھتے ہیں بات کہاں تک پہنچتی ہے۔ دریائے نیل کا تذکرہ نہایت معلوماتی اور بہترین تھا۔ طاہرہ گلزار صاحبہ کے خط میں چار بیویوں کی شرعی اجازت کا نہایت نامناسب انداز میں ذکر ہوا ہے۔ طاہرہ صاحبہ اگر چار بیویوں کی اجازت ہے تو ان میں برابری کا سخت حکم بھی ہے۔''

☆ محمد عمران جونانی کا تجزیہ کراچی سے۔ ''جنوری کی یک سطّی سرگزشت سرفراز خان نیازی کے تعارف پر مبنی ہے۔ اوپر والے کا کرم، تیز دماغ اور اعلیٰ ذوق یکجا ہوں تو ایسے ہی شاہکار جنم لیتے ہیں۔ خالد قریشی کی ''آکٹوپس'' تفسیر ہے کہ ایک غلطی چھپانے کے لیے انسان دس غلطیاں کرتا ہے۔ ایک قصہ کو تحریر کے ذریعہ فلم کی صورت سامنے لاکھڑا کرنے کا کام عمدگی سے کیا گیا۔ منظر امام نئے سال کے ساتھ نئی امنگیں سجاتے نظر آئے۔ غیر ضروری طوالت سے گریز نے ''کیسے کیسے لوگ'' کی افادیت میں اضافہ کیا۔ جی جی جناب درست فرمایا۔ ''ملٹن کیوں اندھا ہوگیا تھا'' والا بورڈ میرا دیکھا بھالا ہے۔ کراچی کے ایم اے جناح روڈ پر مولوی مسافر خانہ اردو بازار کے اسٹاپ پر ہے یہ عینک ساز کی دکان ہے چونکہ ہم خود عینک لگاتے ہیں چنانچہ ان الفاظ کی افادیت خوب سمجھتے ہیں۔ ابنِ کبیر کے ''پراسرار گمشدگی'' ایسی قیمتی تحریر نے معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ ویسے وزراء تو ہمارے بھی غائب ہو جاتے ہیں اور نہ ہوں تو انہیں غائب کیا بھی جاسکتا ہے۔ آفاقی صاحب نے طالب صاحب کا جو انٹرویو نقل کیا ہے وہ بار بار پڑھنے کے قابل ہے۔ اس کے بعد لاہور کے قبرستانوں اور باغات کا ذکر ہے۔ لاہور ایسا سمندر جس کی بار بار سیر کرنے پر بھی مکمل سیرابی نہیں ہوتی اس ضمن میں کراچی کے میوہ شاہ قبرستان کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا جو ایشیا کے چند بڑے قبرستانوں میں سے ہے لیکن بے ہنگم پھیلاؤ کا یہ عالم ہے کہ قبروں کے اوپر قبریں بھی بنی ہوئی ہیں۔

جرائم کی کثرت کی بناء پر اکیلے جانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مریم کے خان حسبِ معمول وقفے کے بعد نہایت معلوماتی تحریر کے ساتھ نظر آئیں۔ رزاقی صاحب نے پہلے امریکی پڑاؤ کا مختصر حال بیان کیا پھر فیلا کی مرطوب آب وہوا میں گھماتے رہے اور اختتام فرانس کے دلفریب سفرنامے پر ہوا۔ ''ہم پلہ'' کی شکل میں شکیل ادریس نے درددل رکھنے والے اداکار راجر مور کا زندگی نامہ کاغذ پر منتقل کیا۔ ساجد صاحب کی ''شکوۂ سخن'' کو معلومات کی کسوٹی پر رکھا جائے تو بات بن سکتی ہے ورنہ یہ مضمون دل میں گھر نہ کرسکا۔ ''شہرِخیال'' میں ملک رحمت کا پُرخلوص نامہ اچھا لگا۔ بشریٰ افضل اور سدرہ بانو کے نوک جھوک سے بھرپور خطوط بھی پسند آئے۔ عمدہ انداز ہے۔ سلیم قیصر وعلیکم السلام۔ آپ کی ساتھیوں سے تفصیلی علیک سلیک بہت خوب ہے۔ اعجاز سٹھار کا تبصرہ حسبِ معمول بہت جاندار ہے۔ فقیر حسین نے خوب صورتی سے سچ بیانیوں پر تبصرہ لکھا۔ طاہرہ گلزار کا خط حسبِ معمول شہرِخیال کے آخر میں بہار دکھلا رہا ہے۔ اس رواں زبان میں خط لکھنا باجی گل ہی کا خاصہ ہے۔ سب سے بڑھ کر وحید ریاست بھٹی کا خط قابلِ قدر شہ پارہ ہے۔ نہایت خوب صورتی سے پورے سال کا نچوڑ پیش کیا اور قابلِ قدر قلم کاروں کو کھل کر سراہا خاص کر آخر میں دی گئی تقریباً تمام ہی تجاویز ایسی ہیں جن کے بارے میں ہمارے بھی دل سے ''ہاں ہاں'' نکل رہی ہے۔ قیصر عباس نے بہترین خط لکھا لیکن کرب کے حوالے سے آپ لکھتے ہیں کہ ''انعام صاحب سنجیدہ کو لے آتے لیکن انہوں نے اس کی جوان بہن کو ترجیح دی۔ صاحب، عرض یہ ہے کہ اس طرح انعام صاحب نے اس لڑکی کا مستقبل محفوظ کرکے اپنے محبوب کی خواہش کا احترام کیا ہے۔ محبوب کا مان رکھ لینا اس کی خواہش پر اپنی چاہت قربان کردینا محبت پالینے سے بڑا عمل ہے۔ ایاز سومرو کی ''مایا'' نے سرورق کا حق ادا کردیا۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ نہایت خوب صورتی سے بیان کیے۔ ایاز نے بلاوجہ فون کرنے کی بجائے ہن کھن کو اس کے مقام پر پہنچادیا۔ اوراوپر والے نے اس کے بچے کی زندگی لوٹادی۔ علی صاحب نے ''فسادِ عشق'' میں خوب دھوکا کھایا۔ جناب آج کے دور میں کوئی کسی کو بائیک پر لفٹ نہیں دیتا اور آپ ایک عزت دار گھر سے بھاگی ہوئی جوان لڑکی کو پناہ دینے چلے تھے۔ ویسے پھر بھی سستے میں چھوٹ گئے۔''

☆ بشریٰ افضل نے بہاولپور سے لکھا ہے۔ ''2 جنوری کو سرگزشت موصول ہوا۔ اپنی محفل میں پہنچے۔ شاہد جہانگیر شاہد کو کرسیٔ صدارت مبارک ہو۔ تبصرہ اچھا تھا۔ دیکھ لیں وحید ریاست بھٹی نے واقعی عمل کرڈالا اور سالانہ تجزیے کے ساتھ حاضر ہوگئے۔ صوبی شاہ پسندیدگی کا شکریہ! طاہرہ گلزار جی لوگوں کو تو میرا میگزین میں لکھنا بھی پسند نہیں ہے۔ میرا لکھنے کا شوق لوگوں کو حسد میں مبتلا کردیتا ہے۔ کوئی میری تعریف نہیں کرتا۔ ہاں جو لوگ بیرونِ ملک رہتے ہیں وہ مجھے ضرور پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں آدھی ملاقات ہوجاتی ہے اور آپ کے تبصرے کو تو شوق سے پڑھتے ہیں۔ خدا کرے نیا سال سب لوگوں کے لیے مبارک ہو۔ وحید ریاست بھٹی کا سالانہ تجزیہ 2014ء مختصر اور جامع تھا۔ کیا خوب تجزیہ کیا ہے۔ محمد سلیم قیصر آپ کا اندازہ غلط بھی تو ہوسکتا ہے نا! اعجاز احمد سٹھار کا تبصرہ اچھا تھا۔ عمران جونانی نے بھی اچھا لکھا۔''

☆ اویس شیخ نے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے لکھا ہے۔ ''اس دفعہ اداریہ نہیں بلکہ اک نوحہ ہے۔ سانحہ پشاور میں وحشت اور بربریت کی جونئی داستان رقم کی گئی ''زمین پھٹی نہ آسمان گرا'' ایک شفیق ٹیچر کو ''انگارا'' بنادیا گیا۔ ظلم کی انتہا کردی۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ سانحہ پشاور کے تمام مرحومین کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے، آمین۔ سائنس دان پاکستان کا تذکرہ ٹھیک تھا۔ ''شہرِخیال'' کی جانب گامزن ہوئے۔ ملک رحمت کا جواب دینے پر شکریہ۔ شاہد جہانگیر صدارت کی کرسی مبارک ہو۔ عزیز مئے سے اسی خلوص کی توقع تھی۔ اس دفعہ فقیر حسین ضیاء کا مکتوب میرے دل کی آواز تھا۔ انکل! یقین مانیے ''کرب'' ایک ایسی سچ بیانی تھی جسے میں پڑھ کے اس رات ٹھیک طریقے سے سو نہیں پایا تھا۔ میرے خیال میں انعام انصاری صاحب نے ''کرب'' نہیں ایک ''قرض'' لکھا جسے ہمارے حکمرانوں کی بے حسی نے اب تک نہیں چکایا۔ وہ چکائیں بھی کیسے؟ انہیں صرف دو ہی چیزیں عزیز ہیں ایک اپنا مفاد اور دوسرا اپنے غیر ملکی آقاؤں کو خوش رکھنا۔ رہی ثبوت کی بات تو بنگلہ دیش میں پاکستان کے حامی لوگوں کی پھانسیوں پر حکومتی خاموشی کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ وحید ریاست بھٹی کا تجزیہ ان کی قابلیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ''شکوۂ سخن'' ڈاکٹر صاحب آپ کی تحریر کی تعریف و توصیف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ ''ہم پلہ'' جیسی تحریریں میرے مزاج کی نہیں اس لیے نہیں پڑھیں۔ ''آکٹوپس'' سے واقف تو تھے مگر ساتھ تنظیم کا لفظ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ ''کیسے کیسے لوگ'' منظر امام کی یہ کاوش پڑھنے والوں کے لیے تحفہ تھی۔ میں ان میں سے بیشتر شخصیات کا مطالعہ کافی بار کرچکا ہوں۔ سفرنامہ اس دفعہ کچھ پیچیدہ سا تھا جو اوپر سے گزر گیا۔ ''پراسرار گمشدگی'' نے حیران کردیا۔ کسی بھی ملک کے وزیرِاعظم کا یوں لاپتا ہوجانا اچنبھے کی بات ہے۔ ''فلمی الف لیلہ'' اس مرتبہ علم وادب سے بھرپور کاوش تھی۔ ''آبِ حیات'' پر تحریر پہلی بار پڑھی۔ کافی محظوظ ہوا۔ ''درست فیصلہ'' مختصر مگر جامع تحریر تھی۔ مریم کے خان صاحبہ آپ میری پسندیدہ لکھاریوں میں شامل ہوچکی ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ ''فلسفہ'' مضمون کے متعلق کچھ لکھیں آپ کا ممنون رہوں گا۔ سچ بیانیوں میں ''مایا'' قرآن مجید کی اس آیت کا زندہ معجزہ تھی

کہ جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ”میں اپنے بندوں کو ایسی جگہ سے رزق دوں گا کہ اس کے وہم و خیال میں بھی نہ ہوگا۔“ ”فاصلوں کا کرب“ شادی شدہ لوگوں کے لیے مکمل سبق تھا۔ ”بھینٹ“ پڑھی تو میں احسن صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے عامر کا شائستہ سے تعارف کروا تو دیا مگر آپ بعد میں عامر سے سچ کہہ بھی سکتے تھے کہ مجھے وہ پسند ہے آخر آپ کا سچا دوست تھا۔ ”آخری ملاقات“ پڑھی۔ پسند لڑکے، اور لڑکی کا بنیادی حق ہے مگر ہمارے نوجوانوں کی عقل پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ دل کی سنتے ہیں مگر دماغ سے نہیں سوچتے۔ سو اس کا انجام کبھی کبھار ”آخری ملاقات“ سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ (اتفاق کی بات ہے جس شمارے کی بات آپ نے کی ہے وہ شمارہ ہمارے پاس بھی نہیں ہے)۔“

☆ قیصر خان کا خلوص نامہ بھکر سے۔ ”اداریہ میں جس غم ناک سانحہ کی بات کی ہے وہ سانحہ تقسیم پاکستان کے دن رونما ہوا۔ بہت الفاظ لکھ سکتا ہوں پر سب الفاظ چھوٹے ہیں۔ معلوم نہیں خدا کے نام پر قتل و غارت کرنے والے لوگ کون ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو برباد کرے۔ ”شہر خیال“ میں نئے سال کے پہلے شمارے میں کرسی صدارت پر بہت پیارے خوب صورت اور جاندار تبصرے کے ساتھ شاہد جہانگیر صاحب جلوہ افروز تھے۔ بہت مبارک باد۔ محمد سلیم قیصر سے درخواست ہے کہ وہ کھل کر بتائیں وہ کس وجہ سے اتنے بڑے جرم میں پھنسے۔ حاجی اعجاز صاحب ہم آپ کے سنجیدہ اور معلوماتی تبصرے کے بہت شوقین ہیں۔ سید انور عباس شاہ ملک، محمد عزیز، عمران جونانی، ملک رحمت، محمد اشفاق اچھے تبصروں کے ساتھ حاضر تھے۔ وحید ریاست بہت ہی اچھے تجزیے کے ساتھ بہت ہی مفید رائے سے حاضر تھے۔ آپا سدرہ بانو صاحبہ شہر خیال میں پورا سال جلوہ افروز رہیں۔ مبارک باد اس کے بعد آپا بشریٰ افضل صاحبہ 11 خطوط کے ساتھ دوسرے نمبر پر رہیں۔ مبارک باد اور ساتھ بہت سی دعائیں آپا جان، آپ کے دشمن بھی کامیاب نہ ہوں، آمین۔ جنوری کے پرچے میں آپا طاہرہ گلزار اور باجی گل صاحبہ اپنے پرانے انداز سے حاضر تھیں اور شہاب نامہ پر رائے دی جو کہ بہت اہم بات کی ہے اللہ تعالیٰ سلامت رکھے، آمین۔ کہانیوں میں ”مایا“ بہت اچھی تھی اس میں ایک بات یا جملہ تھا کہ میں نے اس کی تخلوق کا خیال کیا تھا۔ بے شک آپ نے خیال کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا اچھا نعم البدل عطا کیا۔ شاہ زیب D.S.P کا بیٹا تھا اور بہت مشہور اور بڑے زمیندار کے بیٹوں کے ہاتھ قتل ہوا تھا۔ ”فاصلوں کا کرب“ بہت اچھی کہانی تھی اگر ماں باپ ایسے ہوں تو رزلٹ بالکل ایسا نکلتا ہے۔ ”بھینٹ“ احسن صاحب واقعی آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہت آزمائش دی ہے۔ پہلے محبت کی دوسری دوست کی اور اس کے ساتھ آپ کو صبر بھی دیا ہے۔ ”آخری ملاقات“ شہر خیال میں لکھنے والی آپا عظمیٰ شکور کی لاجواب کہانی تھی۔ حریم صاحبہ اور اس کا بھائی دونوں نفسیاتی پاگل تھے اور علی صاحب جان نہ سکے اللہ نے حریم کو اس کے کیے کی سزا دی ہے اور پتا نہیں بھائی کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ ”فساد عشق“ پروفیسر صاحب اپنے شاگرد کی چال میں پھنس گئے۔ واقعی کچھ لوگ ناسور ہوتے ہیں۔ پروفیسر صاحب ایک چھتر کے بعد بچ گئے میرا بہت تجربہ ہے۔ پولیس سے اللہ بچائے اور پروفیسر کے ساتھ سب سے التجا ہے وہ لڑکی کے کیس میں امداد نہ کریں۔ چاہے بھائی ہو۔ ”غم دل“ خواہشات جب وسائل سے بڑھ جائیں تو ایسا ہوتا ہے اور رشدی خان واقعی ایک عظیم انسان ہیں جنہوں نے شیطان کی نہیں سنی اور پاگل لالی نہ سمجھ سکی۔“

☆ سید انوار عباس شاہ کا مکتوب۔ ”پشاور کے 16 دسمبر والے سانحے کو مدتوں بھلایا نہیں جا سکتا۔ اس سلسلے میں جناب شاہد جہانگیر شاہد اور باجی گل طاہرہ گلزار ضرور اپنی خیریت سے مطلع کریں کہ ان کے کوئی عزیز یا ان کے بچے اس اسکول میں پڑھتے تو نہیں تھے (وہ تمام بچے ہمارے، آپ کے ہم سب کے عزیز تھے)۔ ”شہر خیال“ میں ایک دفعہ پھر شاہد جہانگیر شاہد بازی لے گئے۔ ماضی کی فلم انڈسٹری اور فنکاروں کے بارے میں معلومات دل کو بہت بھلی لگیں۔ شاید حبیب اور اعجاز کے علاوہ بھی ماضی کے اور فنکار زندہ ہوں اور گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ ہم ان کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل آفاقی صاحب ”فلمی الف لیلہ“ میں وقتاً فوقتاً ماضی کی معروف ہیروئن شمیم آراء کا تذکرہ کرتے رہتے تھے کہ وہ آج کل امریکا میں اپنے بیٹے کے پاس ہیں اور تادم تحریر کوما کی حالت میں ہیں۔ اس کے بعد ہمیں ان کے بارے میں نہیں معلوم۔ اسی طرح موسیقار سہیل رعنا کے بارے میں ان کے امریکا یا کینیڈا اسیٹل ہونے کے بعد ہمیں نہیں معلوم، (سہیل رعنا کینیڈا کی مٹی میں مدفون ہو چکے ہیں) شکریہ مسز سدرہ بانو ناگوری دیگر بہن بھائیوں کی طرح آپ نے بھی میری سلور جوبلی والی تحریر کو پسند کیا اور معراج انکل نے بھی اس تجویز کو منظور کر کے تیاری شروع کر دی ہے ان کا تو اسپیشل تھینکس۔ اس تجویز کی تھوڑی سی تشنگی باقی اس طرح رہ گئی کہ قابل احترام اور محترم شخصیت شاہد جہانگیر شاہد صاحب نے اس بارے میں اپنی رائے نہیں دی جو کہ بہت ضروری تھی۔ قیصر عباس خان اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ شہر خیال کی زینت بنے۔ انہوں نے بھی میری سلور جوبلی والی تجویز کے بارے میں اپنا ووٹ دیا۔ صوبی شاہ نے گو کہ مختصر لکھا لیکن خوب لکھا۔ آتی رہا کریں۔ محمد سلیم قیصر کے لیے ہم تہہ دل سے دعا گو ہیں کہ خداوند کریم ان پر اپنی رحمتوں کی برسات عطا کرے اور ان کے دکھ درد دور فرمائے، آمین۔ ویسے کیا حالات اور وجوہات تھیں جن کی وجہ سے آپ اس مقام تک پہنچے۔ اعجاز حسین ستھار خوب صورت موتی پروئے ہوئے ”شہر خیال“ کی زینت بنے۔ پڑوسیوں سے محبت کا

اظہار کیا اس والہانہ جذبے کا بے حد شکریہ۔ عمران جونانی اور فقیر حسین ضیا کے خط بھی شاندار تھے۔ ہر دلعزیز بہن طاہرہ گلزار عرف باجی گل آپ کا خط سبق آموز اور شاندار تھا۔ وحید ریاست بھٹی کا سالانہ تجزیہ پڑھنے کے قابل تھا۔ یقیناً اس پر بہت محنت ہوئی، ہم ان کو داد دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کو تو ہم عملی طور پر یہاں سے پھولوں کے ہار نہیں پہنا سکتے، یہ عمل لفظوں کے ذریعے ہم ان تک پہنچا سکتے ہیں۔ ان کی تحریر شکوۂ سخن سبق آموز اور معلومات سے بھرپور تھی۔ ''اکیلی عورت'' ایک دکھ بھری تحریر تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد جب شاہینہ نے بچوں کی خاطر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا تو ماں باپ نے اس کی شادی بغیر سوچے سمجھے فیصل جیسے بے غیرت شخص سے کردی۔ نتیجتاً شاہینہ کو اذیت ناک دن دیکھنا پڑے۔ ''پراسرار حویلی'' نام کی طرح پراسرار تحریر تھی۔ ''جیسے کو تیسا'' ایک دلچسپ تحریر تھی یہ حقیقت ہے کہ پتا اس کو ہوتا ہے جس کے دل پر گزرتی ہے۔ عظمیٰ شکور کی کہانی ''آخری ملاقات'' ایک بہترین، سبق آموز اور ان لوگوں کے لیے حوصلہ افزا تحریر تھی جو تھوڑی سی پریشانی یا مصیبت آجانے پر ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ ''بھینٹ'' ایک بے مثال تحریر تھی۔ اللہ تعالیٰ عامر اور شائستہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ منظر امام کی تحریر ''کیسے کیسے لوگ'' نے تو اس شمارے کو چار چاند لگا دیے۔ مشہور شخصیات کے بارے میں معلومات معہ ان کی تصاویر کے مضمون قابلِ تحسین تھا۔ اس کے علاوہ ہم پلہ، آکٹوپس، الوداع، پراسرار گمشدگی اور آب حیات جادو اثر تحریریں تھیں۔''

☆ رانا محمد شاہد کا خلوص نامہ بورے والا سے۔ ''دسمبر کا سرورق اچھا لگا۔ معراج صاحب کا اداریہ ایک تلخ حقیقت کو اجاگر کر رہا تھا۔ غربت کی چکی میں پستی عوام ہمیشہ سے سیاستدانوں اور پیسے والوں کے ہاتھوں ایسے ہی بھیانک مذاق و دھوکے کا شکار ہوتی آئی ہے۔ ''شہر خیال'' میں شاہد جہانگیر کا تبصرہ اچھا لگا۔ اسی لیے پہلے نمبر پر تھا۔ سید انور عباس کی سلور جوبلی نمبر میں سرگزشت کی تاریخ پر تفصیلی مضمون والی تجویز معقول لگی۔ ڈاکٹر قرۃ العین! ویسے میرے خیال میں پُراسرار نمبر سے بہتر ہے روحانی نمبر نکالا جائے۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی! نوبل نعام یافتہ مسلمانوں کے متنازعہ ہونے پر آپ کی معلومات حقیقت کے بہت قریب لگیں کہ مسلمانوں کو نوبل انعام بھی اپنے مفادات کو مدِنظر رکھ کر دیا جاتا رہا۔ اس ساری بات کا مطلب مسلمان انعام یافتگان کی کوششوں و صلاحیتوں کو نظر انداز کرنا ہرگز نہیں ہے۔ قیصر خان بھائی! تبصرے کے لیے وقت نکال ہی لیتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ کوشش کرتے ہیں کہ تبصرہ مختصر ہوتا کہ بھی لکھنے والے شامل ہوسکیں۔ بشریٰ افضل مبارک باد کا شکریہ۔ صحافت کے پیشے کے اسرار و رموز کو اجاگر کرتی مریم کے خان کی تحریر دلچسپ تھی۔ شمارے کا سب سے خوب صورت، دلچسپ اور معلوماتی مضمون ''دریائے نیل'' طارق عزیز خان کا تحریر کردہ تھا۔ مجھے دریائے نیل پر تفصیلی و تحقیقی مضمون درکار تھا۔ یہ تشنگی و تلاش بھی دور ہوئی۔ سرگزشت کے چھوٹے کٹ پیس اب دلچسپ و معلوماتی ہوتے جا رہے ہیں۔ یقیناً اس طرف آپ نے توجہ کی ہے۔ منظر امام صاحب نے جنوری تا دسمبر معلومات کا بہت مفید سلسلہ جاری رکھا۔ ان سے گزارش ہے کہ نئے سال پر معلومات کا کوئی اور منفرد سلسلہ شروع کردیں۔ مثلاً مہینے میں پیدا اور وفات پانے والی شخصیات پر مختصر یا مہینے میں ہونے والے اہم ترین واقعات پر وغیرہ۔''

☆ منشی محمد عزیز میمن کا خلوص نامہ لندن سے۔ ''سرورق کے اوپر والے ایک کونے میں غالباً شکوۂ سخن منیر شکوہ آبادی ہیں (جی نہیں راجر مور ہے) چھپکلی کو دیکھ کر بہت حیرت ہوئی لیکن جب سرورق کی کہانی ''مایا'' پڑھی تب بات سمجھ میں آگئی۔ بے شک اللہ تعالیٰ کے نوازنے کے نرالے طریقے ہیں۔ ''فاصلوں کا کرب'' زویا اعجاز کی یہ تحریر پڑھ کر مجھے تو لائبہ کے والدین بلکہ بے غیرت والدین پر شدید غصہ آیا۔ یقیناً میاں بیوی کی آپس کی ہمہ وقت لڑائی جھگڑے اور چپقلش کے نتائج بد سے بدتر انداز میں ظاہر ہوتے ہیں۔ احسن فاروقی کی ''بھینٹ'' افسردہ کرگئی۔ یقیناً آج بھی بہت سے لوگ عموماً اور عورتیں بالخصوص نام نہاد عاملوں کے ہاتھوں لٹتے رہتے ہیں۔ عظمیٰ شکور کی ''آخری ملاقات'' منفرد قسم کی آپ بیتی تھی۔ یقیناً حریم نفسیاتی مریضہ تھی جس نے اپنے محبوب کے ساتھ نرالا برتاؤ کر ڈالا۔ ''فسادِ عشق'' کا نام فسادِ کاروبار ہونا چاہیے تھا کیوں کہ بات بظاہر ارسلان کی نظر میں تو کاروباری رقابت ہی تھی ناں۔ بے چارے پروفیسر صاحب اپنے شاگرد کی مدد کے چکر میں مفت بے عزت ہوئے۔ ''پراسرار حویلی'' پڑھتے ہوئے میں خود بھی ڈر گیا کیوں کہ باہر شدید دھند، سردیوں کا موسم، ہو کا عالم اور کمرے میں اکیلا میں۔ ایسے میں یہ کہانی پڑھتے ہوئے بجلی چلی گئی تھی تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے میں مجھے تو خود ایسے محسوس ہوا جیسے عباد اور یاسر کے ساتھ میں بھی اسی پراسرار حویلی میں ہوں۔ بہرکیف ایک آدھ ایسی پُراسرار کہانی ہر ماہ ہونی چاہیے۔ ''اکیلی عورت'' میری نظر میں اس ماہ کی بہترین سچ بیانی تھی۔ جس میں شاہینہ شانی نے زبردست ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے درندے نما شوہر سے بالآخر نجات حاصل کرلی۔ نہ جانے کیسی وہ ماں تھی جس نے اپنی اولاد کی اولاد کے بارے میں ذرا سا بھی نہیں سوچا۔ اس ماہ کی آخری اور طویل ترین آپ بیتی ''غمِ دل'' ایک مصور اور آرٹسٹ کی داستانِ حیات جس کی زندگی میں اس کی شادی سے پہلے دو لڑکیاں آئیں مگر ان کے فلسفۂ محبت عجیب تھے۔ خصوصاً لالی کا وہ انداز بہت ہی بے ہودہ اور لغو تھا۔ وہ یقیناً ظاہری چکاچوند کی دلدادہ تھی اور اسی وجہ سے ایک بازاری عورت بن گئی۔ ''شکوۂ سخن'' ڈاکٹر ساجد امجد کا بہترین مضمون تھا۔ ''درست فیصلہ''

مریم کے خان عالمی سیاست کے موضوع پر تحریر لائی تھیں جس میں روسی لیڈروں کے غلط اور چین کے درست فیصلے کا ذکر تھا۔ یقیناً ایک چھوٹی سی غلطی بھی ریاست کو کئی صدیاں پیچھے دھکیل دیتی ہے۔ شیراز خان ''آبِ حیات'' کے موضوع پر مختصر مگر مفصل تحریر لائے جس میں ہر مذہب کے حوالے سے آبِ حیات کا ذکر تھا۔ ''ہم پلہ'' میں محترم شکیل ادریس صاحب نے راجر مور کے حالاتِ زندگی کا بڑا خوب صورتی سے احاطہ کیا ہے۔ ''کیسے کیسے لوگ'' منظر امام صاحب دنیا کے مشہور لوگوں کی خامیوں اور معذوریوں سے متعلق ہمیں آگاہ کررہے تھے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ ہمت مرداں مدد خدا۔ ''الوداع'' میں حسن رزاقی صاحب کا ائرہوسٹس کو دیا گیا مشورہ پڑھ کر بہت لطف آیا۔ کیا خوب مشورہ دیا ہے رزاقی صاحب نے۔ اداریہ پڑھ کر ایک بار پھر دل غموں کے سمندر میں ڈوب گیا۔ میرے خیال میں یہ پوری دنیا کی تاریخ کا انتہائی افسوس ناک اور دل دہلا دینے والا واقعہ ہے جسے پڑھ اور سن کر انتہائی دھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا ہے۔ میرے خیال میں شاید ہی کوئی ایسا سنگدل انسان ہوگا جس نے اس افسوسناک واقعے بلکہ سانحے کا اثر نہ لیا ہو۔ خود میرے بچے ٹی وی پر ان معصوموں کے جابجا بکھرے ہوئے خون آلود جوتے اور کتابیں دیکھ کر نفسیاتی مریض بنتے جارہے ہیں۔ ایک دن بیٹے نے مجھ سے کہا۔ ''پاپا! میں اسکول نہیں جاؤں گا۔'' میں نے پوچھا۔ ''کیوں؟'' تو کہنے لگا۔ ''وہ ظالم لوگ ہمارے اسکول میں بھی نہ آجائیں۔'' اور میں اپنے بیٹے کو دلاسہ بھی نہ دے سکا۔ یک صفحی داستان میں پاکستانی سائنسداں سرفراز خان نیازی کے حالاتِ زندگی سے مختصر اور مکمل آگاہی حاصل ہوئی۔ لیجیے جی! یہ ہے محبتوں اور چاہتوں کا شہر جسے ''شہرِ خیال'' کہا جاتا ہے۔ شہرِ خیال کی صدارت ایک بار پھر محترم شاہد جہانگیر شاہد کے نام تھی۔ بہت بہت مبارک باد محترم کو۔ 2014ء میں بھی وہ ''شہرِ خیال'' میں چھائے رہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے تاکہ ہم ان کے خوب صورت خطوط سے محظوظ ہوتے رہیں۔ پشاور ہی سے ایک صاحب انور اعجاز خان آف یک توتہ ہوا کرتے تھے۔ ان کے خطوط کو منی اسٹوری کہا جاسکتا ہے کیوں کہ وہ بھی بہت معلوماتی اور اصلاحی خطوط بھیجتے ہیں۔ سدرہ بانو اور بشریٰ افضل! آپ دونوں خواتین بھی خصوصی مبارک باد کی مستحق ہیں۔ سرگزشت سے آپ کی محبت قابلِ تعریف ہے۔ ملک رحمت! بالکل درست کہا آپ نے سلور جوبلی نمبر یقیناً خاص الخاص شمارہ ہوگا اس کے لیے آپ لوگ ڈٹ جائیں اور صفحات اور قیمت ڈبل کردیں۔ بشریٰ افضل! ہمارا ووٹ بھی آپ کا ہوا، بنا کسی لالچ کے۔ محمد اشفاق! میرے خیال میں اب خود کو بھی معاف کردیں اور ''اُس'' کو بھی۔ ویلڈن وحید ریاست بھٹی! بہت محنت کی ہے آپ نے اور بڑی باریک بینی کے ساتھ سرگزشت کا سال 2014ء کا تجزیاتی جائزہ پیش کیا ہے۔ ویسے ایک بات ''جوانوں'' سے کہنا چاہوں گا کہ دیکھیے۔ ''شہرِ خیال'' میں 2014ء میں مجھ ناتواں بوڑھے نے ہی مرد حضرات کی لاج رکھی تھی۔ یارو! آپ کیوں پیچھے رہتے ہیں۔ آیئے ناں ذرا شہرِ خیال کی طرف بھی۔ بھئی صاحب! انکل سے یہ سفارش کریں کہ مستقل طور پر بھی سرگزشت کی قیمت دس روپے بڑھا کر صفحات 340 کردیے جائیں تو بہتر رہے گا۔ ''علمی آزمائش'' میں آپ نے انعام یافتگان کا تذکرہ نہیں کیا۔ خیر آپ کی مرضی۔ آخر میں یہ بتادوں کہ محترم رانا محمد شاہد کی والدہ محترمہ اللہ کو پیاری ہوگئی ہیں۔ مرحومہ کے لیے مغفرت کی دعا کردیجیے گا۔''

☆ ناصرہ احمد کا خلوص نامہ نیویارک امریکا سے۔ ''سرگزشت باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ ''فلمی الف لیلہ'' تو ہمیشہ کی طرح قابلِ ستائش ہے۔ حسن رزاقی صاحب کا سفرنامہ ''الوداع'' بھی بہت عمدہ اور دلچسپ ہے۔ دسمبر کے رسالے میں اور تو سب اچھا تھا۔ صرف ''خونخوار'' پر مجھے تھوڑا سا اعتراض ہے۔ لکھنے والے نے تو اپنا کمال دکھا دیا لیکن فی زمانہ اتنے بے شمار خونی درندے دندناتے پھر رہے ہیں جو عورتوں کی بے حرمتی کررہے ہیں اور مردوں کے گلے کاٹ رہے ہیں معصوم بچوں کو قتل کردیتے ہیں اور وہ یہ سب ٹی وی پر دکھانے پر خوش ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں اس ماحول میں ایسا خونی قصہ ان ظالم لوگوں کو ظلم کرنے کے نئے طریقے سکھا سکتا ہے۔ اب آیئے پاکستانی بچوں کی تعلیم کی طرف۔ اس کی کسمپرسی کے حالات کے بارے میں بار بار پڑھ رہی ہوں لیکن حکومت کی طرف سے تو کوئی توقع نہیں ہے۔ آپ کا رسالہ پڑھنے والے ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ یہ ممبران مل جل کر بچوں کی پڑھائی کے لیے کچھ ہمت کریں۔ اگر صرف دس ممبران اپنے محلے یا گلی کے تین، چار بچے اکٹھے کرکے ان کو اپنے گھر کی ڈیوڑھی میں بٹھا کر پڑھانا شروع کردیں تو ایک سال میں 40 بچے اسکول کے لیے تیار کیے جاسکتے ہیں۔ پڑھانے کے لیے اردو اور انگریزی۔ ذاتی صفائی، ماحول کی صفائی اور اچھے شہری بننے کے طریقے سکھائے جائیں۔ دینیات مولویوں پر چھوڑ دیں۔ اگر ممکن ہو تو اپنی زکوٰۃ کی رقم میں سے کچھ حصہ ان بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی کتابوں پر استعمال کریں اور اگر ہوسکے تو ہفتے میں ایک دن ان کو سادہ سا کھانا کھلائیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ پروگرام چل سکتا ہے۔ اگر آپ مہربانی فرما کر میرا یہ پروپوزل شائع کردیں تو پھر معلوم ہوجائے گا کہ کتنے لوگ واقعی قوم کے دردمند ہیں اور آگے بڑھ کر کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ (آپ کی تجویز واقعی بہت عمدہ ہے)۔''

☆ فقیر غلام حسین ضیاء بھکر سے رقمطراز ہیں۔ ''جناب معراج صاحب آپ کی وسیع القلبی ہے کہ تنقید پر کبھی خفا نہیں

ہوئے۔عمر ڈھلتی جا رہی ہے مگر ذہن کھلتا جا رہا ہے ہر شمارہ خوب سے خوب تر کہلانے کا حق رکھتا ہے۔صد تے جاواں۔ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کا ''شکوہ سخن'' ایک ادبی اور تحقیقی مقالہ ہے۔ایسے عظیم لوگ جو زمانے کی گرد میں اب گم نام ہیں ان کو نئی نسل تک لانا بلاشبہ بڑی عرق ریزی کا کام ہے۔ڈاکٹر صاحب کی طرف سے نئے سال کا بہترین تحفہ ہے۔منظر امام صاحب نے ''کیسے کیسے لوگ'' کے عنوان سے انگریز سائنس دانوں کا تعارف اوران کی جسمانی معذوریوں کا تعارف خوب کرایا ہے۔کیا ہی بہتر ہوتا کسی مسلمان سائنس داں کا بھی ذکر فرما دیتے۔علی سفیان آفاقی صاحب کا شکریہ انہوں نے حبیب جالب سے ملا دیا۔کاشف زبیر صاحب کی تہلکہ خیز کہانی ''سراب'' اللہ کرے یونہی چلتی رہے۔ایاز احمد سومرو کی سچ بیانی ''مایا'' پر سرگزشت کے اپنے تبصرہ پر مزید کچھ کہنے کی حاجت نہیں۔زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔اسباب کیسے بنتے اور بگڑتے ہیں۔یہ سب مسبب الاسباب کی قدرت کاملہ کے انداز کریمانہ ہیں۔''

☆ خالد شفیع ملک نے بھکر سے لکھا ہے۔''سرگزشت میگزین اپنی نوعیت کا الگ میگزین ہے جس میں ایک دنیا سمائی ہوئی ہے۔اس کے تمام مضامین رنگا رنگ ہیں۔جب ایک قاری پڑھنا شروع کردے تو پڑھنے کے دوران میں تمام دنیا سے کٹ کر سرگزشت کی دنیا میں کھو جاتا ہے۔جنوری 2015ء میں ''کیسے کیسے لوگ'' پڑھا جو کہ بہت اچھا ہے تمام یورپین، امریکا کے نامور لوگ شامل ہیں۔۔بے شک انہوں نے بہت کام کیا ہے لیکن ہمارے ذہنوں میں یورپ اور امریکا کے لوگ چھا گئے ہیں اور ہم اپنے اسلاف کو بھول گئے ہیں۔شاید ہماری یادداشت کمزور ہے۔ہمارے مسلمانوں نے جو کام کیے ہیں وہ یادگار ہیں اور یورپین یونیورسٹیوں میں اب بھی محفوظ ہیں۔مثلاً جابر بن حیان نے گندھک کا تیزاب سب سے پہلے بنایا۔البیرونی نے سب سے پہلے زمین کا رداس معلوم کیا اور خطوط طول بلد عرض بلد کا جال نقشے پر فٹ کیا۔ابن ماجد، بحر ہند میں جہاز رانی کے متعلق کتابیں لکھیں۔بوعلی سینا نے پہاڑوں میں معدنیات اور طب پر کافی کتابیں لکھیں۔''القانون طب'' کتاب یورپ کی یونیورسٹیوں میں اٹھارہویں صدی تک پڑھائی جاتی تھی۔''

☆ احمد خان توحیدی کراچی سے مرقوم ہیں۔''نئے سال کا پہلا شمارہ جنوری 31 دسمبر راولپنڈی سے ملا۔وجہ موسم سرما کی چھٹیاں ہیں ہم پنڈی میں ہیں۔16 دسمبر پہلے ہی کیا کم جگر خراش ہے جو پھر کاری زخم لگا دیے گئے۔معصوم بچوں اور پولیو قطرے والی ٹیم کا کیا جرم ہے؟ اللہ تعالیٰ معصوم کلیوں کی قربانیاں رائیگاں نہ فرمائیں۔سائنسداں پاکستان سرفراز نیازی کے بارے میں قبل بھی پڑھا ہے تفصیل کا شکریہ۔یک صفحہ کو کتابی شکل دے دیں یہ ایک اہم دستاویز ہے۔شاہد جہانگیر پھر کرسی صدارت پر جلوہ افروز تھے ڈبل مبارک۔تبصرہ گڈ تھا۔واقعی اس عمر میں بھی آفاقی صاحب کے سوا کسی نے فلمی دنیا کے بارے میں نہ لکھا۔ہمت کو داد دیتے ہیں۔بھائی سلیم قیصر میں آپ کی رہائی کے لیے روزانہ سورۂ قمر پارہ 27 حضرت نوحؑ والی دعا آیت نمبر 10 پڑھتا ہوں۔آپ بھی اوّل آخر 11 بار درود شریف پھر 313 بار پڑھیں اللہ آزادی دیں گے۔سسٹر طاہرہ گلزار پشاور، آپ جیسی بے بی گڑیا بہن سے کون ناراض ہوسکتا ہے۔بھائی انور عباس بھکر، تبصرہ گڈ تھا جس قوم میں ایدھی و چھیپا جیسے لوگوں کی خیر نہ ہو ہمارا اللہ بیلی ہے۔وحید ریاست بھٹی کلر سیداں، بھائی میں آپ کا بہت قریبی ہمسایہ دریائے سواں کی زرخیز مٹی چکری کا سپوت ہوں۔منظر امام صاحب بارہ ماہ کے حالات کے بعد ''کیسے کیسے لوگ'' معہ تصاویر لانے پر شکریہ۔''فلمی الف لیلہ'' آفاقی صاحب نے ڈاکٹر کے سامنے کلمہ حق کہنے والے حبیب جالب اور فیض احمد فیض جیسے عظیم شاعروں کا تذکرہ کیا۔اب آتے ہیں سچ بیانیاں کی طرف۔''مایا'' میں ہن کھن کے بارے میں پہلی بار پڑھا۔قدرت کے کارخانے میں کوئی چیز ناکارہ نہیں ہے۔لی وانگ غیر مسلم ہونے کے باوجود انسانیت کا درس دے گیا۔''فاصلوں کا کرب'' لائبہ اور علی کی شادی اچھی بات۔والدین کا خلا والدین ہی پُر کرسکتے ہیں۔''بھینٹ'' جعلی عاملوں کی دکان، جاہل و احمق لوگوں سے چلتی ہیں۔''آخری ملاقات'' علی کی معذوری، نگینہ بہت عظیم ہے۔حریم کو اپنے خاوند اور بچوں کے ساتھ پیار سے رہنا چاہیے۔''

☆ عزیز اللہ لکھتے ہیں۔''2015ء کی ہر دل عزیز کہانی ''مایا'' ٹاپ کی سچ بیانی ہے۔کروڑوں سلام محترم معراج رسول صاحب کو۔سو سلام ایاز سومرا کو، سچ کہا ہے کسی نے' پیسا ساتھ ہو تو وقت کا ہے کی۔میں تو کہتا ہوں پاکستان سونا ہے سونا۔دور جانے کی ضرورت نہیں ہر سال عرب شہزادے سندھ میں نایاب پکھیوں کا شکار کرتے ہیں۔سنگاپور سے وانگ لی مان ہن کھن کے عشق میں مرا جا رہا ہے۔ہن کھن جتنا زہریلا ہوتا ہے اتنا مہنگا بھی ہے اور قیمتی بھی ہوتا ہے۔اپنی روح کی تسکین کی خاطر اور شرمندگی سے بچنے کے لیے یہ بوڑھے دولت مند سیاست داں اپنے جسم کو ٹائٹ اور چست رکھنے کی خاطر ہن کھن کو استعمال کرتے ہیں۔وانگ لی مائن نے یہ بات ثابت کردی کہ دردمند دل غیر ملکیوں میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔پہلی سچ بیانی ''مایا''۔''بھینٹ'' دوسرے نمبر پر۔''فساد عشق'' تیسرا نمبر''۔''پُراسرار

حویلی" چوتھا نمبر اعجاز مختار آپ کے جسم میں اتنی ڈھیر ساری بیماریاں پل رہی ہیں حیرت ہے یا تو آپ کے گھر کا ماحول صحیح نہیں یا تو آپ کے ہاں کھانا پینا صحیح نہیں۔"

☆ محمد خواجہ نے کورنگی کراچی سے لکھا ہے۔ "خوب صورت آرٹ کے نمونہ والی کرسی کے ساتھ ایک بڑی چھپکلی دیکھ کر جھرجھراہٹ ہوئی یہ کیسی مناسبت ہے لیکن کہانی "مایا" پڑھ کر حقیقت سامنے آئی۔ معراج رسول صاحب! آپ کے اداریے میں ایک ایک لفظ سے لہو کی بوندیں ٹپکتی نظر آئیں۔ اسکول کے معصوم پھولوں کو گولی مارنے والے حیوان سے بھی بدتر ہیں۔ وہ انسان ہی نہیں تھے تو مسلمان کہاں سے ہوئے۔ شاید خونخوار درندہ اور مہلک سانپ بھی بچوں کی معصوم شکل دیکھ کر بغیر نقصان پہنچائے گزر جاتا۔ لیکن آہ اس کے بعد شاید ایسی درندگی دنیا میں کہیں دیکھنے میں نہیں آئے گی۔ ان کے لیے موت بھی کم سزا ہے۔ سرگزشت کو کیا کہوں کہ یہ موتیوں کی مالا ہے یا رنگ برنگی پھولوں کا گلدستہ۔ شخصیات کا تعارف جن میں بڑے بڑے شاعر، سائنسداں، اداکار۔ غرض زندگی کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے ہرفن مولا کے زندگی کے حالات اور کاوشوں کا سلسلہ اس قدر معلوماتی ہوتا ہے جو ہمیں شاید ہی کسی درسگاہ میں بتایا جاتا ہو۔ معلومات کا ایک خزانہ جو ذہن اور دل پر اثر انداز ہو جاتا ہے۔ "آکٹوپس" خالد قریشی کی تحریر ایک بوڑھے سے ہو جانے والی انجانی غلطی کو اس نے حماقت سے تیسرا قتل کر کے بجائے اپنے بچاؤ کے خود ہی موت کے منہ میں جا پہنچا۔ یہ انسانی نفسیات کی ایک عجیب اور عبرت ناک کہانی ہے۔ "الوداع" حسن رزاقی ایک ائر لائن انجینئر کے ساتھ بہت عمدہ مصنف بھی ہیں۔ ان کی تحریر انتہائی معلوماتی ٹیکنیکل کا معلوماتی خزانہ ہے۔ ائر لائن سے دلچسپی ہر شخص رکھتا ہے لیکن جو معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں وہ بہت ہی تعریف کے لائق ہیں ساتھ ہی سفرنامہ اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو یکجا کر کے جو مزہ پیدا کیا گیا وہ واقعی ان کی تحریر کا کمال ہے۔ میں سب سے پہلے اسے پڑھتا ہوں۔ آپ کا رسالہ شکاریات کا قصہ تحریر کرتا تو مزہ دوبالا ہو جاتا۔ آپ شکاریات کو بھی ضرور رسالے میں شامل کریں۔ یہ ایک ایڈونچر ہی تو ہے۔ "مایا" ایک بہت ہی عجیب اور اسرار سے بھرپور ہے۔ بن کھن کا پہلی بار پڑھا۔ یہ ہمارے سندھ میں ہوتی ہے اور اتنی قیمتی اور زہریلی بھی بڑی حیرت ہوئی، ہاں کالے بچھو کو دیکھا ہے اور پڑھا بھی ہے کہ باہر ممالک کو بیچ دیے جاتے ہیں بہت مہنگی قیمت پر۔ "فاصلوں کا کرب" بڑی دل دوز آپ بیتی اور نصیحت آمیز۔ یقیناً زندگی میں کچھ خلا کبھی پُر نہیں کیے جاتے۔ چاہے کچھ بھی نعم البدل مل جائے۔ "بھینٹ" دو دوستوں کی لازوال محبت اور قربانیوں کی داستان حسرت۔ بہت اچھی کہانی تھی۔ "آخری ملاقات" ایک مختصر آپ بیتی۔ "پراسرار حویلی" بہت ہی پُراسرار کہانی جس میں ایڈونچر کی بہت ہی دل گردہ کی عکاسی ہے۔ آخری کہانی "اکیلی عورت" بہت گہری اور حقیقی کہانی۔ ہمارے معاشرے میں ایسے ہی واقعات ہیں۔ بیٹی کے ماں باپ کے لیے ایک سبق آموز کہانی۔ جن کی ایک جلد بازی اور غلط فیصلے ہمارے معاشرے کی بہو بیٹیوں کو جہنم میں دھکیل دیتی ہے۔"

☆ رانا فیصل جاوید کی علی پور شہر سے آمد۔ "کافی تعطل کے بعد ایک مرتبہ پھر شہر خیال میں حاضر ہوں۔ اس مرتبہ سرگزشت کو بھی غم واداسی کا لبادہ اوڑھے پایا وجہ تو سب کو ہی پتا ہے۔ انسانیت سوز دہشت گردی کا واقعہ جو پشاور کے ایک کیڈٹ اسکول میں ہوا۔ اس واقعے نے پوری قوم کو غم کے آنسو دیے۔ دہشت گردوں کے عزائم کا پردہ چاک کرتے اداریے نے دہشت گردوں کے لیے نفرت میں اضافہ کیا۔ انشاء اللہ پاکستان آرمی ان کو برباد کرے گی۔ یک مشتی داستان پڑھ کر کچھ حوصلہ ملا کہ پاکستان میں لاتعداد ہرفن مولا ہیں۔ بس ان کی صلاحیتوں کو صرف کرنے کی ضرورت ہے۔ "شہر خیال" میں وحید بھٹی کے تجزیے نے متاثر کیا۔ "شکوۂ سخن" میں ڈاکٹر ساجد امجد نے قارئین کو خوب ادبی رنگ میں رنگا۔ حادثاتی کہانی "آکٹوپس" میں جونیئر ہائیڈ کے ساتھ ہونے والے خوفناک حادثے نے دل میں درد کی ٹیسوں کو بڑھاوا دیا۔ تحریر "کیسے کیسے لوگ" اس فقرے کی تفسیر لگی کہ ہمت مرداں مدد خدا سفرنامہ "الوداع" انفرادیت کا حامل رہا۔ آسٹریلوی وزیراعظم کی گمشدگی کے واقعے نے چونکا دیا۔ "ہم پلہ" میں جیمز بانڈ 007 کا تذکرہ ہوا۔ "فلمی الف لیلہ" پڑھنے کو دل نہیں کیا۔ آفاقی صاحب، موجودہ فلم انڈسٹری پر بھی کچھ لکھیں۔ مریم کے خان نے درست فیصلہ لکھتے ہوئے حقائق کا درست تجزیہ کیا۔ حقائق دل نے تسلیم کیے۔ "بیت بازی" اچھی رہی۔ سچ بیتیوں پر تبصرہ کیا تو خط طویل ہو جائے گا۔ اس لیے صرف نظر کرتے ہوئے میری چند گزارشات ہیں اب کوئی نئی سلسلہ وار کہانی شروع ہونی چاہیے۔ جیسا کہ دہشت گردی، قومی سلامتی اتحاد وغیرہ۔ قومی سلامتی کے اداروں پر لکھا جائے۔ اس کہانی میں ان دشمنوں کا گھناؤنا چہرہ اجاگر کیا جائے جو ہمارے پیارے ملک کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی کہانیاں قوم اور قوم کے سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ضروری ہیں۔"

تاخیر سے موصول خطوط

آفتاب احمد نصیب اشرفی، لاہور۔ حکیم سید محمد رضا شاہ، نورنگہ میانوالی۔ امتیاز نثار فاروقی، کوئٹہ۔ نیاز احمد سومرو، سکھر۔ محمد احباب، ناصر حسین خاصخیلی، کراچی۔ فصیحہ خانم، حیدرآباد۔ نیاز لکانی، کوٹ ڈیجی۔ ارشاد حسین، کوٹ ادو۔

باکمال

ڈاکٹر ساجد امجد

کمال کی لال کنڈوری میں لپٹی ہوئی بھوک اس کی ماں جائی تھی، بہن ہی کی طرح ساتھ ساتھ تھی۔ روح کے راگ میں ایک چیخ سمائی ہوئی تھی زندگی آہ و فغاں کا مرکب بن چکی تھی۔ پھر بھی وہ صبر و شکر کی سولی پر جینے کے لیے مسیحائے وقت بننے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اسے نہ تن کا ہوش تھا اور نہ پیٹ میں دہکتے تندور کا۔ وہ بس ایک ہی سوچ میں ہمہ وقت غلطاں نظر آتا کہ کسی طور سائنس کے ان نظریات کو غلط قرار دے دے جو غلط ہوتے ہوئے بھی رائج ہیں۔ یہ اندازِ تفکر، ہمہ وقت فکر میں ڈوبے رہنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بچپن ہی سے وہ فکر میں ڈوبا ہوا نظر آتا اسی لیے اساتذہ اسے غبی سمجھتے۔ وہ سست الوجود سمجھا جاتا۔ لوگ اس کے تاریک مستقبل کی پیش گوئی کرتے مگر جب اس کی سوچ و فکر نے دنیا کو نئے زاویے عطا کیے تو سب انگشت دنداں رہ گئے۔

دنیائے سائنس میں سب سے مشہور سائنس داں کا ذکرِ خاص

موٹی گردن اور چھوٹے سر والا بھاری بھرکم شخص کلاس روم میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی تمام بچے کسی مشینی پرزے کی طرح تن کر کھڑے ہوگئے۔ صرف ایک بچہ تھا جو غالباً سوچ رہا تھا کہ اس موقع پر کیا کرنا چاہیے حالانکہ یہ روز کا معمول تھا جب مدرس کلاس روم میں داخل ہوتا تھا، بچوں کو کھڑا ہونا پڑتا تھا اور یہ موٹی گردن چھوٹے سر والا مدرس ہی تو تھا۔ اس بچے کو یاد آیا کہ اس موقع پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ وہ اس وقت کھڑا ہوا جب تمام بچے بیٹھ چکے تھے اور استاد بلیک بورڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے اکیلا کھڑا دیکھ کر کلاس میں قہقہے گونجنے لگے۔ استاد نے ہنسی کی آواز سن کر پلٹ کر دیکھا لیکن اس وقت تک، وہ بچہ گھبرا کر بیٹھ چکا تھا۔ ہنسی کا طوفان بھی تھم چکا تھا۔ استاد نے بلیک بورڈ پر بہت آسان سا کوئی لفظ لکھا اور اس سست لڑکے کی طرف متوجہ ہوا۔

''البرٹ تم بتاؤ میں نے کیا لکھا ہے؟''

البرٹ اس طرح چونکا جیسے کسی نے اسے نیند سے اٹھا دیا ہو۔ استاد نے اپنا سوال پھر دہرایا۔ البرٹ کا حال یہ تھا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

''تم کس قدر سست اور غبی ہو۔ میں پچھلے دو دنوں سے ایک ہی سوال تم سے کر رہا ہوں اور تم میرا منہ چڑاتے رہتے ہو۔ آج میں تمہیں ضرور سزا دوں گا۔''

بچوں کے ہاتھوں میں گدگدی ہونے لگی۔ البرٹ آج پھر پٹنے والا ہے۔ اس سردی میں بید کھائے گا تو مزہ آئے گا۔

بچے کچھ اور توقع کر رہے تھے۔ استاد نے کوئی اور سزا تجویز کی۔ اس نے آج کے موسم کو مدنظر رکھتے ہوئے یہی سزا مناسب سمجھی ہوگی۔

''باہر ہال میں چلے جاؤ اور دوپہر تک وہیں کھڑے رہو۔''

البرٹ یہ حکم سن کر بھی اپنی جگہ پر جما ہوا تھا جیسے استاد کے منہ سے نکلے ہوئے لفظوں کو تول رہا ہو۔ پھر جیسے سب کچھ اس کی سمجھ میں آگیا ہو۔

پچھلی نشستوں سے آواز آئی۔ ''سست کہیں کا۔'' اس

نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کا نام نہیں لیا گیا تھا لیکن وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ اسی کو کہا جا رہا ہے۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور کلاس روم سے نکل کر باہر ہال میں آ گیا۔ باہر نکلتے ہی اسے احساس ہوا کہ یہاں تو بے انتہا سردی ہے۔ دوپہر تک یہاں کھڑے رہنا مشکل ہو جائے گا لیکن یہ سوچ کر اطمینان بھی ہوا کہ استاد کے بید کھانے سے بہتر ہے کہ وہ یہاں سردی میں کھڑا رہے۔ یہاں نہ کوئی سوال پوچھنے والا تھا نہ جواب مانگنے والا۔ یہ خوشی الگ تھی۔

پہلی جماعت کے چھ سالہ بچے کی بساط ہی کیا۔ وہ جلد ہی سردی کی شدت سے کانپنے لگا۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس سے تو اچھا تھا استاد کے بید کھا لیتا، گرم کمرے میں تو رہتا۔ پھر اس نے وہی کیا جو وقت گزاری کے لیے کیا کرتا تھا۔ وہ پچھلی باتیں سوچنے بیٹھ گیا۔ وہ اپنی ماں کی زبانی سنی ہوئی باتیں دل ہی دل میں دہرا رہا تھا۔

''میں چھ سال قبل 14 مارچ 1879ء کو میونخ سے پچاس میل مغرب میں واقع قصبہ الم میں پیدا ہوا تھا۔ میں ابھی ایک سال کا تھا کہ میرے والدین اس بڑے شہر (میونخ) میں منتقل ہو گئے۔ میونخ جنوبی جرمنی کے اس علاقے میں واقع ہے جس کو ''بوریا'' کہتے ہیں۔ میری پیدائش سے چند سال قبل بوریا اپنی آزادی سے دست کش ہو گیا تھا اور پروشیا دیگر ریاستوں کے ساتھ مل کر نئی جرمن سلطنت کا حصہ بن گیا تھا۔ نئے نظام کے تحت اسکول فوجی مشینوں کی طرح چلائے جا رہے تھے۔ نظم و ضبط اتنا سخت تھا جتنا سخت کسی فوجی بیرک میں ہوتا ہے۔''

اسی نظم و ضبط کا مظاہرہ وہ دیکھ رہا تھا کہ سخت سردی میں کلاس روم سے باہر کھڑا ٹھٹھر رہا تھا۔

اس سردی کو برداشت کرتے ہوئے اسے گھر کی پُرمسرت زندگی یاد آ گئی۔ گھر کی تو بات ہی اور تھی۔ وہ گھر پہنچتا تو اس کی بارہ سالہ بہن مایا گرم جوشی سے اس کا استقبال کرتی تھی اور ماں اس کا تو جواب ہی نہیں تھا۔ باورچی خانے میں بٹھا کر اسے گرم گرم کھانے کھلاتی تھی۔ گھر کی یاد آئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ گھر پہنچتے ہی ماں سے کہہ دے گا کہ اسے اس اسکول میں نہیں پڑھنا۔

ابھی ایک گھنٹا گزرا تھا کہ اس کے استاد کو غالباً اس پر رحم آ گیا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ شدید سردی میں کہیں وہ بیمار ہی نہ پڑ جائے۔ اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور اسے

اندر آنے کی اجازت دے دی۔ البرٹ اس پیشکش کو جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ وہ سر جھکائے اندر آ گیا اور اپنی نشست پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ گود میں رکھے ہوئے تھے۔ گردن اب بھی جھکی ہوئی تھی۔

چھٹی کے بعد وہ گھر پہنچا تو حسبِ معمول اس کی بہن نے اس کا استقبال کیا۔ ماں اسے دیکھتے ہی باورچی خانے میں چلی گئی۔ وہ سردی سے بچنے کے لیے باورچی خانے میں چلا گیا۔ ماں نے وہیں اس کے سامنے کھانا رکھ دیا۔ مایا بھی اس کے پاس ہی آ کر بیٹھ گئی۔ اسے اب تک اسکول میں گزری ہوئی تکلیف یاد تھی۔ وہ سوچ بھی رہا تھا کہ ماں سے نہیں تو بہن سے ضرور کہے گا کہ اسکول ماسٹر نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے کھانے کے دوران میں اس نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا باپ اسکول جا کر کہہ دے کہ البرٹ کو سزا دے لیا کرو لیکن اسے کمرے سے باہر نہ نکالا کرو۔ وہ بیمار پڑ گیا تو کیا ہو گا۔ ماسٹر کی طرف سے دی گئی جسمانی سزا اسے اسے بہت ڈر لگتا تھا۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ کسی کو کچھ نہ بتائے۔ اس نے خاموشی سے کھانا ختم کیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مایا اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی تھی۔ وہ چاہتی تھی البرٹ اس کے ساتھ کھیلے لیکن وہ ہمیشہ کی طرح بستر پر لیٹ کر بے حس و حرکت ہو گیا۔

''البرٹ تم کیسے بھائی ہو۔ میرے ساتھ کھیلتے ہی نہیں ہو۔''

''مایا، تمہیں معلوم ہے کھیل کود مجھے پسند نہیں۔ پھر بھی روز یہی ضد کرتی ہو۔''

''تمہیں کھیل کود کیوں پسند نہیں۔''

''یہ مجھے نہیں معلوم۔ بس نہیں ہیں پسند۔''

''کھیلنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلانے پڑتے ہیں۔ اس لیے تمہیں پسند نہیں۔''

''میں کچھ سوچ رہا ہوں۔ مجھے سوچنے دو۔''

''بس تم سوچتے ہی رہنا۔ چچا روڈی کے بچے آئیں گے تو میں ان کے ساتھ کھیلوں گی۔''

''ہاں کھیل لینا۔'' البرٹ نے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

یہ ایک دن کا قصہ نہیں تھا۔ مایا کو روز اسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ پھر وہ گھر کے اندر لگے ہوئے باغیچے میں اکیلی ہی ٹہلتی رہتی تھی۔ کوئی خوش نصیب دن ہی ہوتا تھا کہ وہ البرٹ کو منا کر باغیچے میں لے آتی تھی۔ یہاں بھی وہ

اس کے ساتھ کھیلنے کی بجائے درختوں کے پتے توڑ کر ان کی باریک باریک شریانوں پر غور کرنے لگتا تھا۔ مایا کو ان باتوں سے کیا سروکار۔ وہ اسے پکار پکار کر تھک جاتی اور پھر اسے اکیلا چھوڑ کر چلی آتی۔ کا اہل نہیں کا۔

اس کی یہ سست روی پورے خاندان میں مشہور ہوگئی تھی۔ اس کے ماں، باپ اس کی طرف سے فکرمند رہنے لگے تھے۔ اس نے بولنا بھی بہت دیر سے سیکھا تھا۔ ہر کام میں دیر لگا دیتا تھا۔ ابھی تو وہ بچہ تھا لیکن اس کے بڑے سوچا کرتے تھے کہ اگر اس کی یہ عادت نہیں بدلی تو وہ اپنی زندگی کیسے گزارے گا۔

کبھی گھر میں کوئی تقریب ہوتی یا مہمان جمع ہوتے تو وہ اچھا خاصا تماشا بن کر رہ جاتا۔ سب بچے کھیل کود میں مگن ہو جاتے مگر وہ تو ایک طرف چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ اسے ہم عمر بچوں اور ان کے کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی۔ ہاں اس وقت اسے خوش دیکھا جا سکتا تھا جب اس کے خاندان والے کسی ویک اینڈ پر قریبی پہاڑیوں پر چلے جاتے اور جھیلوں پر سیر و تفریح کرتے اور دیہاتی ڈھابوں میں ٹھہرتے۔ اسے جھاڑیوں کے درمیان چلنا بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کی خوشی اپنی جگہ لیکن یہاں بھی وہ دوسرے بچوں سے مختلف ہی نظر آتا۔ جھیل کی سطح آب پر ننھی ننھی لہروں پر نظریں جمائے پہروں بے حس و حرکت بیٹھا رہتا یا طرح طرح کے پتوں کو توڑ کر ان کی ساخت پر غور کرتا رہتا۔

ایک مرتبہ وہ ایک ندی کے کنارے پکنک منا رہے تھے۔ البرٹ حسب معمول ندی کے پانی پر نظر جمائے بیٹھا تھا۔ اس کے چچا روڈی بہت دیر سے اسے دیکھ رہے تھے۔ آخر انہوں نے البرٹ کی ماں کی توجہ اس طرف دلائی۔

''تم اپنے بیٹے کو دیکھ رہی ہو۔ سب بچے یہاں آ کر خوش ہیں۔ ایک دوسرے کو چھیڑ رہے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ کھیل رہے ہیں لیکن البرٹ خوش نہیں ہے۔ سب سے الگ اداس بیٹھا ہے۔''

''وہ اداس نہیں ہے۔'' اس کی ماں نے کہا۔ ''وہ اس لیے خاموش ہے کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔''

اس کی ماں اسی طرح اپنے بیٹے کی صفائیاں پیش کیا کرتی تھی۔ اس کی یہ بات سن کر اس کے چچا کو ہنسی آ گئی۔

''ہاں لگتا تو مجھے بھی ہے کہ البرٹ بڑا ہو کر پروفیسر بنے گا۔''

البرٹ کی ماں اس طنز کو نظر انداز نہ کر سکی۔ اس نے اپنے دیور کو سرزنش کی۔ ''تمہیں البرٹ کا مذاق اڑانے کی ضرورت نہیں۔''

''میں مذاق نہیں اڑا رہا ہوں۔ میں تو یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ذہین ترین طلبہ ہی اس معزز عہدے تک پہنچتے ہیں۔''

''تمہیں میرے بیٹے کی ذہانت پر کوئی شک ہے؟''

''ذہین تو وہ ہے لیکن کسی عہدے تک پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلانے پڑتے ہیں۔ اس کی سست روی اسے کیسے آگے بڑھنے دے گی۔''

''یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس کی سست روی سے تو ہم سب ہی پریشان ہیں۔ اسے تو کھلونوں تک سے دلچسپی نہیں ہے۔ جب ذرا بڑا ہو جائے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ہاں ہو تو جائے گا۔'' چچا نے کہا اور بات ختم کر دی۔

ابھی وہ زیادہ بڑا نہیں ہوا تھا۔ صرف ایک سال گزرا ہوگا۔ وہ سات سال کا تھا کہ سخت بیمار پڑ گیا۔ وہ ویسے ہی ہلنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اب تو بیمار تھا بالکل بستر سے لگ گیا۔ اس کی تھکی ہوئی آنکھیں اور زیادہ تھک گئیں۔ دن بھر تکیے پر سر رکھے کھڑکی سے نظر آنے والے باغ کو دیکھتا رہتا۔ مایا نے اپنے کھلونے دے کر بہت چاہا کہ وہ ان سے کھیلے لیکن اسے ان کھلونوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اس کے ایک چچا کا نام جیک تھا جو اس کے باپ کے ساتھ مل کر مشترکہ کاروبار کرتے تھے۔ دونوں بھائیوں کی بجلی کے سامان کی ایک چھوٹی سی ورکشاپ تھی۔ ہرمن آئن اسٹائن کاروبار کی دیکھ بھال کرتے تھے اور جیک آئن اسٹائن ٹیکنیکل کاموں کے انچارج تھے۔ دکان پر کچھ سامان کم پڑ گیا تھا۔ ہرمن آئن اسٹائن یہ سامان لینے قریبی قصبے میں گئے۔ انہوں نے ایک دکان میں چھوٹا سا قطب نما رکھا دیکھا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتے رہے پھر انہیں البرٹ کا خیال آیا۔ اسے کھلونوں سے دلچسپی نہیں ہے لیکن یہ قطب نما اسے ضرور پسند آئے گا کیوں کہ یہ کھلونا نہیں ہے البتہ کھلونے جیسا ضرور ہے۔ کم از کم البرٹ اسے کھلونا ہی سمجھے گا۔ اس نے وہ قطب نما خرید لیا۔

وہ گھر پہنچا تو البرٹ اپنے بستر پر لیٹا چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''دیکھو البرٹ، میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔''

''کیا ہے یہ؟''

''جادو کی سوئی والی ڈبیا۔''

''جادو کی ڈبیا؟''

''اس ڈبیا کو چاہے تم سیدھا کرلو یا الٹا یا پھر ترچھی کرلو اس کی سوئی ہر حالت میں ایک ہی طرف اشارہ کرے گی، ہوئی نا جادو کی سوئی؟''

البرٹ نے وہ ڈبیا اپنے ہاتھ میں لے لی اور ہتھیلی پر رکھ لی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جو کچھ اس کے باپ نے کہا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں ایک طرف پلٹا پھر دوسری طرف۔ ہر بار سوئی اسی جگہ اسی سمت، واپس آگئی جس پر کہ وہ پہلے تھی۔

یہ پہلا موقع تھا جب البرٹ نے کسی چیز میں اس قدر دلچسپی لی تھی۔ اس کی تھکی ہوئی آنکھیں روشن ہوگئی تھیں۔ بجھا ہوا چہرہ دمکنے لگا تھا۔ وہ حیران تھا کہ ڈبیا کا رخ کسی طرف بھی موڑ لو۔ سوئی کا رخ ہمیشہ ایک ہی طرف کیوں رہتا ہے۔

''ڈیڈی، سوئی کا رخ ہمیشہ ایک طرف کیوں رہتا ہے؟''

''میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا، بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ سب جادو سے ہوتا ہے۔''

''جادو کچھ نہیں ہوتا۔ میں یہ نہیں مانتا۔''

''چچا جیک سے یہ پوچھ لینا۔ ان چیزوں کو وہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہی تمہیں بتا سکیں گے۔''

اس کا باپ جا چکا تھا۔ وہ بدستور سوئی کی حرکت پر غور کررہا تھا۔ وہ صرف اتنا کرسکا کہ ایک جھٹکے سے سوئی کو دوسری طرف لے جاتا لیکن سوئی گھوم کر پھر شمال کی طرف آجاتی۔ اس کی حیرانی بڑھتی جارہی تھی۔ وہ صرف اتنا جان سکا کہ بیرونی فضا میں کوئی چیز ایسی ضرور ہے جو سوئی کو گھومنے پر مجبور کررہی ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ فضا میں کوئی قوت ضرور موجود ہے۔

اس کی ماں کب، کمرے میں آئی اور کب اس کے سرہانے آکر کھڑی ہوگئی، اسے کچھ بھی معلوم نہ ہوسکا۔ وہ اس طرح ساکت بیٹھا ہوا تھا جیسے پتھر کا بن گیا ہو۔ اس کی ماں پریشان ہوگئی تھی کہ اس کھلونے نے اس کے بیٹے پر کیا جادو کردیا ہے۔ ماں کے کہنے پر اس نے قطب نما ہاتھ سے رکھ دیا اور بستر پر لیٹ گیا لیکن بہت دیر تک اسے نیند نہ آئی۔ اس کا ذہن یہی سوچے جارہا تھا کہ وہ کون سی قوت ہے جو ''سوئی'' کو حرکت دے رہی ہے۔

سائنس کی دنیا سے یہ اس کا پہلا تعارف تھا۔

اسکول کی دنیا میں، وہ اب بھی اجنبی مسافر کی طرح تھا۔ اس سے جب کوئی سوال پوچھا جاتا، جب تک وہ اس پر اچھی طرح غور نہیں کرلیتا جواب دینے سے گریز کرتا۔ غور کرنے کا یہ عمل بعض اوقات اتنا طویل ہوجاتا کہ استاد یہ سوچ کر آگے بڑھ جاتا کہ اسے جواب نہیں آتا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جو کچھ وہ کہے وہ غلط ثابت ہو۔ جب تک اسے یقین نہیں ہوجاتا کہ اس کا جواب بالکل درست ہے اس وقت تک وہ اسے زبان پر نہ لاتا۔ جب کہ دوسرے بچے برق رفتاری سے کھڑے ہوتے اور جو منہ میں آتا کہہ دیتے۔ استاد کا کہنا بھی یہی تھا کہ جواب ضرور دینا چاہیے خواہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ البرٹ کے غور کرنے کی عادت کو یہ سمجھا جاتا تھا کہ اسے کچھ نہیں آتا۔

وہ پرائمری اسکول کے سب سے اونچے درجے میں آگیا تھا اور نو سال عمر ہوگئی تھی مگر اس کا حال اب بھی وہی تھا۔

پرائمری پاس کرنے کے بعد اسے ایک ایسے ادارے میں داخل کرادیا گیا جہاں وہ لڑکے تعلیم پاتے تھے جو کسی قسم کا پیشہ اپنانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے ایسے اسکول سے ڈپلوما حاصل کرنا ہوتا تھا۔

اس کے والدین کو اس کے مستقبل کی طرف سے سخت تشویش تھی کیوں کہ پرائمری اسکول میں وہ سب لڑکوں سے کمزور تھا۔ یوں بھی آگے بڑھنے کی جستجو اس میں نظر نہ آتی تھی۔

اس کے بارے میں جو اندیشے تھے وہ درست ثابت ہورہے تھے۔ یہاں اسے لاطینی اور یونانی زبانیں پڑھنی ہوتی تھیں۔ اسے اپنی زبان بولنے ہی میں دقت ہوتی تھی غیر ملکی زبانیں کیسے بول سکتا تھا۔ گرامر کے لگے بندھے اصول یاد کرنے سے اسے سخت نفرت تھی۔ تاریخ کے مضمون میں بھی وہ نالائق تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ ہی میں نہیں آتی تھی کہ جو واقعات کتابوں میں پہلے ہی سے موجود ہیں انہیں یاد کرنے کا کیا فائدہ۔ ضرورت پڑنے پر کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

استادوں کی یہ ضد تھی کہ جو بات جس طرح ہے اسی طرح یاد کرلو جب کہ وہ اس پر بضد رہتا تھا کہ ایسا کیوں ہوا؟ ایسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا وغیرہ۔ اس کے یہ سوالات اس کے استادوں کے لیے پریشان کن تھے۔ اس نالائقی کے باوجود ''الجبرا'' اس کے لیے دلچسپ ترین مضمون تھا۔ اس نے بہت جلد اس میں مہارت حاصل کرلی تھی۔ اس مرحلے پر اس میں ایک اور قابلِ ذکر تبدیلی آئی۔ گھر کا ماحول ایسا

نہیں تھا لیکن اس میں مطالعہ کا شوق پیدا ہو گیا۔ مطالعے کا یہ شوق اسے سائنس کی طرف لے گیا۔ سائنس کے متعلق کتابوں کا ایک مقبول عام سلسلہ اس کے ہاتھ لگ گیا۔ یہ کتابیں جانوروں، پودوں اور آتش فشاں پہاڑوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کتابوں کو پڑھ کر اسے یہ محسوس ہوا جیسے وہ سراغ رساں ہے اور قدرت کے چھپے ہوئے رازوں کو دریافت کرتا پھر رہا ہے۔ اس نے ان کتابوں کو تقریباً حفظ کرلیا۔ یہ حیرت اس کے لیے خوش کن تھی کہ اس نے ان کتابوں کو حفظ کیسے کرلیا۔

درسی کتب اس کے لیے ہمیشہ اجنبی بنی رہیں۔ وہ امتحانوں میں پاس تو ہوتا رہا لیکن وہ کلاس کا نالائق ترین لڑکا سمجھا جاتا تھا جو سبق کو اٹک اٹک کر یاد کرتا تھا۔

اس وقت کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ عظیم سائنس داں بننے والا ہے۔

☆......☆

وہ رات نہایت اندھیری اور اس سے بھی زیادہ تشویش ناک تھی۔ مسٹر آئن اسٹائن دو دن کی غیر حاضری کے بعد اسی رات گھر پہنچے تھے۔ ان کی بیوی کو معلوم تھا کہ وہ دن میں کہاں رہے اور اب یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ وہ کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ وہ بہت دیر تک خاموش رہیں لیکن جب شوہر کو بھی خاموش دیکھا تو پوچھے بغیر نہ رہ سکیں۔

''آپ کی خاموشی مجھے یہ بتا رہی ہے کہ جس کام سے آپ گئے تھے وہ کام پورا نہیں ہوا۔''

''تم نے ٹھیک اندازہ لگایا۔ برے وقت میں کوئی کام نہیں آتا۔ میں نے ایک ایک دروازہ کھٹکھٹا کر دیکھ لیا۔ کوئی مدد کرنے کو تیار نہیں۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ دکان بند کرنا پڑے۔''

''دکان بند پڑی رہے گی تو گھر کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔''

''یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ جیک بھی پیچھے ہٹ گیا ہے۔ رقم تو اس کی بھی ڈوبی ہے لیکن اب وہ مزید کچھ لگانے کو تیار نہیں۔''

''پھر تم نے کیا سوچا۔''

''سوچنا کیا ہے۔ دکان کا کرایہ اپنی جیب سے تو دینے سے رہا۔''

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ اب ہوگا کیا۔''

''میرے پاس ایک تجویز ہے اگر تم اتفاق کرو۔ ہم اٹلی کے شہر میلان چلے جائیں۔ وہاں میرے کچھ رشتے دار ہیں۔ وہ میرا نیا کاروبار جمانے میں میری مدد ضرور کریں گے۔''

''اٹلی تک جانے کا کرایہ بھی تو ہو۔''

''ہم یہ مکان فروخت کردیں گے۔ کچھ رقم ہمارے پاس ہوگی کچھ رشتے دار مدد کردیں گے۔''

''یہ تو بڑی حماقت ہوگی۔ ہمارے بیٹے البرٹ کا کیا بنے گا۔ جب تک وہ ڈپلوما حاصل نہیں کرلیتا اس کا یہاں رہنا ضروری ہے۔''

''اسے بھی ساتھ لے جائیں گے۔ وہاں بھی تو اسکول ہوں گے۔''

''اس کا پڑھائی میں دل نہیں ہے۔ اس اسکول سے تو وہ پھر بھی کچھ مانوس ہو گیا ہے۔ نئی جگہ جا کر تو اس کا دل بالکل ہی اچاٹ ہو جائے گا۔''

''پھر کیا ہو سکتا ہے۔''

مسٹر آئن اسٹائن کے لیے یہ بڑا مشکل سوال تھا کہ البرٹ کا کیا کیا جائے۔ انہیں کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ وہ کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ پھر وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئے۔

''البرٹ کچھ دنوں کے لیے بورڈنگ ہاؤس میں رہ سکتا ہے۔ اس کا یہ آخری سال ہے۔ امتحان دینے کے بعد وہ ہمارے پاس میلان چلا آئے گا۔ وہ اب پندرہ سال کا ہو گیا ہے اپنا خیال خود رکھ سکتا ہے۔''

''میں البرٹ کے بغیر کیسے رہ سکوں گی۔ تم یہ جانتے ہی ہو کہ وہ کتنا بے پروا لڑکا ہے۔ وہ اکیلے رہ سکے گا۔''

''یہ قربانی تو تمہیں دینی پڑے گی۔ زیادہ سے زیادہ ایک سال کی بات ہے اس کے بعد تمہارا بیٹا تمہارے پاس ہوگا۔ ڈپلوما اس کے پاس ہوگا۔''

البرٹ کی ماں اب بھی تیار نہیں تھی لیکن اسے ماننا پڑا۔ مسٹر آئن اسٹائن نے مکان فروخت کردیا اور البرٹ کو بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دیا گیا۔ احتجاج کرنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس نے باپ کے حکم کو تسلیم کرلیا۔

آئن اسٹائن اپنے خاندان کے ساتھ میلان چلے گئے اور البرٹ بورڈنگ ہاؤس میں رہنے لگا۔

گھر والوں کے چلے جانے کے بعد البرٹ بے سہارا رہ گیا۔ وہ سدا کا سست اور کاہل تھا۔ اس کی ماں اس کی دیکھ بھال کرتی تھی اور اب وہ اس کے پاس نہیں تھی۔ اس تنہائی

نے اسے چڑچڑا بنا دیا۔ اس کا غصہ اپنے استادوں پر اترا۔ وہ پڑھنے میں ذرا دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ استادوں کو سوال و جواب میں الجھائے رہتا۔ اس کے سوالوں کے جواب دیتے دیتے اساتذہ عاجز آ گئے۔

''تمہیں جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے وہ پڑھا کرو۔ بے تکے سوال مت کیا کرو۔'' ایک روز ایک استاد نے اس سے کہا۔

''میں جب تک پوری طرح مطمئن نہ ہو جاؤں آگے کیسے بڑھوں۔''

''کلاس میں ایک تم ہی تو نہیں ہو اور کسی طالب علم کو یہ شکایت کیوں نہیں۔''

''وہ سب کند ذہن ہیں۔ طوطے کی طرح رٹتے رہتے ہیں۔ میں ہر مضمون کی گہرائی تک جانا چاہتا ہوں۔''

''تم اگر سب سے قابل ہو تو یہ اسکول چھوڑ دو۔''

''اب مجھے یہی کرنا پڑے گا کیوں کہ آپ کے پاس میرے سوالوں کے جواب نہیں۔''

''تم نے ٹھیک کہا۔ میرے پاس ان سوالوں کے جواب نہیں تم یہ اسکول چھوڑ دو۔ یہ دوسرے طلبہ کے لیے بھی اچھا ہو گا۔''

اس کے یہ جھگڑے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ طلبہ بھی اس کے خلاف ہو گئے تھے کہ وہ اساتذہ کو اپنے سوالوں میں الجھائے رہتا ہے اور اس طرح ہمارا نقصان ہوتا ہے۔

اس صورتِ حال میں البرٹ نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اسکول چھوڑ دے اور ماں کے پاس ''میلان'' چلا جائے۔ اس نے اپنے ڈاکٹر سے یہ سرٹیفکیٹ لے لیا کہ اس کی صحت خراب ہے اور اسے آرام کرنے کی ضرورت ہے۔

اسکول انتظامیہ اس سے اتنی تنگ تھی کہ فوراً اسے چھٹی دے دی۔

چھ مہینے بعد ہی وہ اپنی ماں کے پاس تھا۔

اٹلی کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی وہ مسحور ہو گیا۔ اس لیے بھی کہ اس کی شفیق ماں اور محبت کرنے والی مایا اس کے سامنے تھی اور اس لیے بھی کہ میلان شہر قدرتی مناظر سے بھرپور تھا۔

اسے دیکھتے ہی ماں کی بے چین بانہوں نے اسے بھینچ لیا اور پھر گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

''البرٹ، تو کتنا دبلا ہو گیا ہے۔ رنگ زرد پڑ گیا ہے اور آنکھیں دیکھ، اندر کی طرف دھنس گئی ہیں۔ خیر تو فکر مت کر یہاں کچھ دن رہے گا تو کبرو جوان بن جائے گا۔''

وہ صرف ایک رات اس پُرسکون ماحول میں سو کر اٹھا تو میونخ میں گزرے ہوئے چھ ماہ کی بے کیفی یکسر غائب ہو گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اسی توجہ کی تلاش میں تھا جو اسے یہاں ملی تھی۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ صبح اٹھتے ہی نئے مکان کے ایک ایک گوشے کو دیکھنے کے لیے بھاگا بھاگا پھرتا۔ باپ کے پاس بیٹھ کر اس نئے ملک اور نئے شہر کے بارے میں سوالات کرتا لیکن اسے تو گرد و پیش سے جیسے کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔ اس نے تو ان مصائب کا ذکر بھی نہیں کیا جو چھ مہینے میونخ میں اکیلے رہ کر اس پر گزرے تھے۔ اسے تو بس یہ خوشی تھی کہ وہ اپنوں میں آ گیا ہے۔ گویا اسے انسانوں سے غرض تھی اشیا سے نہیں۔ آخر کار مسٹر آئن اسٹائن ہی نے اس کی سابقہ زندگی کے بارے میں ذکر چھیڑا۔

''ہمارے آنے کے بعد تم نے بڑی مشکل میں دن گزارے ہوں گے؟''

''مجھے بورڈنگ کے اکیلے کمرے سے غرض نہیں تھی لیکن میرے ارد گرد جو لوگ تھے وہ ٹھیک نہیں تھے۔ انہوں نے میری روح کو بہت تکلیف پہنچائی۔ میری مراد ان اساتذہ سے ہے جو کچھ نہیں جانتے۔ ان کے درمیان رہ کر میں اپنا وقت ضائع کر رہا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے تم اب واپس نہیں جاؤ گے؟''

''قطعی نہیں۔''

''پھر تم نے کیا سوچا ہے۔'' آئن اسٹائن نے کہا۔

''خیر چھوڑو۔ یہ کام ہمارا ہے کہ ہم سوچیں۔ فی الحال تو میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ دن کچھ نہ کرو صرف آرام کرو۔''

مسٹر آئن اسٹائن نے اسے آرام کا مشورہ دے تو دیا تھا لیکن وہ اس کے مستقبل کی طرف سے فکرمند ہو گئے تھے۔ اس رات جب وہ سونے کے لیے لیٹے تو انہوں نے ضروری سمجھا کہ بیوی سے البرٹ کے بارے میں بات کریں۔

''میرا خیال ہے البرٹ! اب جرمنی واپس نہیں جائے گا۔ اس کی تعلیم ادھوری رہ گئی ہے۔''

''اچھا ہی ہوا وہ واپس آ گیا۔ دیکھتے نہیں وہ کتنا کمزور ہو گیا۔ میرے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کھائے گا تو کچھ جان پکڑے گا۔''

''تم بھی غلط نہیں کہتیں لیکن وہ کب تک تمہارے

ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کھاتا رہے گا۔ اس کے مستقبل کے بارے میں کچھ تو سوچنا پڑے گا۔ میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ وہ آرام کرتا رہے اور ہم اس پر خرچ کرتے رہیں۔''

''ابھی اسے آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور آپ اس کی بے کاری سے تنگ آگئے۔''

''میرا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ پیسے کمائے لیکن اسے آئندہ کیا بننا ہے، یہ بھی تو سوچنا ہوگا۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ وہ کوئی کام سیکھ سکے گا۔ بجلی کے سامان کی دکان میں بھی اسے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''ریاضی میں تو وہ بہت ہوشیار ہے۔'' مسز آئن اسٹائن نے اس کا دفاع کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ مستقبل میں اسے انجینئر بنایا جائے تو محض ریاضی میں مہارت سے کام نہیں چلتا اور بھی مضامین پڑھنے پڑتے ہیں۔ کوئی ٹیکنیکل کام سکھایا جائے تو بھی یہ معلوم ہو کہ اسے رغبت ہے یا نہیں۔''

''اس سے کھل کر بات کیوں نہیں کر لیتے۔''

''ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ میں چاہتا ہوں وہ کچھ دن آرام کر لے، جب تک اس کی صحت بھی کچھ اچھی ہو جائے گی۔ ابھی تو یہ ضروری تھا کہ ہم خود کسی نتیجے پر پہنچ جائیں۔''

البرٹ کو کھلی چھٹی مل گئی تھی۔ اب وہ جی بھر کے آرام کر سکتا تھا۔ سیر و تفریح میں مشغول رہ سکتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اپنی پسندیدہ کتابیں پڑھ سکتا تھا۔ اسکول کی مصروفیات اسے اتنا وقت نہیں دیتی تھیں کہ وہ مطالعہ کر سکے۔ وہ ہر وقت مطالعہ میں مصروف رہنے لگا۔ وہ جہاں جاتا کوئی نہ کوئی کتاب اس کے ہاتھ میں ہوتی۔

وہ تھا ہی انوکھا۔ اب اس عمر میں داخل ہو چکا تھا کہ لڑکیوں میں دلچسپی لے لیکن اسے ان سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مایا کی کئی اطالوی سہیلیاں تھیں جو البرٹ کے آجانے سے خوش تھیں اور چاہتی تھیں کہ وہ ان کے ساتھ کچھ وقت گزارے۔ سیر و تفریح کے لیے اپنے ساتھ لے جانے کی خواہاں رہتی تھیں لیکن وہ سب کی دل شکنی کر رہا تھا۔

''مایا، تمہارا بھائی تو جیسے لڑکا ہی نہیں ہے۔'' ایک دن ایک لڑکی نے کہا۔

''تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو۔''

''کتنے ہی لڑکے ہیں جو مجھ سے دوستی کے خواہش مند ہیں۔ میں تمہارے بھائی سے خود دوستی رکھنا چاہتی ہوں لیکن اس نے کبھی میری حوصلہ افزائی نہیں کی۔''

''ہاں وہ سدا کا ایسا ہی ہے۔ بے حد شرمیلا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ لڑکا نہیں۔''

''ایسی بھی کیا شرم۔''

''کوشش کرتی رہو۔ شاید کسی دن وہ تمہارے قابو میں آجائے۔'' مایا نے شرارت سے کہا پھر وہ دونوں ہنسنے لگیں۔

مایا نے بھی البرٹ کی توجہ کئی مرتبہ اس طرف مبذول کی۔ لڑکیوں کی فرمائشیں اس تک پہنچائیں۔ ان کی پسندیدگی کے پیغام اس تک لے جاتی لیکن اس کی کھوئی کھوئی شکل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

آرام کرتے کرتے وہ اکتا چکا تھا اور ابھی تک اپنے لیے اسے کوئی منزل نظر نہیں آرہی تھی۔ ایسے خیالات اس کے دل میں کم ہی پیدا ہوتے تھے لیکن ایک دن اس کے دل میں یہ خیال آیا۔

''ماں، میں آرام کرتے کرتے تھک چکا ہوں۔ میرا خیال ہے اس ملک کو اچھی طرح دیکھنے کے لیے مختصر سا دورہ کروں کیوں کہ یہاں دیکھنے کو بہت سی چیزیں ہیں۔''

''مجھے خوشی ہے کہ تم آرام کرتے کرتے تھک گئے ہو اور گھومنا پھرنا چاہتے ہو۔ یہ خوش آئند تبدیلی ہے لیکن میرے ننھے البرٹ ہمارے پاس اتنے پیسے کہاں جو تمہارا یہ شوق پورا کریں۔''

''ماں، میں نے یہ کب کہا کہ مجھے پیسے دو۔ میں اکیلا پیدل سفر کروں گا۔ کسی بھی سڑک کے کنارے سو جایا کروں گا۔ اتنے پیسے تو میرے پاس ہوں گے کہ معمولی کھانا کھا لیا کروں گا۔''

''میں یہ کب چاہوں گی کہ تو بے آرامی کے دن گزارے۔''

اس کی ماں کے پاس جو تھوڑی بہت رقم تھی وہ اس نے البرٹ کے حوالے کر دی اور وہ سیاحت کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ وہ جنوب کی طرف چلتا ہوا جنیوا پہنچا اور پھر اطالوی ساحل کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ''پیسا'' جا پہنچا۔ وہاں سے اندرونی ملک کا رخ کر کے اونچی پہاڑیوں پر آباد قدیمی دیہات میں گھومتا رہا۔ کھلے میدانوں میں سوتا رہا۔ زمین پر سوتے سوتے اس کا بدن گٹھیلا اور کھردرا ہو گیا۔ دھوپ کی تمازت نے اس کا رنگ گہرا کر دیا۔ فلورنس پہنچا تو آرٹ کے خزانے دیکھ کر خوشی اس کی روح تک اتر گئی۔

وہ اس طویل سیاحت کے بعد گھر پہنچا تو ایک بری خبر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے باپ کا کاروبار ایک مرتبہ پھر ناکام ہو گیا تھا اور وہ ''میلان'' چھوڑ کر کہیں اور جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

البرٹ کا باپ اب اس سے سخت ناراض بلکہ مایوس تھا۔ اس کے خیال میں اگر اس کا جوان بیٹا اس کا ہاتھ بٹاتا تو کاروبار میں ناکامی ہرگز نہ ہوتی۔ اس کے خیال میں جو بیٹا اس کا ہاتھ نہ بٹا سکتا ہو اس کے لیے اس کے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ جو کچھ کرنا تھا، آئن اسٹائن کو اب خود کرنا تھا۔ ان دنوں وہ سخت پریشان تھا۔ اسے نئی دکان تلاش کرنی پڑے گی نیا گھر ڈھونڈنا پڑے گا۔ وہ اٹلی سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اٹلی ہی کے ایک شہر 'پادیہ' جانے کا ارادہ کر لیا۔

پادیہ پہنچنے کے بعد مسٹر آئن اسٹائن نے اپنے بیٹے سے صاف کہہ دیا کہ البرٹ کو تعلیم دلانے کے لیے اب اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں، لہٰذا اب وہ کوئی کام دھندا کرے، اپنے خرچ کے لیے اپنی روزی خود پیدا کرے۔ یہ بڑا بے درد فیصلہ تھا لیکن آئن اسٹائن نے اس کے حق میں یہی بہتر سمجھا۔

اس نے باپ کے کہنے کے مطابق جب اس پر غور کیا کہ وہ کس پیشے کو اپنا سکتا ہے تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ بے پناہ دولت کا حصول اس کے مزاج کا حصہ ہی نہیں۔ اسے کسی ایسے پیشے کا انتخاب کرنا چاہیے جو اس کی روح کی تسکین کا باعث ہو۔ اسے میونخ کی درس گاہ یاد آئی جہاں سزا دے کر زبردستی تعلیم دی جاتی تھی۔ مجھے اسکول ماسٹر بننا چاہیے تاکہ میں طلبہ کو اسی انداز سے تعلیم دے سکوں جو مجھے نہیں مل سکی۔

اس کے باپ کا خیال تھا کہ اسے کسی ٹیکنیکل شعبے میں اپنا مستقبل بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ البرٹ نے ڈپلوما حاصل نہیں کیا تھا جس کی بنیاد پر اسے یونیورسٹی میں داخلہ مل سکتا لیکن یہ امید کی جا سکتی تھی کہ ریاضی میں غیر معمولی مہارت کی وجہ سے داخلہ مل جائے گا۔

یہ مشکل آسان ہوئی تو ایک اور مشکل آ گئی۔ البرٹ نے صاف کہہ دیا کہ ٹیکنیکل کالج کیسا بھی ہو جرمنی میں نہ ہو۔ ایک مرتبہ پھر سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور یہ طے ہوا کہ زیورچ کی سوس فیڈرل پالی ٹیکنیک یونیورسٹی میں داخلے کی کوشش کی جائے۔

آئن اسٹائن کے خاندان کا ایک متمول گھرانا سوئٹزر لینڈ میں رہتا تھا۔ مسٹر آئن اسٹائن نے انہیں خطوط لکھے۔ اپنی کم آمدنی اور البرٹ کی تعلیم میں پیش آنے والی مشکلات کا تذکرہ کیا۔ ان کے اس رشتے دار نے اسے ایک سو سوئس فرانک ہر ماہ دینے کا وعدہ کیا ہر چند کہ یہ ایک قلیل رقم تھی لیکن کچھ نہ کچھ سہارا ہو گیا۔

اب البرٹ کو داخلے کے لیے مقابلے کے امتحان میں بیٹھنا تھا۔ وہ ایک صبح سوئٹزر لینڈ کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسے بھروسا تھا کہ ریاضی میں مہارت کی وجہ سے وہ کامیاب ہو جائے گا۔ فکر تھی تو علم الحیات اور علم النباتات کی۔ اس نے خوب محنت کی اور امتحان میں بیٹھ گیا جس کا ڈر تھا وہی ہوا۔ ڈائریکٹر نے اسے بتایا۔

''تمہاری قابلیت دیکھ کر یہ نتیجہ سامنے آیا ہے کہ تمہیں اس اسکول میں داخلہ نہیں مل سکتا۔''

''مجھے افسوس ضرور ہوا لیکن میں کیا کروں میری قسمت ہی ایسی ہے۔ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے امتحان میں بیٹھنے کا موقع دیا۔''

زیادہ افسوس کی ضرورت نہیں ہے۔ فزکس اور ریاضی میں تمہاری قابلیت قابلِ رشک ہے۔ میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم کالج میں داخلے کی تیاری کرنے والے اسکول میں داخل ہو جاؤ۔ ''آراؤ'' کے اسکول میں کوشش کرنا۔

آراؤ زیورچ سے 35 میل دور ایک قصبہ تھا۔ اس کا جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ اسکول میں قید ہونے سے بہتر ہے وہ آزاد پھرتا رہے لیکن روزی پیدا کرنے کے لیے بھی تو کچھ کرنا تھا۔ روزی کمائے بغیر اس کے لیے گھر میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ باپ نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اتنے بڑے لڑکے کو گھر بیٹھ کر نہیں کھلا سکتا۔ وہ اسکولوں کی حالت سے بہت تنگ تھا۔ بچپن میں اس پر جو گزری تھی۔ جس طرح سردی کے باوجود اسے ہال میں کھڑا کر کے اسے سزا دی جاتی تھی اس کے برے اثرات ابھی تک اس کے ذہن پر قائم تھے۔ اس کے باوجود ''آراؤ'' کے اسکول چلا گیا۔ اسکول پہنچ کر اسے خوش گوار حیرت ہوئی۔ یہاں کا ماحول بہت اچھا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی اسکول اتنا اچھا بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں کوئی بات زبردستی نہیں ٹھونسی جاتی تھی۔ سوالات پوچھنے پر اساتذہ خوش ہوتے تھے بلکہ پہلی مرتبہ اس کی طرف کسی نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ پروفیسر ونٹلر کو یہ خاموش طبع نوجوان اتنا پسند آیا کہ انہوں نے اسے کھانے کی دعوت دے دی۔

"آج رات کا کھانا میرے ساتھ۔ کھانے کے لیے میرے گھر آنا۔ مجھے امید ہے تم میرے بچوں سے مل کر خوش ہو گے۔"

البرٹ نے انکار کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے اسے یہ موقع ہی نہیں دیا۔

"شاید تم وعدہ کر کے بھی نہ آؤ اور میں انتظار کرتا رہوں۔ اسکول ختم ہونے کے بعد میرے ساتھ ہی چلنا۔ ہم دونوں اکٹھے ہی پیدل گھر چلیں گے۔"

وہ ان کے ساتھ گیا۔ پوری فیملی ایسی خوش اخلاق تھی کہ پہلی ملاقات ہی میں وہ ان کا گرویدہ ہو گیا۔ وہ بھی سب گھر والوں کو اتنا پسند آیا کہ پہلی ملاقات ہی میں انہوں نے اسے کرائے کے مکان سے اپنے گھر منتقل ہونے کی دعوت دے دی۔

"ہمارے گھر میں بہت جگہ ہے۔ تم یہاں منتقل ہو جاؤ۔ تم کرائے سے بچ جاؤ گے اور ہم سمجھیں گے ہمیں ایک بیٹا اور مل گیا۔"

پروفیسر ونٹلر کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ وہ شرمیلا اور تنہائی پسند لڑکا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کبھی اس پر زور نہیں دیا کہ وہ آداب مجلس کا خیال رکھے اور ان کے پاس آ کر بیٹھا کرے۔ البرٹ یہی چاہتا تھا کہ کوئی اسے سمجھے۔ اس پر بے جا پابندیاں عائد نہ ہوں۔ یہ سہولت اسے یہاں مل رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس میں خوشگوار تبدیلیاں آنے لگیں۔ وہ ان کے بچوں کے ساتھ گھل مل گیا۔ ان کے ساتھ پکنک منانے کے لیے بھی جانے لگا۔ البتہ روزانہ کی چہل قدمی کے لیے وہ کسی کو ساتھ لے جانا پسند نہیں کرتا تھا کیوں کہ اس چہل قدمی کے دوران میں ہی وہ سائنس کے مسائل پر غور کر سکتا تھا جو اس کے ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔

یہاں رہ کر اسے مطالعہ کا بھی خوب موقع مل رہا تھا۔ پروفیسر ونٹلر نے اپنی لائبریری کے دروازے اس پر کھول دیے تھے۔ فارغ اوقات میں وہ اسے پڑھانے بھی بیٹھ جاتے تھے۔

جب وہ لائبریری چاٹ چکا تو اس پر یہ عقدہ کھلا کہ اس کا اصل میدان فزکس ہے۔ ریاضی کی دنیا محدود تھی۔ وہ کسی فارمولے کو اپنی مرضی کے مطابق تبدیل نہیں کر سکتا تھا جب کہ اس کا ذہن نئی نئی چیزیں تلاش کرنا چاہتا تھا۔ قدرت کے اسرار کی نقاب کشائی چاہتا تھا اور یہ گنجائش فزکس میں تھی۔ اس نے ریاضی کی طرف سے منہ موڑ لیا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ آیندہ زندگی میں فزکس ہی اس کی زندگی کا دلچسپ موضوع ہوگا۔

اس کی محنت نے رنگ دکھایا اور ایک سال سے بھی کم عرصے میں اس نے ڈپلوما حاصل کر لیا۔ اب وہ زیورچ جا کر پالی ٹیکنیک یونیورسٹی میں داخل ہو سکتا تھا۔ اس نے اپنے میزبانوں سے اجازت طلب کی۔ پروفیسر ونٹلر بھی اب اسے روک نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے اس وعدے کے ساتھ اسے رخصت کیا کہ وہ ان سے ملنے کے لیے جلد ہی آئے گا۔

وہ پولی ٹیکنیک یونیورسٹی میں داخلہ لینے پہنچا تو ڈائریکٹروں نے ایک بدلباس نوجوان کو اپنے قریب کھڑا دیکھا۔ بال بکھرے ہوئے کاندھے آگے کو جھکے ہوئے۔ بالکل اجڈ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنی عمر سے زیادہ سنجیدگی تھی۔ اس کے پاس ڈپلوما تھا اور شاندار نمبر تھے اس لیے محض ظاہری ہیئت کو جواز بنا کر اسے داخلے سے محروم نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اسے داخلہ مل گیا۔

اسے اس کے رشتے داروں کی طرف سے ایک سو سوس فرانک ماہانہ مل رہے تھے جو ناکافی تھے اور اس کی عمر کے نوجوان کے لیے تو بالکل ہی ناکافی تھے کیوں کہ اس کی عمر کے نوجوانوں کے بہت سے شوق ہوتے ہیں۔ اتنی رقم تو صرف لباس پر ہی خرچ ہو جاتی لیکن اس کے شوق ایسے نہیں تھے کہ زیادہ رقم کی ضرورت پڑتی۔ خوراک اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ لباس کے معاملے میں وہ ہمیشہ کا بے پروا تھا۔ ہمیشہ پیدل چلتا تھا لہٰذا سواری کا کوئی خرچ نہیں تھا۔ صرف سر چھپانے کے لیے چھت درکار تھی۔ اس نے یونیورسٹی کے قریب ہی سستا سا ایک کمرا کرائے پر لے لیا اور خود کو پوری طرح کتابوں کے سپرد کر دیا۔

اس کی شخصیت میں کوئی جاذبیت نہیں تھی جو کوئی اس کے قریب آتا۔ اس کی کم گوئی کو دوسرے لڑکے غرور سے تعبیر کرتے تھے۔ اس کا عالم تو یہ تھا کہ دو وقت کھانا نہیں کھاتا تھا کسی سے دوستی کیا رکھتا۔ دوستی رکھنے کے لیے پیسے خرچ کرنا پڑتے ہیں اور اس کے پاس پیسے اتنے ہوتے ہی نہیں تھے۔ صرف ایک لڑکا مارسل اس کے قریب آنے کی جسارت کر سکا تھا۔ وہ اس کا مداح ہو گیا تھا۔ اس کے کمرے میں آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ ارد گرد کتابوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا۔ دونوں سائنس کے موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے رہتے تھے۔ کبھی یہ بھی ہوتا کہ البرٹ کسی مسئلے میں الجھا ہوتا اور مارسل آ جاتا۔ یہ بڑا

یک طرفہ وقت ہوتا تھا۔ مارسل بولتا رہتا اور البرٹ خاموش اپنے خیالوں میں غرق رہتا۔ مارسل کو جب احساس ہوتا کہ جو کچھ وہ بول رہا ہے، البرٹ شاید سن بھی نہیں رہا ہے۔ وہ کسی اور ہی دنیا میں گم ہے تو مارسل خاموشی سے اٹھ کر چلا جاتا لیکن اس کی عدم توجہی پر مارسل کبھی ناراض نہ ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کہتا۔ ''دیکھو دوست آج تم گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے ہو پھر کسی وقت بات کریں گے۔''

یہی حال اس کا لیکچر سننے کے بارے میں بھی تھا۔ وہ بڑی بے قاعدگی سے لیکچر سننے جاتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت فزکس کی لیبارٹری میں گزرتا تھا۔

اس کو اپنی اس خامی کا احساس اس وقت ہوا جب امتحان سر پر آئے۔ اس نے لیکچر تو سنے ہی نہیں تھے۔ نوٹس بھی اس کے پاس نہیں تھے۔ اس وقت مارسل اس کے کام آیا۔ وہ تمام لیکچروں میں شریک ہوتا رہا تھا۔ ان لیکچروں کی خاص خاص باتیں اس کی مختلف کاپیوں میں درج تھیں۔ اس نے وہ سب کاپیاں البرٹ کے حوالے کر دیں۔

''دوست گھبراتے کیوں ہو۔ میں نے یہ نوٹس بنائے ہوئے ہیں۔ ان سے تیاری کرو اور امتحان میں بیٹھ جاؤ۔''

البرٹ کے لیے یہ بھی مشکل تھا۔ پھر بھی اس نے دل پر پتھر رکھ کر انہیں رٹنا شروع کر دیا۔ ان نوٹس کو رٹتے ہوئے یہ خوشی اس کے لیے کم نہیں تھی کہ وہ لیکچر سننے کی کوفت سے بچ گیا ہے۔

وہ پہلے سال کے امتحان میں کامیاب ہو گیا۔

مارسل اور اس کی دوستی پروان چڑھتی رہی۔ اس کی زبانی البرٹ کی تعریف سن کر چند اور لڑکوں نے البرٹ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ وہ زیادہ دوستیوں کا قائل نہیں تھا اس لیے صرف چار لڑکوں کو اس نے اپنے قریب آنے کی دعوت دی۔ یہ ایک گروپ سا بن گیا جو البرٹ کے کمرے میں آ کر سائنسی موضوعات پر بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔

وہ اپنی تعلیم کے تیسرے سال میں تھا کہ سربیا سے آئی ہوئی ایک لڑکی اس کی جماعت میں داخل ہوئی۔ اس کا نام میلوا مریش تھا۔ اس کے بال سیاہ اور چہرہ کسی قدر چوڑا تھا۔ وہ بھی کم بولتی تھی۔ ایک پُراسراری خاموشی اس کے گرد پہرا دیتی رہتی تھی۔ یہی حال البرٹ کا بھی تھا۔ وہ تو کلاس میں جاتا ہی کم تھا۔ میلوا مریش نے آتے ہی بھانپ لیا کہ البرٹ نامی لڑکا اسی کے مزاج کا ایک حصہ ہے۔ اول جلول سا، اچھے کپڑوں سے بے نیاز، چہرے پر خوف ناک سنجیدگی۔ البرٹ نے بھی اسے دیکھا اور پھر خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بات اس وقت تو آئی گئی ہو گئی۔ دو چار دن مزید گزر گئے۔ وہ کلاس میں تو آتا ہی نہیں تھا۔ ایک روز کوریڈور میں مل گیا۔ میلوا مریش نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا۔

''جہاں تک میرا خیال ہے تم میری ہی کلاس میں پڑھتے ہو۔''

''ہاں پڑھتا تو ہوں۔''

''میں نے صرف ایک دو مرتبہ ہی تمہیں کلاس میں دیکھا ہے۔''

''میں بہت کم آتا ہوں۔''

''کیا تم یہ تو نہیں سمجھنے لگے ہو کہ تمہیں بہت کچھ آتا ہے۔''

''میں زیادہ بیٹھ کر لیکچر نہیں سن سکتا۔''

''عجیب آدمی ہو۔ پھر پاس کیسے ہو جاتے ہو۔''

''تم کچھ دن یہاں رہو گی تو خود جان لو گی۔''

''مجھے تم عجیب سے لگے ہو۔''

''اور بہت سے لوگ بھی یہی کہتے ہیں۔'' البرٹ نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

وہ اس کی اس بدتمیزی پر حیران رہ گئی اور اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کی چال بھی عجیب سی تھی جیسے دبے قدموں سے بلی فرش پر چلتی ہے۔ وہ اپنی آواز ہی نہیں چھپاتا اپنے قدموں کی چاپ بھی چھپاتا ہے۔ وہ مسکرا دی۔

وہ کئی دن تک اس کا تعاقب کرتی رہی۔ اس کے بارے میں معلومات جمع کرتی رہی۔ اسے معلوم ہوا کہ اس کے دوستوں کا ایک گروپ ہے جو اس کے گھر جمع ہوتے ہیں اور معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ فزکس کے بارے میں استادوں سے زیادہ معلومات رکھتا ہے۔ میلوا مریش کا فزکس سے دم نکلتا تھا۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ فزکس کے مضمون میں اس سے مدد لے گی۔ وہ ایک روز کلاس روم میں آ نکلا تھا۔ میلوا مریش اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے برابر جا کر بیٹھ گئی۔

''تم تو کلاس میں آتے نہیں ہو آج کیسے آ گئے۔''

''بس آ گیا۔''

''تم مجھ سے باتیں کرنے کے لیے کچھ وقت نکال سکو گے۔''

''شاید نہیں، یہاں اور بہت سے لڑکے ہیں تم ان

سے بات کر سکتی ہو۔"

"مجھے لڑکے سے نہیں البرٹ سے باتیں کرنی ہیں۔"

"تم بھی مجھے دوسروں سے مختلف نظر آتی ہو اس لیے میرے گھر چلی آؤ، وہاں چند اور طالب علم بھی آتے ہیں باتیں تو وہیں ہو سکتا ہوں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں نے تمہارا گھر تو دیکھا ہی نہیں ہے۔"

"یہ کلاس ختم ہو جائے پھر میرے ساتھ چلنا۔"

لیکچر شروع ہو چکا تھا۔ وہ دونوں لیکچر سنتے رہے۔ لیکچر ختم ہوا تو اس نے میلوامریش کو ساتھ لیا اور گھر پہنچ گیا۔

"تم بیٹھو میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔ کچن کس طرف ہے؟"

"میں کافی پیتا ہوں۔"

"میں کافی بنائے دیتی ہوں۔ تم اتنا سوچتے ہو تھک جاتے ہو گے۔"

البرٹ کو اپنی ماں یاد آ گئی جو اس کے اسکول سے آتے ہی کچن کا رخ کرتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بھی یہی الفاظ ہوتے تھے کہ تو کتنا دبلا ہو گیا ہے کچھ کھایا کر۔

وہ سلیقے سے کافی بنا کر لائی تو اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ایک عورت کا گھر میں رہنا کتنا ضروری ہوتا ہے۔ کافی بنانے کے دوران میں ہی اس نے گھر میں پڑے واحد بیڈ کی چادر تبدیل کر دی تھی اور کتابیں سلیقے سے جما دی تھیں۔

"تم میری عادتیں کیوں بگاڑ رہی ہو۔ تم نہیں ہو گی تو پھیلا ہوا گھر مجھے کتنا برا لگے گا۔"

"میں کہاں جا رہی ہوں۔ اب تو روز ہی آتی رہوں گی۔"

"میلو! ایک بات پوچھوں؟"

"شکر ہے تم کچھ پوچھ تو رہے ہو۔"

"تمہاری آنکھوں میں اتنی اداسی کیوں ہے۔ ایک تشنگی ہے جو دیکھنے والے کو بھی پیاسا بنا دیتی ہے۔ کون سا دکھ ہے جو چھپائے پھر رہی ہو۔"

"تم کافی پیو تمہیں میرے دکھوں سے کیا کام۔"

"دیکھو، دوستی اسی وقت پروان چڑھتی ہے جب ہم ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانتے ہوں۔"

"تو پھر تمہیں اپنے بارے میں بتانا چاہیے۔"

"میں بھی بہت کچھ بتاؤں گا پہلے تم اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"میں وہ لڑکی ہوں جو ماں کی ممتا سے محروم رہی ہے۔ میرے باپ نے اسے طلاق دے دی تھی اور مجھے زبردستی اپنے پاس لے آیا تھا، مجھے یہ بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اسے مجھ سے محبت نہیں تھی وہ تو صرف میری ماں کو ستانے کے لیے مجھے اپنے پاس لے آیا تھا۔ میری ماں بے چاری مجھے یاد کرتے کرتے مر گئی۔ میرے باپ نے دوسری شادی کر لی اور مجھے بالکل نظر انداز کر دیا۔ میں خود بخود بڑی ہوتی رہی۔ میری نئی ماں میرا وجود ذرا برداشت نہیں کرتی تھی۔ میرے باپ نے مجھے خود سے اپنی امداد کے لیے یہاں پڑھنے بھیجا ہے۔ اس لیے نہیں بھیجا کہ وہ میرا اچھا مستقبل چاہتا ہے۔ میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ اب اس کے پاس لوٹ کر نہیں جاؤں گی۔ گریجویشن کرنے کے بعد اپنا راستہ اپنی زندگی خود بناؤں گی۔"

"مجھے تمہارے حالات سن کر تم سے ہمدردی ہے۔"

"اب تم اپنے بارے میں کچھ بتاؤ تم بھی کچھ کم الجھے ہوئے نظر نہیں آتے۔"

"میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہے۔ مجھ سے سب محبت کرتے ہیں۔ بس اتنا ہے کہ میرا باپ مجھے بے روزگار دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ ایک نکھٹو کی اس کے گھر میں جگہ نہیں۔ جب پڑھ لکھ کر کوئی ہنر سیکھ لو اور کمانے لگو تو میرے پاس چلے آنا۔"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مارسل آ گیا۔ اس نے میلو کو اس کے پاس بیٹھا دیکھا تو ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھر آئی البرٹ نے بھی اسے محسوس کر لیا تھا۔

"دوست تم جیسا سمجھ رہے ہو ویسا نہیں ہے۔ میلو میرے پاس اس لیے آئی ہے کہ ہم اسے اپنے گروپ میں شامل کر لیں۔ میرے خیال میں یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ وہ یہاں آیا کرے۔ ایک لڑکی کی موجودگی میں ہم مہذب بھی ہو جائیں گے اور یہ کافی بھی بہت اچھی بناتی ہے۔"

مارسل کو اس سے زیادہ سروکار بھی نہیں تھا جو وہ کچھ پوچھتا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اسے بھی یہ اچھا لگا کہ ان کے درمیان ایک لڑکی موجود ہے۔ وہ بہت کم ہنس رہی ہے لیکن وہ البرٹ کو بھی تو برداشت کر رہا ہے۔

میلوامریش نے وہاں باقاعدگی سے آنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بہت کم بولتی تھی لیکن سنتی توجہ سے تھی۔ البرٹ کی طرح بار بار غیر حاضر نہیں ہو جاتی۔ البرٹ کے گروپ کے

دوسرے سے ملنے کے بعد ہی ان سے مانوس ہوئے تھے۔

میلوا مرلش فزکس میں بہت کمزور تھی لہٰذا وہ البرٹ کے ساتھ فزکس لیبارٹری میں بھی جانے لگی۔ یہاں پہنچ کر اس کا بھی وہی حال ہوا جو دوسروں کا ہوتا تھا۔ وہ اس سبجیکٹ میں البرٹ کی قابلیت دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''تم تو بعض اساتذہ سے بھی زیادہ جانتے ہو۔''

''میں نے جو کچھ سیکھا ہے اساتذہ ہی سے سیکھا ہے اس لیے یہ نہ کہو کہ میں ان اساتذہ سے زیادہ جانتا ہوں۔''

''یہ اچھی بات ہے کہ تم اساتذہ کا احترام کرتے ہو لیکن حقیقت یہی ہے۔''

''شاید ایسا ہی ہو۔'' البرٹ نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو یہ خوشی ہے کہ مجھے مفت کا ٹیوٹر مل گیا۔''

''مجھے یہ خوشی ہے کہ مجھے تمہاری صورت میں ایک سننے والا مل گیا ہے۔ میں اپنے خیالات کا اظہار اس کے سامنے کرسکتا ہوں۔ میں بولتا رہتا ہوں اور تم ٹکٹکی باندھ کر میری طرف دیکھتی رہتی ہو۔''

''جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ میں تمہیں اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لینا چاہتی ہوں۔ ہمیں آخر کو بچھڑنا ہے اس طرح تم میری آنکھوں میں تو رہو گے۔''

''پلیز میلو، میں ایسی باتوں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ تم میرے لیے دوست ہو دوست رہو گی اور دوست ہوتے ہی اس لیے ہیں کہ بچھڑ جائیں۔ آدمی صرف اپنے ساتھ ہمیشہ رہ سکتا ہے۔''

''تم اگر سائنس داں نہ ہوتے تو شاعر یا فلسفی ہوسکتے تھے۔''

''تم اگر مجھے نہ ملی ہوتیں تو میں کچھ بھی نہ ہوتا نہ شاعر نہ فلسفی نہ سائنس داں۔ تم میرا یقین ہو۔'' البرٹ نے کہا اور اپنا کھردرا ہاتھ اس کے نرم ہاتھ پر رکھ دیا۔

''میں بھی تم سے مل کر بہت سے دکھ بھول گئی ہوں۔'' میلوا مرلش نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

اس دن وہ لیبارٹری سے نکلے تو ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان چکے تھے۔ کم از کم میلو نے اتنا جان لیا تھا کہ پتھر کی طرح سخت نظر آنے والا البرٹ اندر سے کتنا نرم ہے۔ وہ بھی کسی سے محبت کرسکتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ خوشی کی بات ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔

البرٹ اس رات سونے کے لیے لیٹا تو اس کی آنکھیں میلوا مرلش کے تصور سے خالی نہیں تھیں۔ وہ خود حیران تھا کہ کوئی شخصیت ایسی بھی ہوسکتی ہے جو سائنسی موضوعات کی طرح اس کے ذہن میں آباد ہوگئی ہے۔ وہ اس کے بارے میں غور کررہا ہے۔ اس کی حسین مسکراہٹ یاد آرہی تھی جو ہر ایک کے لیے نہیں تھی۔ اس کے ہاتھوں کا لمس یاد آرہا تھا۔ وہ سماجی رشتوں سے دور تھا لیکن یہ کیسا رشتہ تھا جو اسے جاگنے پر مجبور کررہا تھا۔

اس دن کے بعد سے وہ دونوں ایک دوسرے سے قریب ہوتے چلے گئے۔ وہ میلو کو لے کر چہل قدمی کے لیے نکل جاتا۔ اس سے پہلے وہ چہل قدمی کے لیے اکیلے نکلتا تھا۔ اس طرح وہ سائنس کے مسائل پر غور کرسکتا تھا۔ وہ اپنے کام کے سوا کسی اور چیز پر توجہ نہیں دیتا تھا لیکن اب میلو اس کی اُمیدوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ وہ سائنس کے علاوہ کچھ اور بھی سوچنے لگا تھا۔ اس نے اپنی بہن مایا کو خط بھی لکھ دیا تھا کہ ایک لڑکی سے میری دوستی ہوگئی ہے۔ اس کا جواب بھی آگیا تھا۔

''تم وہی البرٹ ہو۔ نہیں ہرگز نہیں۔ تم وہ ہو ہی نہیں سکتے۔ تمہاری اور کوئی لڑکی دوست! اگر تم مجھ سے مذاق نہیں کررہے ہو اور محض یہ بتانا چاہتے ہو کہ تم اب بڑے ہوگئے ہو تو یہ مذاق مت کرو اور اگر واقعی ایسا ہے تو دیر مت کرو اس سے فوراً شادی کرلو۔ ایسی لڑکیاں روز روز نہیں ملتیں جو تم جیسے گدھے کو اپنا دوست بنائیں۔''

اس نے وہ خط میلوا مرلش کو بھی دکھایا۔ دکھانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ اپنی بہن کی زبانی اسے یہ سنانا چاہتا تھا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ اتنا شرمیلا تھا کہ یہ بات اپنے منہ سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ میلو جانتی تھی کہ وہ شرمیلا ہے لیکن لڑکی ہونے کے ناتے وہ بھی اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی تھی۔

وقت گزرتا رہا اور ان دونوں کی تعلیم کا آخری سال آگیا۔ امتحان نزدیک آئے البرٹ کو فکر ہوئی کیوں کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ اپنے گھر واپس جاسکتی تھی۔ وہ اس سے پہلے اس کی رضامندی لینا چاہتا تھا۔

''میلو امتحان دینے کے بعد تمہارا کیا پروگرام ہوگا۔''

''مجھے جانا ہوگا۔''

''اسی باپ کے پاس جو تم سے نفرت کرتا ہے؟''

''میں سائبیریا کی بات کررہی ہوں۔ ضروری نہیں کہ اپنے گھر جاؤں۔''

''یہیں کیوں نہیں رہ جاتیں۔''
''میرے پاس یہاں کی شہریت نہیں ہے۔''
''اگر تم مجھ سے شادی کرلو تو شہریت مل سکتی ہے۔''
''تم مجھے شہریت دلانے کے لیے شادی کرو گے یا واقعی شادی کرنا چاہتے ہو۔''
''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''
''ٹھیک ہے۔ گریجویٹ بننے کے بعد ہم شادی کرلیں گے۔''

وہ دونوں امتحان کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ اب البرٹ ایک نئے جذبے کے ساتھ تیاری کررہا تھا۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ امتحان کا نتیجہ اس کے حق میں نہ نکلے اور اس کی شادی کھٹائی میں پڑ جائے۔ اس نے مارسل کے بنائے ہوئے نوٹس لے لیے اور جو لیکچر وہ سن نہیں سکا تھا اس کی خوب اچھی طرح تیاری کی۔

رزلٹ آؤٹ ہوا تو بیسویں صدی کا پہلا سال اس کا استقبال کررہا تھا اور اس کی چار سالہ تعلیم مکمل ہوئی تھی۔ اب وہ میلوامریش سے شادی کرنے کے لیے آزاد تھا۔ نئی صدی کی نئی زندگی۔

وہ خوش تھا اور سوچ رہا تھا کہ سب سے پہلے یہ خوش خبری ماما کو سنائے گا۔ سوچنا یہ تھا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے گھر جائے یا خط لکھ کر خوش خبری سنا دے۔ اپنے باپ سے کہے کہ اب تو وہ کمانے کے لائق ہوگیا ہے۔ اب تو گھر میں اس کے لیے جگہ بن جائے گی۔ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ گھر والوں کی طرف سے ایک خط اسے ملا۔ خط پڑھتے ہی اس کے خیالوں کی ہر عمارت ڈھیر ہوگئی۔ اس نے تو یہ سوچا تھا کہ وہ میلو سے شادی کرلے گا۔ سو فرانک جو اسے ملتے ہیں ان میں گزارہ کرلے گا اور سائنس کے متعلق جو اس کے نظریات ہیں ان کو مزید وسعت دیتا رہے گا لیکن اس خط میں تو کچھ اور ہی لکھا تھا۔ خط میں لکھا تھا چونکہ اس کی تعلیم مکمل ہوگئی ہے اس لیے جو ماہانہ الاؤنس اسے ملتا تھا وہ اب نہیں ملے گا۔

وہ اچانک چھاؤں سے دھوپ میں آکر کھڑا ہوگیا۔ میں ہرگز شاندار زندگی گزارنے کے حق میں نہیں لیکن کھانا پہننا تو پڑتا ہی ہے۔ سو فرانک قلیل رقم تھی لیکن تھی تو سہی۔ شادی کے بعد اخراجات میں کچھ نہ کچھ اضافہ تو ضرور ہو جائے گا۔ کوئی نہ کوئی ذریعۂ معاش تو ضرور ہونا چاہیے۔

وہ اس فکر میں غلطاں تھا اور میلو شادی کے لیے اصرار کررہی تھی۔ ایک خطرناک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ وہ اپنی پریشانیوں میں میلو کو شریک کیوں کرے۔ میلو کسی دولت مند آدمی سے شادی کرکے زیادہ خوش رہ سکتی ہے۔ وہ سوئٹزرلینڈ چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے میلو سے کوئی رابطہ نہ رکھے۔ وہ مایوس ہو کر لوٹ جائے گی۔ وہ اگلے دو دنوں تک غور کرتا رہا۔ میلو اس سے ملنے بھی آئی تو وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ میلو یہ سوچ کر لوٹ گئی کہ وہ کسی سائنسی مسئلے پر غور کررہا ہے۔

دو دن مسلسل غور کرنے کے بعد وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے ایک درمیان کا راستہ تلاش کرلیا تھا۔ اس نے طے کرلیا کہ وہ میلو کو اعتماد میں لے گا۔ میلو اس سے ملنے آئی تو اس نے بات چھیڑ دی۔

''میلو! مجھے گھر والوں کی طرف سے جو سو فرانک ملتے تھے وہ اب نہیں ملیں گے۔''
''میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ کیوں لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ سب کے گھر والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔''
''میں ایک مفلس آدمی ہوں جس کے پاس چند نظریات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ نظریات بھی وہ ہیں جو ابھی دنیا پر ظاہر نہیں ہوئے ہیں بلکہ ابھی مجھ پر بھی پوری طرح منکشف نہیں۔''
''اگر تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں تم سے دولت مند بننے کا تقاضا کروں گی تو یہ تمہاری بھول ہے بلکہ غلطی ہے۔ تم مجھ پر اعتماد کرو میں تمہارے ساتھ ہر حال میں گزارہ کرلوں گی۔''
''میرے پاس اتنا بھی نہیں ہے کہ ہم دو وقت کی روٹی کھاسکیں۔''
''تم کہیں نوکری کرسکتے ہو۔''
''میں نے بھی یہی سوچا ہے لیکن اس میں کچھ دن لگ سکتے ہیں۔ تم کچھ دن کے لیے اپنے گھر چلی جاؤ۔ میں یکسوئی سے کوئی ملازمت ڈھونڈ لوں گا۔ ملازمت ملتے ہی ہم شادی کرلیں گے۔''
''البرٹ! یہ سمجھ لینا کہ اگر تم نے مجھے نہیں بلایا تو میں کہیں شادی نہیں کروں گی۔''
''میں بھی یہ نہیں سوچ سکتا کہ تمہارے سوا کسی اور سے شادی کروں۔''

میلوامریش اس ساعت کا انتظار کرنے اپنے گھر چلی گئی۔

البرٹ اب کسی ملازمت کی تلاش میں تھا۔ اس نے

پچھلے چار برس میں بہت سے مضامین کا علم حاصل کیا تھا۔ سائنس کے متعلق اپنے نظریات کو بے پناہ وسعت دی تھی۔ فزکس کے بارے میں اس کی معلومات کی تو کوئی انتہا ہی نہیں تھی۔ پولی ٹیکنیک کے پروفیسر تک اس کی قابلیت کے معترف تھے۔ اسے یقین تھا کہ اسے فزکس کے پروفیسروں کے اسسٹنٹ کے طور پر ملازمت مل جائے گی۔ معاوضہ بہت کم ہوگا لیکن آئندہ پروفیسر بننے کے لیے اسے تربیت مل جائے گی۔ اس نے درخواست دی لیکن اسے حوصلہ افزا جواب نہیں ملا۔ ٹال مٹول سے کام لیا جاتا رہا۔ آئندہ کے موہوم وعدے کیے جاتے رہے۔ یونیورسٹی کی انتظامیہ کے اس رویے نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔ کہیں یہ لوگ مجھے غیرملکی تو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ اس کے پاس شہریت کی دستاویزات موجود تھیں۔ اس نے وہ پیش کردیں۔ اس کے بعد بھی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ اب وہ یہ سوچنے میں حق بہ جانب تھا کہ شاید وہ یہودی ہے اس لیے اس کے حق میں فیصلہ نہیں ہورہا ہے۔ انہی دنوں اس کے ایک مداح پروفیسر نے اس پر یہ انکشاف کیا کہ بعض پروفیسر اس اندیشے میں مبتلا ہیں کہ یہ غیرمعمولی طور پر ذہین طالب علم کہیں ان سے آگے نہ نکل جائے، اسی لیے اس کی مخالفت کی جارہی ہے۔

اس انکشاف کے بعد اس کے سوا کیا ہوسکتا تھا کہ وہ ان پروفیسروں کی ذہنیت پر افسوس کرتا ہوا راستے سے ہٹ جائے۔ میری وسیع معلومات سے دیگر طالب علم کو جو فائدہ پہنچ سکتا تھا وہ اب نہیں پہنچے گا۔ اس نے کہا اور اخبارات میں اشتہارات دیکھ کر درخواستیں بھیجنے لگا۔ آخر اسے ایک اسکول میں عارضی ملازمت مل گئی۔ ایک پروفیسر چھٹی پر گیا ہوا تھا۔ البرٹ کو اس کی جگہ رکھا گیا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ پروفیسر واپس نہ آئے۔ اس صورت میں اس کی ملازمت مستقل ہوسکتی تھی۔

وہ اپنے حلیے، اور شکل سے بے وقوف ہی لگتا تھا۔ جب تک وہ بولنا شروع نہ کردے کوئی اس کی قابلیت کا معترف نہیں ہوسکتا تھا۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ معمولی لباس پہنے ہوئے شرماتا ہوا ایک نوجوان آدمی کلاس روم میں داخل ہوا۔ شرماتے ہوئے اس نے کہا ''گڈ مارننگ'' جواب میں قہقہے سنائی دیے۔ کسی طرف سے کاغذ کا ایک گولا آیا اور اس کے قدموں میں آکر گرا۔ بہت سے لڑکوں نے فرش پر پاؤں مارنے شروع کردیے۔ جس سے عجیب قسم کا شور پیدا ہوا۔ اس نے طلبہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ مچالو جتنا شور مچانا ہے جب میں فزکس کے کسی نکتے کی وضاحت کرنا شروع کروں گا تو تم میں سے کوئی بھی نہیں بول سکے گا۔ یہ وقت وہ ہوگا کہ اگر میں تشریح چھوڑ کر کلاس سے باہر جانا بھی چاہوں گا تو تم جانے نہیں دوگے۔ اس نے چاک اٹھایا اور بلیک بورڈ کی طرف گیا۔ کلاس میں طرح طرح کی آوازیں پیدا ہورہی تھیں۔ اس نے بلیک بورڈ پر ایک شکل کھینچی اور اس کی تشریح کے لیے لیکچر دینا شروع کردیا۔ آہستہ آہستہ شور دب گیا۔ اب وہ دھیمی آواز میں بول رہا تھا لیکن خاموشی اتنی تھی کہ اس کی آواز طلبہ تک بہ آسانی پہنچ رہی تھی۔ پیریڈ ختم ہونے تک پوری دلچسپی پیدا ہوچکی تھی۔

دوسرے دن وہ کلاس روم میں پہنچا تو طلبہ نہایت عقیدت سے اس کے احترام میں کھڑے ہوگئے۔ اس نے لیکچر دینا شروع کیا تو کلاس میں سانس لینے تک کی آواز نہیں تھی۔ پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔ طلبہ اس کی آمد کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ وہ معلومات کے خزانے لٹاتا رہا اور طلبہ جھولیاں بھرتے رہے۔

ایک دن اس کی بجائے پرانا پروفیسر کلاس میں آیا معلوم ہوا وہ چھٹی گزار کر واپس آگئے ہیں اور نئے پروفیسر کی چھٹی ہوگئی۔ طلبہ نے کئی دن تک احتجاج کیا کہ البرٹ کو واپس لایا جائے لیکن بے سود!

وہ پھر بے روزگار تھا۔ اس کی جیب میں چند فرانک تھے اور لمبی سڑکیں، لاتعداد فاقے تھے۔ اس نے پیسے بچانے کے لیے ایک وقت کا کھانا چھوڑ دیا۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب اسے دونوں وقت بھوکا رہنا پڑتا۔ پھر اسے ایک بورڈنگ اسکول میں دو لڑکوں کی ٹیوشن مل گئی۔ دونوں لڑکے نہایت ذہین تھے۔ البرٹ نے سوچا کہ اگر وہ ان لڑکوں کو اپنے طریقوں کے مطابق تعلیم دے تو ان کا مستقبل نہایت شاندار ہوگا۔

''آپ ان لڑکوں کو پوری طرح مجھے سونپ دیں۔ میں انہیں جو تعلیم اور جس طریقے سے دوں مجھے آزادی ہو۔''

اس کے اس مطالبے کو بغاوت سمجھا گیا۔ اسے فوراً برطرف کردیا گیا۔

وہ پھر بے روزگار ہوگیا۔

وہ بھوک سے نڈھال تھا۔ کئی کئی دن کھانا نہ ملنے سے بہت کمزور ہوگیا تھا۔ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ اس کو دینے کے لیے دنیا کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ

سوچ رہا تھا خدایا! میں دولت کے انبار کب چاہتا ہوں۔ میں تو اپنے لیے اور میلو کے لیے چند ضروری چیزیں چاہتا ہوں۔ یہ کنجوس دنیا مجھے کچھ بھی دینے کو تیار نہیں۔ میں کسی اعلیٰ عہدے کا طلب گار نہیں، میں تو موچی کا کام بھی کرنے کو تیار ہوں۔

وہ اسی عالم پریشانی میں اپنے پرانے ہم جماعتوں کے پاس گیا۔ اپنی شرمیلی طبیعت کے باوجود ان سے کھل کر کہا کہ اس کے لیے کسی باعزت روزگار کا انتظام کر دیں لیکن کوئی اس کے کام نہ آسکا۔

وہ ایک سڑک کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا۔ بھوک کی شدت نے اس کی آنکھوں تلے اندھیرا طاری کر دیا تھا۔ اس کے جوتے پھٹ گئے تھے اس لیے احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا۔ اردگرد کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا کہ اس کا پرانا دوست مارسل اس کے سامنے آگیا۔

''البرٹ! یہ تم ہو؟ اف میرے خدا تم نے یہ کیا حالت بنالی ہے۔'' مارسل نے کہا۔ ''میں کچھ دنوں سے سوئٹزرلینڈ میں نہیں تھا ورنہ تمہاری یہ حالت کبھی نہ ہوتی۔''

''کیا ہوا میری حالت کو۔ میں تو سدا کا ایسا ہی ہوں۔''

''نہیں میرے دوست نہیں، تم ایسے تو نہیں تھے۔ ضرور تم سے میلو نے بے وفائی کی ہے۔''

''تم نے بالکل غلط اندازہ لگایا۔ اسے الزام مت دو۔''

''پھر کیا بات ہے۔'' مارسل نے اس کے الجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا چلو کسی کیفے میں بیٹھ کر گرم گرم کافی پیتے ہیں۔ باقی باتیں وہیں ہوں گی۔''

وہ دونوں ایک کیفے میں چلے گئے۔ یہاں پہنچ کر مارسل کو خیال آیا کہ البرٹ نے نہ جانے کب سے کچھ نہیں کھایا ہوگا۔ اس نے کافی کے ساتھ گوشت اور آلوؤں کا آرڈر بھی دے دیا۔

وہ نہ جانے کب کا بھوکا تھا۔ خود فراموشی کے عالم میں پوری پلیٹ چٹ کر گیا۔ مارسل اسے کھاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ البرٹ نے کچھ کہنے کے لیے پلیٹ سے نظریں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے دوبارہ دیکھنے کے قابل ہوئی ہوں۔

کافی پینے کے دوران میں مارسل نے اس سے پوچھا کہ وہ کس پریشانی میں ہے۔ البرٹ نے وہ کہانی لفظ بہ لفظ دہرادی جو اس پر گزری تھی۔

''مجھے اپنی پروا نہیں لیکن میلو مجھ سے شادی کے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اگر کچھ دن اور مجھے ملازمت نہیں ملی تو وہ مجھے بے وفا سمجھے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھے بے وفا کہے۔''

مارسل کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے البرٹ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''تم فکر مت کرو۔ میں تمہارے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔ میرے والد کا سرکاری حلقوں میں بہت اثر رسوخ ہے۔ میں ان سے کہوں گا کہ وہ کہیں نہ کہیں تمہاری ملازمت کا بندوبست کر دیں گے۔ تم کل اسی وقت اسی کیفے میں ملنا۔ میں تمہیں خوش خبری ضرور سناؤں گا۔''

البرٹ دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ ایسے وعدے وہ بہت سن چکا تھا۔ پھر بھی وہ مارسل کا شکر گزار تھا کہ اس نے میرا پیٹ تو بھر دیا۔ اب کل تک مجھے کوئی فکر نہیں ہوگی۔

اسے یقین نہیں تھا کہ مارسل اتنی جلدی کوئی خوش خبری سنادے گا۔ پھر بھی وہ دوسرے دن اس کیفے میں پہنچ گیا۔ مارسل اس سے پہلے وہاں پہنچ چکا تھا۔

''آؤ دوست، پہلے کچھ کھالو پھر میں تمہیں خوش خبری سناؤں گا۔'' اس نے کہا اور البرٹ کی پسندیدہ ڈش کا آرڈر دے دیا۔ جب وہ کھانا کھا چکے اور کافی آگئی تو مارسل نے اسے خوش خبری سنائی۔

''میں نے والد صاحب سے بات کی تھی۔ تمہاری نوکری سمجھو پکی ہے۔ یہ اسامی ایجادات کو رجسٹرڈ کرانے کے دفتر میں ہے۔ تمہیں وہاں کے ڈائریکٹر سے ملاقات کرنی ہوگی باقی کام وہ خود کرلیں گے۔''

''وہاں انٹرویو ہوگا؟''

''ایک رسمی سی کارروائی ہوگی۔ والد صاحب نے بات کرلی ہے۔ جہاں سفارش ہو وہاں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔''

البرٹ کو اب بھی یقین نہیں تھا لیکن وہ مارسل کا دل رکھنے کے لیے ڈائریکٹر سے ملاقات کے لیے پہنچ گیا۔ وہ اسی حلیے میں تھا جس میں وہ عام طور پر رہتا تھا۔ بہت پرانا ڈھیلا ڈھالا سا سوٹ اس کے بدن پر تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اچھا خاصا ہونق لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ڈائریکٹر کو مایوسی ہوئی تھی۔ روزگار کے متلاشی نوجوان تو

بڑی ٹیپ ٹاپ سے دفتر میں آتے ہیں۔ یہ تو اسی طرح اٹھ کر آ گیا ہے جس طرح گھر میں بیٹھا ہو گا حالانکہ نوکری کا ضرورت مند معلوم ہوتا ہے۔

''آپ کو یہ تو بتا دیا ہو گا کہ یہاں کیا کام ہوتا ہے۔''

''کچھ بتایا تو تھا لیکن میں نے ٹھیک سے سنا نہیں۔'' البرٹ نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ اس کا لہجہ سپاٹ اور بے اثر تھا۔

''مسٹر میں آپ کو بتا دوں تا کہ آپ یہ فیصلہ کر سکیں کہ آپ کو یہ کام کرنا بھی ہے یا نہیں۔ بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی کسی ایجاد کو پیٹنٹ کرانے کے لیے درخواست دیتا ہے تو وہ اس کے بارے میں دفتر کو ایک ٹیکنیکل رپورٹ بھیجتا ہے۔ یہاں کام یہ ہوتا ہے کہ درخواست پر غور کیا جائے۔ دیکھا جائے کہ وہ ایجاد واقعی قابلِ عمل ہے۔''

البرٹ ان کی باتوں کو سن ضرور رہا تھا لیکن خاموش تھا۔ اس کے چہرے سے قطعی یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ان سے متفق بھی ہے، کوئی اور ہوتا تو درمیان ہی میں بول پڑتا کہ جناب آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس سے مجھے کامل اتفاق ہے لیکن اس کے چہرے پر تو کوئی تاثرات ہی نہیں تھے۔

ڈائریکٹر جھنجلایا تو ضرور لیکن سفارش مضبوط تھی اور پھر یہ بھی سن چکے تھے کہ امیدوار ایک غیر معمولی سائنس داں ہے۔ اس لیے اس کی عدم توجہی کو نظر انداز کرتے ہوئے دو ٹوک انداز میں پوچھا۔

''جو کچھ میں نے کہا کیا آپ اس کام کو کر سکیں گے؟''

''میں یہ کام توقع سے بڑھ کر کر سکوں گا۔''

''میں آپ کو یہ عہدہ پیش کرنے سے پہلے ایک دو باتیں اور پوچھنا چاہتا ہوں۔''

البرٹ کا دل زور سے دھڑکا۔ اب ضرور یہ پوچھا جائے گا کہ میں یہودی تو نہیں ہوں۔ جیسے ہی میں کہوں گا میں یہودی ہوں یہ نوکری میرے ہاتھ سے چلی جائے گی لیکن اس کا یہ اندازہ غلط نکلا۔ انہوں نے اس کی شہریت کے متعلق سوال کیا تھا۔

''کیا تم سوئٹزرلینڈ کے شہری ہو۔ میرا مطلب ہے شہریت ہے آپ کے پاس۔''

''جی ہاں جناب میں جرمن نژاد سوئس شہری ہوں۔'' اس نے دستاویز نکال کر ڈائریکٹر کے سامنے رکھ دی۔

''میں آپ کو شروع میں تین ہزار فرانک سالانہ تنخواہ دے سکتا ہوں۔''

ایک بے روزگار نوجوان کے لیے یہ ایک خطیر رقم تھی لیکن البرٹ کے چہرے پر خوشی کے کوئی آثار ظاہر نہیں ہوئے۔ حد تو یہ ہوگئی کہ اس نے ڈائریکٹر کو خوش کرنے کے لیے لمبے چوڑے فقرے بھی استعمال نہیں کیے۔ اس نے ملازمت کی نوید اس طرح سنی جیسے یہ اس کا حق تھا جو اسے مل گیا۔

اس ملازمت کی نوید سنتے ہی اس نے میلوا مریش کو خط لکھ دیا کہ وہ سوئٹزرلینڈ کے شہر ''برن'' چلی آئے جہاں ایک دفتر میں اس کی ملازمت بطور کلرک ہوگئی ہے۔

اس نے میلوا مریش سے شادی کرلی اور ایک عمارت کی چوتھی منزل پر آباد ہوگیا۔

اس نے اپنے کام کو سمجھنے کے لیے محض چند روز مشقت کی اور پھر اس نتیجے پر پہنچنے میں اسے دیر نہیں لگی کہ وہ اتنی اہلیت رکھتا ہے کہ سارے دن کا کام دو تین گھنٹوں میں ختم کرسکتا ہے۔ یہ بات ڈائریکٹر کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ یہی ظاہر کرتا رہا کہ کام بہت محنت طلب ہے۔ دن بھر گزر جاتا ہے اور سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی۔ وہ دفتر کا کام زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے میں مکمل کرلیتا باقی وقت سائنس کے ان مسائل کو حل کرنے میں گزارتا جو ہمیشہ اس کے ذہن میں موجود رہتے تھے۔ اپنی میز کی دراز میں اس نے ایک فائل رکھی ہوئی تھی۔ وہ دفتر کا کام ظاہر کرکے اپنا کام کرتا رہتا اور جونہی کوئی شخص اس کی میز کی طرف آتا وہ اس کاغذ کو جلدی سے فائل میں چھپا دیتا تا کہ کوئی یہ نہ جان سکے کہ وہ بھی کوئی ایجاد کرنے میں مشغول ہے۔

روزگار کا مسئلہ حل ہوگیا تھا۔ اس کی ضروریات پوری ہو رہی تھیں۔ اب اس کے پاس اتنی ذہنی فرصت تھی کہ وہ سائنس کے ان مسائل پر بھرپور توجہ دے سکتا تھا جو کافی عرصے سے اس کے ذہن میں جگہ بنا رہے تھے۔ یہ نظریات، روشنی، حرکت اور بیرونی خلا سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ نظریات اب تک کسی کے ذہن میں نہیں آئے تھے اس لیے ان کا کوئی نام بھی نہیں تھا۔ اس نے ان نظریات کو فلسفہ اضافیت کا نام دے دیا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا وہ فلسفہ منافیت پر زیادہ سے زیادہ غور کرتا گیا۔ ان نظریات کو مرتب کرنے لگا۔ اس کی اس دیوانگی نے چند اور دیوانوں کو اس سے ملوا دیا۔ ان میں ایک انجینئر، ایک طالب علم اور ایک ریاضی داں تھا۔ چوتھی

منزل پر واقع اس کا فلیٹ ان ملاقاتوں کا مرکز بن گیا۔ وہ اور اس کے دوست خاموشی سے ان نظریات کی چھان بین کررہے تھے۔ اس کا ذہن ایسی لیبارٹری بن گیا تھا جس میں ہر وقت تجربات ہوتے رہتے تھے۔

اس کے دو بچے ہوگئے تھے۔ وہ ان کی دیکھ بھال میں مصروف ضرور رہتا لیکن وہ ایک غائب دماغ سائنس داں تھا جو دنیاوی معاملات میں بے ڈھنگا لیکن سائنسی معاملات میں نڈر اور دھن کا پکا تھا۔ وہ اپنے نظریات میں ایسے خیالات کی تردید کرتا جارہا تھا جن کو اب تک مقبولیت مل چکی تھی۔ ان مقبول خیالات کے خلاف آواز اٹھانا کوئی مذاق نہیں تھا۔

آخر 1905ء میں دن رات کی انتھک محنت کے بعد اپنے غوروفکر کے نتائج کو کاغذ پر منتقل کرچکا تھا۔ اس رپورٹ میں وہ خیالات درج تھے، جو اس نے خلا، وقت اور کائنات کے متعلق قائم کیے تھے۔ یہی اس کا نظریہ اضافیت تھا جس نے مستقبل میں سائنس کے راستے کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔

اس نے کاغذ کے اس پلندے کو ایک بڑے لفافے میں بند کیا اور ڈاک خانے پہنچ گیا۔ اس لفافے پر جرمنی کے سائنسی جریدے ''انالن ڈر فزک'' کا پتا درج تھا۔ اس نے لفافے پر مطلوبہ قیمت کے ٹکٹ لگائے اور لفافہ سپرد ڈاک کردیا۔

اس کے نظریات شائع ہوئے تو سارے یورپ کے سائنس دانوں نے اس مقالے کو پڑھا۔ یہ بات عرصے سے طے شدہ تھی کہ روشنی برقیاتی مقناطیسی شعاعوں پر مبنی ہوتی ہے۔ آئن اسٹائن کے مفروضات نے اس کلاسیکی نظریے کو بری طرح رد کردیا۔

سائنس داں حیران تھے۔ ایک بالکل جدید نظریہ ان کے سامنے تھا۔ فزکس کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہوگیا تھا۔ حیرت کا یہ حصار ذرا ٹوٹا تو سائنس دانوں کو یہ جاننے کی فکر ہوئی کہ آخر یہ البرٹ ہے کون۔ اس نے کس انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جس نے اتنا عظیم نظریہ پیش کردیا اس کا نام اس سے پہلے کسی نے سنا ہی نہیں۔ سائنس دانوں میں سے بہت سوں کو اشتیاق ہورہا تھا کہ اسے تلاش کیا جائے اور اس سے ملاقات کی جائے۔

برلن یونیورسٹی میں فزکس کے ایک شہرہ آفاق پروفیسر نے پہل کی اور اس سے ملاقات کے لیے طویل مسافت طے کر کے برلن پہنچ گیا۔

پروفیسر اس سے ملاقات کرتے وقت اسی حیرت سے دوچار ہوا جس حیرت کا شکار اس سے ملنے والے ہوا کرتے تھے۔ اس کا لباس بے حد معمولی تھا۔ بال بے ترتیب اور بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر ابھی تک لڑکپن کے آثار تھے اور سب سے حیرت ناک بات یہ کہ وہ ایک کلرک تھا۔

پروفیسر راستے بھر یہ سوچتا آیا تھا کہ آئن اسٹائن کسی شاندار تجربہ گاہ میں اس کا استقبال کرے گا۔ اس کے جسم پر شاندار کپڑے ہوں گے لیکن اس کا تو گھر اتنا چھوٹا تھا کہ کسی مہمان کو بٹھا بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے ریستوران میں اپنے مہمان سے ملاقات کررہا تھا۔

اس کے نظریات نے اسے اتنی شہرت دی کہ تھوڑے عرصے بعد ہی اسے یورپ کے عظیم سائنس دانوں کی ایک کانفرنس میں تقریر کرنے کی دعوت دی گئی۔ یہ کانفرنس آسٹریلیا کے شہر سالزبرگ میں ہونی تھی۔ یہ خیال ہی اس کے لیے پُرمسرت تھا کہ وہ سائنس دانوں کے اجتماع میں تقریر کرے گا۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا عظیم لمحہ تھا جب اس نے مقررین کے لیے بنائے گئے پلیٹ فارم پر قدم رکھا۔ اس کے جسم پر جھولتا ہوا پرانا کوٹ سب کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ ان میں سے بہت سے زمانے کی ناقدری پر افسوس کررہے تھے جس نے ایسے عظیم سائنس داں کو اس حال پر رکھا ہوا ہے۔ اس کی تقریر نے سب کو مسحور کردیا۔

تقریب کے اختتام پر ہر زبان پر ایک ہی سوال تھا۔ وہ اب تک کلرک کیوں ہے۔ یہ نوجوان پولی ٹیکنیک یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے۔ اسے تو اسی ادارے میں پروفیسر ہونا چاہیے تھا۔ زیورچ میں نوجوان سڑکوں پر نکل آئے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ اسے پروفیسر مقرر کیا جائے۔

اسے زیورچ یونیورسٹی کی طرف سے پیشکش کی گئی لیکن اس میں شرط یہ رکھی گئی تھی کہ پہلے وہ رواج کے مطابق بطور معاون لیکچرر کام کرے اس کے بعد اسے پروفیسر شپ مل سکتی ہے۔ وہ شاید یہ پیشکش قبول کرلیتا لیکن مشکل یہ تھی کہ معاون پروفیسر کو کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ دو بچوں کی ذمہ داری اس پر تھی وہ یہ خشک پیشکش کیسے قبول کرسکتا تھا۔

وہ پیٹنٹ دفتر میں بدستور کلرکی کرتا رہا۔

زیورچ یونیورسٹی اسے ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ آخر کچھ عرصہ بعد میں اسے پروفیسر شپ کی باقاعدہ پیشکش کردی گئی۔ یہ ایسا عہدہ تھا جو برسوں کی محنت کے بعد حاصل ہوتا تھا اور البرٹ آئن اسٹائن ابھی پورے تیس سال کا بھی

نہیں ہوا تھا۔

یہ خیال کہ وہ پروفیسر ہے اس کے لیے قابلِ فخر نہیں تھا خوشی تھی تو یہ کہ اب وہ اپنا تمام وقت اپنے پسندیدہ موضوع فزکس پر صرف کر سکے گا۔

میلوا مریش اس کے ساتھ رہتے ہوئے بہت سارے سخت دن گزار چکی تھی۔ ذرا سی سہولت ملی تو اس نے ہاتھ پاؤں نکالے۔

''تم اب پروفیسر ہو۔ اس چھوٹے سے مکان میں رہتے ہوئے کیا اچھے لگو گے۔ کوئی بڑا مکان لو۔''

سماجی زندگی کے ہمراہ چلنے کا اہل نہیں تھا۔ اسے اپنے سائنسی کاموں کے مقابلے میں ہر کام غیر اہم معلوم ہوتا تھا۔ اس کی بیوی ضد کر رہی تھی کہ وہ نئے سوٹ خریدے۔ اس طرح کی زندگی گزارے جو دوسرے پروفیسر گزارتے ہیں۔ اسے بڑا مکان بھی لینا پڑا اور بیوی کی خوشنودی کے لیے نئے سوٹ بھی سلوانے پڑے۔

اس کے دماغ میں اپنے نظریے سے متعلق جو خیالات پیدا ہو رہے تھے انہیں عملی شکل دینے کے لیے اسے وقت درکار تھا اور زیورچ یونیورسٹی میں مصروفیت بہت تھی۔ اسے کلرکی کا زمانہ یاد آتا تھا جب اس کے پاس وقت ہی وقت ہوا کرتا تھا۔ اس کا فلسفہ اضافیت ابھی محض ایک خاکہ تھا اسے مکمل کرنے کے لیے ابھی بہت وقت درکار تھا۔ وہ چاہتا تھا اسے تنہا چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ اپنا کام جاری رکھ سکے۔ اس کی بیوی نے اخراجات اتنے بڑھا لیے تھے کہ وہ پریشان رہنے لگا تھا۔ یہ پریشانی اس کے کام پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ دوسری طرف اس کی شہرت مصیبت بن گئی تھی۔ اسے مختلف کانفرنسوں میں بلایا جا رہا تھا جہاں اسے تقریریں کرنی پڑتی تھیں۔ ان تقریروں کی تیاری میں بھی اس کا بہت سا وقت ضائع ہو جاتا تھا۔ وہ اب سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا کہ دوبارہ اپنی پرانی ملازمت پر چلا جائے جہاں وہ کلرکی کرتا تھا اور خوش تھا لیکن اس سے پہلے ہی قسمت نے اس کے دروازے پر دستک دے دی۔ پریگ یونیورسٹی نے اسے مکمل پروفیسر شپ کی پیشکش کر دی (زیورچ یونیورسٹی میں وہ معاون پروفیسر تھا) اس عہدے میں معمول کے فرائض سے زیادہ آزادی تھی۔ تنخواہ بھی زیادہ تھی۔ اس نے اس پیشکش کو قبول کر لیا۔

پریگ یونیورسٹی یورپ کی قدیم ترین یونیورسٹی تھی اور علم کے ہر شعبے کے نامور ماہرین اس کے عملے میں شامل تھے۔ یہاں طلبہ بھی وہ آتے تھے جنہوں نے سائنس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔

یہاں اسے وہ علمی ماحول ملا جس کا وہ متلاشی تھا۔ اس کی بیوی بھی زیورچ سے پریگ آکر بہت خوش ہوئی۔ اس لیے بھی کہ یہاں رومان پرور اور قدرتی مناظر کی بہتات تھی اور اس لیے بھی کہ اس کا شوہر اب ایک بھاری تنخواہ اس کے ہاتھ میں دے رہا تھا۔ اس کے برعکس البرٹ کو اپنی تنخواہ کی کمی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ اس لیے خوش تھا کہ یہاں تحقیقی کام کرنے کے بہت مواقع تھے۔ اس کے زرخیز ذہن کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ وہ کہیں بھی ہو ارد گرد کی چیزوں کو نظر انداز کر کے مسائل پر غور کر سکتا تھا۔ اپنے نظریات کی خامیاں تلاش کر کے انہیں درست کر سکتا تھا۔ اس کے غور و فکر کرنے کی عادت ہی اس کی تجربہ گاہ تھی۔ وہ اپنے خیالات میں غرق رہتا کوئی طالب علم کچھ پوچھنے کے لیے اسے مخاطب کرتا تو وہ ہرگز ناراض نہ ہوتا۔ طالب علم کا مسئلہ حل کرنے کے بعد وہ واپس اپنے خیالوں کی دنیا میں پہنچ جاتا۔

وہ یہاں اتنا خوش تھا کہ اسے یورپ کے دوسرے حصوں کی یونیورسٹیوں میں بھی پیشکش ہوئی لیکن اس نے اس جنت کو خیرباد نہیں کہا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یورپ کے سیاسی حالات کچھ اچھے نہیں تھے۔

یہ سیاسی حالات گمبھیر ہونا شروع ہو گئے۔ وسطی یورپ کے سیاسی حالات کا اثر پریگ پر بھی پڑنے لگا۔ پہلی جنگ عظیم دروازے پر دستک دینے لگی تھی۔ انہی دنوں اس کے پرانے اسکول فیڈرل پالی ٹیکنیک نے اسے باقاعدہ پروفیسر کے عہدے کی پیشکش کی۔ اس نے یہ خبر میلو کو بھی سنائی۔ میلو کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

''اس پیش کش سے مجھے خوشی ہوئی ہے۔''

''لیکن مجھے زیورچ واپس جانے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ میں یہاں بہت خوش ہوں۔''

''میں زیورچ کے سوا کہیں خوش نہیں رہوں گی۔''

''یہ بھی تو سوچو ہم کتنی مشکلوں کے بعد یہاں آئے ہیں۔''

''کچھ بھی ہو۔ جب ایک موقع ملا ہے تو میں زیورچ جائے بغیر نہیں رہوں گی۔''

وہ ہمیشہ کی جذباتی اور ضدی تھی جو کہہ دیتی تھی وہ کر کے رہتی تھی۔ البرٹ نے سمجھ لیا کہ اب وہ نہیں مانے گی۔

البرٹ نے پریگ یونیورسٹی چھوڑ دی اور زیورچ چلا آیا۔

یہ وہی پرانا اسکول تھا جہاں اسے اسسٹنٹ کی اسامی دینے سے بھی انکار کر دیا گیا تھا۔ اب اس کا احترام کیا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں فخریہ چمک آگئی۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ اس کا دوست مارسل وہیں تھا۔ اسے ایک قابلِ اعتماد مددگار مل گیا۔ ریاضی کے سوال حل کرنے میں مارسل کی قابلِ اعتماد صلاحیت کی وجہ سے آئن اسٹائن کی بہت سی محنت بچ گئی۔

پریگ میں قیام کے دوران میں اس نے تحقیق کے مزید نتائج شائع کیے تھے۔ اس نے اس کام کو اور آگے بڑھایا اور ایک اور رپورٹ شائع کی۔

وہ یہاں مطمئن تھا لیکن ابھی اس اطمینان کا ایک ہی سال گزرا تھا کہ اسے برلن میں پروشین اکیڈمی آف سائنس کی ممبر شپ کی پیش کش ہوئی۔ وہاں طلبہ کو پڑھانے کے سوا اور کوئی کام نہیں تھا۔ وہ اپنا سارا وقت تحقیق پر لگا سکتا تھا۔ یہ اس کے لیے آئیڈیل صورتِ حال تھی لیکن میلو نے اس کی خوشی میں زہر گھول دیا۔ وہ زیورچ چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔

''میری آئندہ ترقی کے لیے بھی نہیں۔''

''مجھے اپنی خوشی عزیز ہے۔ تمہیں جانا ہے تو چلے جاؤ۔''

''تمہارے بغیر۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

اس کی تلخ مزاجی نے البرٹ کو کچھ اور کہنے کا موقع نہیں دیا۔

وہ اکیلا روانہ ہو گیا۔

برلن پہنچ کر اس نے ایک کمرا کرائے پر لیا جو برلن یونیورسٹی کے قریب ہی تھا۔ یونیورسٹی کے حکام نے اسے خوش آمدید کہا۔ وہ پہلا دن ضائع کیے بغیر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

میلو اور بچوں کے بغیر رہنا دشوار تھا۔ اس نے اس کا علاج یہ ڈھونڈا کہ خود کو بے انتہا مصروف کر لیا۔ کوئی لمحہ ایسا چھوڑا ہی نہیں کہ بیوی بچوں کو یاد کر سکے۔ وہ اپنی طرف سے بالکل ہی غافل ہو گیا۔ اب اس کے پاس ٹائی باندھنے، ہیٹ پہننے یا بال ترشوانے جیسی فضول باتوں کے لیے، وقت ہی نہیں تھا۔

اس کی ذاتی زندگی میں کئی انقلاب آچکے تھے۔ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ والد کی وفات ہو چکی تھی۔ مایا کی شادی ہو چکی تھی لیکن وہ ماں کے ساتھ ہی رہ رہی تھی۔

ماں کا خط آیا تھا جس کے ذریعے اسے یہ تمام تفصیلات معلوم ہوئی تھیں۔ انہوں نے یہ ہدایت بھی کی تھی کہ تمہارے چچا روڈی برلن ہی میں رہتے ہیں ان سے ضرور ملا کرو۔ خط میں ان کا پتا بھی لکھا تھا۔

وہ لامتناہی تنہائی سے اتنا اکتا چکا تھا کہ اس نے چچا روڈی سے فوراً رابطہ کیا۔ چچا کے لیے یہ خوشی کی بات تھی کہ ان کا بھتیجا برلن آ گیا ہے۔ وہ اس کی شہرت سے بھی خوش تھے۔ انہوں نے ایک رات اسے کھانے کی دعوت دی۔ خاندان کے دوسرے لوگوں کو بھی دعوت دی تاکہ سب سے اس کی ملاقات ہو سکے۔ وہ سب بھی بچپن کے خاموش طبع البرٹ سے ملنے کے مشتاق تھے۔ سب جمع ہو گئے۔ ہر زبان پر اس کی تعریف تھی۔ سب کے سر فخر سے بلند تھے کہ ان کا رشتہ دار اتنا بڑا سائنس داں بن گیا ہے۔

اس کی چچازاد بہن ایلسا بھی وہیں تھی۔ اس نے بچپن میں اسے دیکھا تھا یا اب دیکھ رہا تھا۔ اب وہ لڑکی سے عورت بن چکی تھی۔ اس کا خاوند مر چکا تھا اور وہ دو چھوٹی بیٹیوں کے ساتھ باپ کے گھر رہ رہی تھی۔ وہ دونوں دیر تک بچپن کی یادوں کو تازہ کرتے رہے۔

بہت دن بعد اس نے وہ کھانے کھائے جو اس کی ماں بنایا کرتی تھی۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلا اور دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ بہت دن بعد ہنسا ہے۔ جب رات گئے وہ وہاں سے رخصت ہوا تو ایلسا اسے دروازے تک چھوڑنے آئی۔

''البرٹ کیا میں اُمید کروں کہ تم دوبارہ بھی آؤ گے۔''

''ایلسا تم جانتی ہو تمہارا البرٹ کہہ کر پکارنا مجھے کتنا اچھا لگا ہے۔ اب تو میں سب کے لیے آئن اسٹائن ہو کر رہ گیا ہوں۔ تم وعدہ کرو کہ ہمیشہ البرٹ کہہ کر پکارو گی تو میں بار بار آیا کروں گا۔''

''البرٹ۔'' وہ صرف اتنا کہہ سکی اور البرٹ نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے شب بخیر کہا۔

البرٹ نے اپنا وعدہ یاد رکھا اور جلد ہی چچا روڈی کے گھر پہنچ گیا۔ ایلسا کی آنکھوں میں اپنائیت کی چمک پیدا ہوئی جسے وہ نظر انداز نہ کر سکا۔

''تمہیں یاد ہے چچا روڈی نے کہا تھا صرف ذہین طلبہ ہی پروفیسر بنتے ہیں۔ اس وقت انہیں میری ذہانت پر شک تھا۔''

''تم نے واقعی سب کی زبانیں بند کردیں۔''

''تمہیں وہ بھی یاد ہوگا کہ جب ہم پکنک پر گئے ہوئے تھے۔ تم خوب کھیل رہی تھیں اور میں چپ چاپ ندی کی لہریں گن رہا تھا۔ چچا نے تمہاری مثال دے کر میری تنہائی کی طرف اشارہ کیا تھا۔''

''ہاں یاد ہے۔ وقت ایسا بدلا کہ ہم دونوں ہی تنہا ہو گئے۔ گھر کی خوشی نہ تمہیں ملی نہ مجھے۔'' ایلسا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''ارے، میں نے تمہیں اداس کردیا۔'' البرٹ نے آگے بڑھ کر اس کے آنسو پونچھے۔ ''ہم بہت جلد پکنک پر جائیں گے اور ہم دونوں بچوں کی طرح کھیلیں گے۔ چلو اب تو ہنس دو۔''

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

''اس نے چچا سے کہہ کر پکنک کا پروگرام بنایا اور واقعی ایلسا کے ساتھ اس طرح کھیلتا پھرا جیسے بچپن لوٹ آیا ہو۔''

وہ پابندی سے چچا کے گھر جانے لگا تھا۔ ایلسا نے ضد کر کے اس سے اس بات پر رضامند کرلیا کہ وہ اپنا ہر کھانا یہیں کھایا کرے گا۔ اس قربت نے ایلسا کو اس کے مزید قریب کردیا۔ اچھے کھانوں نے اس کی صحت پر بڑے اچھے اثرات مرتب کیے۔ وہ اپنی غذا کی طرف بہت کم دھیان دیتا تھا لیکن اب ایلسا اسے بچہ تصور کر کے زبردستی کھلاتی تھی۔ وہ کوشش کرتی تھی کہ وہ اچھا اور موزوں لباس پہنا کرے خاص طور پر اس وقت جب وہ کسی تقریب میں شرکت کرے یا کسی اہم شخصیت سے ملنے جایا کرے لیکن وہ ایسا بے پروا تھا کہ پھر بھی بغیر پالش کے جوتوں کے ساتھ ہی تقریبات میں پہنچ جاتا تھا۔

ایلسا کی محبت اور توجہ نے اس کی عادتوں میں خاطر خواہ تبدیلیاں پیدا کردی تھیں۔ وہ میلوا اور ایلسا کے درمیان موازنہ بھی کرنے لگا تھا لیکن اپنا زیادہ وقت ان خیالوں پر ضائع نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی زیادہ تر کوششیں تحقیق پر مرکوز تھیں۔ اس نے ایک سال کے اندر اندر اپنے فلسفۂ اضافیت کے متعلق ایک اور مقالہ ترتیب دے لیا۔ یہ مقالہ زیادہ ہیجان انگیز ثابت ہوتا لیکن جب تک اس کا وقت آتا جرمنی نے فرانس اور بیلجیم پر حملہ کردیا اور پہلی جنگِ عظیم شروع ہوگئی۔ اس کی ساری سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔

حالات غیر یقینی ہوتے جا رہے تھے۔ وہ گھنٹوں بیٹھ کر جنگی معاملات پر بحثیں کیا کرتا تھا۔ تمام مجلسی سرگرمیاں بند کردی تھیں۔ زیادہ وقت ایلسا کے ساتھ گزرتا تھا۔ اب وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ ایلسا اس کی مزاج داں ہے۔ ایک دن اس کے دل میں دبا ہوا سوال اس کے ہونٹوں پر آ ہی گیا۔

''ایلسا مجھ سے شادی کروگی؟''

''میں تمہارے لائق نہیں ہوں۔ تم اپنی خدمت کا موقع دو یہی بہت ہے۔''

''یہ خدمت تو شادی کے بعد بھی کرسکتی ہو بلکہ زیادہ بہتر طریقے سے کروگی۔''

''میں تو انکار کی جرأت بھی نہیں کرسکتی۔''

''میں چچا روڈی سے بات کرلوں گا۔''

اس نے اپنی بہن مایا کو خط لکھا اور مایا نے چچا کو خط لکھ کر انہیں راضی کرلیا۔ اس نے ایلسا سے شادی کرلی۔ اس کی دونوں لڑکیاں بھی اس کی سرپرستی میں آگئیں۔

جنگ زور و شور سے جاری تھی۔ جنگ شروع کرنے کا الزام جرمنی پر آرہا تھا۔ جنگ اس الزام کو دھونے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کے لیے سرکردہ جرمنوں نے دانش وروں، فنکاروں اور سائنس دانوں کو جمع کر کے ان سے ایک بیان پر دستخط کرالیے۔ اس بیان میں جرمنی کے فوجی اقدامات کو جائز قرار دیا گیا تھا۔ جب یہ بیان آئن اسٹائن کے پاس آیا تو اس نے دستخط کرنے سے انکار کردیا۔

حکام کو اس سے یہ توقع نہیں تھی۔ وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ دنیا کا عظیم سائنس داں ان کے ساتھ ہے لیکن وہ جنگ کو خلاف انسانیت سمجھتا تھا پھر اسے جائز کیسے قرار دے سکتا تھا۔ اس کے اس جرأت مندانہ اقدام نے جرمنی کو دہلا کر رکھ دیا۔ وہ شک و شبے کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔

سوئٹزرلینڈ کے شہری خوش تھے کہ وہ ان کا ہے۔ اس کے پاس سوئس شہریت تھی۔

☆......☆

البرٹ کی دوسری تھیوری شائع ہوچکی تھی۔ اس کے نظریات رائج سائنسی نظریات سے اس قدر مختلف تھے کہ بہت سے سائنس داں اس کے نظریات کو درست مانتے ہوئے بھی عملی ثبوت چاہتے تھے۔ عملی ثبوت یہ تھا کہ آفتاب

کی طرح نظر آنے والے ستارے اپنے اصلی محور سے قدرے اِدھر اُدھر نظر آنے چاہیے تھے لیکن آفتاب کے چمک دار سرے کے اتنے نزدیک ہونے کی وجہ سے انہیں کیسے دیکھا جاسکتا تھا۔ یہی ہوسکتا تھا کہ پورے سورج گہن کا انتظار کیا جائے۔ آفتاب کی تیز روشنی کے ہٹ جانے کی وجہ سے تاریک آسمان پر یہ ستارے دیکھے جاسکتے تھے۔

1918ء میں جنگ ختم ہو چکی تھی۔ اس کے اگلے سال سورج کو مکمل گہن لگا۔ اس سے پہلے انگلینڈ کی رائل سوسائٹی نے اس گہن کا مشاہدہ کرنے کے لیے ماہرین سیارگاں کو افریقا و برازیل کی طرف بھیجا تاکہ گہن کے دوران میں آسمان کی تصویریں کھینچی جائیں۔ گہن چند منٹ ہی رہا جہاں ماہرین نے اس قلیل عرصے میں سیکڑوں تصاویر بنالیں۔

ان تصاویر نے ثبوت فراہم کردیا کہ اس کا نظریہ اضافیت درست تھا۔ آفتاب سیاہ ٹکیہ کا منظر پیش کررہا تھا اور اس کے گرد روشنی کا ہالہ تھا۔ یہی وہ ستارے تھے جو اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔

تمام دنیا کے سائنس دانوں نے اس کے نظریے کو درست تسلیم کرلیا۔ اخبارات اس کے بارے میں خبریں چھاپنے لگے۔ اس کی شہرت آسمان کو چھورہی تھی۔ بچوں کے نام اس کے نام پر رکھے جانے لگے۔ سگار تیار کرنے والے ایک ادارے نے اپنے سگار کا نام ہی اضافیت رکھ دیا۔ دنیا بھر سے لیکچر دینے کے لیے اسے دعوت نامے موصول ہونے لگے۔ خطوط کے بھرے ہوئے تھیلے اس کے نام آنے لگے۔

شہرت آئن اسٹائن کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ اس کے شب و روز میں کوئی بھی تبدیلی نہ آئی۔ وہ اس تماشے کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے یہ سب تعریفیں کسی دوسرے شخص کے لیے ہیں۔ اس نے کبھی یہ نہ چاہا کہ اسے اہم ہستی سمجھا جائے۔

وہ تو یہ بھی بھول جاتا تھا کہ اسے کہاں سے دعوت نامہ آیا ہے اور اسے کب جانا ہے۔ پیرس کی رسدگاہ نے اسے دنیا کے ممتاز ترین سائنس دانوں کے سامنے تقریر کرنے کی دعوت دی تو وہ دعوت نامہ میز کی دراز میں رکھ کر بھول گیا۔ ایلسا ایسی باتیں خوب یاد رکھتی تھی۔ اس نے ایک دن پہلے اسے یاد دلایا۔ اس نے بے توجہی سے سنا اور دوسرے دن خاموشی سے اسٹیشن پہنچ گیا۔ ریل کے تیسرے درجے میں بیٹھ کر گیا اور پیرس کے ریلوے اسٹیشن پر اتر کر

پیدل ہی طویل فاصلہ طے کر کے رسد گاہ پہنچ گیا۔ استقبالیہ کمیٹی کے ارکان اسے فرسٹ کلاس میں ڈھونڈتے رہے۔
اس پائے کا سائنس داں تیسرے درجے میں سفر کرے گا انہیں یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اتنی شہرت کے باوجود اتنی عاجزی، یہ تھا البرٹ آئن اسٹائن۔
پوری دنیا کی توجہ اس پر لگی ہوئی تھی اور وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں کتابوں کے درمیان خاموشی سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اب بھی لمبی سیر پر نکلتا تھا۔ اس کے سرخ چہرے اور سر پر بکھرے ہوئے بالوں کے گچھے کو اس وقت تک سب جان چکے تھے۔
یہ سب اپنی جگہ لیکن جرمنی میں یہودیوں کے خلاف جذبات بھڑکائے جا رہے تھے۔ چند جرمن سائنس دانوں نے تو اس کے نظریہ اضافیت کو یہودی فلسفہ کہنا شروع کر دیا کیوں کہ آئن اسٹائن یہودی تھا۔ اسے ان کی اس حرکت پر سخت دکھ ہوا۔ اس لیے نہیں کہ اس کے نظریے کو غلط قرار دیا جا رہا تھا بلکہ اسے سائنس دانوں کی ذہنیت پر افسوس ہو رہا تھا جو سائنس کو بھی مذہب کے خانوں میں بانٹ رہے تھے۔
اس نے اس تکلیف کا ازالہ بیرونی دوروں سے کیا۔ وہ جرمنی سے باہر دوروں کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ وہ جس طرف نکل جاتا۔ اس کے لیکچر سننے کے لیے لوگوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ اسے وہ تسکین بخش تسکین مل رہی تھی۔ اس کے ملک میں جو ناخوشگوار ماحول پرورش پا رہا تھا اس سے، کچھ وقت کے لیے اسے چھٹکارا مل گیا۔
انہی دوروں کے دوران میں وہ ایک خاص لیکچر دینے کے لیے پراگ یونیورسٹی گیا جہاں وہ کسی زمانے میں پروفیسر رہ چکا تھا۔ وہ جہاں جاتا تھا لوگوں کی ایک بڑی تعداد اسے دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتی تھی اس لیے اس کی آمد کو خفیہ رکھا گیا تھا۔ صرف پروفیسر فلپ فرانک تھے جو اسے لینے اسٹیشن گئے تھے۔ وہ راستے بھر یہ سوچ رہے تھے کہ عالمی شہرت نے آئن اسٹائن کو بہت کچھ بدلوا دیا گیا ہو گا۔ اس کی سادگی رخصت ہو چکی ہو گی لیکن جب آئن اسٹائن نے ریل کے ڈبے سے نیچے قدم رکھا تو پروفیسر کو سخت حیرت ہوئی۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ شکن آلود اوور کوٹ اور پچکا ہوا ہیٹ پہنے جو شخص گاڑی سے اترا وہ کسی طور پر بین الاقوامی شخصیت کا مالک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔
اس رات وہ تقریر کرنے کے لیے آڈیٹوریم میں پہنچا تو آڈیٹوریم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ان میں سے اکثریت ان کی تھی جو یہ سمجھ بھی نہیں سکتے ہوں گے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ تو بس اس عظیم انسان کو دیکھنے چلے آئے تھے۔
ہٹلر کے برسر اقتدار آنے کے بعد اس کا جرمنی میں رہنا دوبھر ہو گیا تھا۔ کیوں کہ وہ یہودی تھا۔ اس کوفت سے بچنے کے لیے وہ طویل دورے کرتا رہا تھا لیکن کب تک!
وہ ہمیشہ سے جمہوریت کا حامی اور آمریت کا دشمن رہا تھا۔ اسی لیے امریکا کا مداح تھا۔ اب جو اپنے ملک میں سیاسی آمریت کا دور دورہ ہوا تو اس نے امریکا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہا۔ ایلسا تو اس کے حکم کے تابع تھی۔ جو وہ کہتا تھا اسے کوئی اعتراض نہیں تھا اور پھر امریکا کا دورہ تو اس کے لیے بھی دل خوش کن تھا۔
اس کی طرف سے اجازت ملتے ہی آئن اسٹائن نے خط کتابت کے ذریعے حکومت امریکا سے اس دورے کی اجازت لے لی۔ تیاری مکمل ہونے کے بعد دونوں میاں بیوی پانی کے جہاز کے ذریعے امریکا کے لیے روانہ ہو گئے۔
اس کی بے پناہ مقبولیت نے اس کے دورے کو خفیہ نہیں رہنے دیا تھا۔ نیویارک میں اس کی آمد کے اشتہار لگ گئے تھے اور اس کے استقبال کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔
وہ لہریں گننے کا ہمیشہ سے عادی تھا۔ جہاز کے عرشے پر کھڑے ہو کر تو اسے یہ موقع خوب ملا۔ ایلسا بھی اس کی دل جوئی کے لیے اس کے ساتھ کھڑی رہتی ورنہ اسے کیبن میں رہنا زیادہ پسند تھا۔ زیادہ دیر تک سمندر پر نظریں جمائے رکھنے سے اس کا سر چکرانے لگتا تھا۔
کپتان نے اسے بتایا کہ جناب اب ہمارا جہاز خلیج نیویارک میں سفر کر رہا ہے اور بہت جلد ساحل پر ہو گا۔
''جناب! اخباری نمائندے جہاز کے عرشے پر ہی آپ سے ملاقات کریں گے اور آپ سے گفتگو کریں گے آپ تیار رہیں۔''
آئن اسٹائن اس قسم کی ملاقاتوں سے بہت گھبراتا تھا لیکن وہ انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے رضامندی ظاہر کر دی۔ کپتان نے عرشے کے ایک حصے میں رسیاں باندھ کر ایک جگہ بنا دی تا کہ اخباری نمائندے وہاں بیٹھ سکیں۔
ساحل نے جہاز کا منہ چوما۔ جہاز لنگر انداز ہو گیا۔ رپورٹر اور فوٹو گرافر جہاز پر چڑھ آئے۔ کیمروں کی روشنیاں حرکت میں آئیں وہ فوٹو گرافروں کی ہدایت پر عمل کرتا رہا۔ بڑے لوگوں کی طرح اس کے چہرے پر بیزاری نہیں تھی۔ وہ

اس طرح خوش وخرم دکھائی دے رہا تھا جیسے اپنے جیسے لوگوں کے درمیان آ گیا ہو۔

فوٹو سیشن مکمل ہونے کے بعد رپورٹر حضرات آگے بڑھے اور سوال پر سوال پوچھنے لگے۔ آئن اسٹائن خوش اخلاقی سے ہر سوال کا جواب دے رہا تھا۔

اس کا انٹرویو ختم ہوا تو نامہ نگار ایلسا کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایلسا اس کے ساتھ جہاں بھی جاتی تھی ایک ہی قسم کے سوالات پوچھے جاتے تھے۔ لہٰذا اب وہ بھی ان سوالوں کی عادی ہو گئی تھی۔ زیادہ تر سوالات آئن اسٹائن کی عادات واطوار اور ایسا کے ساتھ اس کے تعلقات اور گھریلو زندگی کے بارے میں ہوا کرتے تھے۔ یہاں بھی وہی سوالات پوچھے گئے۔ وہ مسکرا مسکرا کر جواب دیتی رہی۔

انٹرویو ختم ہوا تو وہ دونوں کچھ دیر کے لیے اپنے کیبن میں چلے گئے اور پھر وہ جہاز سے نیچے اتر گئے۔ ایک سرکاری وفد اس کے استقبال کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اسے اور ایلسا کو بغیر چھت والی ایک بڑی کار میں بٹھا دیا گیا۔

آئن اسٹائن کی کار کے پیچھے پیچھے کاروں کا ایک کارواں سٹی ہال کی طرف روانہ ہوا۔ اسے اپنی مقبولیت کا اندازہ نہیں تھا لیکن ایلسا جانتی تھی کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ لوگوں کا جوش وخروش دیدنی ہوگا۔ یہی ہوا بھی۔ شہر میں داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا سڑکوں پر لوگوں کا بھاری ہجوم تھا۔ وہ سب آئن اسٹائن زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے اور ہاتھ ہلا رہے تھے۔ ایلسا نے آئن اسٹائن کو کار میں کھڑے ہونے کے لیے کہا۔ کار کھلی چھت کی تھی لہٰذا وہ کھڑا ہو گیا اور بازو لہرا لہرا کر نعروں کا جواب دینے لگا۔ فلک بوس عمارتوں کی کھڑکیوں میں لوگ کھڑے تھے۔ ہر آنکھ اسے دیکھنے کی مشتاق تھی۔ کچھ لوگ اس کی کار کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ دیوانہ وار چیخ چیخ کر اسے مخاطب کر رہے تھے۔ سٹی ہال تک پہنچنے میں اسے بہت دیر لگ گئی تھی۔ سڑکوں کے دونوں طرف لوگ ہی لوگ تھے۔ سٹی ہال میں میئر نے اس کا استقبال کیا اور شہر کی کنجی پیش کی۔

اس کے بعد دعوتوں اور تقاریب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ واشنگٹن گیا تو صدر وارن ہارڈنگ نے وائٹ ہاؤس میں اس کا استقبال کیا۔

اس نے اس دورے میں پرنسٹن، ہارورڈ اور کولمبیا یونیورسٹی میں لیکچر دیے۔

چھ ہفتوں کا یہ دورہ انہی مصروفیات میں گزر گیا۔ جس دن اسے روانہ ہونا تھا اس سے ایک رات پہلے نیویارک کے ہوٹل الپسٹر میں وسیع پیمانے پر ڈنر کا اہتمام کیا گیا۔

یہاں سے انہیں لندن جا کر کنگز کالج میں تقریر کرنی تھی۔ وہ جہاز میں بیٹھا تو یہ خیال اس کے دل میں جاگزیں ہو گیا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو امریکا اس کی بہترین پناہ گاہ بنے گا۔ امریکا اسے یہودی کہہ کر طعنہ نہیں دے گا۔

وہ امریکا کی گراں قدر آزادی کا تحفہ اپنے ساتھ لے کر جا رہا تھا۔

وہ لندن پہنچا تو رولز رائس کار اس کی منتظر تھی جو اس کے میزبان لارڈ ہالڈین نے بھیجی تھی۔ باوردی ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور وہ دونوں اس میں بیٹھ گئے۔ یہ کار کچھ فاصلہ طے کر کے ایک خوب صورت بنگلے میں داخل ہو گئی۔ گاڑی رکتے ہی کئی ملازم ایک ساتھ دوڑے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ وہ دونوں باہر آئے۔ آئن اسٹائن نے اپنا سامان اتارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن ملازمین پہلے ہی سامان اتار چکے تھے اور لے کر کسی طرف جا بھی چکے تھے۔ لارڈ ہالڈین رسمی استقبال کے لیے آ چکے تھے۔

”آپ اور مادام کچھ دیر آرام کر لیں۔ ڈنر پر ملاقات ہوگی۔“

ملازموں نے انہیں راستہ دکھایا اور وہ دونوں محرابوں اور راہداریوں سے گزرتے ہوئے ایک کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ چابی سے دروازہ کھولا اور ہٹ کر کھڑا ہو گیا تاکہ وہ پہلے داخل ہوں۔ وہ ابھی تک اتنا سیدھا اور پرتعیش زندگی سے ایسا ناواقف تھا کہ خواب گاہ کو ہال روم سمجھ کر ایلسا سے کہنے لگا۔ شاید یہ ملازم غلطی سے ہمیں یہاں لے آیا ہے۔ کوئی خواب گاہ اتنی وسیع بھی ہو سکتی ہے یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب اس نے اپنا سامان کمرے کے وسط میں پڑا دیکھا۔ ملازم غلطی سے یہاں نہیں لے آیا ہے بلکہ اسے یہیں آرام کرنا ہے۔ پھر شاندار فرنیچر اور وسیع وعریض بیڈ پر نظر پڑی۔ وہ اپنی جھینپ مٹانے کے لیے ایک صوفے میں دھنس گیا۔ ملازم حکم کے منتظر تھے۔ صندوقوں سے سامان ابھی باہر نکالنا تھا۔

”یہ کیا مصیبت ہے۔ ان ملازموں کو باہر نکالو۔ میں انہیں زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا۔“ البرٹ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔ ایلسا اس کی اس بڑبڑاہٹ کو خوب سمجھتی تھی۔

”ہم تمہیں بعد میں بلا لیں گے۔ فی الحال تمہارا کوئی

کام نہیں۔'' ایلسا نے ملازموں سے کہا۔

ملازموں نے تسلیم کے لیے سر جھکایا اور کمرے سے نکل گئے۔

اس کے اعزاز میں ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس تقریب میں برطانیہ کی تقریباً تمام اہم شخصیات شریک تھیں۔ اس تقریب میں سارے وقت اس کے نظریہ اضافیت پر باتیں ہوتی رہیں۔ یہ ایسا پیچیدہ نظریہ تھا کہ وہاں بیٹھا ہوا کوئی شخص اسے سمجھنے کا پوری طرح اہل نہیں تھا۔ ہر شخص یہی ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اس کے کچھ حصے کو سمجھتا ہے۔ آئن اسٹائن کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیوں کہ ان میں سے کوئی بھی سائنس داں نہیں تھا۔

اگلی شام اسے کنگز کالج میں لیکچر دینا تھا۔

لیکچر ہال کھچا کھچ بھر تو گیا تھا لیکن منتظمین خوف زدہ تھے کہ کہیں کوئی بدنظمی نہ ہو جائے۔ ان کی توقع سے زیادہ لوگ آ گئے تھے اور یہی بات باعث تشویش تھی۔ ان لوگوں کو نظریہ اضافیت سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ یہ یقیناً کوئی گڑبڑ کرنے آئے ہیں کیوں کہ آئن اسٹائن جرمن ہے۔ برطانیہ ابھی تک جرمنی کے ساتھ جنگ کو بھولا نہیں ہے۔ وہ اپنی سرزمین پر ایک جرمن سائنس داں کو ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ منتظمین کو اب احساس ہو رہا تھا کہ انہوں نے آئن اسٹائن کو مدعو کر کے غلطی کی ہے۔ برطانوی عوام کے دلوں میں جرمنی کے خلاف نفرت ہے۔ کہیں یہ معزز مہمان اس نفرت کا نشانہ نہ بن جائے۔

آئن اسٹائن کو برطانوی عوام کے مخالفانہ جذبات کا احساس تھا۔ اسے ایسے الفاظ کا چناؤ کرنا تھا جن سے وہ برطانوی عوام کی سرد مہری دور کر سکے۔

اس نے اپنی تقریر کا آغاز نیوٹن کو خراجِ عقیدت پیش کرنے سے کیا۔

''مجھے اس ملک میں آ کر تقریر کرنے سے خوشی ہو رہی ہے جس ملک نے دنیا کو عظیم ترین سائنس داں دیا۔''

نیوٹن کی تعریف میں الفاظ خرچ کرنے کے بعد اس نے یہ فلسفہ سمجھایا کہ سائنس ملکی حدود سے تعلق نہیں رکھتی۔ وہ سب کے لیے ہوتی ہے۔ سائنس داں کا تعلق کسی ملک و مذہب سے نہیں ہوتا۔ سائنس انسانوں کی بھلائی کے لیے ہے چاہے وہ کہیں کے بھی ہوں۔

حاضرین میں پھیلی ہوئی بے زاری، بے دلی اور سرد مہری رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ اس کے بعد آئن اسٹائن نے جو کچھ کہا لوگوں نے سنا اور خوب تالیاں بجائیں۔

آئن اسٹائن نے ان کے ہم وطن نیوٹن کو خراجِ عقیدت پیش کیا تھا وہ اس کا استقبال کر رہے تھے۔ یہ خیال کہیں بھی نہیں تھا کہ کون جرمن ہے اور کون انگریز۔ ایک طرف سائنس داں تھا دوسری طرف سائنس داں کے پرستار۔

ان ہیجان انگیز دوروں کے بعد انہیں برلن اپنے گھر کی طرف لوٹنا تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر دوبارہ انگلستان کو عبور کیا۔

وہ باہر کی روشنی سے وطن کے اندھیروں میں داخل ہوا تو آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل نہیں تھیں۔ جنگ کے بعد کی تباہ کاریاں عریاں ہو کر سامنے آ گئی تھیں۔ ہر طرف بے کاری کا عفریت منہ کھولے کھڑا تھا۔ یہودی خاص طور پر نشانہ بن رہے تھے۔ وہ تو عالمی شہرت یافتہ باعزت سائنس داں تھا۔ اس صورت حال سے بچا ہوا تھا لیکن اپنے ہم قوموں کے ساتھ ناروا سلوک دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ وہ ان کی مدد کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے یہودیوں کے لیے چندہ جمع کرنے کا کام شروع کر دیا۔ جو تنظیمیں فلاحِ یہود کے لیے پیش پیش تھیں۔ وہ اپنا منصب بھول کر ان کی تقاریب میں شریک ہونے لگا۔ اس کی شخصیت کے باعث بڑے بڑے ہجوم اکٹھے ہونے لگے۔ وہ یہ کام قصبہ قصبہ گھوم پھر کر کر رہا تھا۔ اس کی ان کوششوں کو دیکھ کر جرمن اس کے خلاف ہو گئے۔ اسے متعصب کہا جانے لگا۔ کچھ دنوں سے دھمکی آمیز خطوط بھی ملنے لگے تھے۔ اس کے لیکچروں کے دوران اس کے خلاف نعرے لگنے لگے۔ وہ جب امریکا اور برطانیہ میں اپنی پذیرائی سے اپنی موجودہ حالت کا موازنہ کرتا تو سخت تکلیف ہوتی۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ اس کے وطن نے اسے کیا دیا۔

اس روز وہ کسی تقریب میں شرکت کر کے گھر واپس آیا تھا۔ بہت تھکا ہوا اور نڈھال۔ ایلسا اس کی یہ حالت نظر انداز نہ کر سکی۔ وہ یہی سمجھی تھی کہ اس کی طبیعت خراب ہے لیکن جب پوچھنے پر اسے بے تحاشا ہنستے ہوئے دیکھا تو اسے تشویش ہوئی۔ کہیں البرٹ کا دماغ تو نہیں چل گیا۔

''کیا بات ہے البرٹ، اس طرح کیوں ہنس رہے ہو۔''

''اپنی حالت پر ہنسوں نہیں تو کیا کروں۔ لوگ اب سائنس داں کو یہودی اور غیر یہودی کے خانوں میں بانٹ

رہے ہیں۔ میرے کام سے انہیں کوئی غرض نہیں۔ وہ مجھے صرف یہودی سمجھتے ہیں۔ حد ہو گئی۔ انہوں نے میرے لیکچر کے دوران میں ایسی گڑبڑ پھیلائی کہ میں لیکچر ادھورا چھوڑ کر آ گیا۔ میں بہت اہم بات کرنے والا تھا اور نہ کر سکا۔''

''البرٹ یہ ہنسنے کی بات نہیں۔ تمہاری جان کو سخت خطرہ ہے۔ تم اب نوبل قدری کے لیے اکیلے نہ نکلا کرو۔''

''اگر انہوں نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو وہ میرا نہیں اپنا نقصان کریں گے۔''

''میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ کچھ دنوں کے لیے اس زہریلے ماحول سے باہر نکل جاؤ۔''

اس روز وہ ایلسا کے ساتھ چچا روڈی کے گھر گیا تو وہ سب بھی اس کی طرف سے فکر مند تھے۔ سب یہی مشورہ دے رہے تھے کہ وہ کچھ دنوں کے لیے برلن چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے۔

''مجھے جاپان سے خطوط آتے رہے ہیں لیکن میں اب تک وہاں جانے سے گریز کرتا رہا ہوں۔ میں سمجھتا تھا یہاں میری زیادہ ضرورت ہے۔''

''البرٹ اب تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرو۔ ہم کچھ عرصہ بعد اپنے وطن لوٹیں گے تو ہاں کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور آ چکی ہو گی۔ کم از کم یہ تو ہوگا کہ لوگ تمہیں بھول چکے ہوں گے۔''

البرٹ آئن اسٹائن نے جاپان میں متعدد لیکچر دینا منظور کر لیا۔

اس نے جرمنی کو الوداع کہا اور جاپان پہنچ گیا۔ اس کی وہی پذیرائی ہوئی جس کا وہ مستحق تھا۔ اس کے جاپان پہنچنے کے دن قومی تعطیل کی گئی اور خود ملکہ معظمہ نے اس کا استقبال کیا۔

اس نے جاپان میں رہ کر جہاں جہاں بھی لیکچر دیے جاپانی عوام جوق در جوق اسے سننے کے لیے آئے۔ حالانکہ ان کے لیے یہ ایک تکلیف دہ عمل تھا۔ وہ مترجمین کے ذریعے اس کے خیالات سن رہے تھے۔ آئن اسٹائن جاپانی عوام کی سائنس دوستی کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ ایک ایسی زبان میں جو ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اس کی تقریر کو گھنٹوں بے حس و حرکت بیٹھے سنتے تھے۔ محض اس یقین پر کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے سب کی بھلائی کے لیے ہے۔

اسے ان تقاریب میں شرکت کر کے اپنے وطن میں اپنی ناقدری کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ اسے یہ بھی خوشی تھی کہ وہ اس ملک میں آزادانہ گھوم سکتا ہے۔ کوئی اسے یہودی ہونے کا طعنہ نہیں دے سکتا۔

کئی ہفتوں کے دورے کے بعد اس نے یہ ملک چھوڑا تو نشانیوں اور تمغوں سے بھرے صندوق اور یہاں کی رنگین یادیں اس کے ساتھ تھیں۔

یہاں سے وہ فلسطین گیا۔

اسی دورے کے دوران میں اس تک یہ خبر پہنچائی گئی کہ سوئیڈش اکیڈمی آف سائنس نے اسے فزکس کے لیے اس کی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے نوبیل انعام دیا ہے۔

جنگ کے بعد کسی جرمن باشندے کو ملنے والا یہ پہلا نوبیل پرائز تھا۔ یہ انعام جنگِ عظیم میں شکست کے لگنے والے زخموں کا ازالہ بن گیا۔ محرومیوں کو تسکین ملی۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ یہ بھول گئے کہ آئن اسٹائن یہودی ہے۔ اب وہ ان کے لیے صرف جرمن باشندہ تھا جسے نوبیل انعام ملا تھا۔

اس نے ایک اور سفر کیا۔ اس بار وہ سوئیڈن کے بادشاہ سے نوبیل پرائز لینے گیا۔ یہ وہ اعزاز تھا جس کی کوئی قیمت نہیں لیکن اس کے ساتھ چالیس ہزار ڈالر کا نقد انعام بھی ملا۔ کوئی اور ہوتا تو اس رقم سے وہ اپنی زندگی مزید رنگین بنا لیتا لیکن وہ آئن اسٹائن تھا۔ اس کی ضروریات بہت کم اور اس کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ اسے اتنی بڑی رقم ملنے کی ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی۔ اس نے یہ تمام رقم اپنی مطلقہ بیوی میلو امریش کو سوئٹزرلینڈ بھجوا دی تاکہ اس کے لڑکوں کی تعلیم پر خرچ کی جا سکے۔

وہ اب اس اطمینان کے ساتھ وطن واپس آیا کہ اب برلن میں اس کے خلاف اٹھنے والی آوازیں دم توڑ دیں گی اور وہ کسی مداخلت کے بغیر اپنا کام کر سکے گا۔ اس کے ذہن نے نظریہ اضافیت سے متعلق کچھ اور اضافے تخلیق کر لیے تھے۔ وہ برلن پہنچ کر اپنے کام میں مشغول ہو جانا چاہتا تھا۔

وہ برلن پہنچ کر پوری تندہی سے اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اب جرمنی میں رہتے ہوئے وہ جرمنوں سے محفوظ تھا۔ اس کی عالم گیر شہرت نے جرمنوں کو مسحور کر دیا تھا۔ وہ یہ دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے تھے کہ محض اس کی وجہ سے برلن یونیورسٹی سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بن گئی ہے۔ سیر و سیاحت کے لیے جو بھی برلن آتا وہ برلن یونیورسٹی ضرور جاتا کہ اس مشہور سائنس داں کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔ کچھ تو یہ بھی جسارت کرتے تھے کہ اسے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے

دیکھنے کے لیے، خاموشی سے اس کمرے میں بھی پہنچ جاتے جہاں وہ چند مخصوص طلبہ سے خطاب کر رہا ہوتا تھا۔ آنے والوں کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ وہ لیکچر دینے میں اتنا منہمک ہے کہ اسے یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کون آیا اور آکر بیٹھ گیا اور جب جی چاہا اٹھ کر چلا گیا۔

وہ تو سمندر تھا۔ لہریں گننے والے، لہریں گنتے تھے لیکن وہ لہریں گننے والوں کو نہیں گنتا تھا۔ سمندر جو ہوا۔

جو لوگ برلن میں اسے دیکھ کر جاتے تھے اپنے ملکوں میں جا کر فخر سے، کہتے تھے کہ وہ آئن اسٹائن کو دیکھ کر آئے ہیں اور سننے والے کرید کرید کر اس کے بارے میں پوچھا کرتے تھے۔ اتنی شہرت شاید ہی کسی سائنس داں کو ملی ہو جو اسے مل رہی تھی۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ اسے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ زندگی بھر نہ سمجھ سکا کہ لوگوں کو اس میں کیا دلچسپی ہے اور کیوں ہے۔

اب وہ برلن میں مصروف ترین دن گزار رہا تھا۔ ایلسا کی مصروفیات بھی بڑھ گئی تھیں۔ البرٹ کے نام ہزار ہا خطوط آتے تھے۔ ایلسا کا کام یہ تھا کہ وہ ان میں سے اہم یا اہم لوگوں کے خطوط الگ کر کے البرٹ کے سامنے رکھے بلکہ پڑھ کر بھی سنائے۔ بے شمار لوگ اس سے ملاقات کے لیے آتے۔ اب وہ ہر ایک سے تو نہیں مل سکتا تھا۔ ایلسا کا کام یہ تھا کہ ان سے ملاقات کی غائیت پوچھے۔ ان کا کوئی مسئلہ ہے تو خود حل کر دے۔ جس سے ملاقات ضروری ہو اسی کو اس تک رسائی دے۔ غیر ملکی سر کردہ ہستیاں بھی ملنے آتیں تو ایلسا ان پر واضح کر دیتی کہ سائنس داں کا زیادہ وقت نہ لیا جائے۔

ایلسا کی اس سخت نگرانی نے اسے اتنا وقت دے دیا کہ وہ چند نئے حیران کن سائنسی نظریات پیش کرنے کے قابل ہو گیا۔ ان نظریات پر وہ سالہا سال سے غور کر رہا تھا۔ یہ نظریات اس فلسفے کا نقطہ آغاز تھے جسے اس نے ''یونیفائیڈ فیلڈ تھیوری'' کا نام دیا۔ یہ دراصل فلسفہ اضافیت ہی کا ضمیمہ تھے۔

اس نظریے کا پیش ہونا تھا کہ اخباری صفحات اس کی خبروں سے بھر گئے۔ ہر طرف چرچا تھا۔ اخباری نامہ نگار برلن کے ہوٹلوں میں بھر گئے۔ وہ اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح اس کا انٹرویو لینے میں کامیاب ہو جائیں۔ آئن اسٹائن حیران تھا کہ ایسا دقیق نظریہ کسی کے کیا سمجھ میں آرہا ہو گا۔ اس کے باوجود لوگ اس کی مداح سرائی میں زمین آسمان ایک کیے دے رہے ہیں۔ دراصل وہ ایک ایسی علامت بن گیا تھا کہ وہ جو بھی کہتا لوگ اسے خدائی راز سمجھ کر قبول کر لیتے۔

برلن میں لوگوں کا جوش و خروش دیکھنے کی چیز تھا۔ اس کے گھر کے سامنے لوگوں کی بھیڑ جمع تھی۔

''ایلسا میں تو ایک عام شہری کی زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ آزادی کے ساتھ گھومنا پھرنا چاہتا تھا لیکن مجھے لگتا ہے یہ لوگ مجھے آزادی کی زندگی نہیں گزارنے دیں گے۔ یہ تو میری پرستش پر تلے ہوئے ہیں۔''

''یہ آپ کے پرستار ہیں ان سے گھبرانا نہیں چاہیے۔''

''میں اس ہجوم میں گھرا رہا تو اپنے تخلیقی کام کیسے کروں گا۔ میرے ذہن میں ابھی کئی نظریات ہیں۔ یہ تو مجھے کچھ بھی نہیں کرنے دیں گے۔''

''کچھ دن کی بات ہے۔ یہ بھیڑ چھٹ جائے گی۔ آپ فکر مت کریں۔ میں سب سنبھال لوں گی۔''

ایلسا نے واقعی سب سنبھال لیا۔ اس نے اخباری نمائندوں سے ملاقاتیں کیں اور انہیں قائل کرلیا کہ وہ انٹرویو ضرور کریں لیکن دس یا پندرہ منٹ سے زیادہ انہیں نہیں ملیں گے۔ جو عام لوگ اس سے ملنے کے خواہش مند تھے انہیں کسی نہ کسی طرح ٹالتی رہی۔ ٹیلی فون پر کالوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ وہ تھکے بغیر فون اٹینڈ کرتی رہی۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا لیکن آئن اسٹائن مطمئن نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا ان پرستش کرنے والوں سے دور چلا جائے۔ انہی دنوں اسے کیلی فورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں تین ماہ کے لیے مہمان پروفیسر کے طور پر کیلی فورنیا آنے کی دعوت دی گئی۔ وہ تو پاؤں لٹکائے بیٹھا ہی تھا۔ اس نے یہ دعوت قبول کرلی۔

وہ کیلی فورنیا کے لیے روانہ ہو گیا۔ مغربی ساحل کی طرف جاتے ہوئے وہ دریائے ہڈسن کے کنارے واقع ایک گرجا گھر کو دیکھنے گیا۔ پادری ڈاکٹر ہیری نے اسے گرجا کو دیکھنے میں اس کی رہنمائی کی۔ ڈاکٹر ہیری اس خوب صورت عمارت کو دکھاتے ہوئے اسے ایسی جگہ لے گئے جہاں چند بڑے لوگوں کے مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ یہ افلاطون ہے، یہ گوتم بدھ، یہ کنفیوشس اور وہ اس مجسمے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ یہ خود اس کا مجسمہ تھا۔ اتنے عظیم لوگوں کے ساتھ اس کا مجسمہ! کوئی اور ہوتا تو خوشی سے چلانے لگتا

لیکن وہ صرف اتنا کہہ سکا۔ ''میں تو ابھی بقیدِ حیات ہوں۔ مرنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں۔ ابھی پچھلے سال ہی تو میں نے پچاسویں سالگرہ منائی ہے۔''

''آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کی خدمات کو زندگی میں ہی سراہا گیا ہے۔''

''میں اسے بے جا ظرف داری ہی کہہ سکتا ہوں۔''

وہ گرجا سے باہر آیا تو اس کے قدم اس کا بوجھ اٹھاتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

اسی رات، وہ اور ایلسا تھیٹر دیکھنے گئے۔ انہوں نے جیسے ہی اپنی سیٹیں سنبھالیں فوراً اعلان ہونے لگا۔

''آپ لوگ خوش قسمت ہیں کہ آپ کے درمیان مسٹر آئن اسٹائن اور ان کی بیگم موجود ہیں۔''

اس اعلان کے ساتھ ہی زوردار تالیاں بجنا شروع ہو گئیں۔ وہ حیران تھا کہ پردہ ابھی اٹھا نہیں، پھر یہ تالیاں کیسی۔ ایلسا نے یاد دلایا کہ یہ تالیاں آپ کی موجودگی کا اعلان سن کر بجائی جارہی ہیں۔ اسے اپنی جگہ کھڑے ہو کر اور ہاتھ ہلا کر ان تالیوں کا جواب دینا پڑا۔

تالیاں تھیں کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا تھا۔ بالآخر کئی منٹ بعد تالیوں کا شور کم ہوا اور کھیل شروع ہوا۔

''ایلسا میں نے کہا تھا نا کہ میری پرستش یہاں بھی کی جارہی ہے۔ یہ صورتِ حال میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔''

''آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔'' ایلسا نے کہا۔ ''سائنس داں اور بھی ہیں لیکن لوگ آپ کو ان سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔''

''میں اس شہرت پر ہمیشہ احتجاج کرتا رہوں گا۔''

''تم کتنے عظیم ہو میرے البرٹ۔''

''اب تم بھی پرستش پر اتر آئیں۔'' البرٹ نے کہا اور دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

وہ جس پبلک مقام پر جارہا تھا اسے ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا ہو رہا تھا۔ اس نے چند روز محض ایلسا کی خاطر اس زحمت کو برداشت کیا اور پھر انسٹی ٹیوٹ کی پروفیسر شپ میں خود کو مصروف کرلیا۔

تین ماہ کی خوش گوار یادوں کو ہمراہ لیے برلن آیا۔ یہاں سیاسی حالت دگرگوں تھی۔ وہ ان حالات کے سنبھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ اس انتظار میں جب کئی مہینے گزر گئے اور حالات کے بد سے بدتر ہونے کے آثار نظر آنے لگے تو وہ ایک مرتبہ پھر کیلی فورنیا جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے اپنا پاسپورٹ برلن میں امریکی قونصل کے دفتر میں ویزا کے لیے بھیج دیا۔ اس کے پاس اسپیشل پاسپورٹ تھا۔ ویزا کی مہر لگوانا محض ایک رسمی کارروائی ہوا کرتی تھی۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا لیکن اس مرتبہ ایسا نہیں ہوا۔ قونصل خانے سے فون آیا۔ کل صبح آئن اسٹائن کو ہمارے دفتر بھیج دیا جائے۔

''یہ کیسا حکم ہے۔ کیا انہیں نہیں معلوم کہ یہ آئن اسٹائن کا پاسپورٹ ہے۔''

''شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ میں جا کر دیکھ آؤں گی۔'' ایلسا نے کہا۔

''نہیں، جب مجھے بلایا ہے تو میں ہی جاؤں گا۔''

دوسرے دن صبح ہی سے آسمان پر بادل چھا گئے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ اسی بارش میں بھیگتا ہوا قونصل خانے کے دفتر پہنچ گیا۔ ایک کلرک نے اسے کرسی پیش کی اور اس سے پوچھ گچھ شروع کردی۔

''آپ کس مقصد سے امریکا جارہے ہیں۔''

''کیا آپ کو نہیں معلوم کہ میں کس مقصد سے جاسکتا ہوں۔''

''شاید مجھے معلوم ہو لیکن آپ جو بتائیں گے میں وہی تو لکھوں گا۔''

''میں وہاں سائنس کے موضوعات پر کچھ تقریریں کرنے جارہا ہوں۔ اپنی مرضی سے نہیں آپ کے ملک کی دعوت پر۔''

''آپ کا تعلق کس سیاسی جماعت سے ہے۔''

''میں اس سوال کا جواب دینا حماقت سمجھتا ہوں۔ اس سے تو بہتر یہ ہے کہ میں امریکا کا دورہ منسوخ کردوں۔'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دفتر سے باہر نکل آیا۔

اس کے باہر نکلتے ہی سفارتی حلقوں میں زبردست کھلبلی مچ گئی۔ ''آئن اسٹائن نے دورۂ امریکا ملتوی کردیا ہے۔ وہ ناراض ہو کر قونصل خانے سے نکل گیا ہے۔'' ٹیلی فون کی گھنٹیاں یہ پیغام ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے لگیں۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ چیف قونصل خود آئن اسٹائن کے گھر پہنچ گیا۔ اس کے کمرے میں وضاحت اور معذرت کے الفاظ گونجنے لگے۔ جس کلرک نے سوالات پوچھے تھے چیف قونصل کا خیال تھا اسے واپس امریکا بھیج دیا

جائے گا۔ آیندہ ایسی گستاخی آپ کے ساتھ نہیں ہوگی۔

''آپ کو فوراً ویزا جاری کیا جارہا ہے۔ آپ کو آنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کا پاسپورٹ آپ کے پاس بھیج دیا جائے گا۔'' اس وعدے کے باوجود آئن اسٹائن کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ وہ کھانے کی میز پر بیٹھا اس وقت بھی بڑبڑا رہا تھا۔

''جس ملک کا کلرک مجھ سے مجرموں کی طرح سوال کرے، میں وہاں کیوں جاؤں۔ میں شہرت کا نہ سہی عزت کا طالب ضرور ہوں۔ ویزا لگ کر آگیا تو بھی نہیں جاؤں گا۔ میں یہ دورہ ملتوی کر چکا۔''

ایلسا سمجھ رہی تھی کہ وہ ابھی غصے میں ہے اس سے کوئی بات نہ کی جائے لیکن جب کھانا ختم ہو چکا تو ایلسا نے موقع دیکھ کر اس سے بات کی۔ ''وہ غریب کلرک غلطی کر بیٹھا ہے۔ اسے معاف کردو۔''

''معافی سے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ ایک اصولی فیصلہ ہے کہ میں امریکا نہ جاؤں۔''

''امریکا اسے اپنی بے عزتی سمجھے گا۔''

''سمجھا کرے۔''

''آپ کی ضد سے کہیں اس کلرک کی ملازمت نہ چلی جائے۔ یہ معاملہ دبے گا نہیں۔ اخباروں میں ہنگامہ برپا ہو جائے گا اور اس کلرک کی ملازمت پر بن جائے گی۔''

وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہوگیا۔ اس کے چہرے پر آیا ہوا تناؤ کم ہونے لگا۔ اس کی آنکھیں ایلسا کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''تم ٹھیک کہتی ہو ایلسا۔ میرا غصہ اس کلرک کا نقصان کردے گا۔ تم اخبارات کو یہ خبر پہنچا دو کہ ہمارے دورے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہم کل امریکا روانہ ہورہے ہیں۔''

☆......☆

امریکا میں اس کی ہمیشہ پذیرائی ہوئی تھی۔ اب بھی ہورہی تھی۔ جنوبی کیلی فورنیا میں یونیورسٹی کے احاطے کے نزدیک اسے چھوٹا سا مکان دیا گیا تھا۔ اس کے صحن میں بیٹھ کر وہ سردیوں کے دنوں میں دھوپ سے لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ یونیورسٹی اتنی نزدیک تھی کہ پیدل یونیورسٹی تک جا سکتا تھا۔ امریکیوں کی مہمان نوازی کا وہ پہلے ہی قائل تھا۔

اس نے اس مکان میں چند دن آرام کیا اور پھر وہ ایک دن یونیورسٹی جانے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

اتنے دنوں کے آرام نے کئی نظریات اس کے ذہن میں تخلیق کردیے تھے۔ اب ان پر اسے مزید کام کرنا تھا۔ وہ اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔

یہاں کے جھمیلوں میں اسے فرصت نہیں مل سکتی تھی لیکن وہ فرصت پیدا کررہا تھا۔ اس کے قدردان میزبان ڈنر پارٹیوں میں شامل کرنے کے لیے طرح طرح کے جال بچھاتے تھے لیکن وہ ایلسا کے ذریعے انہیں نرمی سے مایوس کردیتا تھا۔ اس کی ڈاک میں روزانہ بڑی تعداد میں خطوط اور تحائف ہوتے تھے جن میں اسے دیکھنا ہوتا تھا کہ کون سا تحفہ قبول کرنا ہے۔ کس تحفے کو رد کردینا ہے۔ وہ قیمتی تحائف کو اکثر رد کردینے کا قائل تھا لیکن معمولی اور کم قیمت کے تحائف کو خلوص کی نشانی سمجھتا تھا۔

امریکا میں فکروعمل کی وہ آزادی تھی جس کا وہ متلاشی تھا۔ وہ وہاں کے سائنس دانوں کے ساتھ مل کر کام کرتا رہا۔

جرمنی میں سیاسی حالات اس کے خلاف ہوتے جارہے تھے۔ وہ کوئی سیاسی شخصیت نہیں تھا لیکن یہودی ہونا اس کے خلاف جارہا تھا۔ ہٹلر کو بہت زیادہ طاقت حاصل ہو گئی تھی۔ اس نے آسانی سے انتخاب جیت لیا۔

آئن اسٹائن کیلی فورنیا سے برلن لوٹنے کی تیاری کررہا تھا کہ ہٹلر جرمنی کا ڈکٹیٹر بن گیا۔ اب اس کا برلن جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس نے برلن جانے کا فیصلہ موخر کردیا اور نیویارک آگیا۔ یہاں اس کا شاندار استقبال ہوا لیکن آئن اسٹائن کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں صاف دیکھی جاسکتی تھیں۔ اس کا وطن برلن اس سے چھوٹ گیا تھا۔ میں تو محفوظ ہوں لیکن میرے ہم قوموں پر کیا گزر رہی ہو گی۔ یہ دکھ ایسا تھا کہ اپنے استقبال میں بجائی جانے والی تالیاں اسے بری لگ رہی تھیں۔

اس نے اعلان کیا کہ وہ چند دن کے اندر بیلجیئم روانہ ہوجائے گا۔

وہ بحری جہاز میں سفر کررہا تھا کہ اس کے اندیشے اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے۔ اسے بتایا گیا کہ نازی برلن میں اس کے مکان میں گھس گئے۔ تمام قیمتی اشیاء تلف کردیں اور اس کا بینک اکاؤنٹ ضبط کرلیا۔

وہ بیلجیئم پہنچا تو ایک بےزر اور بےگھر شخص تھا جس کا کوئی وطن نہیں تھا۔ اس نے ساحل سمندر پر ایک چھوٹی سی جھونپڑی لے لی اور کام شروع کردیا۔ وہ گھنٹوں ساحل پر بیٹھا رہتا اور اپنی تھیوریوں پر غور کرتا رہتا۔

جرمنی میں اس کے خلاف غم و غصے کے جذبات تھے۔

اس کے بہت سے دوستوں کو قتل کیا جا چکا تھا۔ جرمن اخبارات اس پر وطن دشمنی کے الزامات لگا رہے تھے۔ ایسے مضامین شائع ہو رہے تھے کہ جن میں لکھا ہوتا تھا۔ آئن اسٹائن کو ابھی تک پھانسی پر کیوں نہیں چڑھایا گیا۔

ایلسا تک یہ خبریں پہنچ رہی تھیں اور وہ تشویش میں مبتلا تھی۔ یہ کھٹکا اسے ہمیشہ لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کب کوئی نازی سرحد پار کر کے آئن اسٹائن تک پہنچ جائے۔

بیلجیم کے شاہ اور ملکہ آئن اسٹائن کے گہرے دوست تھے۔ انہیں، جب معلوم ہوا کہ وہ بیلجیم میں ہے اور اپنی ضد کی وجہ سے ساحل کے قریب ہی رہنا چاہتا ہے تو انہیں معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا۔ دونوں ملکوں کی سرحدیں ملتی تھیں لہٰذا آئن اسٹائن کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ شاہ نے جھونپڑی کے نزدیک پہرا بٹھا دیا تاکہ ہر آنے جانے والے پر نظر رکھی جاسکے۔

کئی ممالک کے سربراہوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ آئن اسٹائن پناہ کی تلاش میں ہے اور اس وقت بیلجیم میں ہے اور جرمنی سے قریب ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ اس کے لیے غیر محفوظ ہے۔ اسے مختلف ملکوں اور اداروں کی طرف سے پیش کش ہونے لگی کہ وہ ان کے پاس آکر پناہ لے سکتا ہے۔ اسے تمام آسائشیں مہیا کرنے کے وعدے کیے جا رہے تھے۔ اس نے بہت غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ امریکا میں سکونت اختیار کرے گا۔

نیو جرسی کے پرنسٹن شہر میں ایک انسٹی ٹیوٹ کی تنظیم کی جا رہی تھی۔ یہ ایک ایسا ادارہ تھا جہاں سائنس داں کسی مداخلت کے بغیر تحقیقی کام کر سکتے تھے۔ یہ ایک پرائیویٹ ادارہ تھا جسے ایک امیر خاندان چلا رہا تھا۔ جس وقت اس کی تنظیم کی جا رہی تھی آئن اسٹائن نے مالکان سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اس ادارے کو اپنی جز وقتی خدمات مہیا کرے گا یعنی سال میں کچھ وقت یہاں رہے گا اور باقی وقت برلن میں گزارے گا۔ اب برلن جانے کا سوال نہیں تھا لہٰذا اس نے منتظمین سے بات کی اور کل وقتی خدمات پیش کر دیں۔

بورڈ نے اس کی پیشکش قبول کی اور وہ مستقل سکونت کے لیے یورپ سے امریکا روانہ ہو گیا۔

وہ نہایت رازداری سے روانہ ہوا۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ کب روانہ ہوا اور کہاں کے لیے۔ اس کی زندگی کو خطرہ تھا لہٰذا یہ رازداری ضروری تھی۔ اس کا جہاز بیچ سمندر میں

اللہ کا ذکر نفسیاتی امراض

کے لیے بہترین علاج

ہالینڈ کے ماہر نفسیات کا کہنا ہے کہ لفظ اللہ کا ذکر افسردگی اور ذہنی تناؤ کے شکار مریضوں کے لیے بہترین علاج ہے۔ ڈچ پروفیسر گزشتہ تین برسوں سے مریضوں پر تجربے کر رہے تھے۔ ان میں بیشتر مریض غیر مسلم تھے جب انہیں لفظ اللہ صاف طور پر بولنے کی تربیت دی گئی تو اس کا غیر معمولی نتیجہ برآمد ہوا۔ ماہر نفسیات کے مطابق اللہ کا ہر حرف نفسیاتی امراض میں موثر ہے۔ پہلا حرف الف نظام تنفس سے خارج ہوتا ہے اور سانس کو کنٹرول میں رکھتا ہے۔ حرف ل کی ادائیگی سے سانس کے تناؤ کو عافیت ملتی ہے اور حرف ہ سے پھیپھڑے اور دل کا رابطہ ہوتا ہے جو دل کی دھڑکن کو کنٹرول کرتا ہے۔ جو مسلمان بلا ناغہ قرآن مجید کی تلاوت اور ذکر اللہ کرتے ہیں وہ خود کو نفسیاتی بیماریوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

(بحوالہ: سکون قلب)

مرسلہ: طالب حسین طلحہ
نیو سینٹرل جیل، ملتان

کھڑا تھا۔ اسے ایک کشتی کے ذریعے جہاز تک پہنچا دیا گیا۔

خلیج نیویارک میں ایک اور کشتی اسے جہاز سے اتار کر ساحل کے ایک خفیہ مقام پر لے گئی۔ اس مقام پر ایک کار اس کی منتظر تھی۔ اس کا انجن اسٹارٹ تھا۔ آئن اسٹائن اور ایلسا کے بیٹھتے ہی اس کار نے فراٹے بھرے اور اسے پرنسٹن پہنچا دیا جہاں ایک شاندار مکان، فرنیچر سے آراستہ اسے نئی زندگی کا پیغام دے رہا تھا۔

یہ چھوٹا سا سفید گھر سڑک کے کنارے بنے ہوئے دوسرے گھروں سے مختلف نہیں تھا۔ کمروں کی ہر کھڑکی سے گھر میں لگا ہوا باغ نظر آتا تھا۔ مکان میں ہر وقت خاموشی طاری رہتی تھی۔ یہ وہی تنہائی تھی جس کا وہ ہمیشہ سے طالب رہا تھا۔ اس کی پچھلی زندگی لوٹ آئی تھی۔ ہر صبح پیدل شہر کے آخری سرے کی طرف چل دیتا تھا۔ کسی خوف اور

خطرے کے بغیر۔ مکان ختم ہونے اور ایک میدان سے گزرنے کے بعد انسٹی ٹیوٹ تھا جہاں اس کا دفتر تھا۔ اس کی فرمائش پر یہاں سادہ سا فرنیچر رکھا گیا تھا۔ وہ اکثر تنہا ہی کام کرتا تھا۔ کبھی کبھی ایک دو معاون بھی اس کی مدد کے لیے شامل ہو جاتے تھے۔ فزکس کے کچھ طلبہ آ جاتے تھے جن سے خطاب کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل ہوتا تھا۔

وہ یہاں پُرسکون زندگی گزار رہا تھا لیکن اسے وہ دوست یاد آتے تھے جنہیں وہ برلن میں چھوڑ آیا تھا۔ وہ مظالم کی ان خبروں سے فکرمند تھا جو اس کے وطن سے اس تک پہنچ رہی تھیں۔ جو لوگ برلن سے بھاگ کر دوسری جگہوں پر چلے گئے تھے وہ اس سے مدد کے طالب رہتے تھے اور وہ ان کی مدد کر رہا تھا۔ کبھی مالی طور پر کبھی سفارش کے ذریعے۔

اس کی زندگی پُرسکون تھی لیکن ابھی اس دریا میں کچھ ارتعاش باقی تھا۔ اس کی نگراں، اس کی مخلص، اس کی بیوی، اس کی چچازاد، اس کی دوست، اس کی سب کچھ چند روز بیمار رہ کر انتقال کر گئی۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھا تھا اور پچھلی زندگی کا ایک ایک ورق پلٹ رہا تھا۔ وہ بار بار آنسو پونچھ رہا تھا۔ اس کے احباب جمع ہو گئے تھے جو اسے تسلی دے رہے تھے لیکن ان کے الفاظ کتنے بے وقعت تھے انہیں کیا خبر تھی کہ وہ خود مر گیا ہے۔

ایلسا کو قریبی دیہات کے ایک قبرستان میں دفن کر دیا گیا جہاں وہ ایلسا سے ملنے روز جایا کرتا تھا۔

بظاہر ایسا لگتا تھا کہ وہ بالکل ٹوٹ چکا ہوگا اور حقیقت بھی یہی تھی۔ وہ اب تک ایلسا کے سہارے چل پھر رہا تھا۔ چلنا بھول سکتا تھا لیکن وہ چلنا نہیں بھولا۔ چند روز بعد ہی لوگوں نے دیکھا کہ ایک شخص جس نے ڈھیلی ڈھالی نیکر، ربڑ کے تلووں والے جوتے اور ایک پرانی قمیص پہن رکھی ہے تیز ہوا میں اس کے الجھے ہوئے بال مزید الجھ رہے ہیں۔ وہ چہل قدمی کے لیے نکلا ہے اور اس وقت سڑک پار کر رہا ہے۔ یہ البرٹ آئن اسٹائن ہے۔

ایک دن اسے لوگوں نے ایک کنسرٹ میں دیکھا۔ کچھ لوگوں نے اسے ایک مقامی سنیما گھر میں دیکھا۔ وہ یہاں فلم دیکھنے آیا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ایلسا کا غم بھلانے کے لیے ان تفریحات میں شریک ہو رہا ہے۔ ان دنوں وہ میونخ کے ایک اسکول میں بیٹھا ہوا بچہ نظر آ رہا تھا۔ چپ چاپ، سہما ہوا، خوف زدہ۔ جیسے ابھی پچھلی صفوں سے آواز آئے گی۔ ''سست کہیں کا۔''

وہ کسی حال میں بھی ہو کام سے غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ جلد ہی ایلسا کو بھلا کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ ایلسا اس کی سیکریٹری بن کر اس کے ساتھ تھی اور اب وہ نہیں تھی۔ اس نے اپنی دیکھ بھال کے لیے ایک سیکریٹری رکھ لی۔ مکان میں ہر وقت خاموشی چھائی رہتی۔ صرف اس کی سیکریٹری وہاں تھی جو اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتی۔ اس کی نگرانی کرتی۔ اس کی ڈاک دیکھتی، فون اٹینڈ کرتی اور اسے یاد دلاتی رہتی کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھے۔

وہ اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ دو اشخاص اس سے ملنے آئے۔ یہ دونوں سائنس داں تھے اور یورپ سے آئے تھے۔ وہ اسے ایک ایسی تحقیق کے بارے میں بتانے آئے تھے جو ایٹم میں بند بے پناہ قوت کو بروئے کار لانے کے امکان کا راستہ دکھاتی تھی۔ آئن اسٹائن کو بتانا اس لیے ضروری تھا کہ انہوں نے یہ تجربات آئن اسٹائن ہی کے نظریات کی روشنی میں کیے تھے۔ انہوں نے اس کا شکریہ بھی ادا کیا۔

''آپ کے بعض نظریات جو رسالہ ''ڈرفزک'' میں شائع ہوئے تھے اگر وہ ہمارے سامنے نہ ہوتے تو ہم ہرگز اس نتیجے پر نہ پہنچتے۔''

''چلو اچھا ہوا۔ میرا نظریہ کسی کے کام تو آیا۔ تحقیق جاری رکھو۔ میں تم پر اپنے نظریات کی چوری کا الزام نہیں دھروں گا۔'' آئن اسٹائن نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں جناب! ہم اپنی بات آپ کو سمجھا نہیں سکے۔ بات بہت تشویش ناک ہے۔ جرمن سائنس دانوں پر بھی آپ کے نظریات کی افادیت ظاہر ہو گئی ہے۔ اگر وہ اسے عملی جامہ پہنا کر ایٹمی قوت بن گئے تو یہ نازی عذاب بن جائیں گے۔''

''تو بننے دو۔ وہ تو ویسے بھی عذاب ہیں۔''

''جناب! یہ یہودیوں کی بقا کا سوال ہے۔ اگر نازی ایٹمی قوت بن گئے تو یہودی کہیں بھی نہیں رہ سکیں گے۔''

وہ دونوں سائنس داں یہودی تھے اور آئن اسٹائن بھی۔ وہ متعصب نہیں تھا لیکن فطری طور پر یہودیوں کے لیے اپنے دل میں گنجائش رکھتا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر ان سے مخاطب ہوا۔

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''ہم یہ چاہتے ہیں کہ امریکا اس میں پہل کرے۔

امریکا سے پہلے اگر جرمنی ایٹمی قوت بن گیا تو بڑی تباہی ہوگی۔"

"اگر ایسا ہے تو تمہیں میری بجائے حکومت امریکا سے بات کرنی چاہیے۔"

"آپ نے درست کہا لیکن حکومت تک ہماری رسائی کہاں۔ اگر آپ صدر روز ویلٹ کو خط لکھ دیں یا ان سے ملاقات کریں تو وہ اس منصوبے پر توجہ دیں گے۔"

آئن اسٹائن اب بھی ہچکچا رہا تھا لیکن ملاقاتیوں کے زور دینے پر وہ تیار ہوگیا۔ اس نے میز کی دراز سے لیٹر پیڈ نکالا اور صدر امریکا کے نام خط لکھ دیا۔

یہ خط نہایت خفیہ طریقے سے صدر تک پہنچا دیا گیا اور ہمیشہ خفیہ رہا۔

یہ خط محض خط نہیں تھا۔ ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ ایٹمی دور کا آغاز۔

ایٹمی قوت کی دریافت کے کام کا آغاز ہوگیا۔ اس دریافت سے آئن اسٹائن کا براہِ راست تعلق نہیں تھا لیکن بہرحال یہ کام شروع اس کے خط سے ہی ہوا۔

امریکی زندگی میں بظاہر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ زندگی اسی طرح رواں دواں تھی لیکن اندر ہی اندر ایک ہیجان انگیز کارروائی جاری تھی۔ حکومت ایک خوفناک تبدیلی کے حصار میں تھی۔

اس منصوبے پر مہینوں کام ہوتا رہا۔ پھر ایک روز اسے نیویارک بلالیا گیا۔ یہ دورہ نہایت خفیہ رکھا گیا تھا۔ اسے بھی تاکید تھی کہ کسی کو کچھ نہ بتائے اور کسی کو اپنے ہمراہ نہ لائے۔

وہ اس سفر پر اکیلا ہی روانہ ہوا تھا لیکن اتفاق سے اس کا ایک معاون اسے راستے میں مل گیا جو اس سفر کا گواہ بن گیا۔

یہ گواہ وہ بھی نہیں دے سکتا تھا کہ آئن اسٹائن کس کام میں مدد کے لیے نیویارک جارہا ہے۔

☆......☆

جنگ عظیم دوم عروج پر تھی۔ جرمنی اور اس کے اتحادی آگے بڑھتے جارہے تھے کہ اگست 1945ء کے ایک دن جاپان کے ایک شہر ہیروشیما پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ایک چندھیا دینے والی روشنی ہوئی۔ پھر زمین پر ایک گرج دار آواز پیدا ہوئی۔ پھر زندگی نام کی ہر چیز موت میں تبدیل ہوگئی۔ بلند و بالا عمارتیں کھلونوں کی طرح اڑ گئیں۔ زمین گرد و غبار بن کر ہوا میں منتشر ہوگئی۔ دو لاکھ زندگیاں چشم زدن میں جھلس کر ختم ہوگئیں۔ اس سے پہلے اتنی بڑی تباہی کسی نے نہیں دیکھی تھی نہ کوئی تصور کرسکتا تھا کہ کوئی ایسا ہتھیار بھی ہو سکتا ہے جو چند سیکنڈ میں اتنی بڑی تباہی لاسکتا ہے۔

یہ وہ بم تھا جو امریکا نے جاپان پر گرایا تھا۔ ایٹم بم۔ دنیا ابھی اس سے ناواقف تھی لیکن امریکا نے اسے تیار کرلیا تھا۔

آئن اسٹائن اپنی مطالعہ گاہ میں پُرسکون بیٹھا کسی کتاب کا مطالعہ کررہا تھا کہ یہ خبر اس تک پہنچی تو اس نے گھبرا کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ باغیچے میں پھول ہوا کی تھپکیاں کھا کر سر ہلا رہے تھے۔ اس نے اپنے منہ میں دبا ہوا پائپ نکالا اور دیوار پر دے مارا۔ یہاں زندگی ہنس رہی ہے اور وہاں زندگی ختم ہوگئی۔ وہ دوبارہ اپنی کرسی پر گر گیا۔ اس کا قصوروار میں بھی ہوں۔ میرے نظریات ہی نے ایٹمی قوت کے بارے میں تحقیق کی راہ کھول دی تھی۔ نہ میں یہ نظریہ تخلیق کرتا نہ یہ دن دیکھتا۔ ڈی روز ویلٹ کے نام میرے خط ہی نے امریکا کو بم تیار کرنے پر راغب کیا تھا۔ اس نے اپنا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ میرا نظریہ تو زمان و مکاں، مادہ اور توانائی کے باہمی رشتوں سے متعلق تھا۔ میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ اس سے انسانوں کی تباہی کا کام لیا جائے۔ اگر امریکا نے یہ بم تیار کرہی لیا تھا تو اسے کسی ویران جگہ پر گرا کر دنیا کو بتا سکتا تھا کہ اس کے پاس ایسا موذی ہتھیار ہے۔ اسے انسانوں پر گرانے کی کیا ضرورت تھی۔ اب یہ فارمولا دنیا کے دوسرے ممالک تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ پھر بتاؤ دنیا کی کیا حالت ہوگی۔

وہ اپنی آرام کرسی پر اس طرح پڑا تھا جیسے مردہ ہو۔ اس کی سیکریٹری کئی مرتبہ اسے دیکھ کر جاچکی تھی۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ وہ کسی موضوع پر غور کررہا ہے۔ اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں لیکن اب کھانے کا وقت ہوگیا تھا۔ وہ ڈرتے ڈرتے اس کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ آئن اسٹائن آنکھیں کھول کر اس کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی لیکن اس کی آواز ساتھ نہ دے سکی۔ وہ اسے یہ کیسے بتاتا کہ اس تباہی کا ایک کردار وہ بھی ہے۔ اس راز کو خفیہ ہی رہنا چاہیے۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور سیکریٹری کے کہنے سے کھانے کی میز پر چلا گیا۔

وہ کھانے کی میز پر آگیا تھا لیکن اس کا ذہن ابھی تک الجھا ہوا تھا۔ اس نے جلدی جلدی کھانا ختم کیا اور آرام

کرنے کے کمرے میں چلا گیا۔ اس کا ذہن ایک مرتبہ پھر جاپان میں ہونے والی تباہ کاریوں کی طرف چلا گیا۔ اب بھی ہوسکتا ہے کہ میں جب تک زندہ رہوں ایٹمی قوت کے غلط نتائج کی طرف توجہ دلاتا رہوں۔ انسانی ذہنوں کو رضامند کرسکوں کہ وہ اس عظیم قوت کو صرف نیک مقاصد کے لیے استعمال کرسکیں۔

☆......☆

اب وہ اپنی احتیاط خود کررہا تھا۔ کوشش کررہا تھا کہ اس کے نظریات اس کی تعلیمات عام لوگوں تک نہ پہنچ سکیں۔ عام لوگوں سے اس کی مراد غیر ذمہ دار سائنس داں تھے اور حال یہ تھا کہ وہ جب اپنی کسی تھیوری کی تشریح کے لیے اپنے شاگردوں کو لیکچر دینا چاہتا تو پریشان کرنے والے لوگوں کا ہجوم لگ جاتا اور جو اس کے لیکچر کو واقعی سمجھ سکتے تھے ان کے لیے جگہ بھی باقی نہ رہتی۔ اس نے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ میں یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھ دیا اور منوا لیا کہ بلیٹن بورڈ پر لکھ کر اس کے لیکچر کا اعلان نہ کیا جائے۔ اس سے اس کے کام میں حرج پڑتا ہے اور سائنس غیر سائنسی لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے۔

اس دن کے بعد سے یہ خبر چپکے سے اہل طلبہ تک پہنچا دی جاتی تھی یا چند خاص خاص آدمیوں کو ٹیلی فون کردیا جاتا تھا۔ فون پر بھی صرف اتنا کہا جاتا ”آج تین بجے دوپہر“۔ سمجھنے والے سمجھ جاتے اور کمرا صرف ان آدمیوں سے بھرتا جو وہاں بیٹھنے کے مستحق ہوتے۔ وہ مقررہ وقت پر وہاں پہنچتا تختہ ریاضی پر چند اشکال کھینچتا اور پھر فزکس ماہرین کی مخصوص زبان میں ان اشکال کی تشریح کرنے لگتا۔

اس کا لیکچر سننے والوں میں سینئر طلبہ ہوتے، یا نواحی یونیورسٹیوں کے سرکردہ سائنس داں۔

لیکچر ختم ہونے کے بعد وہ خاموشی سے باہر نکل جاتا۔ ایک شخص آتا اور تختہ سیاہ کے پیچ کھول کر اسے نیچے اتارتا اور ایک خاص کیمیاوی مادہ چھڑکتا تاکہ چاک سے لکھی گئی اشکال اور الفاظ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوجائیں اور اس عظیم سائنس داں کی یادگار بن کر ہمیشہ زندہ رہیں۔

یہ تھی ایک ترقی یافتہ ملک میں اس ہیرو کی قدر ومنزلت۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے وہ کمزور ہوتا گیا۔ اگلے دس برسوں تک وہ سائنس دانوں کی تربیت میں مصروف رہا۔ بڑھتی ہوئی عمر اور کام کی زیادتی نے اسے ناتواں کردیا تھا۔ اب لیکچر دیتے ہوئے اس کی آواز اتنی دھیمی ہوتی تھی کہ سامعین بڑی مشکل سے سن پاتے تھے۔

ڈاکٹروں نے اسے ہدایت کردی کہ جیسے ہی سردی کا آغاز ہو وہ سر پر اونی ٹوپی پہننا شروع کردے۔ اکیلے گھر سے نکلنے کو منع کردیا لہٰذا چہل قدمی کے لیے نکلتا تو اس کا کوئی نہ کوئی معاون اس کے ساتھ ہوتا۔

1955ء میں وہ اتنا کمزور ہوگیا تھا کہ کئی کئی دن گھر سے نکلنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اس کا جھریوں بھرا چہرہ اپنی اس بے بسی پر افسردہ رہنے لگتا تھا۔ یقیناً ان دنوں وہ اپنی تھیوریوں پر نہیں اپنے ماضی پر غور کرتا رہا ہوگا۔

اسی سال اس کا جنم دن منایا گیا۔ یہ مارچ کا مہینا تھا۔

وہ اپنی مطالعہ گاہ تک محدود ہوگیا۔

اس کی کمزوری اتنی بڑھی کہ اس کے ڈاکٹروں کو تشویش ہونے لگی۔ وہ اسپتال میں داخل ہونے سے بچتا تھا لیکن اب اسے اس کی مرضی پر نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ اسے پرنسٹن اسپتال پہنچا دیا گیا۔ فوری علاج سے کچھ بہتری آگئی۔ ملاقات کے لیے آنے والوں سے بات چیت بھی کرنے لگا۔ اس عزم کا اظہار بھی کرنے لگا کہ اسپتال سے جاتے ہی وہ اپنے کام میں لگ جائے گا۔ اس مرتبہ کچھ ایسے راز منکشف کرے گا کہ دنیا حیرت زدہ رہ جائے گی۔

ڈاکٹروں کو بھی اُمید ہو چلی تھی کہ اب وہ سنبھل گیا ہے۔

18 اپریل 1955ء کو آدھی رات کے بعد نرس اس کے سرہانے کھڑی تھی۔ اس نے دیکھا کہ سوتے میں اس کی سانس الجھ رہی ہے۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہورہی ہے۔ وہ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے دروازے کی طرف بھاگی لیکن راستے ہی سے پلٹ آئی۔ وہ سوتے میں کچھ کہہ رہا تھا اس نے قریب آکر سننا چاہا۔ وہ جرمن زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ نرس کے لیے یہ الفاظ اجنبی تھے۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ خدا جانے وہ کیا کہہ رہا تھا۔ کس کو یاد کررہا تھا۔ دل کی بات دل ہی میں لے کر چلا گیا۔ اس کی بہت سی باتیں دنیا کی سمجھ میں نہیں آئی تھیں آخری بات بھی کوئی نہ سمجھ سکا۔

جب تک ڈاکٹر آتا، وہ مرچکا تھا!!

ماخذات: آئن اسٹائن

ترجمہ و ترتیب: اوپی نامی

سوعظیم آدمی: مترجم عاصم بٹ

لاکھوں بیانات میں سے چند ایک کا ذکر

خون کے آنسو

انور فرحان

16 دسمبر... وہ سانحہ ہے جس نے ظلم کی انتہا کو چھولیا ہے۔ اس سانحے پر خاموش رہنا بھی ظالمین کی اقتدا ہے۔ ہر سطح پر اس ظلم کی مذمت ضروری ہے۔ کیونکہ حملہ وطن دشمنوں نے ہمارے مستقبل پر کیا ہے۔ یہ ننھے ننھے پھول وطن کے لیے بہت کچھ کرتے۔ ملک کی بقا و سلامتی کے لیے، تعمیر و ترقی کے لیے اپنا حصہ ڈالتے مگر ان ظالمین نے ان کی زندگی کے چراغ گل کرکے ہمارے مستقبل کو تاریک کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم پر ڈھائے گئے اس ظلم پر پوری دنیا نے افسوس ظاہر کیا ہے ہمارے درد کو کم کرنے کے لیے الفاظ کا مرہم رکھا ہے۔

16 دسمبر 2014ء کو دن کے گیارہ اور ساڑھے گیارہ کے درمیان جدید آتشیں اسلحوں سے لیس سات دہشت گردوں نے پشاور کے آرمی پبلک اسکول میں گھس کر ننھے، کمزور اور معصوم طالب علموں کو اپنی گولیوں اور بموں کا نشانہ بنا کر جس درندگی کا مظاہرہ کیا، اس نے پوری دنیا کو دہلا کر رکھ دیا ہے۔ انسان نما درندوں نے جس بربریت کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی بھرپور مذمت ہر اس شخص نے کی ہے جس کے سینے میں درد مند دل ہے۔ بچے تو ہمارے ہوں، آپ کے ہوں یا کسی کے بھی ہوں، ہر کوئی ان سے پیار کرتا ہے کیوں کہ بچے تو پھول ہوتے ہیں اور پھول گلے کا ہار ہوتے ہیں۔ گھر کی خوب صورتی اور سنگھار ہوتے ہیں۔ بربریت کا شکار ہونے والے ان پھولوں کی قبروں پر پھولوں کی برسات دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹ گیا۔ صاحب اولاد ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ درندگی کا شکار ہونے والے پھول سے بچوں کے والدین پر کیا قیامت گزری ہوگی۔

134 بچوں اور اساتذہ کی شہادت پر جہاں پاکستان میں تین روزہ سوگ منایا گیا وہاں ترکی میں بھی سوگ کے لیے ایک دن وقف کردیا گیا۔ دیگر ممالک کے سربراہان نے بھی اس سانحے پر اپنے گہرے دکھ کا اظہار کیا اور وزیراعظم میاں محمد نواز شریف کو ٹیلی فون کرکے بتایا کہ دہشت گردی کی اس بزدلانہ کارروائی کی وہ بھرپور مذمت کرتے ہیں اور حکومتِ پاکستان اور پاکستانی عوام کے دکھ میں برابر کے

شریک ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل بان کی مون نے بھی اس بربریت کی مذمت کی اور متاثرین سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ پوپ پال نے بھی گرجا گھر میں شہید بچوں کے درجات کی بلندی اور لواحقین کے لیے صبرِ جمیل کی دعاؤں کا اہتمام کیا۔ دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں میں بھی دنیا بھر میں دعائیں کرائی گئیں۔ بھارت نے اپنے تمام سیاسی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اپنے لوک سبھا میں اس دہشت گردی کے خلاف قراردادِ مذمت پاس کرائی۔ جب کہ بھارت کے تمام اسکولوں میں طلبہ نے دو منٹ کی خاموشی اختیار کر کے، پشاور کے آرمی پبلک اسکول کے تمام شہید طالب علموں سے ہمدردی اور یک جہتی کا ثبوت دیا۔

ان سارے واقعات کی تفصیل پر جانے کی بجائے میں اس وقت اس حساس موضوع پر سب سے زیادہ حساس طبقہ کے احساسات و جذبات کی تفصیل بیان کروں گا۔ یہ طبقہ آرٹسٹوں اور فنکاروں کا ہے۔ شوبز کے تمام شعبوں سے وابستہ لوگوں کے دلوں پر اس سانحۂ عظیم سے کیا قیامت گزری اور اس کا اظہار انہوں نے کس طرح کیا یہ سب کچھ آپ کو بتاؤں گا۔

پاکستانی شوبز سے تعلق رکھنے والے فنکاروں اور دیگر متعلقہ افراد نے اس سانحۂ عظیم پر اپنے غم و غصے کا بھرپور اظہار کیا۔ فلم اور ٹی وی کے نامور اداکار طلعت حسین نے آرٹس کونسل کراچی میں منعقد ہونے والے مذمتی اجلاس میں اپنے گہرے دکھ کا اظہار کیا۔ اس دوران انہوں نے یہ بھی کہا۔ ''آج جو حالات پاکستان کے ہیں ایسے کبھی نہیں تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں حکومت نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ دہشت گردی کے طوفان کو روکنے میں حکام بری طرح ناکام ہیں۔''

کراچی کے آرٹس کونسل کے انعقاد پذیر مذمتی اجلاس میں سینئر فلم اور ٹی وی آرٹسٹ منور سعید نے کہا۔ ''بچے ہمارا سرمایہ ہیں۔ ہم ان میں اپنا مستقبل تلاش کرتے ہیں مگر افسوس کہ ہم انہیں بھی تحفظ دینے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ کیا یہ ہماری شرمندگی کا باعث نہیں کہ ہمارے تعلیمی ادارے بھی دہشت گردی سے محفوظ نہیں؟''

فلم اور ٹی وی سے وابستہ در اسٹائل اداکار ایوب کھوسو نے پشاور اسکول کے المناک سانحے پر اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اپنی زندگی میں اس سے بڑا اور برا سانحہ نہیں دیکھا۔ آخر ان معصوم بچوں کا کیا قصور تھا جو اپنے گھروں سے تعلیم حاصل کرنے اسکول گئے تھے۔ دہشت گردی کا بھلا یہ کیا انداز ہے کہ بڑوں کا انتقام بچوں سے لیا جائے؟ یہ کیسے مسلمان ہیں؟ انہیں مسلمان تو کیا آدم کی اولاد کہنا بھی انسانیت کی توہین ہے۔''

ٹی وی کے معروف اداکار فواد خان جنہوں نے بھارتی فلم ''خوب صورت'' سے عالمگیر شہرت حاصل کی۔ انہوں نے پشاور اسکول کے سانحے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس سانحے پر گہرے دکھ اور صدمے کی حالت میں ہوں۔ اسکول کے معصوم بچوں کا قتلِ عام وحشیانہ درندگی ہے۔ اس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ میری دعائیں ان کے غمزدہ والدین کے ساتھ ہیں۔ رحیم و کریم اللہ انہیں صبرِ جمیل عطا فرمائے۔''

معروف فلمساز و ہدایت کار اور ویژول افیکٹ کری ایٹر سعید رضوی نے سانحۂ پشاور پر اپنے صدمے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''پشاور میں معصوم بچوں کی شہادت ایک بدترین سانحہ ہے۔ درندہ صفت دہشت گردوں نے جس سفاکی سے بچوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا ہے اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ کوئی انسان کبھی ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ یہ کون لوگ ہیں جنہیں معصوم جانوں پر بھی رحم نہیں آیا۔ یہ بچے ہمارا مستقبل تھے۔ ہماری نسلوں کو ختم کرنے کی سازش کی جارہی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ درندہ نما ان لوگوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے اس مقصد کے لیے ہم سب کو اپنے تمام اختلافات بھلا کر متحد و متفق ہو جانا چاہیے۔''

عتیقہ اوڈھو کا دل پشاور سانحے سے دہل کر رہ گیا۔ انہوں نے پشاور کے آرمی پبلک اسکول کے معصوم طالب علموں پر بے رحم دہشت گردوں کے حملے پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کیا کہوں مارے صدمے کے مجھ سے تو بولا بھی نہیں جارہا ہے۔ اس واقعے نے میرے دل کو اس طرح دہلا کر رکھ دیا ہے کہ میرا دماغ بھی گویا ماؤف ہو گیا ہے۔''

اداکارہ ماہرہ خان نے چھوٹے چھوٹے تابوتوں میں اسکول کے معصوم بچوں کی میتیں جاتے دیکھ کر اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا۔ ''تابوت جتنے چھوٹے ہوتے ہیں اتنے ہی بھاری ہوتے ہیں۔ انہیں اٹھانے والے ہی نہیں، انہیں دیکھنے والے بھی ان کے بوجھ سے دبے جاتے ہیں۔ وہ بچے جو اسکول میں علم کی روشنی حاصل کرنے گئے تھے انہیں موت کے اندھیرے میں دھکیلنے والے بزدل اور نفرت انگیز ہیں۔

ان کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔"

معروف پاکستانی گلوکار شفقت امانت علی نے دہشت گردی کے اس المناک سانحے پر اپنے احساسات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "کوئی مذہب دہشت گردی اور بربریت کی اجازت نہیں دیتا۔ جن دہشت گردوں نے یہ خونی کھیل کھیلا ہے ان کا کوئی مذہب نہیں۔ جو مذہب سے برگشتہ ہوتے ہیں، وہ اللہ کے نافرمان بندے ہوتے ہیں۔ اللہ ان کی طرف نہیں ہوتا۔ دنیا کے مستقبل کو مارنا اللہ نے نہیں سکھایا۔ اس لیے اللہ کا عذاب ان پر ضرور نازل ہوگا۔"

صدارتی ایوارڈ یافتہ گلوکارہ شاہدہ منی نے اس سانحۂ عظیم پر اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا "پشاور کے اسکول میں ہونے والے سانحے کے بعد میں کئی دنوں تک سو نہیں سکی۔ شہید ہونے والے میرے اور اس قوم کے بچے تھے۔ اب وقت آگیا ہے کہ وطن عزیز کو دہشت گردوں سے پاک کر دیا جائے۔ ملک کو درپیش اندرونی اور بیرونی خطرات سے نمٹنے کے لیے تمام سیاسی قوتوں کو متحد ہونا پڑے گا۔ پاکستان کی بقا اور سالمیت آپس کے اتحاد و اتفاق میں ہے۔ اس طرح کے واقعات کے بعد لوگوں میں خوف و ہراس پھیلتا ہے۔ اب ہماری سیاسی اور عسکری قیادت کو پوری قوت کے ساتھ ان درندہ صفت دہشت گردوں سے نمٹنا ہوگا۔ پوری قوم اپنی پاک فوج کے ساتھ ہے۔"

لاہور میں فلم انڈسٹری کے زیر اہتمام تعزیتی اجلاس ہوا اس میں سجاد بگٹی، چودھری اعجاز کامران، مسعود بٹ، قیصر ثناء اللہ، جونی ملک، پرویز رانا، نسیم حیدر شاد، سعید رانا، صنم بٹ، عاکف ملک، زیڈ اے زلفی اور اداکارہ ریشم سمیت درجنوں فلم والوں نے شرکت کی۔ اس موقع پر فاتحہ خوانی کی گئی اور شہداء کو خراج عقیدت پیش کیا گیا اور ان کی یاد میں شمعیں روشن کی گئیں۔ مقررین نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "بچوں پر ظلم و بربریت کی انتہا کی گئی ہے۔ دہشت گرد بزدل اور گھٹیا لوگ ہیں۔ جنہوں نے بے گناہ معصوم طالب علموں اور اساتذہ کو بے دردی کے ساتھ قتل کردیا۔ حکومت اور سیاست دانوں کو اکٹھے ہوکر دہشت گردی کا خاتمہ کرنا چاہیے۔"

اس نوع کی دیگر مذماتی اور تعزیتی تقریبات کا اہتمام بھی لاہور میں کیا گیا جن میں سید نور، صائمہ، جاوید شیخ، مصطفیٰ قریشی، علی ظفر، نعمائمہ ملک، خوشبو، عائشہ خان، ماریہ خان، مہوش حیات، عرفان کھوسٹ، کاشف محمود، شامل خان، احسن خان، مہرین راحیل، شیبا بٹ، یمی راحیل، فردوس جمال، اسد، فاروق مینگل، آمنہ الیاس، صبا قمر، اقراء، کرن حق، جاناں ملک، عذرا آفتاب، ثوبیہ خان، عائشہ خان، امین اقبال، سہیل سمیر، عظیم سجاد اور گلوکار عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی، جواد احمد، علی حیدر، انور رفیع، علی عظمت، فاخر، سجاد علی۔ حامد علی خان، ندیم عباس، گلوکارہ سائرہ نسیم، ترنم ناز، شازیہ منظور نے اپنے گہرے دکھ کا اظہار کیا۔

لاہور کے اسٹیج فنکاروں نے بھی اپنے گہرے دکھ اور افسوس کا اظہار کیا۔ پروڈیوسر حنیف، اداکار عابد کشمیری، سخاوت ناز، ظفر ارشاد، حسن مراد، گوگا جی، طاہر نوشاد اور دیگر نے اپنے بیان میں کہا۔ "اس سانحے پر ہمارا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ دہشت گردوں کو سزائے موت سے بھی کوئی بڑی سزا دی جاتی تو وہ بھی کم ہوتی۔"

پشاور کے آرمی پبلک اسکول کے المناک سانحے پر کراچی کے تھیٹر اور ٹیلی ویژن کے جن فنکاروں، ہدایت کاروں اور دیگر متعلقہ افراد نے شدید الفاظ میں مذمت کی اور بچوں کو بے دردی کے ساتھ گولیوں اور بموں کا نشانہ بنانے والے دہشت گردوں کو نشان عبرت بنانے کا مطالبہ کیا' ان میں قیصر خان نظامانی، شکیل صدیقی، رؤف لالہ، عرفان ملک، علی حسن، حنیف راجا، ماجد جہانگیر، سید فرقان حیدر، اقبال موٹلانی، خادم حسین اچوی، خالد ظفر، خالد سلیم موٹا، نعیمہ گرج، حسن جہانگیر، فرید خان، سلیم آفریدی، ایاز خان، اسلم شیخ، انور اقبال، ایم ابراہیم، عارف مہدی، اسلم محمود، عزیز بیجونواز، ولی شیخ، سلیم جاوید، ڈاکٹر مستانہ، شہزاد عالم، نذر حسین، مہتاب شاہ، ایم ایوب، پرویز صدیقی اور سلومی کے نام قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے اپنے مذمتی بیانات میں جو کچھ کہا اس کا لب لباب یہ ہے کہ ہم دہشت گردوں کی بزدلانہ کارروائی کی جتنی بھی مذمت کریں کم ہے۔ ایسے درندہ صفت افراد کو پاکستان ہی نہیں پوری دنیا سے نیست و نابود کردینا چاہیے۔ ہم شہید ہونے والے معصوم بچوں کے والدین اور اہل خانہ سے دل کی گہرائیوں سے اظہار تعزیت کرتے ہیں۔ ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعاگو ہیں کہ رب رحیم و کریم انہیں صبر جمیل عطا فرمائے، آمین ثم آمین!!

ممبئی کی فلمی نگری کو بھی اس سانحے نے غمزدہ کردیا۔

برصغیر کے لیجنڈ فنکار یوسف خان المعروف دلیپ کمار نے اس بہیمانہ حملے پر اپنے جذبات کا اظہار کرتے

ہوئے کہا۔ ''میں نے یہ المناک خبر سنی تو مجھے ایک دھچکا لگا۔ اس سانحے پر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اس دکھ کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔'' انہوں نے پہلی بار کسی ویب سائٹ پر پیغام دیا ہے جس میں معصوم بچوں کی شہادت پر اپنے گہرے دکھ اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''طالبان دہشت گردوں نے پشاور کے اسکول میں جس درندگی کا مظاہرہ کیا ہے وہ میرے لیے ناقابلِ فراموش ہے۔ طالبان کا جرم اب ناقابلِ معافی ہے۔''

یہ بات یاد رہے کہ دلیپ کمار کی جنم بھومی پشاور ہے۔ اس حوالے سے بھی انہیں پشاور اور اس کے شہریوں سے ایک خاص انسیت ہے۔ ان کا یہ کہنا ''میرا دل چاہتا ہے کہ اڑ کر ان غمزدہ والدین کے پاس پہنچ جاؤں جن کے بچے اس سانحے میں ان سے چھن گئے ہیں۔'' اس امر کی نشاندہی ہے کہ انہیں آج بھی اس شہر اور اس کے لوگوں سے کس قدر محبت ہے۔ جب کہ ایک دردمند دل رکھنے والے حساس فنکار کی حیثیت سے بھی اس سانحے پر دکھی ہونا ایک فطری امر ہے۔

بھارت کے میگا اسٹار امیتابھ بچن نے پشاور کے آرمی پبلک اسکول پر طالبان کے بزدلانہ حملے پر اپنے احساسات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ وقت دعا ہے کہ مذہب کے داعی اب معصوم بچوں پر بھی رحم نہیں کرتے۔'' انہوں نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا۔ ''اس سانحے پر اظہارِ خیال کرنا بہت مشکل ہے۔'' انہوں نے اپنے ایک بلاگ میں اس سانحے کا شکار ہونے والوں سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''ہلاک شدگان اور بچ جانے والے بچوں کے لیے دعا کی جانی چاہیے۔'' 72 سالہ بالی ووڈ اسٹار کو اس المناک سانحے پر ناقابلِ بیان صدمہ پہنچا ہے جس کا اظہار وہ لفظوں میں نہیں کر سکتے۔ ''میں اس موقع پر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ آگے بڑھیں اور اس دہشت گردی کے بے لگام گھوڑے کے منہ میں لگام دیں۔ دہشت گردوں کو روکیں اور اس بربریت کو پروان چڑھنے کا ذرا بھی موقع نہ دیں۔''

بالی ووڈ فلموں کی اہم ترین ضرورت اور عوام کے دلوں کی دھڑکن دبنگ خان پشاور اسکول کے سانحے پر اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنے مشہور ٹی وی شو ''بگ باس 8'' اس سانحے کے بعد روٹین سے ہٹ کر کیا۔ اس شو میں انہوں نے پشاور کے متاثرہ طلبہ کے سوگ میں سیاہ لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ جب کہ اس روز اس شو میں میوزک کا استعمال کیا گیا نہ ڈانس پیش کیا گیا۔ وہ خود بغیر میک اپ کے نمودار ہوئے۔ بے حد افسردہ چہرے کے ساتھ اس شو کی میزبانی کی۔ انہوں نے پشاور کے آرمی پبلک اسکول میں دہشت گردوں کے ہاتھوں شہید ہونے والے بچوں کے غم میں گہرے دکھ اور افسوس کا اظہار کیا اور اس درندگی کی مذمت کرتے ہوئے کہا۔ ''مذہب کے نام پر بچوں کو قتل کرنے والوں نے قرآن نہیں پڑھا۔''

سلمان خان نے اپنے اس شو کے علاوہ ٹوئیٹر پر اپنے جذبات کا یوں اظہار کیا۔ ''جہاد کا مطلب کوشش ہے، اچھا بننے کی کوشش۔ جب کہ آج جہاد کا بہت زیادہ غلط مطلب لیا جاتا ہے۔ فسادی لوگوں نے فساد کو جہاد بنا دیا ہے۔'' انہوں نے اپنے اس پیغام میں سوال کیا۔ ''آخر کب تک معصوم بچے انتہاپسندی کی بھیانک قیمت ادا کرتے رہیں گے؟'' وہ اپنے ٹوئیٹ میں کہتے ہیں۔ ''ایک معصوم جان بچانا پوری انسانیت کو بچانے کے برابر ہے۔ اسی طرح ایک معصوم اور بے گناہ کی جان لینا پوری انسانیت کی جان لینے کے برابر ہے۔ حتیٰ کہ جنگ کے دوران بھی بچوں، عورتوں، بزرگوں، مذہبی عبادت گاہوں اور زراعت کو نشانہ بنانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ پیغمبر اسلام کا تو ارشاد پاک ہے۔ ''وہ ہم میں سے نہیں جس کے ہاتھ اور جس کی زبان سے دوسرے محفوظ نہ ہوں۔''

ممبئی فلم انڈسٹری کے نامور اداکار انوپم کھیر نے سانحۂ پشاور کے بعد دہشت گردوں کے نام ایک کھلے خط میں کہا ہے ''ہر مرتبہ جب تم دہشت گردی کرتے ہو تو میں تھوڑا سا مر جاتا ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں بہت عرصہ سے تھوڑا تھوڑا مرتا جا رہا ہوں۔ میں اس وقت مرا جب شہری علاقوں میں بم دھماکے ہوئے۔ جب عام لوگوں کو یرغمال بنایا گیا۔ جب طیارے ہائی جیک ہوئے۔ جب اپنا دفاع نہ کر پانے والے کمزور ہلاک ہوئے اور جب نہتے غلاموں کی طرح بیچ دیے گئے۔ لیکن آج جب تم نے 130 سے زائد بچوں کو پشاور کے ایک اسکول میں سنگ دلانہ قتل کیا تو مجھے ڈر ہے کہ میرے اندر مزید مرنے کے لیے کچھ نہیں رہا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس بربریت کے پیچھے تمہارے کیا مقاصد تھے لیکن تم نے مجھے چلتی پھرتی لاش میں بدل دیا ہے۔ تم بچوں کو قتل کرنے کا کیا جواز پیش کر سکتے ہو؟ کیا معصوم چہروں پر گولیاں برسانے کے لیے بہادری کا ایسا ہی مظاہرہ کرنا چاہیے؟ تم نے ان بچوں پر شیطانی دہشت گردی

کی جو یہ بھی نہیں جانتے کہ تنازعات کیا ہوتے ہیں۔ کوئی بھی مذہب بچوں کو قتل کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ تم نے آج جس بربریت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی لفظوں میں مذمت ممکن نہیں۔ یہ سچ ہے کہ تاریخ بڑے پیمانے پر قتل عام کے واقعات سے بھری پڑی ہے لیکن وہ زیادہ تر سیاسی تحریکوں یا ایسے ہی تنازعات کا شاخسانہ تھے لیکن تم نے آج معصوم بچوں کا جس طرح قتل عام کیا ہے، اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔'' انوپم کھیر نے اپنے کھلے خط میں مزید لکھا ''مجھے نہیں معلوم کہ تم کس طبقے یا کس سوچ سے تعلق رکھتے ہو کیوں کہ جانوروں کو بھی صرف بھوک مٹانے یا خوف کی وجہ سے مارا جاتا ہے۔ درحقیقت تم شیطان سے بھی بدتر ہو۔ جنگوں کی تصویریں دیکھ کر میں جذباتی ہو جاتا ہوں لیکن آج ایسا نہیں ہوا۔ آج میں نے اس والد کی تصویر دیکھی ہے جس نے بیٹے کو اسکول بھیجنے سے پہلے خود اپنے ہاتھوں سے اس کے جوتوں کے تسمے باندھے تھے۔ غمزدہ باپ کہہ رہا تھا۔ ''میرے پاس جوتے تو ہیں لیکن میرا بیٹا نہیں ہے۔'' میں اس پر جذباتی نہیں ہوا بلکہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آج تمہارے پاگل پن نے ہر جگہ والدین کو ایک کر دیا ہے جو سب مل کر تمہیں کوس رہے ہیں اور وقت ثابت کر دے گا کہ ان کا کوسنا ضائع نہیں گیا۔''

بالی ووڈ کنگ خان نے پشاور کے اسکول میں پھول جیسے طالب علموں کے قتل عام پر اپنے دلی دکھ کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ٹوئیٹر میں لکھا۔ ''بچوں کے ساتھ رہنے سے ہمارے دلوں کو امن و شانتی حاصل ہوتی ہے۔ جب کہ ایسے لوگوں کے لیے، میرے دل میں بے انتہا نفرت ہے جو امن کے سفیروں پر حملہ کرتے ہیں۔'' شاہ رخ خان نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے مزید لکھا۔ ''بچوں سے ہی روح کو تسکین ملتی ہے۔ ان لوگوں سے مجھے شدید نفرت کا احساس ہو رہا ہے جنہوں نے ہمارا مستقبل، ہمارے بچے اور ہمارے دل کا سکون چھین لیا ہے۔'' یاد رہے کہ شاہ رخ خان بھی پشاور کے ہیں۔

بھارت کے معروف فلمساز مہیش بھٹ جن کا پاکستانی فلم انڈسٹری اور فلم والوں سے قریبی تعلق ہے اور جو اپنی فلموں کے ذریعے بھی دونوں ملکوں کی ثقافت اور روایات کا تبادلہ کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے پشاور کے المناک سانحہ کے بعد اپنے ایک انٹرویو میں کہا۔ ''دہشت گرد کبھی بھی مسلمان نہیں ہو سکتے۔'' انہوں نے اپنی اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میری والدہ مسلمان تھیں۔ انہوں نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک قول کے بارے میں مجھے بتایا تھا جو آج بھی مجھے یاد ہے کہ ''مسلمان وہ ہے، جس کے قول اور فعل سے دوسرے شخص کو نقصان نہ پہنچے۔'' لیکن آج یہ عالم ہے کہ بھائی بھائی کو مار رہا ہے۔ ''ایسے دہشت گرد کبھی بھی مسلمان نہیں ہو سکتے جو اپنے بھائیوں اور بچوں کا خون بہائیں۔''

مہیش بھٹ نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ''سانحہ پشاور انتہائی قابلِ مذمت ہے۔ پاکستان کے تمام لوگوں کو متحد ہو کر دہشت گردی سے نمٹنا چاہیے۔''

نامور نغمہ نگار اور کہانی نویس جاوید اختر کے ہدایت کار اور اداکار بیٹے فرحان اختر پشاور سانحے سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہیں اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔ انہوں نے اپنے گہرے صدمے کا اظہار کرتے ہوئے ٹوئیٹ کیا۔ ''میرا دل ٹوٹ گیا ہے۔ یہ انتہائی تکلیف دہ سانحہ ہے۔ خدا مجھے اس صدمے کو برداشت کرنے کا حوصلہ دے۔''

بالی ووڈ کی معروف نغمہ نگار پرسون جوشی آرمی پبلک اسکول پشاور کے طالب علموں کے بہیمانہ قتل پر صدمے سے نڈھال ہو گئیں۔ اپنے اس دلی دکھ کا اظہار انہوں نے اپنی ایک نظم میں کیا ہے۔ جس میں وہ کہتی ہیں۔ ''اس واقعے پر تو آسمان کو زور شور سے رونا چاہیے اور تہذیبوں کی گردنیں بھی شرم سے جھک جانی چاہیے۔ یہ ماتم کا وقت تو ہے ہی لیکن سوچنے اور غور و فکر کرنے کا وقت بھی آ گیا ہے کہ دہشت گردی کے اس کینسر کو کیسے ختم کیا جائے؟''

بھارتی اداکارہ دیا مرزا نے پشاور سانحہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ المناک صورتِ حال ہے۔ اس پر قابو پانا تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے۔''

بالی ووڈ اداکارہ بپاشا باسو کا کہنا ہے۔ ''میں نہیں جانتی انسان کس طرح دہشت گرد بن جاتا ہے اور دنیا کو دہشت زدہ کرنے کے لیے پھول جیسے بچوں کو اپنی بربریت کا نشانہ بناتا ہے۔''

ممبئی فلم انڈسٹری کی بنگالی اداکارہ رانی مکھرجی نے نئی دہلی میں سانحۂ پشاور کے شہید طالب علموں کی یاد میں شمعیں روشن کرتے ہوئے کہا۔ ''اس بربریت پر سفاک قاتلوں کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ نہتے بچوں پر گولیاں برسانے والے درندوں سے بھی بدتر ہیں۔''

خلا میں اذان دینے والے اور روزہ رکھنے والے پہلے شخص کا ذکر خاص

ابن کبیر

خلا میں نماز
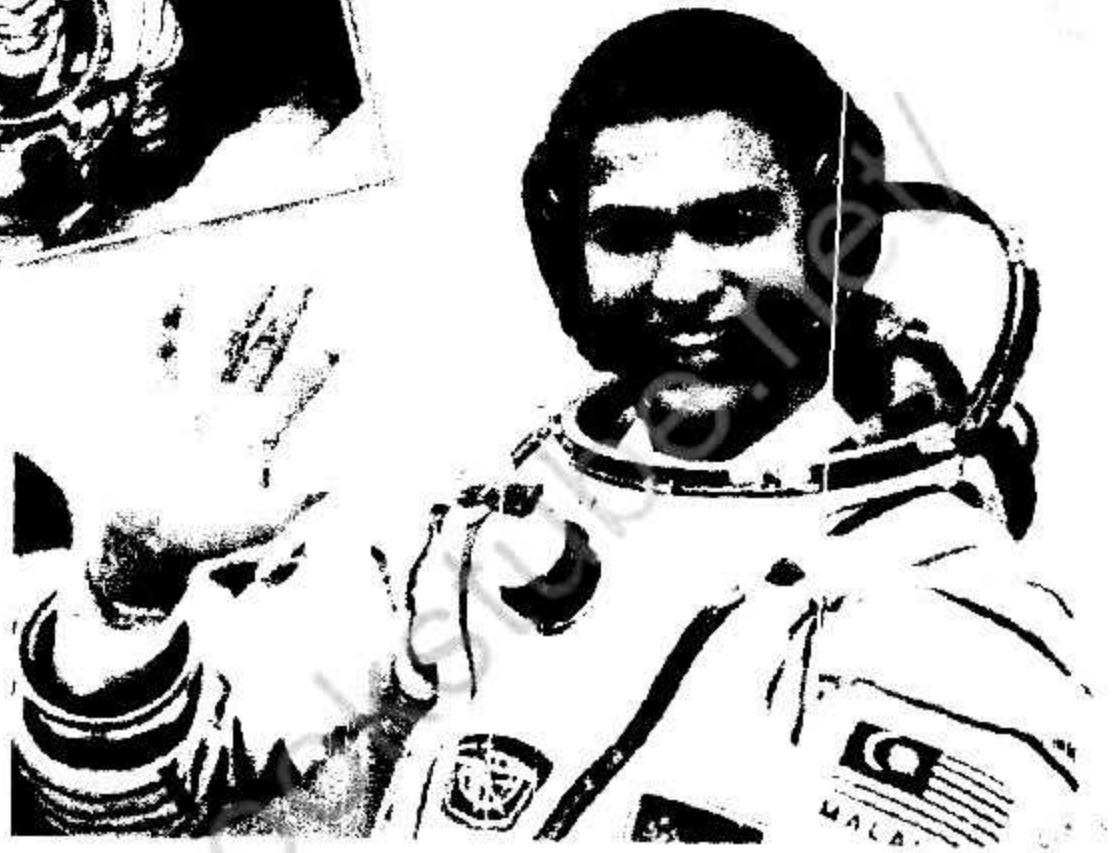
سیارۂ زمین سے اوپر بہت اوپر خلائی وسعتوں میں جب پہلی بار اذان کی آواز گونجی، پہلے شخص نے رمضانوں کے روزے رکھے اور اس کے لیے حکومت کی طرف سے علماکمیٹی بنی، غور و خوض کے بعد 18 صفحے پر محیط سفارشات مرتب ہو گئیں جس میں دیگر ممالک کے جید علما کے فتوے بھی شامل تھے۔ جس میں خلا کی وسعتوں میں کس رخ پر سجدہ کیا جائے۔ نماز کے وقت کا تعین کس طرح ہو۔ روزے کے لیے احکام کیا ہیں۔ کس طرح سحر و افطار کے وقت کا تعین ہو اور یہ سفارشات صرف ایک شخص کے لیے مرتب ہوئی۔ وہ شخص کون ہے کس ملک کا رہائشی ہے۔

زمین سے بہت دور، خلا کی ازلی خاموشی میں تیرتے اسپیس اسٹیشن میں کچھ ہلچل ہوئی۔ اسٹیشن کے اندرونی حصے میں نصب چھوٹے سے اسپیکر سے اذان نشر ہوئی اور وہ کمزور پڑ چکی کششِ ثقل میں تیرتا اپنے کیبن کی سمت بڑھنے لگا۔

دبیز، شفاف شیشے کے پاس وہ کچھ پلوں کو ٹھہر گیا۔ وہاں ستاروں کے جھرمٹ اور محوِ حرکت سیاروں کے درمیان اُس کا گھر کسی چراغ سا چمک رہا تھا۔ زمین کے ستر فیصد حصے پر موجود نیلا سمندر گندمی مٹی کے ملاپ سے سحر انگیز امتزاج پیدا کر رہا تھا۔

اس نے گہرا سانس لیا۔ تنفسی حرکت دل تک گئی، جو

اُس ہستی کی ثناء سے بھرا تھا، جو مشرق و مغرب کا مالک ہے۔ جس نے لامتناہی کائنات کے ہر ذرّے پر اپنی مہر ثبت کر رکھی ہے۔

''اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔'' اس نے زیرِلب کہا۔

لطافت بیں تیرتا وہ شٹیل کے اس حصے میں پہنچا، جہاں آکسیجن کا انتظام تھا۔ سوٹ سے آزاد ہونے کے بعد نظر مالنچکوف پر پڑی۔

روسی نے گردن ہلائی۔ ''تو تمہاری عبادت کا وقت ہوگیا؟''

''ہاں، عصر کی نماز۔'' اس کی چھوٹی سیاہ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے اپنے پیروں کو مقناطیسی فلور سے جڑے لونگ بوٹ میں قید کیا، تاکہ صفر کششِ ثقل میں ایستادہ ہوسکے۔

جب مالنچکوف نے سوال کیا کہ اِس مشق کی کیا ضرورت جب علماء نے خلا میں اشارے سے نماز پڑھنے کی اجازت دے رکھی ہے، تو وہ مسکرایا۔ ''کیونکہ یہ عمل مجھے خوشی بخشتا ہے۔''

یہ ایک خواب کا سفر تھا۔ خواب، جو وہ بچپن سے دیکھتا آیا تھا، جس کی تکمیل اب سے دو روز قبل ایک پُرقوت راکٹ کے ذریعے اسے یہاں لے آئی۔ اور اب وہ زمین سے میلوں پرے اپنے رب کے حضور سجدہ ریز تھا۔ نماز کی ادائیگی کے بعد وہ میز تک گیا۔ کچھ دیر مختلف مرتبانوں کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر جوس کا پیکٹ اور سینڈوچ لے کر کھانے کی میز تک پہنچا۔ کچھ ہی دیر میں قازقستان کے شہر بایکونور میں نمازِ مغرب کا وقت ہوا چاہتا تھا۔

وہ وہیں کے اوقات کے مطابق روزہ افطارہ کیا کرتا تھا۔ اور وہ ایسا کرنے والا دنیا کا پہلا شخص تھا۔

☆......☆

جولائی کی آخری کرنیں کھڑکی کی چوکھٹ پر دھیرے دھیرے سمٹنے لگیں تو پنچھیوں نے اپنے گھونسلوں کا رخ اختیار کیا۔

گلی میں کھیلتے بچے گھروں کی سمت چل دیے۔ اپنے کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے گیند ایک سمت اچھالی، جوتے اتارے اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ سورج لگ بھگ ڈوب چکا تھا۔ آسمان میں چھائی زرد روشنی میں کہیں دُور، بادلوں کے پیچھے چاند کی ہلکی سی شبیہہ تھی، جس نے اس کے معصوم ہونٹوں پر مسکراہٹ سجادی۔

ایک ہی آسمان میں سورج اور چاند کو بیک وقت دیکھنا اس کے لیے ہمیشہ ہی مسحور کن رہا۔

اچانک نظر شمالی افق پر پڑی۔ وہاں، بلندیوں پر کوئی شے حرکت کر رہی تھی۔ ایک ہوائی جہاز، جو وسعتوں کو چیر کر برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ پیچھے دھویں کی دبیز لکیر تھی۔

اس نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کر مٹھی بند کرلی۔ ایک لمحے کو لگا، جیسے اس نے جہاز قید کرلیا ہو۔

اگلے ہی پل جہاز پھر آسمان میں ظاہر ہوا۔ اس نے مٹھی کھولی۔ نظریں اس وقت تک جہاز پر ٹکی رہیں، جب تک وہ افلاک کی وسعتوں میں غائب نہیں ہوگیا۔

سورج پوری طرح ڈوب چکا تھا۔ بادلوں سے تاک جھانک کرتے چاند کے ساتھ اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی۔ موذن فلاح کی سمت پکار رہا تھا۔ نمازیوں نے وضو بنایا اور مسجد کی جانب چل دیے۔

''مظفر۔ کیا ارادے ہیں؟'' گلی سے کسی نے پکارا۔

اس نے نیچے جھانکا۔ اسٹریٹ لائٹ کی کمزور پڑتی روشنی میں اسے اپنا دوست یونس نظر آیا۔ ''نماز کے لیے نہیں چلنا کیا؟''

''ابھی آیا۔'' وہ غسل خانے میں گھس گیا۔ وضو بناتے ہوئے یاد آیا کہ رمضان شروع ہونے میں صرف ایک ہفتہ باقی ہے۔ روزے رکھنے کی خواہش سات سالہ بچے کے دل میں پروان چڑھنے لگی۔

کچھ ہی دیر میں وہ سیلن زدہ زینہ عبور کر کے گلی میں پہنچ چکا تھا۔

''اس بار میں نے روزے رکھنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔'' اُس نے چھوٹتے ہی کہا۔

''گرمیوں کے روزے۔'' یونس نے گردن ہلائی۔

''ٹھیک ہے۔ وہ میرے والد کہتے ہیں ناں، ہمت مرداں مدد خدا۔''

دونوں دوست مسجد کی سمت چل دیے۔ مظفر نے پھر آسمان کی سمت دیکھا۔ دھویں کی لکیر اب تیزی سے بکھرتی جا رہی تھی۔ اس بار لڑکے نے لکیر کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کی اور اگلے ہی پل اپنی حرکت پر ہنس پڑا۔ پاس سے گزرتے

بڑے میاں نے اسے گھورا۔

وہ کوالالمپور میں غروب ہونے والا جولائی 1979 کا آخری سورج تھا۔ نیل آرمسٹرنگ کو چاند پر قدم رکھے دس برس بیت چکے تھے۔ ناسا نے مریخ بھی فتح کرلیا تھا۔ خلائی محاذ پر سوویت یونین کو پے در پے شکست ہورہی تھی۔ مگر شکستوں کے اس سلسلے سے جزیرہ نما ملائشیا میں مقیم شیخ مظفر شکور کی قسمت پر کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔ قدرت کا منصوبہ بے عیب تھا۔

☆......☆

باپ عرب، ماں ملائی۔ ددھیال صحراؤں میں مقیم اور ننھیال ساحلوں پر آباد۔ مگر نہ تو وہ ملائی تھا، نہ ہی عرب۔

اپنے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں، چاہے شیخ محی الدین واضح نہ ہو، مگر اس کی شناخت سے متعلق وہ واضح سوچ رکھتا تھا۔

''یہ ایک سچا مسلمان بنے گا۔ پانچ وقت کا نمازی۔ ملائشیا کے لیے قابل تقلید مثال۔''

عورت مسکرا دی۔ دل میں سوچا، یہ عرب بھی خوب ہیں، ٹھیک ہے پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں، پر ایسا بھی کیا دیکھ لیا اپنے بیٹے میں۔ البتہ نماز والی بات پر وہ خوش ہوئی۔ خود بھی صوم وصلوٰۃ کی پابند تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب اگست 1957 میں برطانوی سامراج سے آزاد ہونے والی جنوب مشرقی ایشیا کی یہ ریاست دھیرے دھیرے اپنے پیروں پر کھڑی ہونے لگی تھی۔ بالخصوص دارالحکومت میں مستحکم معیشت کے اثرات نظر آنے لگے۔ پختہ سڑکیں۔ بلند عمارتیں۔ نکاسی وفراہمی آب کا جدید نظام۔ اور ہاں، بے شمار مساجد۔ جن میں چند تو مسلم طرز تعمیر کا شاہکار تھیں۔

یوں تو ملائشیا میں اور قومیں بھی آباد تھیں، دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو بھی مکمل آزادی تھی، مگر اکثریت ملائی مسلمانوں کی تھی۔ ریاستی مذہب بھی اسلام تھا۔

شیخ محی الدین نے، جو کھجوروں اور سخت روٹی کو مرغوب ترین غذا تصور کرتا، خود سے عہد کیا کہ وہ اپنے بچے کو ایک سچا مسلمان بنائے گا۔ اوائل عمری ہی سے اپنے ساتھ مسجد لے جانے لگا۔ اسے بنیادی عقائد سے آگاہ کرنے کا عمل اسی وقت شروع کردیا، جب عام بچے کھیل کود میں مصروف ہوتے۔ ساتھ ہی وہ ایک اور خیال بچے کے ذہن میں راسخ کررہا تھا۔

''تمہیں اس ملک کے لیے مثال بننا ہے۔ ہمارے خاندان کا نام روشن کرنا ہے۔''

سیاہ آنکھوں والا معصوم بچہ، جس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اُس میں ایک وجیہہ مرد پوشیدہ ہے، اپنے باپ کی باتیں پوری طرح تو نہیں سمجھ پاتا مگر یہ ضرور جان لیتا کہ اس کا تعلق کسی بلند جذبے سے ہے۔ ایسا جذبہ جو اظہار کے وقت اس کے باپ کے چہرے پر چمکتا۔ جس کی دمک ماں کی آنکھوں میں نظر آتی اور جس کی ہمک وہ اپنے خوابوں میں پاتا جہاں وہ فضا میں پرواز کررہا ہوتا۔

ہاں، پرواز۔ معتدل موسموں والے شہر کے اس بچے کے دل کے نہاں گوشوں میں اس آرزو نے کب جنم لیا، اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے مگر سچ یہ ہے کہ وہ کبھی ایک پل کو بھی اس خواہش سے جان نہیں چھڑا سکا۔

نصابی کتابوں سے الجھتے ہوئے، شہر کی بلند و بالا عمارتوں کے پہلو سے گزرتے ہوئے اور گلی میں بچوں کے ساتھ فٹبال کھیلتے ہوئے وہ اس خواہش کو اپنے اندر ڈولتا محسوس کرتا۔ یہ اس وقت بھی ساتھ تھی، جب اُس نے طب کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت بھی جب آپریشن تھیٹر میں پہلا چیرا لگایا۔ اس وقت بھی، جب ایک دوشیزہ کو کہرے کی کائنات میں اپنے روبرو پایا۔ اس خواہش نے کبھی پیچھا نہیں چھوڑا۔

ہاں، ایک لمحہ ایسا ضرور ہوتا جب یہ بے چین خواہش کچھ شانت ہوجاتی، کچھ ٹھہر جاتی۔ ایسا تب ہوتا، جب کوالالمپور کی فضاؤں میں اذان گونجتی اور مؤذن شہر کے باسیوں کو فلاح کی سمت پکارتا۔

☆......☆

موار... ملائشیا کا دوسرا بڑا شہر۔ شاہوں کی راجدھانی اور مظفر کی پہلی درس گاہ۔

موار جونیئر سائنس کالج کا شمار ملک کی بہترین درس گاہوں میں ہوتا تھا۔ وہاں تک رسائی ان ہی طلبا کے حصے میں آتی جو کتابوں کو کھلونوں سے زیادہ عزیز رکھتے۔ جو چھٹی کا انتظار نہیں کرتے بلکہ اس گھنٹی کے منتظر رہتے جو اسکول شروع ہونے کا اعلان کرے... اور مظفر ان میں سے ایک تھا۔ ایک مہذب شخص کا تہذیب یافتہ بیٹا۔ جس کی مسکراہٹ اور آنکھیں اپنی حلیم ماں سی تھیں۔

یہ وہ زمانہ ہے، جب امریکا کی Pioneer 10 نامی خلائی گاڑی نظامِ شمسی کے کنارے پہنچنے میں کامیاب

ہو گئی تھی۔ یہ روداد مظفر نے کالج میگزین میں پڑھی۔ یہ جان کر اس کی خوشی دو چند ہو گئی کہ ناسا کی اس خلائی گاڑی کو اُسی برس خلا میں چھوڑا گیا تھا جب اس نے خوشیوں کی اس دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔

اس نے Pioneer 10 کی تصاویر کاٹ کر کمرے کی دیوار پر چسپاں کر لیں۔ وہاں اور بھی کئی تصاویر تھیں۔ ایک میں نیل آرمسٹرنگ چاند پر کھڑا ہے، ایک میں راکٹ شعلے اگلتا ہوا فضا میں بلند ہو رہا ہے، ایک میں خلا میں تیرتے خلاباز کے پیچھے نیلی زمین دکھائی دے رہی ہے۔ یہی وہ تصویر تھی جس نے اسے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ وہ تصویر میں موجود خلاباز کی جگہ لینا چاہتا تھا۔ وہاں بلندی سے اس حسین دھرتی کا جو کائنات میں زندگی کی قوت سے ہمک رہی تھی، مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔

وہ خوابوں میں جی رہا تھا اور قدرت مسکرا رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اُس کی تقدیر میں کیا لکھا ہے۔

یوں تو موار میں موسم شانت رہتا مگر سالانہ نتائج کے اعلان والے روز نہ جانے کہاں سے گھنے بادل اُمڈ آئے۔ کچھ ہی دیر میں گھن گرج کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ کھلی فضا میں ہونے والی تقریب کو ہال میں منتقل کر دیا گیا اور بچوں کے والدین تو کسی نہ کسی طرح پہنچ گئے، مگر کوالالمپور سے آنے والا شیخ محی الدین اب تک نہیں پہنچا تھا۔ مظفر کی نظریں بار بار دروازے کی طرف اٹھتیں اور پھر مایوس لوٹ آتیں۔

اچانک اسٹیج پر کچھ مانوس چہرے نمودار ہوئے۔ اس کی کلاس کے نتائج کا اعلان ہونے کو تھا۔ مظفر نے گہرا سانس لیا۔ کھڑکی پر نظر ڈالی جہاں بارش دستک دے رہی تھی اور باہر دھند چھائی ہوئی تھی۔

اس کے کلاس ٹیچر نے تیسری پوزیشن لینے والے بچے کا نام پکارا۔ اس کا عزیز ترین دوست بے یقینی کے ساتھ اٹھا اور تالیوں کی گونج میں اسٹیج کی سمت بڑھنے لگا۔ پھر دوسری پوزیشن پانے والے کا نام ہال میں گونجا اور بادل زور سے گرجے۔

مظفر مایوسی میں اتر گیا۔ یقین ہو گیا کہ اس بار وہ پوزیشن لینے میں ناکام رہا ہے۔ خود سے کہا۔ ”اچھا ہوا کہ آج ڈیڈ نہیں آئے۔ انہیں کتنا دکھ ہوتا۔“

اس بار بادل کچھ زیادہ ہی زور سے گرجا۔ یوں جیسے توڑ پھوڑ کرتا ہوا ہال میں چلا آئے گا۔ سب کی نظریں دروازے کی سمت اٹھ گئیں۔ کچھ لمحے وہ مؤدبانہ خاموشی سے دروازے کی سمت دیکھتے رہے۔ اچانک دروازہ ایک دھماکے سے کھلا۔ بارش کی بوچھاڑ اندر داخل ہوئی اور ایک بھیگا ہوا شخص نظر آیا۔ وہ ٹھٹھر رہا تھا۔

”ڈیڈ آپ آ گئے۔“ مظفر نے چیخ ماری اور دوڑتے ہوئے اس سے لپٹ گیا۔ دو آدمی بھاگے بھاگے گئے اور تولیے لے آئے۔ آدمی نے خود کو خشک کیا اور مظفر کی ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔

”ممی کیسی ہیں؟ میرا کمرا چھوٹو کو تو نہیں دے دیا؟ مسجد کے امام صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟“ اس کے پاس ڈھیروں سوال تھے۔

آدمی مسکراتا رہا۔ بچہ دم لینے کو رکا تو پوچھا۔ ”آج میں خاصا لیٹ ہو گیا۔ کیا تمہاری کلاس کا رزلٹ سنا دیا گیا ہے؟“

”ہاں۔“ بچے کے لہجے میں کچھ مایوسی تھی۔ باپ نے اسے تھپکی دی۔ اسٹیج سے میزبان کی آواز سنائی دی۔

”اور پہلی پوزیشن لی ہے شیخ مظفر شکور نے۔“

یہ وہ جملہ تھا، جس پر یقین کرنے میں اس کے معصوم ذہن کو تھوڑا وقت لگا۔ جب وہ تالیوں کے حوصلہ افزا شور میں اسٹیج کی سمت بڑھ رہا تھا، اساتذہ کے شفیق چہروں پر مسرت دمکنے لگی۔ زینے پر قدم رکھنے سے قبل اس نے مڑ کر اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ وہاں یقین کا دریا موجزن تھا۔

اُس کا باپ... وہ عرب لاعلم تھا کہ اس بھیگے ہوئے لمحے اس کی نظریں ملائشیا کے مستقبل پر ٹکی ہیں۔ اس کا بیٹا، استعارہ کی شکل اختیار کرنے والا ہے۔

وہ دوپہر، جب موار میں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور ایک ننھا طالب علم پہلی پوزیشن کا میڈل گلے میں ڈالے مسکرا رہا تھا، Pioneer 10 نے نظام شمسی کے کنارے سے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔

☆......☆

اس نے چیتے سی جست لگائی۔ ایک کسرتی بدن پانی کو تیز دھار آلے کی طرح چیرتا ہوا غائب ہو گیا۔ اس کے بازوؤں میں بجلیاں بھری تھیں۔ وہ برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ سیکڑوں لوگوں کے پُرجوش نعرے حوصلہ بڑھاتے رہے۔ سوئمنگ پول کے کنارے کھڑا کوچ چیخ چیخ کر ہدایات جاری کر رہا تھا۔ مگر وہ انہیں نہیں سن رہا تھا۔ اس کا دل دعائیہ کلمات کے ساتھ سانس لے رہا تھا کہ فتح قریب تھی۔

وہ شیخ مظفر تھا۔ موار جونیئر سائنس کالج کا طالب علم۔

مگر اُس قیمتی لمحے وہ درس گاہوں کے مابین کسی مقابلے میں شریک نہ تھا۔ اس کے مدمقابل طالب علم نہیں تھے۔ یہ تو نیشنل لیول پر ہونے والا ایک کانٹے دار مقابلہ تھا جس میں کسرتی بدن والے خوش شکل مظفر نے سب کو گرویدہ بنا لیا۔ وہ شرکاء میں سب سے کم عمر تھا مگر عزم سب سے بلند۔

1982ء کے اِن کا تذکرہ تیراکی کے شائقین کبھی اُس کے بغیر نہیں کرتے۔ جب کبھی یہ موضوع نکلتا خود سے کہتے: ”ہاں، وہ پہلی پوزیشن حاصل نہیں کر سکا، مگر اس نے دوسروں کو ناکوں .... چنے چبوا دیے۔“

جب ایک خصوصی انٹرویو میں ایک دل نشیں صحافی نے اس کی حیران کن کارکردگی کی بابت سوال کیا تو وہ مسکرایا۔ ”بہت سادہ ہے، اگر آپ کے ذہن میں یقین کا تن آور درخت ہو، تو اس کے پھل آپ کی جھولی میں گرنے لگتے ہیں۔ ذہنی یقین، جسمانی معجزے دکھاتا ہے۔“

لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اگلے برس پھر تیراکی کے مقابلوں میں جادو جگائے گا مگر یہ کیا، مظفر تو اب داستان گو بن گیا تھا۔ 84ء میں جب ریاستی سطح پر داستان گوئی کا مقابلہ ہوا تو لوگوں نے شیخ محی الدین کے بیٹے کو ہاتھوں کی فنکارانہ حرکت، چہرے کے اتار چڑھاؤ اور آواز کے زیروبم کی مدد سے ایک سحرانگیز کہانی سناتے دیکھا۔ انہیں لگا، جیسے، تاریخ کے جھروکوں سے کوئی قصہ گو برآمد ہوا ہے جس نے انہیں الاؤ کے گرد بٹھا لیا ہے اور وہ وقت سے ماوراء ہوگئے ہیں۔ جب مقابلے کے آخر میں اسے فاتح ٹھہرایا گیا تو کسی کو حیرت نہیں ہوئی۔ خود مظفر بھی متحیر نظر نہیں آیا۔ یقین کے درخت پر لگے پھل جھولی میں گرنے لگے تھے۔

87ء میں پھر اس نے ایک کڑے مقابلے میں حصہ لیا مگر نہ تو وہاں کوئی سوئمنگ پول تھا، نہ ہی کوئی اسٹیج۔ وہ تو ٹینس کورٹ تھا۔ موار کالج کا چہیتا اب ٹینس ریکٹ تھامے کھڑا تھا اور وہ لوگ جو اسے جانتے تھے، حیرت سے تک رہے تھے۔ ان کے ذہنوں میں سوال تھا۔ ”یہ شخص ہے کیا؟ ایک مقرر، ایک تیراک، ایک داستان گو یا ایک ٹینس پلیئر؟“

آج ہم جانتے ہیں کہ ان کے سوالات محدود تھے۔ جتنا وہ سوچ سکتے تھے، سمجھ سکتے تھے، شیخ مظفر شکور اس سے کچھ بڑھ کر تھا۔ وہ ملائشیا کے لیے قدرت کا تحفہ خاص تھا۔

☆......☆

”بھارت کا رخ کرو تو آگرہ ضرور جانا۔ وہاں محبت کی ایک زندہ یادگار ہے جسے تاج محل کہتے ہیں۔ شاہجہاں اور ممتاز کی محبت کے گیت آج بھی سنائی دیتے ہیں۔“

یہ وہ بات تھی، جو دو عشروں قبل دہلی سے یہاں آکر آباد ہونے والے اس کے پڑوسی مسٹر ناصر اکثر کہا کرتے تھے۔ جب انہیں پتا چلا کہ وہ واقعی ہندوستان جا رہا ہے تو اسے ہمایوں کے مزار اور لال قلعہ کی تاریخ بتانے کے ساتھ خصوصی نصیحت کی کہ دہلی جائے تو جامع مسجد میں دو نفل ادا کرے۔ اور اگر وقت ہو تو قطب مینار اور دریائے جمنا کی سیر کو بھی جائے۔ مسٹر ناصر نے تو اس کے لیے پورا سفری ہدایت نامہ تیار کر لیا تھا۔

مگر وہ آگرہ یا دہلی نہیں، کرناٹک کے ضلع اڈوپی جا رہا تھا، جو اپنی زرخیز ثقافت، مندروں اور ماہی گیروں کے لیے مشہور تھا۔ مگر سچ کہیں، تو وہ اڈوپی بھی نہیں جا رہا تھا، اس کی منزل تو بحیرہ عرب سے آٹھ میل دور واقع چھوٹا سا علاقہ منی پال تھا۔

اب ہمارا مظفر کستربے میڈیکل کالج کا طالب علم تھا۔ اور منی پال اس سے ملحقہ یونیورسٹی ٹاؤن تھا۔ ویسا علاقہ وہ قطعی نہیں تھا، جس کا سفر اختیار کرنے سے قبل دوست احباب آپ کو مشورے دیں کہ فلاں فلاں جگہ ضرور جانا۔ یہ ایک پُرسکون قصبہ تھا۔ جہاں مقیم لگ بھگ تمام افراد کا تعلق میڈیکل کالج سے تھا۔ وہاں خاموشی چھائی رہتی۔ نہ تو بازاروں کا شور، نہ ہی ٹریفک کا زور۔ بس کوئل کی کوک۔

جب طلبا پڑھتے پڑھتے اکتا جاتے، تو ان پہاڑیوں کا رخ کرتے، جن کے آگے بحیرہ عرب کے پانی پھیلے تھے۔ جہاں پنچھی نیچی پرواز کرتے اور غوطہ لگا کر شکار دبوچ لیتے۔ اور ایک پرانا لائٹ ہاؤس، جہاں کھڑے ہو کر مظفر نے سمندر سے آتی نمی محسوس کی اور اُس کا گرویدہ ہوگیا۔

وہ یہاں سرجری اور میڈیسن میں بیچلرز کی ڈگری لینے آیا تھا۔ مگر ہندوستان ہی کیوں، کیا ملائشیا میں اچھی درسگاہوں کی کمی تھی۔ اس کے پیچھے ایک سے زاید کہانیاں تھیں۔

ایک تو وہ کہانی جو اس کی ماں اپنی سہیلیوں کو سنایا کرتی تھی کہ اس کے بیٹے کو اسکالرشپ ملی ہے اور وہ ہندوستان کی ایک بڑی درس گاہ سے اکتسابِ علم کرنے جا رہا ہے۔ دوسری کہانی اس کا ماموں محلے داروں کو سناتا پھرتا۔

”جناب، ہمارے ہاں تو میڈیکل کالجز کی فیسیں

آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ تعلیم کو کاروبار بنالیا ہے۔ بھائی محی الدین کیا کریں۔ ہندوستان بھیجنا پڑ رہا ہے۔''

مگر سب سے اہم کہانی وہ ہے، جو اس کا باپ اُسے سنایا کرتا۔ ''جو پرواز کے لیے پیدا ہوتے ہیں نوجوان، وہ ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ سفر تو باعث رحمت ہے۔ اب دیکھو، اگر ہمارے اجداد ادھر نہ آتے، تو نہ میں تمہاری اماں سے ملتا نہ ہی تم پیدا ہوتے۔''

اس جملے کی ادائیگی کے ساتھ بوڑھا زوردار قہقہہ لگاتا۔ پھر یکدم سنجیدہ ہوجاتا۔ ''اچھا سنو، وہاں مندر بہتیرے ہیں۔ ہمیں تمام مذاہب کا احترام کرنا چاہیے، مگر وہاں قدیم مساجد ضرور تلاش کرنا اور وقتاً فوقتاً خط لکھتے رہنا۔''

تو اب مظفر ہندوستان میں تھا جہاں نئے تجربات کے ساتھ مسالے دار کھانے اس کے منتظر تھے، جنہیں کھاتے ہوئے آنکھوں اور ناک سے پانی بہتا رہتا۔

ویسے اس کی ماں کی سنائی کہانی میں دم تھا۔ اُس درس گاہ کا شمار ہندوستان کے بہترین میڈیکل کالجوں میں ہوتا۔ وہاں سے اکتساب فیض کرنے والے اس وقت دنیا کے بڑے اداروں میں فرائض انجام دے رہے تھے۔ البتہ مظفر کے دل میں کسی یورپی یا امریکی ادارے کا حصہ بننے کی خواہش نہیں تھی۔ وہ تو ڈگری لینے کے بعد ملائشیا لوٹنے کا آرزومند تھا، تاکہ صلاحیتیں اپنے ملک کی ترقی کے لیے وقف کردے۔

گو وہ انتہائی سرگرم طالب علم تھا، مگر یہ جگہ اس کی سابق درسگاہ سے مختلف تھی۔ تقریری مقابلے کم ہوتے۔ تیراکی کا شوق بھی انفرادی دلچسپی تک محدود ہوگیا۔ ملائی زبان تو کوئی جانتا نہیں تھا جو وہ داستانیں سناتا۔ کبھی کبھار جب لاشوں کی چیر پھاڑ اور اسائنمنٹ کا بوجھ اسے بیزاری میں مبتلا کردیتا، تب وہ بحیرہ عرب کی نمکین ہوا کا ذائقہ چکھنے کے لیے لائٹ ہاؤس کی سمت چل پڑتا۔

یہ ایک معمول کی مشق تھی جو دوسرے برس کے ماہ ستمبر میں جب پانیوں پر دھند چھائی تھی، یکدم بدل گئی۔ لائٹ ہاؤس کا زینہ عبور کرتے ہی نوجوان نے ایک اپسرا کو روبرو پایا۔ ہوا نے اُس کے سرخ لبادے کو سنبھال رکھا تھا۔ کالی زلفیں اسرار بڑھا رہی تھیں۔

آہٹ سن کر وہ مڑی۔ وہ آنکھیں بحیرہ عرب سے نیلی اور گہری تھیں۔ مسکرائی تو جیسے مندروں کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ پھر آہستگی سے، بغیر ایک لفظ کہے فضا میں تیرتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

مظفر خوابناکی سی کیفیت میں تھا۔ جب کچھ سنبھلا، تو ذہن مسٹر ناصر کی کرناٹک کی ساحروں سے متعلق سنائی کہانیوں کی سمت چلا گیا۔

اُس نے لائٹ ہاؤس سے نیچے جھانکا۔ کہرے میں لپٹا سرخ لبادہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔

''میرا نام مظفر ہے۔'' وہ چلایا۔ ''آپ کا نام؟''

لڑکی پلٹی۔ دھیرے سے مسکرائی اور کار میں بیٹھ گئی۔ گاڑی دھند کو چیرتے ہوئے غائب ہوگئی اور مظفر کے دل میں وہ جذبہ ہمکنے لگا، جسے ہم محبت کہتے ہیں، جو خلاؤں سا وسیع ہے، جہاں دل کی خلائی گاڑی بھٹک جائے، تو پھر کبھی نہیں ملتی۔

☆......☆

یہ اُس کا باپ تھا جس نے خط پڑھتے ہی اندازہ لگالیا کہ اُس کا بیٹا ایک عظیم تبدیلی سے گزر رہا ہے۔

اور کیوں ناں اندازہ لگاتا۔ کسی زمانے میں وہ بھی جوان اور دل پھینک تھا۔ لیکن اب وہ محتاط ہوگیا تھا۔ زندگی کو تھوڑا بہت سمجھنے لگا تو اس نے بیٹے کو خط لکھا۔ براہِ راست نصیحت کرنے کی بجائے اشارتاً کہا کہ وہ اپنی پڑھائی پر توجہ مرکوز رکھے۔ یہ بھی لکھ دیا کہ ماں تمہارے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہے۔

اُس وقت تک مظفر کی اُس اپسرا سے دو ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ پہلی تو خواب میں ہوئی اور دوسری میونسپل لائبریری کی سیڑھیوں پر۔ اور اُس شام نوجوان نے جانا کہ آئن اسٹائن درست کہتا تھا، واقعات وقت کی رفتار پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں، جیسے یہ لمحہ... جو تھم سا گیا ہے۔

اِس بار وہ کچھ زیادہ حسین اور حقیقی لگی۔ ساڑی میں ملبوس دوشیزہ کی دلفریب مسکراہٹ اشارہ تھی کہ وہ مظفر کو پہچان گئی ہے۔

اس سے پہلے کہ وہ بھیڑ میں گم ہوجاتی، مظفر اس کے پیچھے دوڑا۔

''ہیلو۔ میں مظفر شکور ہوں۔ اور آپ؟''

''میں سپنا ہوں۔'' لڑکی مسکرائی تو پھر گھنٹیاں بجنے لگیں۔

وہ قریبی کافی شاپ میں جا بیٹھے۔ موسم سے بات شروع ہوئی جو مشاغل سے ہوتی پسند ناپسند تک پہنچی۔ مظفر نے کچھ اپنے بارے میں بتایا، کچھ اس کے بارے میں جانا۔

جب سپنا جانے لگی، تو مظفر نے پوچھا۔ ''ہم پھر کب مل سکتے ہیں؟''

وہ پلٹی اور وقت تھم گیا۔ ''جب بحیرہ عرب کے پانیوں پر دھند چھائی ہوئی ہو اور ایک ملائی نوجوان پڑھائی سے اُکتا چکا ہو۔''

یہی وہ ملاقات تھی، جس سے لوٹ کر اُس نے اپنے باپ کا تازہ تازہ موصول ہونے والا خط پڑھا۔ یکبارگی حقیقت کی دنیا میں آگیا جہاں تلخی کی دیواریں اور حقائق کی چٹانیں تھیں۔

اس نے معروضی انداز میں اپنی کیفیت کا جائزہ لیا۔ وہ ایک غیر ملکی تھا جو اجنبی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا۔ ایسی لڑکی جس کی ثقافت اور مذہب یکسر الگ ہیں۔

''میں یہاں پڑھنے آیا ہوں، عشق لڑانے نہیں۔'' بستر پر جانے تک وہ خود کو سمجھاتا رہا مگر خواب کا کیا کیجیے۔ اس پر کسی کا کہاں زور چلتا ہے۔ وہاں ایک اپسرا کی حکمرانی تھی۔

☆......☆

مون سون شہر کے لیے تیز بارشیں لے کر آیا۔ ندی نالے بھر گئے۔

امتحانات کے دوران میں بادل مسلسل برستے رہے۔ اس دوران سپنا کی کئی بار یاد آئی۔ اس نے مختلف جگہوں پر اسے تلاش بھی کیا، مگر ہاتھ ناکامی آئی۔

امتحانات کے بعد رمضان شروع ہو گیا۔ سحری اور افطار پھر تراویح، مظفر کے شب و روز نئی ترتیب میں ڈھل گئے۔ زیادہ وقت عبادت میں گزرتا۔ وہ یونیورسٹی میں واقع چھوٹی سی مسجد میں نماز پڑھا کرتا۔ اکثر افطار بھی وہیں کرتا۔

عید آئی اور چلی گئی۔ اس بار اپنوں کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ یہ عید کا تیسرا دن تھا، جب وہ صبح بیدار ہوا تو کھڑکی کے باہر دھند تھی۔ اچانک ذہن میں جھماکا ہوا۔ ریسٹورنٹ کی ایک بھولی بسری یاد کا سرا ہاتھ آگیا۔ وہ جلدی سے تیار ہوا۔ باہر نکلتے ہوئے مٹھائی کا وہ ڈبا اٹھا لیا جو کل ملائشیا سے یہاں پہنچا تھا۔

قدموں میں اُمید کی لہر تھی اور چہرے پر ایک خاص نوع کا اطمینان۔ لائٹ ہاؤس کے گرد کہرا تھا اور چٹانوں سے ٹکراتے سمندر کا شور کہیں دور سے آتا محسوس ہوتا۔ اس نے خاموشی سے زینہ عبور کیا۔ آخری قدمچے پر پہنچ کر اس نے گہرا سانس لیا۔ وہ وہاں موجود تھی۔ سرخ لبادے میں ملبوس۔ بال کھلے۔

لڑکی کے چہرے پر مانوس مسکراہٹ اور اطمینان تھا۔ وہ انتظار میں تھی۔

''یہ آپ کے لیے۔'' اس نے مٹھائی کا ڈبا آگے کر دیا۔ ''میری والدہ نے بھجوائی ہے۔''

''شکریہ۔'' اس نے ڈبا لے لیا۔

دونوں کے درمیان خاموشی کا ایک حسین وقفہ آیا۔ پھر دھند زدہ منظر میں مظفر کی آواز گونجی۔ ''آپ بے حد حسین ہیں۔''

''واقعی؟'' وہ سر پیچھے جھٹک کر ہنسنے لگی۔ ''اور تم بہت اچھے انسان ہو مظفر۔''

''شاید ہم پھر نہ ملیں۔'' اُس نے جی کڑا کر کے کہا۔

سپنا کچھ پل اسے دیکھتی رہی۔ آنکھوں میں یاس تھی۔ پھر اُس کے لب وا ہوئے۔ چپ ٹوٹی۔ ''ہم ان ملاقاتوں کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔''

''ہاں۔ اس نے گردن ہلائی۔ ''الوداع۔''

وہ مڑا اور زینے سے اترنے لگا۔ پس منظر میں نقرئی آواز گونجی۔ ''عید مبارک مظفر۔''

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دھند میں کسی روشن مینار کی طرح تھی اور ساری زندگی اُس کے ذہن میں محفوظ رہنے والی تھی۔

''عید مبارک۔'' وہ زینہ اتر کر ہر طرف چھائی دھند میں گم ہو گیا۔

☆......☆

دعائیں سماعتوں میں رس گھولتیں۔ جھریوں زدہ ہاتھ اس کے چہرے پر تھے اور شہر پر نازل ہونے والے طوفانی جھکڑ بے معنی ہو چکے تھے۔

وہ ایک بوڑھی عورت تھی جو چند روز قبل اپنے اکلوتے بیٹے کو لیے اسپتال آئی۔ اس کا بیٹا گزشتہ کئی برس سے گھٹنوں کے ناقابلِ برداشت درد کے باعث چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے سرجری کا مشورہ دیا۔ مریض آپریشن ٹیبل تک تو پہنچ گیا مگر اس روز شہر ہولناک طوفان کی لپیٹ میں آگیا۔ موسلا دھار بارش ہوئی۔ سینئر سرجن وقت پر نہیں پہنچ سکا۔ ادھر مریض درد سے تڑپ رہا تھا۔ کیس توقع سے زیادہ گمبھیر تھا۔ سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، ایسے میں ایک نوجوان ڈاکٹر جس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا تھا کہ وہ اسپورٹس اور تقریری مقابلوں

میں حصہ لے چکا تھا، سامنے آیا۔

پیرامیڈیکل اسٹاف مظفر کو پسند کرتا تھا مگر کیس کی پیچیدگی دیکھتے ہوئے وہ اُمید کھونے لگے۔ اُن میں اور مظفر میں یہی تو فرق تھا۔ وہ کبھی اُمید کا اجلا دامن نہیں چھوڑتا۔ آپریشن سے پہلے، وہ بوڑھی عورت کے پاس آیا۔ ''مسلمان مصیبت میں گھبرایا نہیں کرتے۔''

کیسے پُریقین الفاظ تھے۔ سسکیاں لیتی عورت چپ ہوگئی۔

وہ ایک طویل اور تھکا دینے والا آپریشن تھا۔ طوفانی جھکڑ شہر میں کہرام مچا رہے تھے۔ کئی چھتیں اڑ گئیں اور دیواریں ڈھے گئیں۔ نشیبی علاقے ڈوب گئے تھے، مگر مظفر ہر شے سے بے پروا سرجری میں جتا رہا۔ آپریشن کامیاب رہا۔ اور اب اس کے مسکراتے چہرے پر جھریوں زدہ ہاتھوں کی شفقت بچی تھی۔ اسپتال کی دیواروں پر سر پٹختے جھکڑ بے معنی ہوگئے تھے۔

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے، جب وہ ملائی شہر سرمبان کے مرکزی اسپتال میں ملازم ہوگیا تھا۔ 97ء میں گریجویشن کی ڈگری ملتے ہی وہ کرناٹک سے سیدھا ملائشیا چلا آیا، حالاں کہ اسے انڈیا میں دو تین اچھی پیشکشیں ہوئی تھیں اور کیوں نہ ہوتیں، وہ میڈیکل کالج کے ذہین ترین طلبا میں سے ایک تھا۔ مگر اپنے وطن کی خدمت کا جذبہ اُسے کھینچتا ہوا سرمبان کے اُس شفاخانے لے آیا، جہاں نہ تو تنخواہ اچھی تھی، نہ اچھی مراعات۔ مگر مظفر کو پروا نہیں تھی۔ اسے تو بس جھریوں زدہ ہاتھوں میں سانس لیتی ممتا کی طلب تھی۔

سیانے کہتے ہیں، بوڑھی دعائیں تقدیر بدل دیتی ہیں اور ایسا ہی ہوا۔ اس طویل آپریشن کے چند روز بعد کوالالمپور سے کال آگئی۔

اپنے آبائی شہر کے ایک اسپتال میں خدمات انجام دینا، جہاں وہ خود بھی بچپن میں زیرِ علاج رہا تھا، ایک پُرمسرت تجربہ تھا۔ اور وہ اس وقت دوچند ہوگیا، جب اس کے پڑوسی مسٹر ناصر پہلے مریض کے روپ میں کمرے میں داخل ہوئے۔

''ارے انکل آپ۔'' وہ کھڑا ہوگیا۔

ہندوستانی نے منہ بنایا۔ ''میاں انکل ونکل نہیں چلے گا۔ مریض ہوں اور شدید تکلیف میں ہوں۔ اچھے ڈاکٹر کی طرح علاج کرو۔''

''جی جی ضرور۔'' اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔ ''پلیز لیٹ جائیں۔''

''اور ہاں لڑکے۔'' بڑے میاں بستر پر لیٹتے ہوئے بولے۔ ''اگر اچھا علاج کیا، تو اور مریضوں کو تمہارا پتا دوں گا۔ سمجھے۔''

اس نے بمشکل ہنسی روکی۔ پھر ان کے پٹھوں کا جائزہ لیا۔ نسخہ لکھا۔ ایک دو ٹیسٹ تجویز کیے۔ جاتے جاتے وہ اچانک مڑے۔ ''مجھے اُمید ہے کہ تم ہندوستان سے اچھی یادیں لے کر لوٹے ہوگے۔''

''جی ہاں، بہت سی یادیں ہیں۔'' اس نے زیرِ لب کہا۔

بوڑھا شخص کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''محبت میں ناکامی لوگوں کو توڑ دیتی ہے، مگر اس نے تمہیں ایک بہتر انسان بنا دیا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم ایک اچھے شوہر ثابت ہوگے۔''

''شوہر!'' وہ چونکا۔

''ہاں میاں۔ تمہاری اماں لڑکی دیکھ چکی ہیں۔ یہی اطلاع دینے تو میں یہاں آیا ہوں۔ علاج تو بہانہ تھا۔'' یہ کہہ کر مسٹر ناصر کمرے سے نکل گئے۔

اس نے اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔

☆......☆

سر پر اسکارف باندھے، بادام کے درخت کے نیچے بیٹھی حلیمہ اسے سیدھی سادہ ملائی لڑکی لگی۔

بلاشبہ خوش شکل اور بااخلاق۔ مگر اس میں مظفر کو وہ شعلہ نظر نہیں آیا، جو حصولِ مقصد کے لیے انسان کو بےکل رکھتا ہے۔ وہ جذبہ، جو اردگرد طاری بےعملی کو توڑ کر فرد کو جدوجہد پر اکساتا ہے۔ ہجوم میں اپنی منفرد شناخت بنانے کی آرزو جگاتا ہے۔

تو اسے لڑکی میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ مگر کوئی ایسا اعتراض بھی نہیں تھا۔ وہ اچھے نین نقش کی تھی۔ سلیقے سے گفتگو کرتی۔ مظفر کو یقین تھا کہ وہ اس کے اہلِ خانہ کا اچھی طرح خیال رکھے گی اور اس کے خوابوں کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گی۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ حلیمہ وہ قوت ہے، جو اُسے افلاک کی بلندیوں تک لے جانے کے لیے زمین تیار کرے گی۔ اُس نے ابھی اس لڑکی کو پہچانا نہیں تھا۔

پہلی حیرت سے مظفر کا اُس روز سامنا ہوا جب اسپتال

کے سامنے سے فلسطین کے حق میں نکالا جانے والا ایک جلوس گزرا۔ جلوس کی قیادت کرتی پُرجوش لڑکی کو دیکھ کر وہ چونکا کہ وہ اسے انتہائی مانوس لگی۔ جب جلوس نظروں سے اوجھل ہوگیا، تب اندازہ ہوا کہ یہ وہی لڑکی ہے، جو اس روز بادام کے درخت سے گرتے شگوفوں میں بیٹھی تھی۔

اگلی بار ساحل سمندر پر تحیر انتظار کر رہا تھا۔ وہ کچھ دوستوں کے ساتھ لہروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ نظر نوجوانوں کے ایک گروہ پر پڑی۔ ہاتھوں میں سفید دستانے۔ سیاہ تھیلے۔ وہ ساحل پر پڑا کچرا اکٹھا کر رہے تھے۔ سب سے آگے ایک لڑکی تھی، جسے اُس نے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا۔

اگلی بار اپنا تجسس مہمیز کرنے کے لیے اسے امریکی قونصل خانے کے پہلو سے گزرنا پڑا جہاں طلبہ کا ایک گروہ یادداشت پیش کرنے آیا تھا۔ ہاں وہ حلیمہ تھی اور بلا کی خوبصورت لگ رہی تھی۔

دھند میں لپٹے لائٹ ہاؤس سے لوٹنے کے بعد پہلی بار مظفر کے دل میں وہ کونپل پھوٹی جو جلد درخت کی شکل اختیار کرنے والی تھی۔

گھر آ کر بھی وہ اُسی دوشیزہ کے بارے میں سوچتا رہا جس نے فلسطینی بچوں کی فلاح و بہبود کا خواب آنکھوں میں سجا لیا تھا۔ بے خیالی میں نظر ایک پرانے میگزین پر پڑی، جس میں ''میر'' نامی خلائی اسٹیشن کا تذکرہ تھا۔

84ء میں قائم ہونے والا یہ اسٹیشن ہنوز خلاؤں میں تیر رہا تھا۔ اور اس اسٹیشن میں ایک خلاباز گزشتہ 14 ماہ سے مقیم تھا۔ نام تھا والری پلیا کوف۔ وہ شخص کسی ایک اسٹیشن میں طویل ترین وقت گزارنے کا ریکارڈ قائم کر چکا تھا۔

مظفر نے آرٹیکل بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ پلیا کوف اب لوٹنے کی تیاری کر رہا تھا۔ مضمون نگار کے مطابق اس کے آبائی وطن روس میں اُس کے استقبال کی تیاری شروع ہوگئی تھی۔

''عرصے بعد روس سے متعلق کوئی اچھی خبر ملی۔'' مظفر نے سوچا۔ ''ورنہ سوویت یونین کے زوال کے بعد تو یہ ریاست اپنے پیروں پر ڈھے گئی تھی۔''

مظفر ٹھیک ہی سوچ رہا تھا۔ سرد جنگ ختم ہوتے ہی روس کے کارخانوں میں آگ بجھ گئی۔ ایک ہولناک بگاڑ نے جنم لیا۔ نظریات متروک ہوئے۔ لینن کے مجسمے اتار دیے گئے۔ سرمایہ دارانہ نظام پیر جمانے لگا۔ جو لوگ سرخ نظریات سے تاحال چمٹے تھے، انہیں اٹھا کر کباڑ خانے میں پھینک دیا گیا۔ بلندیوں اور خلائی جنگ امریکا کی جیت پر تمام ہوئی۔

مظفر کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور اس کی سنہری کرنیں چوکھٹ پر سمٹ رہی تھیں۔ ایسے میں کہیں بلندیوں پر گھن گرج ہوئی۔ وہ ایک طیارہ تھا جو دھوئیں کی لکیر چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ مظفر نے ہاتھ بڑھا کر اُسے مٹھی میں بند کر لیا اور اگلے ہی پل اپنی بچگانہ حرکت پر جھینپ گیا۔

طیارہ مٹھی سے نکل گیا تھا۔ بس دھوئیں کی لکیر رہ گئی اور تب جامع مسجد سے مؤذن کی آواز بلند ہوئی۔

☆......☆

لائٹ... کیمرا... ایکشن!

وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ جوس کا گلاس اٹھا کر ایک ہی سانس میں حلق میں اتار لیا۔ پھر کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''او کے۔ کٹ!'' ڈائریکٹر کی آواز سنائی دی۔ ''بھئی بہت عمدہ مظفر۔ یار ڈاکٹری چھوڑ۔ تجھ میں ایک اچھا ماڈل چھپا ہے۔''

مظفر نے قہقہہ لگایا۔ ''بھائی، تم سے دوستی ہے، اس لیے چلا آیا۔ ورنہ یہ جھنجٹ کون پالے۔''

''یہ لیجیے۔'' ڈائریکٹر نے قہقہہ لگایا۔ ''لوگ ٹی وی پر آنے کے لیے مرے جا رہے ہیں اور نواب صاحب اُسے جھنجٹ کہہ رہے ہیں۔ خیر، جناب اس جھنجٹ کی ادائیگی جلد ہو جائے گی۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''جناب، ادائیگی تو ہوگی۔ آپ کو ضرورت نہ ہو، تو کسی فلاحی تنظیم کے لنگر خانے میں دے دیں۔''

شوٹ سے لوٹ کر مظفر اپنے کاموں میں لگ گیا۔ وہ اس واقعے کو بھول ہی گیا تھا کہ ایک روز دفتر میں رکھا فون بجا۔ دوسری طرف اُس کے والد تھے۔

''بھئی ماڈلنگ کا شوق تھا تو پہلے بتاتے، ایسے ہی تمہیں اتنا پڑھایا لکھایا۔''

پہلے تو وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکا۔ جب اندازہ ہوا کہ آج نشر ہونے والا اشتہار زیر بحث ہے تو جھینپ گیا۔ ٹیلی فون کالز کا تانتا بندھ گیا۔ دوست، رشتے دار، اسپتال کے ساتھی۔ ہر کوئی مبارک باد دے رہا تھا۔

شام میں ڈائریکٹر کا فون آیا۔ وہ اُسے ایک اور اشتہار میں کاسٹ کرنا چاہتا تھا۔

''کیا دیوانے ہو گئے ہو۔'' وہ جھلا گیا۔

''دیوانے تو لوٹ ہو گئے ہیں تمہارے۔ اور دیکھو نہ مت کرنا۔ ایجنسی نے، تمہیں ہی کاسٹ کرنے کے لیے کہا ہے۔ مجھ غریب پر رحم کرو۔'' یہ کہہ کر اُس نے فون کاٹ دیا۔ مظفر ہیلو ہیلو ہی کرتا رہ گیا۔

کچھ دیر بعد پھر فون بجا۔ یہ کال آج موصول ہونے والی تمام کالز سے زیادہ حیران کن تھی۔

لائن کی دوسری طرف شہر سلنگور میں واقع نیشنل یونیورسٹی آف ملائشیا کا ڈائریکٹر تھا۔ ''مسٹر مظفر۔ اچھا ہوا آپ سے بات ہو گئی۔ بہت دیر سے رابطے کی کوشش کر رہا ہوں، مگر...''

''اوہ، کیسے ہیں جناب۔ وہ بس آج لائنز کچھ مصروف تھیں۔'' اُس نے خجل ہو کر کہا۔

''سمجھ سکتا ہوں جناب۔ دراصل مجھے آپ سے بہت اہم بات کرنی تھی۔ میں یونیورسٹی آف ملائشیا کی جانب سے آپ کو ملازمت کی پیش کش کرنا چاہتا ہوں۔''

''واقعی۔'' وہ اچھل پڑا۔ اس درس گاہ کا شمار ملک کے بہترین اداروں میں ہوتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ ایک دن اُس تک رسائی حاصل کر لے گا مگر یہ سب اتنی جلدی ہوگا، اس کی وہ توقع نہیں کر رہا تھا۔

ڈائریکٹر کی آواز اُسے لمحۂ حال میں لے آئی۔ ''نیا سیشن شروع ہو رہا ہے۔ میں چاہوں گا کہ آپ آ کر ہم سے مل لیں۔''

اگلے ہی دن اس کی کار فراٹے بھرتی یونیورسٹی کی سمت جا رہی تھی، جو کوالالمپور سے 35 کلومیٹر دور تھی۔ مختصر سی میٹنگ میں تمام معاملات طے پا گئے۔ اچھی تن خواہ۔ بہترین مراعات۔

لوٹتے وقت وہ بہت خوش تھا۔ گھر پہنچا ہی تھا کہ فون بجا۔ دوسری طرف اس کا دوست تھا۔ ''کیوں مجھ غریب کے پیٹ پر لات مار رہے ہو۔ چلے آؤ۔ دو گھنٹے کا شوٹ ہے۔''

''مگر بات یہ ہے دوست...''

ڈائریکٹر نے بات کاٹ دی۔ ''تو چاہتا ہے کہ تیری بھابی مجھے گھر سے نکال دے۔ میں کچھ نہیں سنوں گا۔ شیو کرو اور سیدھے چلا آ۔''

اس نے گہرا سانس لیا اور ریسیور رکھ دیا۔ ''بچپن کے دوست بھی عذاب ہوتے ہیں۔''

دو گھنٹے کا کہہ کر اسے رجھایا گیا تھا۔ شوٹ ساری رات جاری رہی۔ جب وہ صبح تھکا ہارا گھر پہنچا تو بستر پر جانے سے پہلے ایک اور خبر سے سامنا ہوا۔

باورچی خانے میں ماں چلا رہی تھی۔ ''بہت کر لی تو نے آوارہ گردی۔ میں نے تیری شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''مگر کیوں...'' وہ بوکھلا گیا۔ ''میرا مطلب، کس سے۔''

''اسی حلیمہ سے۔ دیکھو وہ لڑکی مجھے پسند ہے۔ اور میں ناں نہیں سنوں گی۔''

وہ نہ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر اسے کچھ وقت درکار تھا۔

''میرے خیال میں...'' اس نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال منگنی ٹھیک رہے گی۔''

عورت نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ بوڑھے نے آنکھ ماری کہ لڑکا راضی ہے، اب خدمت کرو۔

''ٹھیک ہے۔ منگنی سہی۔ جا اب تھوڑا آرام کر لے۔''

وہ دھپ سے بستر پر گرا اور گرتے ہی سو گیا۔

☆......☆

وہ ققنس تھا، جو اپنی راکھ سے جی اٹھا۔

نیا ہزاریہ روس کے لیے نئے سفر کا آغاز تھا۔ پوتن نے منہدم ہو چکی ریاست کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کا عہد باندھ لیا مگر اس کام کے لیے جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت تھی۔ اس سرد مہر شخص نے غضب کا دماغ پایا تھا۔ معاشی استحکام پہلی ترجیح۔ اس نے روس کے بہترین دماغوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا۔ پڑوسی ممالک سے رابطے شروع کیے۔ دوستوں کا اعتماد بحال کیا۔ یوں روس کے زخم خوردہ جسم میں جان پڑنے لگی۔ وہ اپنی راکھ سے دوبارہ جنم لینے لگا۔

روس اور ملائشیا میں تجارتی روابط تو پہلے سے تھے، مگر 2003 کے اوائل میں دونوں ممالک کے اعلیٰ عہدے داروں کے درمیان ایک خفیہ میٹنگ ہوئی۔ ایک بڑا معاہدہ ہونے والا تھا۔ مہاتیر محمد کی حکومت نے اپنی ایئرفورس کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انہیں لڑاکا طیارے درکار تھے۔ نظر انتخاب دو انجن والے Su-30 پر ٹھہری، جس کی رفتار نے اس زمانے میں تہلکا مچا رکھا تھا۔ روسی ساختہ یہ طیارہ 96ء میں مارکیٹ میں آنے کے بعد سے خبروں میں تھا۔ ایک جہاز کی قیمت 40 ملین ڈالر۔ ملائی حکومت اٹھارہ جہاز خریدنے کو تیار تھی۔ یہ ایک شان دار معاہدہ تھا۔ کروڑوں ڈالر کا سودا جسے روس کسی صورت کھونا نہیں چاہتا تھا۔

تمام معاملات طے پا گئے۔ معاہدے پر دستخط ہونے کا وقت تھا اور تب... ملائی وزیر خزانہ نے روس کے سامنے ایک کڑی شرط رکھی، جو تیزی سے صحت کھوتے مہاتیر محمد کے لیے طیاروں کے سودے جتنی اہم تھی۔ دراصل کئی برس سے ملائشیا کے بہترین ذہنوں میں ایک منصوبہ پنپ رہا تھا اور انھوں نے سودے کے لیے وقت کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔

روس کی جانب سے انکار کے امکانات لگ بھگ نہ ہونے کے برابر تھے مگر اُس وقت ملائی وفد شدید تناؤ کا شکار ہو گیا، جب روسیوں نے مذاکرات ملتوی کر دیے۔

روسی وزیر خزانہ نے اپنے خلائی پروگرام کے ڈائریکٹر سے رابطہ کیا۔ شرط سن کے ایک لمحے کو وہ ٹھٹکا گیا۔ سوچ بچار کے بعد انہیں صدر روس سے بات کرنے کا مشورہ دیا گیا۔

اگر آج پوتن کو دنیا کا طاقتور ترین شخص کہا جا رہا ہے، تو یہ بے سبب نہیں۔ دراصل یہ طاقت اس کی بے پناہ ذہانت کی دین ہے۔ وہ بڑے بڑے مسئلے چٹکیوں میں حل کر لیا کرتا تھا۔

تو ملائی حکام کی شرط سن کر وہ ضرور مسکرایا ہوگا۔

''ہاں۔'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ہوگا۔ ''ہمیں شرط منظور ہے۔''

اشارہ ملتے ہی Su-30 طیاروں کی خرید کا معاہدہ طے پا گیا۔

ملائی وزیر خزانہ نے فوراً ٹیکنالوجی منسٹر جمال الدین بن محمد کو فون کیا۔ ''پریس کانفرنس کے لیے تیار ہو جائیں۔''

☆......☆

ہواؤں میں بہار کی خبر تھی اور درختوں پر پھول کھلنے کا موسم آ گیا۔ ملائشیا کے لیے وہ ایک پُرمسرت دن تھا۔ ایسا دن، جو کئی برسوں تک اُن کی یادوں کو مہکانے والا تھا۔

مسرت میں، حیرت کی آمیزش کے ساتھ احساس تفاخر بھی تھا۔ اور کیوں نہ ہو، ایک عظیم خواب کی تکمیل کا لمحہ آ گیا تھا۔ پہلے ملائی باشندے کا خلا میں جانے کا راستہ ہموار ہونے لگا تھا۔

یہ موقع اتنا اہم تھا کہ وزیر اعظم نے خود اُس کا اعلان کیا۔ ''میرے ہم وطنو۔ مبارک ہو۔ رائل ملائشیا ائرفورس کے لیے اٹھارہ انتہائی جدید Su-30 کی خریداری کا معاہدہ طے پا گیا ہے۔ ساتھ ایک خبر اور ہے۔''

عوام کو اِس اعلان نے ناقابلِ مزاحمت جوش سے بھر دیا کہ نیشنل اسپیس ایجنسی کے تحت حکومت روس کے اشتراک سے Angkasawan نامی پروگرام شروع کیا جا رہا ہے۔ روسی حکومت دو ملائی خلابازوں کو تربیت فراہم کرے گی اور پھر ان میں سے.... ایک شخص انٹرنیشنل اسپیس اسٹیشن میں قدم رکھنے کا اعزاز حاصل کرے گا۔

''تو بھائیو، جلد ایک ملائی کائنات کی وسعتوں میں قدم رکھنے کو ہے۔'' وزیر اعظم نے کہا۔

وہ ایک تحیر خیز لمحہ تھا۔ کئی ملائی فرطِ جذبات سے رو پڑے۔

ٹیکنالوجی منسٹر جمال الدین ابن محمد نے مزید تفصیلات بتائیں۔ ''اس کا مقصد بین الاقوامی دنیا میں اپنی شبیہ بہتر بنانا نہیں، بلکہ اپنی نئی نسل کو سائنس اور ریاضی جیسے مضامین کی جانب راغب کرنا ہے۔ ہمیں آزاد ہوئے پچاس برس بیت چکے ہیں اور اس سے اچھا تحفہ اور کیا ہوگا کہ ایک ملائی اب خلا میں جائے۔''

اس نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ پھر گویا ہوا۔ ''ہمیں ملائشیا کے لیے ایک رول ماڈل کی تلاش ہے، جو نئی راہوں کی نشان دہی کرے۔''

پریس کانفرنس تمام ہوتے ہی ہر گھر، ہر محلے میں بحث چھڑ گئی۔ چائے خانوں، ریستورانوں میں مکالمے جاری تھے۔ لوگ پُرجوش تھے۔ اس رات کوئی نہیں سویا۔ ہر سو جشن تھا۔

مگر اِس شور سے دور، جشن سے پرے ایک شخص آنکھیں موندے بستر پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ کھڑکی سے جھانکتی چاندنی دیواروں پر بکھری تھی، جہاں نیل آرمسٹرنگ کی تصویر تھی، جہاں ایک خلائی گاڑی تھی، جہاں ایک راکٹ شعلے چھوڑتا فضا میں بلند ہو رہا تھا۔

شیخ مظفر شکور اس وقت حالتِ دعا میں تھا مگر وہ کسی خواہش کی تکمیل کا طلب گار نہ تھا، وہ تو اس پُرمسرت موقع کے لیے قدرت کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

☆......☆

ٹیلی فون بجا۔

دوسری طرف ٹیکنالوجی منسٹر تھا۔ ڈائریکٹر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''جی جمال الدین صاحب۔ حکم۔''

''جناب۔ مزاج بخیر ہیں۔ بھئی آپ کو اسپیس پروگرام کی تو خبر ہے ہی۔ اب ہم اسپیس ایجنسی کو ایک اہم ذمے داری سونپ رہے ہیں۔''

''حکم کیجیے۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''اس قومی مشن کے لیے آپ کو دو خلا باز منتخب کرنے ہوں گے، جو روس میں تربیت حاصل کریں گے۔ ان میں سے کوئی ایک ہی انٹرنیشنل اسپیس اسٹیشن جانے والے راکٹ میں سوار ہوگا۔ تین کروڑ افراد میں سے صرف ایک۔'' وزیر نے وقفہ لیا۔ ''آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بھاری ذمے داری ہے۔''

''بالکل۔'' ڈائریکٹر نے اعتماد سے کہا۔ ''بس وہ شرائط بتادیں، جن کی بنیاد پر امیدواروں کو پرکھا جانا ہے۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر وزیر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ ملائشیا کا حقیقی چہرہ ہونا چاہیے۔ ایک قابلِ تقلید انسان۔''

اس گفتگو سے بہت دور، کوالالمپور کے ایک بھرے پرے علاقے میں وہ انسان، جسے بین الاقوامی دنیا میں ملائشیا کا نیا چہرہ بننا تھا، ایک بوڑھی عورت کو سڑک پار کروا رہا تھا۔ اور اس عمل کی انجام دہی کے بعد وہ تقریباً دوڑتا ہوا اسپتال کی سمت بڑھنے لگا۔

شیخ مظفر کو لیٹ ہونا گوارا نہیں تھا۔

اسپیس پروگرام سے متعلق جاری تجزیوں اور تبصروں میں اس وقت تیزی آگئی، جب ٹیکنالوجی منسٹر نے ایک گرم دوپہر میونسپل کارپوریشن کی عمارت کے کھچا کھچ بھرے ہال میں ملائی اسپیس ایجنسی کو سونپی جانے والی ذمے داری کا اعلان کیا۔ اُس نے ویب سائٹ پر اپ لوڈ کردہ فارم کا ذکر کرتے ہوئے واضح کیا کہ امیدواروں کو کڑے امتحان سے گزرنا پڑے گا۔

''لاکھوں میں سے کسی ایک ہی کو یہ سنہری موقع ملے گا۔''

عوام کا ردِعمل توقعات سے کئی گنا زیادہ تھا۔ ہزاروں افراد نے فارم ڈاؤن لوڈ کیا۔ اگلے روز اسپیس ایجنسی کی ویب سائٹ بڑھتے دباؤ کی وجہ سے بند ہوگئی۔ اسے بحال کرنے سے قبل درخواست فارم کو مختلف حکومتی سائٹ پر اپ لوڈ کرنا پڑا، ورنہ وہ پھر جواب دے جاتی۔

اڑتالیس گھنٹے بعد جب ایجنسی کے ڈائریکٹر نے ویب سائٹ پر نظر ڈالی، تو سر پیٹ لیا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک ہفتے بعد ان کے پاس اتنی درخواستیں ہوں گی کہ پورا دفتر کاغذوں سے بھر جائے گا۔

درخواستوں کی آمد کا سلسلہ اگلے کئی روز جاری تھا۔ البتہ اس انسان نے جو کچھ ماہ بعد خلا میں اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہونے والا تھا، ابھی تک درخواست روانہ نہیں کی تھی۔ وہ قدرت کے منصوبے سے بے خبر مریضوں کے علاج معالجے میں لگا تھا۔

ایک ڈرامائی تبدیلی کے لیے قدرت کی غیر مرئی ڈور حرکت میں آئی۔ چھوٹے چھوٹے واقعات رونما ہوئے، جن کی گہرائی میں ترتیب پوشیدہ تھی۔

مظفر کی منگیتر حلیمہ نے خواب میں چاند گاڑی دیکھی۔ بیدار ہونے کے بعد ابھی وہ خواب کی تفہیم میں الجھی تھی کہ ایک غیر متوقع فون کال موصول ہوئی۔ شہر کے مشرقی علاقے میں فلسطین پر آج دوپہر ایک سیمینار ہو رہا تھا۔ منتظمین خواہش مند تھے کہ وہ اس میں شرکت کرے۔ مقررہ وقت پر لڑکی گھر سے نکلی تو مطلع صاف تھا۔ مگر سیمینار سے نمٹ کر جب آسمان میں سیاہ دبیز بادل نظر آئے، تو وہ بڑبڑائی۔ ''اس موسم میں بارش۔''

ابھی ٹیکسی میں سوار ہوئی تھی کہ بادل زور سے گرجا۔ کچھ ہی دیر میں اندھیرا چھا گیا۔ تیز ہواؤں کے ساتھ مینہ برسنے لگا۔ کئی درخت اکھڑ گئے۔ اسے ٹیکسی چھوڑنی پڑی۔ جب وہ ایک چھپر تلے کھڑی بھیگ رہی تھی، اچانک انکشاف ہوا کہ اس کا متوقع سسرال بس چند گلیوں پرے ہے۔

بوڑھا محی الدین اسے دیکھ کر یوں مسکرایا، جیسے وہ اس کی آمد کی توقع کر رہا ہو۔ مظفر کی ماں نے اسے گلے لگالیا۔ اپنے کپڑے دیے۔ بوڑھا اسے گھر دکھانے لگا۔ وہ مظفر کے کمرے میں بھی گئے، جہاں لگی تصاویر اس کے بچپن کی کہانی بیان کر رہی تھیں۔

یکبارگی اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ بھولا ہوا خواب یاد آتے ہی اسے آج کے عجیب و غریب واقعات میں ترتیب نظر آنے لگی۔

''کیا مظفر نے اسپیس پروگرام کے لیے اپلائی کیا ہے؟'' اس کا یہ سوال ساس کو غیر ضروری لگا کہ وہ اپنے بیٹے کو ایک معالج کے روپ میں جانتی تھی۔ یہ لڑکے کا باپ تھا، جس نے کسی دانا کی طرح گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اگر نہیں کیا، تو کرنا چاہیے۔''

اس طوفانی دوپہر جب اسپتال میں مظفر کو اپنی منگیتر کی فون کال موصول ہوئی، تو پہلے وہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ اور جب سمجھ گیا، تو خود سے سوال کیا کہ آخر اس نے اب تک اس پروگرام کے لیے درخواست کیوں نہیں دی۔ ''یہ کام تو مجھے پہلے کرلینا چاہیے تھا۔''

جب وہ فارم ڈاؤن لوڈ کرتے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا، تب اسے خیال آیا کہ یہ پہلی بار تھا، جب اس نے اپنی منگیتر سے براہِ راست بات کی۔ اور کتنی عجیب بات ہے کہ اس دوران میں محبت سے متعلق دونوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

دو گھنٹے بعد اس نے درخواست تمام ضروری کاغذات کے ساتھ متعلقہ ایڈریس پر روانہ کردی۔ بادل آسمان سے یوں غائب ہوگئے تھے، جیسے وہ کبھی وہاں رہے ہی نہ ہوں۔ سورج پھر نمودار ہوگیا۔

☆......☆

قدرت کے منتخب کردہ شخص کی درخواست موصول ہوچکی تھی، مگر ابھی وہ ہزاروں درخواستوں میں چھپی بیٹھی تھی۔

جدید ٹیکنالوجی کی مدد لی گئی۔ درخواستوں کے پرنٹ لینے کی بجائے کمپیوٹر ہی پر ایک خودکار نظام نے ان کا جائزہ لیا۔

ساڑھے گیارہ ہزار افراد۔ کو چھلنی باریک تھی اور شرائط کڑی، اس کے باوجود سیکڑوں درخواستیں ڈائریکٹر کی میز تک پہنچنے میں کامیاب رہیں۔ یہ تمام امیدوار اعلیٰ تعلیم یافتہ، بلا کے ذہین اور چاق و چوبند تھے۔

عملہ اگلے چوبیس گھنٹے تک مصروف رہا۔ کوئی شخص گھر نہیں گیا۔ آخر دو سو امیدواروں کا انتخاب کیا گیا۔ عملے نے ان افراد کو خوشخبری بھرے فون کیے۔ انگریزی احرفِ تہجی کے اعتبار سے مرتب کردہ فہرست میں شیخ مظفر شکور، وہ آخری شخص تھا، جسے انہوں نے کال کی۔

اپنے رب کا شکریہ ادا کرنے کے بعد جسے مظفر نے پہلا فون کیا، وہ اس کی منگیتر تھی۔ اب محبت ان پر سایہ فگن تھی۔

مظفر نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ ذہانت اور قابلیت کی جانچ کے کڑے مراحل عبور کر جائے گا۔ وہ تو دو سو افراد میں منتخب ہونا ہی اپنے لیے اعزاز سمجھ رہا تھا مگر جب موسم سرما کی پہلی شام اتری اور شہر میں سرد ہواؤں نے راستہ تلاش کیا، حکومت نے ان دس افراد کا اعلان کردیا، جنہوں نے دشوار گزار مرحلہ عبور کرلیا تھا۔

مظفر کا نام ان میں شامل تھا۔

جب باپ نے گلے لگاتے ہوئے اپنے متحیر بیٹے کو کہا۔ ''اب صرف ایک مرحلہ باقی ہے۔'' ٹھیک تب اسے اپنی کہی ہوئی ایک بات یاد آگئی۔ ''اگر آپ تخیل کی دنیا میں یقین کا بیج بوئیں اور اس کی آبیاری کریں، تو اس کا پھل حقیقت کی دنیا میں آپ کو ضرور ملے گا۔''

آگاہی کے اُس لمحے کے بعد وہ ہر آنے والے دن اس یقین کو پختہ کرتا رہا کہ تربیت کے لیے روسی شہر اسٹار سٹی جانے والے دو ملائی نوجوانوں میں ایک... شیخ مظفر شکور ہوگا۔

پہلے فیض خالد کے نام کا اعلان ہوا۔ اور یہ متوقع تھا۔ ملائی آرمی کا وہ چھبیس سالہ سپاہی کسی چیتے کی طرح پھرتیلا اور چوکس تھا۔ مسکراتے چہرے کے پیچھے عزم کا منہ زور دریا تھا۔ روشن آنکھوں میں آہنی ارادے چھپے تھے۔ وہ خلاؤں کی تسخیر کا خواب لے کر پیدا ہوا تھا۔

دوسرے امیدوار کے نام کا اعلان خاصی تاخیر سے ہوا۔ اُس وقت تک میڈیا خالد کا انٹرویو کرچکا تھا اور وہ اپنی بذلہ سنجی سے ملائشیا کو گرویدہ بنا چکا تھا۔

جب اسپیس ایجنسی نے دوسرے امیدوار کا نام ظاہر کیا، بہت رات ہوچکی تھی۔ چھٹکو پریس چھاپی اور اخبارات پریس میں چلے گئے۔ خبر اگلی صبح اتنی تاخیر سے نشر ہوئی کہ شہری روزمرہ کے کاموں کے لیے گھر سے نکل گئے تھے۔

شام ڈھلے جب میڈیا کو دوسرے کامیاب اُمیدوار کا انٹرویو کرنے کا خیال آیا، ٹیکنالوجی منسٹری کی جانب سے مظفر اور خالد کو سامان باندھنے کا حکم جاری ہوچکا تھا۔ انہیں اگلی صبح روس روانہ ہونا تھا۔

میڈیا کو اس کے ماں باپ اور اسپتال کے ساتھیوں سے بات کرکے رپورٹ مکمل کرنی پڑی، جس کا سب سے نمایاں حصہ وہ تھا، جب کیمروں نے اس کے گھر کی دیوار پر چسپاں نیل آرم اسٹرنگ کی تصویر کو فلمایا۔

☆......☆

دھماکا ہوتے ہی منظر سرخ روشنیوں میں نہا گیا۔

خلائی جہاز شہابیوں کی زد میں آگیا۔ خطرے کا سائرن کان پھاڑ رہا تھا۔ مسلسل جھٹکوں کے دوران میں آکسیجن گھٹنے کا احساس ہولناک تھا۔ مظفر کا دم گھٹ رہا تھا۔ زندہ رہنے کا اکلوتا امکان خلائی جہاز کو خطرے کے علاقے سے باہر نکالنا تھا۔

یہ ہولناک منظر خلا کا نہیں تھا۔ ابھی وہ زمین ہی پر تھے۔ وہ ایک مصنوعی صورتِ حال تھی۔ روسی خلائی حادثوں کا خاصا تجربہ رکھتے تھے۔ وہ Soyuz-TMA نامی خلائی گاڑی میں سوار ہونے والے خلابازوں کو بدترین خطرات سے نمٹنے کی مشق کروا رہے تھے۔ مشقوں کا یہ سلسلہ اٹھارہ ماہ جاری رہنے والا تھا۔

کچھ لوگ سمجھ رہے تھے کہ روس میں مظفر اور خالد مزے

میں ہوں گے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اٹھارہ ماہ انتہائی کٹھن تھے۔ انہیں بدترین صورتِ حال میں زندہ رہنے، موت کے روبرو ہونے اور اسے شکست دینے کی مشق اتنی بار کروائی گئی کہ انہوں نے خوف کا لفظ اپنی لغت سے خارج کر دیا۔

مظفر کی خالد سے گاڑھی چھننے لگی تھی۔ وہ اسے فوج میں گزرے دنوں کی کہانیاں سناتا، مظفر کرناٹک کے قصے بیان کرتا۔ وہ بھول گئے تھے کہ ابھی اُن کے درمیان ایک مقابلہ باقی تھا۔ قسمت کسی ایک پر مہربان ہونے والی تھی۔ اور جب وہ لمحہ آیا، تو اسے پہلی مبارک باد دینے والا خالد ہی تھا۔

''تم میرے بھائی کی طرح ہو۔'' اس نے مظفر کے گلے لگتے ہوئے کہا تھا۔ ''مظفر کی خلا میں موجودگی کا مطلب ہے کہ خالد وہاں موجود ہے۔''

جولائی 2007 میں جب روسی ساختہ Soyuz TMA میں سوار ہونے والے خوش قسمت ملائی نوجوان کے نام کا اعلان کیا گیا، علیمہ کے ماں باپ نے بوڑھے باپ کو فون کر کے کہا۔ ''جناب، جونہی آپ کا لڑکا لوٹے، شادی کی تاریخ طے کرلیں۔ ہم ایسے گوہر نایاب کو کھونا نہیں چاہتے۔''

☆......☆

ایک جانب مظفر کی کامیابی کے شادیانے بج رہے تھے، دوسری طرف ناقدین چھریاں تیز کر رہے تھے۔

آغاز ایک انگریزی اخبار کی رپورٹ سے ہوا، جس میں ملائی خلائی پروگرام کو پیسوں کا ضیاع قرار دیتے ہوئے اس میں بھاری گھپلوں کا انکشاف کیا گیا۔ حکومت اس الزام سے نمٹنے کی تیاری کر رہی تھی کہ ایک اور اخبار نے منتخب ملائی پر پھبتی کسی کہ وہ کوئی خلا باز نہیں، بس ایک سیاح ہے، جس کی وجاہت اور کسرتی بدن کو حکومت اگلی الیکشن مہم میں بطور اشتہار استعمال کرنے والی ہے۔

مظفر پر ہونے والی تنقید، جس نے اس کی منگیتر اور کئی دوستوں کو افسردہ کر دیا تھا، جلد دم توڑ گئی۔ پہلا بیان ملائشیا میں روسی سفیر الیگزینڈر کیرچیوے نے دیا۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا۔ ''مظفر کڑی تربیت سے گزرا ہے اور خلا بازوں والی تمام مہارتوں کا حامل ہے۔'' اس نے ملائی نوجوان کو کسی بھی امریکی یا برطانوی خلا باز کے ہم پلہ قرار دینے پر اصرار کیا۔

کچھ روز بعد ناسا کے ایک سابق افسر ربرٹ گبسن نے، جو مظفر کے تربیتی پروگرام میں شامل رہا تھا، اپنے انٹرویو میں اسے شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے

خلا میں جانے والے مسلمانوں کا تذکرہ

ملائشیا سے تعلق رکھنے والا شیخ مظفر شکور خلا میں جانے والا نواں مسلمان تھا۔ اس سے قبل آٹھ مسلمان یہ اعزاز اپنے نام کر چکے ہیں۔ پہلا شخص سعودی عرب سے تعلق رکھنے والا سلطان سلیم السعود تھا، جس نے 1985 میں کششِ ثقل سے آزادی کا انوکھا تجربہ کیا۔ تین برس بعد شامی باشندے محمد فارس نے خلا کے لیے رختِ سفر باندھا۔ سوویت یونین سے تعلق رکھنے والے موسیٰ منارف نے تو مجموعی طور پر خلا میں 541 دن گزارے۔ اس کے بعد افغانستان کے عبدالاحد محمد، روس کے توکتار آوبا کیروف اور قازقستان کے تالگات موسیٰ نے یہ اعزازات اپنے نام کیے۔

اگلے صاحب سالیوان شالیوف تھے۔ وہ بھی قازقستان ہی کا باشندہ تھا، جو دو بار (98ء اور 2004) میں خلا میں گیا۔ آٹھواں نام اہم ہے کہ اس بار کسی مسلم مرد نے نہیں، بلکہ ایک عورت نے خلا میں سفر کا خواب آنکھوں میں سجا لیا تھا۔ یہ تھی ایرانی نژاد امریکی انوشہ انصاری، جس نے 2006 میں یہ کارنامہ انجام دیا۔ اس کی یادداشتیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ انوشہ کے اگلے برس مظفر خلا میں گیا اور وہاں ماہ رمضان گزارنے اور عید منانے والا پہلا شخص ٹھہرا۔

ایک ماہر خلا باز قرار دیا۔ ''ایک خلا نورد کے لیے کوئی اور لفظ استعمال کرنا، جیسے خلائی سیاح یا مسافر اس کی توہین ہے۔ مظفر ان بہترین لوگوں میں سے ایک ہے، جن سے میری ملاقات ہوئی۔''

اس اثناء میں حکومت نے مالی گھپلوں جیسے سنگین الزام سے دو دو ہاتھ کرنے کی تیاری بھی کر لی۔ ایک بڑی پریس کانفرنس میں اعلان کیا گیا کہ ملائی خلا باز کا مقصد صرف خلا میں چہل قدمی نہیں۔ وہ انسانی خلیوں کے نمونے، دواؤں میں استعمال ہونے والے بیکٹریا اور پروٹین کرسٹل ساتھ لے جائے گا اور صفر کششِ ثقل میں اُن پر مختلف تجربات کرے گا۔ عوام کو یقین دلایا گیا کہ اگر تجربات کامیاب رہے، تو علاج

معالجے اور ادویہ سازی کی صنعت کو حیران کن فائدہ پہنچے گا۔
ایک سرکاری اہلکار جوش میں یہ بھی کہہ گیا۔ "انٹرنیشنل اسٹیشن میں شیخ مظفر ملائی کھانے تیار کرے گا اور دیگر خلا بازوں کی ہماری ذائقہ دار چائے Teh tarik سے تواضع کرے گا۔"
پریس کانفرنس کا بہت چرچا ہوا۔ توقع کے عین مطابق سنجیدہ نکات سے، زیادہ چائے کی تیاری اور ملائی کھانے زیرِ بحث رہے۔ بالآخر ٹیکنالوجی منسٹر کو سامنے آنا پڑا، جس نے واضح الفاظ میں کہا۔ "خلا میں شیخ مظفر کو چائے اور کھانوں کی تیاری سے زیادہ اہم معاملات درپیش ہوں گے۔" اس نے انسانی خلیوں اور پروٹین کرسٹل پر ہونے والے تجربات کی اہمیت اجاگر کی۔ "جناب مظفر کی انٹرنیشنل اسپیس اسٹیشن میں موجودگی کے دوران میں ملائی نوجوانوں کے لیے ایک لائیو کلاس کا اہتمام کیا جائے گا، جہاں وہ صفر کشش ثقل پر ٹھوس اور مائع کے بدلتے برتاؤ پر روشنی ڈالیں گے۔"
بلاشبہ یہ باتیں اہم تھیں۔ مگر ایک پہلو اور تھا، جس کی جانب کسی نے توجہ نہیں دی۔
یہ ایک اضطراب تھا۔ ایک خاص نوع کی بے چینی، جو مظفر کی اساطیری شہرت پر منتج ہونے والی تھی۔

☆......☆

ہاں، وہ ایک محب وطن ملائی تھا، ایک ایماندار معالج، فرماں بردار بیٹا، مگر سب سے پہلے ایک مسلمان۔ پنج وقتہ نمازی۔ پابندی سے روزے رکھنے والا، خیرات دینے والا، دوسروں کے کام آنے والا مسلمان۔ ہر سانس میں اپنے رب کو یاد رکھنا، اس کے حضور سجدہ ریز ہونا مظفر کے نزدیک اس دن کی اہم ترین سرگرمی تھی اور یہی امر اُسے بے چین کیے ہوئے تھا۔ جوں جوں سفر کی تاریخ قریب آتی گئی، بے چینی بڑھتی گئی۔
بالآخر اس نے ٹیکنالوجی منسٹر کو فون کیا جو دفتر میں بیٹھ رمضان کی آمد کا حساب لگا رہا تھا۔ نوجوان کی باتوں سے اس کا دل محبت سے بھر گیا۔ ساتھ ہی وہ حیران ہوا کہ اس نے خود اس بابت کیوں نہیں سوچا۔ منسٹر نے اسپیس ایجنسی فون کیا۔
"آپ نے میرے منہ کی بات چھین لی۔" ڈائریکٹر پُرجوش تھا۔ "ہم فوراً کام شروع کر دیتے ہیں۔"
اب اعلیٰ حکام نے قومی فتویٰ کونسل سے رابطہ کیا۔ علماء نے جب مدعا سنا، تو فتویٰ جاری کرنے سے پہلے، خلا میں جانے والے نوجوان اور اُس کی معاونت کرنے والوں کے لیے دعائیہ کلمات ادا کیے۔
علماء اور اسپیس ایجنسی کے ماہرین کے درمیان کئی نشستیں ہوئیں۔ ٹیکنالوجی منسٹر نے معاملے میں خصوصی دلچسپی لی۔ دیگر ممالک کے علماء سے بھی رابطہ کیا گیا۔ بالآخر 18 صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ تیار کیا گیا۔ حکومتی منظوری کے بعد اس کی ایک کاپی شیخ مظفر کو بھجوا دی گئی۔
اُس کتابچے کو وصول کرتے ہوئے اُس نے وہی خوشی محسوس کی جو میڈیکل کی ڈگری وصول کرتے ہوئے کی تھی۔ وہی مسرت جو خلائی پروگرام کے لیے منتخب کردہ دو سو افراد میں اپنا نام پاکر رگ وپے میں دوڑ گئی تھی۔ وہی تشکر جو اس روز محسوس کیا، جب اسے خلا میں جانے والے پہلے ملائی کے طور پر چنا گیا۔
کتابچہ ہاتھ میں تھا اور آنکھوں میں نمی تھی۔ کتابچے کا نام ساری کہانی بیان کر رہا تھا۔ "انٹرنیشنل اسپیس اسٹیشن میں اسلامی عبادات کا ہدایت نامہ!"
ہاں، جس مشکل نے اسے بے کل رکھا، جس مسئلے نے بے چین کیا، اس کا سدباب ہو چکا تھا۔
قصہ یوں ہے کہ منتخب ہونے کے بعد ہی سے مظفر کے ذہن میں یہ سوالات گردش کرنے لگے کہ وہ ہمہ وقت، تیزی سے حرکت کرتے اسپیس اسٹیشن میں قبلے کا تعین کیسے کرے گا؟ صفر کشش ثقل میں نماز کیسے ادا کی جائے گی؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کتنی بار نماز ادا کرے گا۔ مسلمان چوبیس گھنٹے میں پانچ بار رب کے حضور جھکتا ہے، دن کا تعین زمین کی محوری اور مداری حرکت سے ہوتا ہے، مگر اسپیس اسٹیشن تو یہ فاصلہ ہر 90 منٹ میں طے کرلے گا۔ یعنی زمین کی حرکت کا کلیہ اسٹیشن پر لاگو کیا جائے، تو ہر 90 منٹ بعد ایک نیا دن ہوگا۔
علماء نے خوب غور وخوص کے بعد فتویٰ دیا کہ شیخ مظفر اسپیس اسٹیشن میں جہاں دن اور رات کی تفریق مٹ جاتی ہے، نماز ادا کرنے کے لیے قازقستان کے اوقات کار پیش نظر رکھے۔ جب اُدھر موذن فلاح کے لیے پکارے تو سجدے میں جھک جائے۔
صفر کشش ثقل میں پانی سے وضو کرنا ناممکن ہے، اس کام کے لیے گیلا تولیہ استعمال کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ وہ رکوع اور سجدے کا پابند نہیں کہ خلا میں تیرتے ہوئے ایسا کرنا غیر امکانی ہے۔ وہ نیت باندھنے سے قبل قبلہ رو ہوجائے۔ آیات پڑھتا ہوا اشارے سے تمام ارکان ادا کرسکتا ہے۔

ملائشیا کے اسلامک ڈیولپمنٹ کے ترجمان نے ایک خصوصی پریس کانفرنس میں کتابچے کی تفصیلات بتائیں۔

”اس کا روسی اور عربی کے علاوہ انگریزی میں بھی ترجمہ کیا گیا اور تمام زبانوں کے علماء نے اس کی توسیع کرتے ہوئے اسے قابلِ تعریف ٹھہرایا ہے۔“

ترجمان نے یہ بھی کہا کہ شیخ مظفر ماہ رمضان کے آخری عشرے میں خلا میں جائیں گے، سفر میں ہونے کی وجہ سے انہیں رعایت ہے، وہ بعد میں روزے پورے کرسکتے ہیں لیکن اگر وہ روزہ رکھتے ہیں، تو اس پر اسٹیشن کی حرکت کا کلیہ لاگو نہیں ہوگا۔ وہ قازقستانی شہر بائیکونور کے اوقات کے مطابق سحری اور افطاری کریں گے۔ ”یوں تو ان پر کوئی شرط عائد نہیں، مگر مجھے یقین ہے کہ وہ خلا میں روزہ رکھنے والے پہلے مسلمان کا اعزاز حاصل کرنے کا موقع جانے نہیں دیں گے۔“

اس جملے پر ٹی وی سیٹ کے سامنے بیٹھا مظفر مسکرایا۔ ”مظفر اپنے رب کا فرماں بردار ہے۔ اور اس کے عطا کردہ موقع سے منہ موڑنا حماقت ہوگی۔“

☆......☆

وہ ایک طلسماتی لمحہ تھا۔ 10 اکتوبر 2007 کو، جونہی ماسکو میں نصب، جہازی گھڑیال کے کانٹے پانچ بج کر 22 منٹ پر پہنچے ملائشیا نے سانس روک لیا۔

اگلے ہی پل اس ڈھلتی ہوئی شام ایک راکٹ آگ اُگلتا ہوا، چنگھاڑتا ہوا فضا میں بلند ہوا۔ پہلے وہ سورج سا دکھتا رہا۔ پھر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ کوالالمپور میں نصب عظیم الجثہ اسکرین پر اور گھر گھر لگے ٹی وی سیٹ پر کروڑوں افراد نے یہ منظر دیکھا اور خود میں خوشی اور تفاخر کا دریا موجزن پایا۔ لوگ آنکھوں میں نمی لیے ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے کہ ان کے دیس کا ایک باسی اس راکٹ میں سوار تھا۔

اس طلسماتی لمحے شیخ مظفر کسی کا بیٹا یا کسی کا منگیتر نہیں تھا۔ وہ فقط ملائشیا کا سپوت تھا۔ پوری دنیا کے مسلمانوں کی آنکھ کا تارا۔ خلا میں جانے والا پہلا ملائی اور ماہ رمضان میں یہ اعزاز پانے والا اولین مسلمان۔

گو راکٹ منظر سے اوجھل ہوگیا تھا مگر کوالالمپور میں نصب اسکرین کے سامنے لگا ہجوم اگلے کئی گھنٹوں تک وہیں رہا۔ یہ جشن جلد نہیں تھمنے والا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ خوشخبری موصول ہوئی، جس کے وہ منتظر تھے۔ مظفر امریکی خلا باز پیگی وائٹسن اور روسی خلا باز یوری مالنچکوف کے ساتھ بہ حفاظت انٹرنیشنل خلائی اسٹیشن پہنچ گیا تھا۔

کچھ گھنٹے مزید گزرے اور پھر وہ خبر بھی آہی گئی، جس کے لیے ملائی مسلمان دعا گو تھے۔ شیخ مظفر شکور نے قازقستانی اوقات کے مطابق سحری کرلی تھی۔

وہ بیماریوں سے جوجھتے مہاتیر محمد کے لیے ایک قیمتی لمحہ تھا۔ وہی تو تھا جس نے ملائی اسپیس پروگرام کی بنیاد رکھی اور اب دعا گو تھا کہ وہ مزید کچھ روز زندہ رہے، کم از کم عید تک، تاکہ اپنے دیس کے ہونہار باشندے کو خلا میں عید مناتا دیکھ لے۔

ہاں، مظفر پوری تیاری سے گیا تھا۔ کچھ مخصوص بسکٹ۔ کچھ مشروب۔ کچھ ملائشیا کی سوغاتیں۔

تو اب وہ زمین سے میلوں پرے، خلا میں تیرتی اسپیس شٹل میں تھا، جس میں نصب اسپیکر سے دھیمی آواز میں اذان نشر ہوتی اور وہ تیرتا ہوا اپنے کیبن کی سمت بڑھنے لگا۔ جب بڑے، شفاف شیشے کے پاس سے گزرتا تو وسیع و عریض کائنات کی ایک جھلک اُس کے دل کو اُس ہستی کی ثناء سے بھر دیتی، جو مشرق و مغرب کا مالک ہے۔ مالنچکوف اسے دیکھ کر کہتا۔ ”تو تمہاری عبادت کا وقت ہوگیا۔“

مظفر اس اسٹیشن میں دس روز رہا۔ اس دوران میں اس نے باقاعدگی سے پانچ وقت کی نماز ادا کی، جس کی فلم پورے ملائشیا نے ایک ناقابلِ بیان خوشی کے ساتھ دیکھی۔ مگر وہ اپنی پیشہ وارانہ ذمے داریوں سے بھی غافل نہیں ہوا۔ جو خلیے اور بافتیں ساتھ لے گیا تھا، ان پر کشش ثقل اور دباؤ سے آزاد ماحول میں تجربات کیے۔ پروٹین کرسٹل کے تجربے میں دقت پیش آئی مگر اس نے اُسے جاری رکھا۔

خلیوں پر ریسرچ کا مقصد کلیجے کے سرطان میں بہتری کے امکانات تلاش کرنا تھا۔ کچھ تجربوں کا تعلق طبی تحقیق اور کچھ کا صنعتی علوم سے تھا۔

کلیجے کے سرطان کی ضمن میں تجربات اُمید پر منتج ہوئے۔ اعداد و شمار امکانات کی جانب اشارہ کر رہے تھے۔

وہاں بیتے یادگار دنوں میں اس نے ویڈیو لنک کے ذریعے ملائی طلبا کو لیکچر بھی دیے۔ سیکڑوں درس گاہوں کے ہزاروں طلبا نے اپنے ہیرو کو انٹرنیشنل اسپیس اسٹیشن میں تیرتے، مائع اور ٹھوس اشیاء کے بدلتے مزاج کی خبر دیتے دیکھا۔ ایک ویڈیو تو بہت مقبول ہوئی، جس میں مظفر نے

دھیرے دھیرے ڈبے سے جوس انڈیلا اور باہر آنے والا مائع ایک چھوٹی سی سرخ گیند میں تبدیل ہوگیا۔ کچھ لمحے وہ اس سے کھیلتا رہا اور ہزاروں متحیر آنکھیں اسے تکتی رہیں۔

یہ فقط طلبا نہیں تھے، پورا ملائشیا اُسے دیکھ رہا تھا۔ عید کے روز اس تعداد میں یکدم کئی گنا اضافہ ہوگیا۔

مظفر کا یہ اعلان کہ وہ بروز عید اسٹیشن میں اپنے ساتھیوں کے لیے ایک دعوت کا اہتمام کرے گا، بین الاقوامی اخبارات کی زینت بنا۔ جنوبی ایشیا کی مسلم اقوام پُرتجسس تھیں۔ خلا میں عید منانے کا تصور ہی اُن کے خون کی رفتار بڑھا دیتا۔ ملائی حکومت نے اس ظہرانے کی لائیو کوریج کا اعلان کر رکھا تھا۔ حکومتی اور سرکاری عہدے داروں نے اپنی مصروفیات کا شیڈول بنانے سے قبل نشریات کے اوقات کار پر نظر ڈالنا ضرور جانا۔

عید کے روز مظفر نے قازقستان کے وقت کے مطابق نماز ادا کی۔ اس کے ہم وطن کچھ گھنٹے پہلے یہ فریضہ انجام دے چکے تھے اور کوالالمپور میں اس کے گھر تہنیتی کارڈوں اور ٹیلی فون کالز کا تانتا بندھا تھا۔ وہ رشتے دار بھی بوڑھے محی الدین تک اپنے نیک جذبات پہنچانا چاہتے تھے، جن کی برسوں سے اُس نے شکل نہیں دیکھی تھی۔

مبارک باد کا یہ طوفانی سلسلہ ظہرانہ کے وقت تھما، جب ملائی ٹی وی نے اس دھندلی مگر تجسس اور دلچسپی سے بھرپور نشریات کا آغاز کیا۔ دو پرائیویٹ چینلز بھی یہ فریضہ انجام دے رہے تھے۔ وزیراعظم نے اپنی مصروفیات منسوخ کر کے خود کو جشن کے اس ریلے کے حوالے کر دیا، جس کا مرکز دارالحکومت میں نصب قوی الجثہ اسکرینیں تھیں۔ اور وہ رونگٹے کھڑا کر دینے والا احساس تھا، جسے الفاظ میں بیان کرنا دشوار تھا۔

معروف شخصیات کے تاثرات فلمانے کے خواہش مند ٹی وی چینلز کی توجہ کا مرکز اسپتال میں پڑا وہ بوڑھا تھا، جو کچھ روز ہوئے بائی پاس سے گزرا تھا۔ مہاتیر محمد، جو ملائی خلائی پروگرام کا بانی تھا۔ وہ ایک یادگار دن تھا، ایک یادگار عید۔

جب ٹی وی اسکرین پر مسکراتے مظفر نے اپنے ہم وطنوں کو عید مبارک کہا، تو سب نے یک زبان ہو کر ولولہ انگیز انداز میں جواب دیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ اُن کی آواز چاند تک پہنچ جائے گی۔

خلا میں جانے والا نواں مسلمان ایک استعارہ بن چکا تھا۔ اور اب وہ اُس کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے، تاکہ ایک ہیرو کے مانند اُس کا استقبال کر سکیں۔

☆☆☆

وہ ایک آگ کا گولا تھا، جو گیسوں کی چادر چیرتا زمین کی سمت بڑھ رہا تھا۔

یہ شعلوں میں لپٹے اس اسپیس کرافٹ کا تذکرہ ہے، جو خلابازوں کو زمین پر لا رہا تھا۔ اس کے گرنے کی رفتار گولی سے تیز تھی اور اسے مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے۔

گو حفاظتی انتظامات مکمل تھے اور مظفر تربیت کے دوران میں اس صورتِ حال سے نمٹنے کی مشق کر چکا تھا، مگر ایک لمحے کو اس کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ خوف کی معمولی سے جنبش، جو اگلے ہی پل یقین کی روشنی میں غائب ہوگئی۔ اس نے اپنے رب کو یاد کیا۔ دعا میں جہاں اپنے پیاروں کو دوبارہ دیکھنے کی آرزو تھی، وہیں احساسِ تشکر بھی کہ اللہ نے اسے ایک ایسا اعزاز عطا کیا، جو اس سے قبل کسی ملائی باشندہ کو نہیں حاصل ہوا۔ ایسا اعزاز، جو کسی مسلمان خلاباز کے حصے میں نہیں آیا تھا۔ اور تب شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے کہا۔ ''اب اگر میری جان بھی چلی جائے، تب بھی کوئی غم نہیں۔''

زمین کی طرف گرتے اسپیس کرافٹ نے محفوظ لینڈنگ کی۔ وہ ایک ویرانے میں گرا تھا۔ تمام لوگ محفوظ تھے اور خوشی سے ان کے چہرے دمک رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں روسی اہل کار تیز رفتار گاڑیوں میں وہاں پہنچ گئے۔

پہلے انہیں قریب ترین خلائی اسٹیشن لے جایا گیا۔ کچھ دیر بعد بین الاقوامی میڈیا نے خلابازوں کی واپسی کی خبر نشر کی، تو ملائشیا میں جشن کا آغاز ہوگیا۔ ایسا جشن جس کی ملکی تاریخ میں مثال نہیں ملتی تھی۔

مظفر کے وطن لوٹتے ہی اس جشن میں شدت آگئی۔ اس نے ملائی زمین پر قدم رکھتے ہی رب کے حضور سجدہ کیا۔ ٹیکنالوجی منسٹر نے اسے آگے بڑھ کر گلے لگایا۔

گیارہ ہزار ملائی باشندوں میں منتخب ہونے والے مظفر نے، جو اب پوری دنیا کے مسلمانوں کا ہیرو تھا، اپنے پیغام میں کہا۔ ''مجھے شہرت کی خواہش نہیں، نہ یہ آرزو ہے کہ میرا استقبال کسی سیلیبریٹی کی طرح کیا جائے۔ میرے اس سفر کا مقصد ملائشیا کے طلبا کو متحرک کرنا تھا، خصوصاً بچوں کو، جن کی آنکھوں میں خواب ہیں۔ بے شک میں خلا میں جانے والا پہلا ملائی شخص ہوں، مگر آخری نہیں۔''

مشہور زمانہ پابندی کا شکار کتابوں کا تذکرہ

پڑھنا منع ہے

منظر امام

انسان کی رفیقِ خاص کتابیں ہوتی ہیں جو زندگی کی صحیح راہ متعین کراتی ہیں مگر کچھ کتابیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو راہ سے بھٹکاتی ہیں۔ انھیں معاشرے کا دشمن کہنا چاہیے۔ اسی وجہ سے ان پر پابندی لگائی جاتی ہے کہ وہ ہر ایک کی پہنچ سے دور رہیں مگر کچھ کتابیں ملکی سیاست کا بھی شکار ہو جاتی ہیں اور ایسی کتابوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ یہاں ہم چند ایسی مشہور کتابوں کا ذکر کررہے ہیں جو پابندی کا شکار بنیں۔

کتابیں ہماری دوست ہیں۔ یہ ہم نہ جانے کب سے سنتے آئے ہیں اور یہ بالکل درست بھی ہے۔ کتابیں ہمیں بہت کچھ دیتی ہیں۔ وہ ہمیں دنیا بھر کی معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں روحانی اور نفسیاتی سکون بھی دیتی ہیں۔ کیونکہ انسان نے ترقی اس وقت سے شروع کی جب چھاپے خانے ایجاد ہوئے۔ کتابیں لکھی اور پڑھی جانے لگیں۔

انسان نے کائنات کے ہر موضوع پر کتابیں لکھی

ہیں۔ اچھی کتابیں، بری کتابیں، کروڑوں کی تعداد میں کتابیں ہی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ دنیا بھر کے کتب خانے کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ہم ان سے رہنمائی حاصل کر کے آگے بڑھتے ہیں۔ کتابوں کا بدل کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم چاہے کتنا ہی جدید طریقہ کیوں نہ اختیار کر لیں کتابوں کا سحر اپنی جگہ قائم رہے گا۔ دنیا بھر میں ایسی بے شمار کتابیں ہیں جو متنازعہ رہی ہیں۔ ان کو متنازعہ بنانے والے ان کے موضوعات ہوتے ہیں۔

بہت سی کتابیں کسی خاص مکتبۂ فکر، مسلک یا مذہب کے خلاف ہوتی ہیں، اس لیے ان پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔ بہت سی کتابیں حکمرانوں کو راس نہیں آتیں اس لیے وہ پابندی کی زد میں آجاتی ہیں۔ بہت سی کتابیں اخلاقی طور پر اتنی گری ہوئی ہوتی ہیں کہ ان کو پڑھنا برا سمجھا جاتا ہے۔ بہت سی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو کسی خاص فلاسفی کی وکالت کرتی ہیں۔ غرض یہ کہ ہر موضوع پر کتابیں موجود ہیں۔

ہم نے اس مضمون میں ایسی چند کتابوں کا جائزہ لیا ہے جو پوری دنیا میں یا تو شدید متنازع رہی ہیں یا بہت سختی کے ساتھ ان پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ ایسی کتابوں میں بڑے بڑے، ناموروں کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ آئیں ایک نظر ایسی کتابوں کو دیکھتے ہیں۔

Things Fall Apart

(تھنگز فال آپارٹ)

یہ مشہور ترین کتاب چنیوا اچبے کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1958ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں اس نے برطانوی اور امریکی سامراجیت پر بھرپور تنقید کی ہے۔ ظاہر ہے، یہ بات ان سامراجیوں کو ہضم نہیں ہوئی، اس لیے انہوں نے اس کتاب پر پابندی لگا دی تھی۔ ایسے کئی ممالک ہیں جہاں اس کتاب پر آج بھی پابندی ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہ ممالک جو آزادی اظہار کے داعی بنتے ہیں جب ان کے یہاں بھی ایسی صورتِ حال ہوتی ہے تو پھر دوسرے معاشرے کا کیا کہنا۔

سلاٹر ہاؤس 5:۔

کرٹ ولن گاٹ کی یہ مشہور کتاب ہے۔ یہ متنازع کتاب امریکا میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی کہانی کچھ یوں ہے کہ پانچ بچے ایک جنگ میں گرفتار ہوئے تھے انہیں ایک قید خانے میں رکھا گیا تھا جہاں ان پر بے پناہ تشدد ہوتا رہا۔ اس کتاب کا Contant ہی ایسا تھا جس کے خلاف ہنگامہ برپا ہو گیا۔ امریکا میں اس کتاب پر سخت پابندی لگا دی گئی اور جہاں جہاں کتب خانوں میں یہ کتاب پہنچ چکی تھی وہاں وہاں سے اس کتاب کو ہٹا دیا گیا۔

کمیونسٹ مینی فسٹو

یہ کتاب کارل مارکس اور فریڈرک اینجل کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب سامراجیت یا کیپیٹلزم کے خلاف ہے۔ اس کتاب نے ایک دنیا کو چونکا کر رکھ دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کی وجہ سے انیسویں اور بیسویں صدی میں دنیا میں کمیونزم کو ترقی ہوئی۔ اس کتاب کے خلاف سامراجیوں کے علاوہ مذہبی حلقوں نے بھی بہت ہنگامہ کیا تھا۔ اس میں پابندی لگا دی گئی تھی اور پڑھنے والا نگاہوں میں آجاتا تھا۔ ممکن ہے کہ اب یہ کتاب یورپ اور امریکا میں ملنے لگی ہو۔ لیکن یہ بھی پابندی کے مراحل سے گزر چکی ہے۔

ایڈونچر آف ہیکل بیری فن

یہ کتاب مشہور ادیب مارک ٹوائن نے لکھی ہے۔ مارک ٹوائن تحریر کی دنیا کا ایک دیو ہیکل انسان تھا۔ اس کے قلم نے اس کتاب کو تخلیق کیا۔ اس پر پابندی تو شاید نہیں لگائی گئی لیکن یہ متنازع ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کے موضوع پر بہت تنقید کی جاتی رہی ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ اس میں فحش مواد

زیادہ ہے اور کچھ کا خیال ہے کہ اس کتاب میں سیاہ فاموں کی بے جا حمایت کی گئی ہے۔ مارک ٹوائن جیسے بڑے مصنف کو اتنا بھی حق نہیں کہ وہ اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کر سکے۔

انارکسٹ کک بک

ولیم پاؤل کی یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے واقعی خطرناک ہے اور اس قابل بھی تھی کہ اس پر پابندی لگا دی جاتی۔ جب ویت نام کی جنگ اپنے عروج پر تھی۔ ولیم پاؤل اس وقت نوجوان تھا۔ اس نے اس وقت یہ کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب میں غیر قانونی طور پر بم بنانے کی ترکیبیں بتائی گئی تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ لکھنے والے کا نظریہ کچھ اور رہا ہو لیکن یہ کتاب تخریب کاروں اور دہشت گردوں کے بہت کام آسکتی تھی۔ اس خطرے کو دیکھتے ہوئے اس کتاب پر پابندی لگا دی گئی۔

میرا خیال ہے کہ لکھنے والوں کو بھی اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ان کا لکھا ہوا ذہنوں پر کس طرح اثر انداز ہوسکتا ہے اور اس میں کتنی خرابیاں یا اچھائیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ بہت سے لکھنے والوں کا نظریہ انفرادیت کا بھی ہوتا ہے یعنی کوئی ایسی بات لکھی جائے جو دوسروں سے بالکل مختلف ہو۔ اس سلسلے میں ان سے بے احتیاطی ہو جاتی ہے۔

The origin of species

چارلس ڈارون کی یہ ہنگامہ خیز کتاب ہے۔ اس کتاب نے پوری دنیا کے سماجی، مذہبی اور معاشرتی طبقوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اس کی اشاعت سے لے کر آج تک اس کتاب کا ہنگامہ نہیں رک سکا ہے۔ اس کتاب میں انسان کے ابتدا کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہ پہلے کیا تھا اور کہاں سے مختلف مدارج طے کرتا ہوا آج موجودہ شکل میں آیا ہے۔ یہ ڈارون کی ساری زندگی کی محنت کا نچوڑ ہے

THE ORIGIN OF SPECIES

اور سب سے زیادہ متنازعہ بھی ہے۔

اے ملین لیٹل پیسز

جیمس فیرے کی یہ کتاب امریکا میں شائع ہوئی تھی۔ یہ انسان پر انسان کے تشدد کی ایسی کہانی ہے جس کو بہت مزے مزے لے کر بیان کیا گیا ہے۔ ابتداء میں یہ کتاب زیادہ متنازع نہیں تھی لیکن جب ٹی وی کا مشہور میزبان اوپراون فیری نے اپنے ایک ٹی وی پروگرام میں اس کتاب پر تبصرہ کیا تو اس کے خلاف ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور یہ کتاب متنازع بن گئی۔

Ulysses

جیمز جوائس کی یہ مشہور زمانہ کتاب جس نے پوری دنیا کے ادیبوں اور ناقدوں کو ہلا کر رکھ دیا اور آج تک اس کتاب کا سحر قائم ہے۔ جیمز جوائس خود ہی ایک بڑا نام ہے اور اس کی یہ کتاب بھی شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے باوجود اس کتاب کا موضوع بہت متنازع رہا ہے۔ اس میں نفسیاتی الجھنوں کے ساتھ ساتھ جنسی الجھنوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ماہرانہ طرزِ تحریر کے ذریعے جنس کے ایسے ایسے حوالوں سے لکھا گیا ہے جو قابلِ گرفت اور ناقابلِ اشاعت کے زمرے میں آتی ہے۔ جیمز کی اس کتاب کو امریکا، برطانیہ اور آئر لینڈ وغیرہ میں چھاپنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ اس نے فرانس جا کر اپنی یہ کتاب شائع کرائی۔ امریکا میں ایک پبلشر نے اس کتاب کو شائع کرنے کی ہمت کی تھی لیکن اسے گرفتار کرلیا گیا۔ یہ کتاب اپنے اسٹائل اور طرزِ تحریر کی وجہ سے بے مثال ہے لیکن اس کا سبجیکٹ اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ اس کو پڑھنے دیا جائے۔

دی کلر پرپل

الااس ڈ کر کی یہ کتاب بھی بہت متنازع رہی ہے۔ یہ ایک ایسی سیاہ فام عورت کی داستان ہے جو دنیا سے اپنا حق مانگنے نکلی ہے۔ اس کتاب پر بے تحاشا تنقید کی گئی کیوں کہ بہت سے حلقے یہ سمجھتے تھے کہ اس کتاب کے مندرجات میں

سیاہ فاموں کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے۔ یہ تو ایک وجہ تھی۔ دوسری وجہ اس کتاب کا Content ہے۔ اس میں جنس، تشدد، اغوا بالجبر اور نہ جانے کیا کیا بھرا ہوا ہے۔ اس لیے اس کتاب پر بھی پابندی لگ گئی تھی۔ مگر 1983ء میں اس کتاب کو "پلیٹزر ایوارڈ" جیسے بڑے انعام کا حقدار بھی قرار دیا گیا۔ 1985ء میں اس ناول پر اسٹوین اسپل برگ جیسے مشہور ہدایت کار نے فلم بھی بنائی۔

Fallen angels

والٹر ڈین کی مشہور کتاب ہے۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی پورے امریکا میں ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ اس کی اشاعت 1998ء میں ہوئی تھی۔ یہ کتاب ویت نام کی جنگ اور اس جنگ کے نتیجے میں

پیدا ہونے والی صورت حال پر ہے۔ ظاہر ہے یہ کتاب موردِ عتاب کیوں نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس پر ہنگامے ہوئے۔ سخت ترین تنقید ہوئی اور وہ پابندی کی زد میں آ گئی۔

The catcher in the raye

جے ڈی سلینگر کی یہ کتاب 1951ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اپنے جنس اور غیر اخلاقی Contanet کی وجہ سے بہت متنازعہ رہی۔ اس سے اخلاقیات کے خراب ہونے کا اندیشہ تھا (اس سے اندازہ لگالیں کہ جہاں کی اخلاقیات ویسے ہی خراب ہے۔ اگر وہاں کے لوگ اس کتاب کے بارے میں یہ سب کہہ رہے ہیں تو یہ کیسی کتاب ہوگی)

ہیری پوٹر سیریز (جے کے رولنگ)

اب آ جائیں کتابوں کے اس سلسلے کی طرف جو ہیری پوٹر سیریز کے نام سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ اس سیریز

کی ہر کتاب پر ایک فلم بن چکی ہے۔ بچے تو بچے بڑے بھی اس کے دیوانے ہیں۔ خود ہمارے ملک پاکستان میں بچے ان کتابوں کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ بہت سے ملکوں میں ان کتابوں پر پابندی ہے بلکہ یہاں تک ہوا ہے کہ ہیری پورٹر کی کتابیں جلا دی گئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتابیں بچوں کو حقیقی دنیاؤں سے بہت دور جادوئی دنیا میں لے جاتی ہیں۔ جہاں بڑے بڑے جادوگر ہیں۔ بھوت ہیں۔ چڑیلیں ہیں اور یہ سب پڑھ پڑھ کر بچوں کے ذہنوں پر برے اثرات پڑنے لگتے ہیں۔ وہ خوابوں اور خیالوں کی دنیاؤں میں رہنے لگتے ہیں اور بچے اگر اثرات گہرے لینے لگیں تو پھر وہ عملی زندگی میں سست ہو جاتے ہیں۔ وہ جادوگروں اور پریوں کو تلاش کرنے لگتے ہیں۔ ان سے عمل کی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ اس بنیاد پر اس سیریز کی کتابیں کئی ملکوں میں ممنوع ہیں۔

A day no pigs would die

(اے ڈے نو پگس وڈ ڈائی)

رابرٹ نیوٹن کی یہ کتاب بہت متنازعہ رہی ہے۔ اس کتاب میں ایک جانور نے اپنی آپ بیتی بیان کی ہے اور وہ بھی اتنے دردناک طور پر کہ پڑھنے والے پریشان ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ویسے تو یہ

کتاب جانوروں پر ہونے والے ظلم کے خلاف احتجاج کے طور پر لکھی گئی ہے لیکن اس کا انداز بہت بھیانک ہے۔ اس لیے متنازعہ ترین کتابوں میں سے ہے۔

Brave new world

آلڈوس ہکسلے کی بہت ساس موضوع پر لکھی ہوئی کتاب ہے۔ یہ کتاب بچوں کی پیدائش کے حوالے سے ہے۔ چونکہ اس کو پڑھنے کے بعد ذہن میں منفی قسم کے خیالات پیدا ہونے لگتے تھے۔ اس لیے اس کتاب کو کتب خانوں، اسکولوں اور کالجوں سے ہٹالیا گیا۔

The metamor phosis

یہ ایک بہت بڑے ادیب کافکا کی شاہکار کتاب ہے۔ کافکا نے اپنی تحریروں میں اس قسم کے تجربات کیے ہیں۔ اس نے دنیا کو لذت اور اذیت کے درمیان دیکھا ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو خود بھی ایک کیڑے میں تبدیل ہو گیا۔ پھر وہ اپنے ماحول کو ایک کیڑے ہی کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

اس کتاب کو اس کے اپنے ملک چیکوسلواکیہ میں متنازعہ اس لیے قرار دیا گیا تھا کہ اس نے اپنی یہ کتاب جرمن میں لکھی تھی۔ بعد میں جب اس کے مندرجات سامنے آئے تو نازیوں اور روسیوں نے بھی اس پر پابندی لگا دی۔

دی پارکس آف بی اِنگ وِیل فلاور

اسٹیفن چوبکی کی یہ کتاب بہت متنازعہ رہی۔ کیم فروری 1999ء کو شائع ہوتے ہی اس کتاب پر امریکا میں مکمل پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک نوجوان نے اپنے ایک دوست کو خطوط لکھے ہیں۔ جن میں اس نے پورے

ماحول اور ملک کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس کے مندرجات میں چونکہ بے حد جنسی رغبت کا رجحان ہے اس لیے اس کتاب پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ 2012ء میں اسی ناول سے ماخوذ اسی نام سے فلم بھی بنی جو 21 ستمبر 2012ء کو ریلیز ہوئی اور 33 ملین امریکن ڈالرز کا بزنس کیا۔

Topic of cancer

1934ء میں شائع ہوئی اور فوری طور پر پابندی کی زد میں آ گئی۔ اسے ہنری ملر نے لکھا تھا۔ یہ ان فرانسیسیوں کی کہانی ہے جو فرانس سے باہر اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک رائٹر ہے جو خود کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے Contant میں جنس اور تشدد کا عنصر ہے۔ اس لیے اس پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔

انکل ٹام کیبن

یہ مشہور ترین کتاب ہیریٹ بیچر کی ہے۔ اس کتاب کو مشہور ترین اور متنازعہ ترین کتابوں کی فہرست میں رکھا گیا ہے۔ اس کتاب کا موضوع سیاہ فام غلاموں کی حالتِ زار ہے۔ متنازعہ ہونے کے باوجود اس کتاب کو دنیا بھر میں بہت زیادہ پڑھا گیا ہے۔

اینڈ ٹینگو میک تھری
(And tango make three)

ویسے تو یہ کتاب بچوں کے لیے ہے۔ اس کے باوجود اس کتاب کے مندرجات پر بہت اعتراضات ہوتے رہے ہیں۔ اس کے خلاف جگہ جگہ احتجاج کیے گئے ہیں۔ یہ دو پنگوئن کی کہانی ہے جو

ایک بچہ پنگوئن ہے، ماں باپ بن جاتے ہیں۔ کتاب بہت دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہے اس کے باوجود متنازعہ اس لیے ہے کہ اس میں جنسیت کا عنصر بہت زیادہ ہے۔

The grapes of wrath

جان اسٹین بیک کی یہ کتاب 1939ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ غریب لوگوں کی جدوجہد کی کہانی ہے۔ شائع ہوتے ہی ایک ہنگامہ برپا ہوگیا تھا۔ اس کے نسخے جلا دیے گئے۔ پھر اس پر پابندی لگا دی گئی۔ ان سب کے باوجود یہ کتاب لٹریچر میں کلاسک کا درجہ رکھتی ہے۔ اس ناول پر 1940ء میں جون فورڈ جیسے مشہور ڈائریکٹر نے ایک فلم بھی بنائی جو 1989ء میں نیشنل فلم رجسٹری نے لائبریری آف کانگریس کے لیے 25 فلموں میں منتخب کرالی۔

امریکن سائکو

بریٹ اسٹین کی کتاب۔ یہ ایک سیریل کلر کی کہانی ہے۔ 1991ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں تشدد کا عنصر اتنا زیادہ ہے کہ اس کی وجہ سے پہلے جرمنی میں پابندی لگی پھر آسٹریلیا اور کینیڈا نے بھی پابندیاں عائد کردیں۔ ایسے ابھی کئی علاقے ہیں۔ جہاں اٹھارہ سال سے کم عمر کے بچوں کا پڑھنا سخت منع ہے۔

I know why the caged bird sing

اس کتاب کو لکھنے والی مایا انجلیو ہے۔ امریکی تاریخ کی سب سے زیادہ متنازعہ کتاب۔ اس پر پابندی بھی انتہائی شدید عائد کی گئی تھی۔ مایا انجلیو نے اسے آپ بیتی کے طور پر لکھا ہے۔ اس میں تشدد، ریپ، منشیات کا استعمال وغیرہ سب کچھ ہے۔ اس کتاب نے فروخت ہونے کا ریکارڈ قائم کردیا تھا۔ پھر اس پر پابندی لگا دی گئی۔

لولیٹا

ولڈامیر نابکو کی کتاب۔ یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جس نے ایک بیوہ عورت سے شادی کی۔ اس کی بارہ سال کی ایک بیٹی تھی۔ اس شخص نے اس بیٹی سے تعلقات استوار کرلیے۔ یہ کتاب پورنوگرافی کے زمرے میں آتی ہے۔ اس کتاب پر بے شمار ملکوں میں سخت پابندی ہے۔

اب ہم کچھ ایسی کتابوں کا ذکر کرتے ہیں جن پر ہندوستان یا پاکستان میں پابندی ہے۔

ہندو ہیون

یہ کتاب میکس وائل نے 1934ء میں لکھی تھی۔ اس کتاب پر ہندوستان میں سخت پابندی ہے۔ یہ کتاب میکس رائل نے اس وقت لکھی تھی جب وہ لاہور کے ایک کالج میں پڑھا رہا تھا۔ یہ کتاب ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کے حوالے سے ہے۔

The face of mother india

THE FACE OF MOTHER INDIA

Mayo, Katherine.

1936ء میں کیتھرین مایو کی لکھی ہوئی یہ کتاب ہندوستان کے سیکولرازم کو آئینہ دکھا رہی ہے۔ اس لیے اس کتاب پر ہندوستان میں سخت پابندی ہے۔ یہ کتاب

ہندوؤں کی ذہنیت اور ہندوستانی مسلمانوں کی حالتِ زار پر ہے۔ پوری طرح بتایا گیا ہے کہ ہندو ذہنیت کس طرح مسلمانوں کا استحصال کرتی ہے۔

اولڈ سولجر صاحب

فرینک، رچرڈ نے

یہ کتاب 1936ء میں لکھی تھی۔ یہ برطانیہ کے ایک فوجی کی داستان ہے۔ جب وہ ہندوستان میں تعینات ... ہندوستان میں اس ... پر پابندی ہے۔

The land of lingam

1937ء میں شائع ہوئی۔ یہ چونکہ ٹیرر ازم اور ان کی رسومات، کے بارے میں ہے۔ اس لیے اس پر سختی سے پابندی ہے۔

ان کے علاوہ کچھ اور کتابیں جو ہندوستان میں پڑھنا منع ہے۔

''پاکستان پس منظر۔ پیش منظر'' حمید انور کی اردو میں ہے۔

''بیز فائز'' آغا بابر کی اردو میں ہے۔ (1950ء)

''خاک اور خون'' نسیم حجازی۔ اردو میں ہے۔ (1950)

''معرکہ سومنات'' مولانا صادق حسین کی۔

''بھوپت سنگھ'' 1959ء میں شائع ہوئی۔ گجراتی زبان میں۔

''مسٹریز انڈیا'' جسے موکی سنگھ نے لکھا۔

''سینٹیڈ گارڈ، انتھرو پولو جی آف سیکس لائف ان لیونٹ'' مصنف برن ہارٹ۔

''چندر موہنی'' جو اردو میں لکھی گئی ایک قدیم کتاب ہے۔

''راما ٹولڈ'' مصنف ابرے مینن۔

''ڈارک آرگ'' مصنف رابرٹ ڈبلیو ٹیلر۔

''ڈیپو کشمیر'' مصنف عزیز بیگ۔

''دی ہارٹ آف انڈیا'' مصنف الیگزینڈر کیمبل۔

''لوٹس اینڈ دی روبوٹ'' مصنف آرتھر کسٹلر۔

''دی ٹرو فرقان'' مصنف السیفی المہدی۔

''سیٹنک ورسس'' مصنف سلمان رشدی

''انڈیا انڈی پینڈنٹ'' مصنف چارلس بیٹھمس،

''این ایریا آف ڈارکنس'' مصنف وی ایس نیپال۔

''دی جوئل ان دی لوٹس'' مصنف ایلن ایڈورڈ۔

The evolution of the British empire and commonwealth from the Amrican Revolution by alfred Leroy Burt.

''مین فرام ماسکو'' مصنف گریوال وائن۔

Erly Islam by Desmond.

''نروائے پولیٹیکل بائیوگرافی میچل ایڈورڈ''

''نائن آور آف راما'' مصنف اسٹینلے ولپرٹ

''نیپال'' مصنف ٹونی ہاگن عائشہ مصنف کرٹ فریشلر

''مذہب نے انسان کے ساتھ کیا کیا'' سخت پابندی، 1954ء میں شائع ہوئی تھی۔

The moor's last sigh:۔

یہ کتاب بدنام زمانہ سلمان رشدی کی ہے۔ ہندوستان میں اس کتاب پر اس لیے پابندی لگا دی گئی کہ اس میں ایک کردار شیوسینا کے بانی بال ٹھاکرے کا نام ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ایک کردار جس کا نام جواہر لعل رکھا گیا ہے۔

وہ کتابیں جو پاکستان میں بین ہیں۔

''ٹھنڈا گوشت'' سعادت حسن منٹو کی۔ اس پر پابندی لگا دی گئی تھی۔

''رنگیلا رسول'' 1924ء میں شائع ہونے والی اس کتاب میں ذاتِ مقدس پر کیچڑ اچھالی گئی ہے۔

یہ کتاب لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے پبلشر راجا پال پر سیکشن 153A کے تحت مقدمہ قائم ہو گیا تھا۔ 6 اکتوبر 1929ء کو راجا پال کو قتل کر دیا گیا۔

Satanic verses

بدنام زمانہ مصنف رشدی کی بدنام زمانہ کتاب۔ اس پر بہت سختی سے پابندی ہے اور اس میں جو بکواس کی گئی ہے اس کے بارے میں کچھ لکھنا ہی فضول ہے۔

سمندری لٹیرے

اشفاق عطاری

بہتے ہوئے پانی پر اپنی حکومت قائم کرنے والے سفّاک لٹیروں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ صدیوں سے انسانی خون کی ہولی کھیلتے آئے ہیں۔ اس کام میں عورتیں بھی پیچھے نہیں ہیں۔ عورتوں نے بھی سمندر کے سینے پر سفاکیت و بربریت کی تاریخ رقم کی ہے۔

آپ نے بحری قزاق تو ضرور دیکھے ہوں گے۔ کچھ نہیں تو فلموں میں تو ضرور دیکھا ہوگا۔ فلموں میں عام طور پر ان قزاقوں کا حلیہ تقریباً ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ سر پر ایک بڑی سی ہیٹ، ہونٹوں کے درمیان دھواں اگلتا ہوا سگار اور ایک آنکھ کے سامنے چمڑے یا کپڑے کا خول۔

پتا نہیں ان قزاقوں کی ایک آنکھ کیوں خراب ہوتی ہے۔ آپ نے ان پر کہانیاں بھی پڑھی ہوں گی۔ ناول بھی لکھے گئے ہیں۔

حالیہ دنوں میں صومالیہ کے بحری قزاقوں کا بہت چرچا رہا ہے۔ یہ لوگ کھلے سمندر میں اپنے جہازوں پر دندناتے پھرتے ہیں اور کسی بھی تجارتی اور مسافر بردار بحری جہاز کو یرغمال بنا کر لوٹ مار کرتے ہیں اور عملے کو پکڑ لیتے ہیں۔

ان کے پاس اسلحہ بھی ہوتا ہے اور افرادی قوت بھی۔ آج کل تو یہ ہونے لگا ہے کہ مسافروں اور جہاز کے عملے کو یرغمال بنا کر باقاعدہ تاوان وصول کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد انہیں رہا کرتے ہیں۔

یہ سمجھ لیں کہ یہ بحری قزاق سمندر کے سینے پر متوازی حکومت قائم رکھتے ہیں۔ ان سے دنیا کی ہر حکومت عاجز آچکی ہے۔ انہوں نے کئی بار پاکستانی جہازوں کو بھی یرغمال بنایا ہے اور عملے کی رہائی کے عوض بھاری تاوان وصول کیا ہے۔ یہ زیادہ پرانی باتیں نہیں ہیں۔ گزشتہ چار پانچ برسوں میں ایسے کئی واقعات ہو چکے ہیں۔

بحری قزاقی کی تاریخ کتنی پرانی ہے۔ اس بارے میں تو یہ نہیں بتا سکتے لیکن معلوم تاریخ کے چند قزاقوں کا ذکر کر رہے ہیں تاکہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ یہ قزاق کس قسم کے ہوتے تھے اور ان کی سرگرمیاں کیا تھیں۔

ولیم کڈ (اسکاٹ لینڈ کا باشندہ):

اس کا زمانہ 1645ء سے 1701ء تک کا ہے۔ یہ امریکا جا کر نیویارک میں آباد ہو گیا تھا۔ وہ ایک دردمند دل رکھنے والا انسان سمجھا جاتا تھا۔ وہ فلاحی کاموں میں بھی حصہ لیا کرتا تھا۔

ولیم کو اس کے پڑوسی اور جہاں یہ کام کرتا وہاں کے لوگ بہت پسند کرتے تھے۔ کیوں کہ یہ نوجوان دوسروں کا ہمدرد تھا۔ ان کے دکھ سکھ میں کام آیا تھا لیکن زندگی نے ابھی تک اسے کچھ زیادہ نہیں دیا تھا۔ اتنی محنتوں کے باوجود اس کے پاس مایوسی اور مفلسی ہی رہی۔ البتہ اس کے خواب بہت شاندار تھے۔ وہ خواب میں اپنے آپ کو دولت مند ہوتے ہوئے دیکھا کرتا اور اس خواب کی تعبیر کی کوشش کرتا۔ ایک دن اسے ایک بحری جہاز پر جب کام کی آفر ہوئی تو اس نے آفر دینے والے سے کہا۔ ”یار! میرے پاس تو اس قسم کے کاموں کا کوئی تجربہ ہی نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔ تجربہ کسی کے پاس نہیں ہوتا کام کے بعد آتا ہے۔“

”تو کیا میں یہاں ٹھیک نہیں ہوں۔“ اس نے

پوچھا۔

”بالکل نہیں، تم جیسے باہمت نوجوان کو تو ابھی تک بہت کچھ کر لینا چاہیے تھا، خیر ابھی بھی وقت نہیں گزرا۔ تم اپنے خوابوں کی تعبیر حاصل کر سکتے ہو۔ اس کے علاوہ بحری جہازوں میں ملازمت کا ایک اور فائدہ ہوتا ہے جو کسی ملازمت میں نہیں ہوتا۔“

”وہ کیا؟“

”دنیا بھر کی سیر۔ جہاں جہاں جہاز لنگر انداز ہوگا، تم وہاں کی سیر کرو گے۔“

ولیم کے لیے یہ بہت بڑا چارم تھا۔ اس نے جہاز پر ملازمت کر لی اور یہاں سے اس کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوگیا۔

وہ بالکل بدل کر رہ گیا۔ اسے جس جہاز پر ملازمت ملی اس کا تعلق بحری قزاقوں سے تھا۔ اب پوری کہانی تو نہیں معلوم لیکن آگے جا کر ولیم خود بحری قزاق بن گیا۔

وہ ایک کامیاب بحری قزاق ثابت ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج میں بے رحمی شامل ہوتی چلی گئی۔ کہاں تو دوسروں کی مدد کرنے والا ایک ہمدرد نوجوان اور کہاں بحری قزاق۔ لوٹ مار اور قتل کرنے والا۔

انسان کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ نہ جانے کب اس کے مزاج میں شیطانیت آ جائے۔ ولیم بھی ایسا ہی ثابت ہوا۔ اس نے سمندر کے سینے پر اپنے جہاز دوڑا دوڑا کر لوٹ مار شروع کر دی۔ اس کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ اس نے ایک بار ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک جہاز پر حملہ کر دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ برطانوی بحریہ اس کے پیچھے لگ گئی اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اسے انگلینڈ لے جایا گیا جہاں اسے پھانسی کی سزا ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ اس کی گردن کی رسی تین بار ٹوٹی تھی۔ چوتھی بار رسی نے مرتے دم تک اس کا ساتھ دیا۔ اس طرح اس بحری قزاق کی کہانی ختم ہوئی۔

ایڈورٹیچ (برطانوی):

یہ ایک انتہائی بے رحم بحری ڈاکو تھا۔ یہ شخص کالی آندھی یا کالی داڑھی والے شیطان کے نام سے مشہور تھا۔ کیوں کہ اس کی کالی داڑھی اس کے سینے پر لہراتی رہتی۔ ایڈورڈ کا زمانہ 1680ء سے 1718ء تک کا ہے۔ اس کی دہشت بہت زیادہ تھی اس نے باقاعدہ جنگی بیڑہ تیار کر

رکھا تھا جس میں چار جہاز تھے اور 3 سو سے زاید اس کے مسلح سپاہی۔

یہ شخص خود بھی ہر وقت مسلح رہتا۔ اس کا لباس ایک طرح کا اسلحہ خانہ تھا درجنوں خنجر دو عدد تلواریں۔ پستول سب ہی ہر وقت اس کے پاس ہوا کرتے۔

ایک ریکارڈ کے مطابق اس شخص نے چالیس سے زیادہ بحری جہازوں کو لوٹا تھا۔ بے شمار قیدی بنائے تھے اور بہت سے قیدیوں کو بے رحمی سے مار دیا تھا۔ اس شخص کی کئی بیویاں تھیں جن کو وہ اپنے ساتھ میں جہاز پر رکھا کرتا۔ ایک بار قیدیوں میں اسے ایک لڑکی پسند آگئی جس کی عمر سولہ سترہ برس ہوگی۔ ایڈورڈ نے اس سے بھی شادی کر لی۔ وہ اسے اپنی دوسری بیویوں سے زیادہ عزیز رکھتا۔ اس کی دل جوئی کی کوشش کرتا۔ پھر ایک دن اس نے اس چہیتی کے ساتھ ایسا سلوک کیا جس سے اس کے مزاج کی بے رحمی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اس بے چاری نے اس کو سمجھانے اور راہ راست پر لانے کی کوشش کی تھی۔ ایڈورڈ نے غصے میں آکر اس کو اپنے وحشی عملے کے حوالے کر دیا کہ وہ اس کے ساتھ جو سلوک چاہے کریں۔

ایک بحری جنگ میں آگ کا ایک گولہ اس کے جہاز پر آلگا۔ جس میں اس کے جہاز میں آگ لگ گئی۔ اس آگ نے اس کی داڑھی کو جھلسا دیا۔ ایڈورڈ زخمی ہو کر گر پڑا۔ اسی حالت میں اس کی گرفتاری عمل میں آئی۔ اس کا سر کاٹ کر کئی دنوں کے لیے لٹکا دیا گیا تھا۔

برتھر لوراہوبے (ویلز):

ابتدا میں معتدل آدمی تھا۔ کسی جہاز پر کام کیا کرتا تھا اور جہاز کے معاملات میں اسے بے پناہ مہارت حاصل تھی۔ اس کا یہی فن بعد میں اس کے کام آیا۔

ایک بار اس کے جہاز کو بحری قزاقوں نے پکڑ لیا۔ قیدیوں میں برتھر بھی شامل تھا۔ اس کو بھی ایک کمرے میں دوسروں کے ساتھ باندھ کر ڈال دیا گیا تھا۔ اتفاق سے اس رات سمندر میں طوفان آگیا۔ قزاقوں کا جہاز دائیں بائیں ڈولنے لگا۔ اس نے چیخ چیخ کر بتایا کہ وہ اس وقت جہاز کو کنٹرول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسے جہاز کے کنٹرول روم میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں اس نے واقعی اس جہاز کو کنٹرول کر کے دکھا دیا۔ قزاق اس کی مہارت سے بہت متاثر ہوئے اور اسے جہاز پر کام کرنے کی پیشکش کی۔ برتھر نے یہ پیشکش فوراً قبول کر لی۔ اس طرح وہ خود بھی ایک قزاق بن گیا۔

کہا جاتا ہے کہ اس نے چار سو کے قریب جہازوں کو اپنا شکار بنایا تھا۔ بالآخر برطانوی بحریہ سے مقابلے میں مارا گیا۔

ہنری (برطانوی):

یہ کچھ پُراسرار بحری قزاق ہے۔ اس کی موت کی تاریخ بھی معلوم نہیں ہے اور یہ بھی نہیں معلوم کہ کہاں اور کن حالات میں اس کی موت واقع ہوئی۔

اس شخص نے 1693ء میں برطانوی شاہی بحریہ سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا تھا۔ پھر ایک اسپینی جہاز پر چلا گیا۔ جہاں کسی بات پر بغاوت ہوگئی اور اس نے بغاوت کی کمان سنبھال لی۔

اس کے بعد سے اس کا بحری ڈاکو کا کردار شروع ہوتا ہے۔ اس نے زیادہ جہاز تو نہیں لوٹے لیکن ایک جہاز ایسا لوٹا جس نے اس شخص کو دولت مند ترین بحری قزاق بنا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہنری قزاقی کی تاریخ کا سب سے دولت مند شخص بن گیا تھا۔

اس نے بحیرہ ہند میں ایک ایسا جہاز لوٹا جس میں سونے چاندی کے جواہرات کی صورت میں بے شمار دولت بھری ہوئی تھی۔

کسی کو نہیں معلوم کہ وہ اپنے اس بیش بہا خزانے کو لے کر کہاں چلا گیا اور کہاں اس کی موت ہوئی۔

اینی بونی (خاتون قزاق):

جی ہاں اس میدان میں کچھ عورتوں نے بھی طبع آزمائی کی ہے اور بہت کامیاب بھی رہی ہیں۔ اینی بونی بھی ان میں سے ایک تھی۔

کہا جاتا ہے کہ وقت انسان کو بدل کر رکھ دیتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اس کی پرانی شخصیت کہیں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اینی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ ایک سیدھی سادی عورت تھی۔ جس کا خاندان بہتر مستقبل کی تلاش میں امریکا جا رہا تھا۔ راستے میں جیمز بونی نام کے ایک شخص کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ شادی کے بعد بونی انتہائی بے وفا شوہر ثابت ہوا۔ شوہر کی بے وفائیوں سے تنگ آکر اینی نے کئی دوسرے مردوں سے تعلقات استوار کر لیے۔ اس نے تعلقات تو استوار کیے تھے لیکن شوہر بونی ہی رہا۔ ان ہی لوگوں میں ایک ملکیو جیک تھا جو ایک بحری قزاق تھا۔ یہاں

سے اینی کی زندگی میں تبدیلی شروع ہوئی۔ پھر اس کی دوستی میری نام کی ایک عورت سے ہوگئی۔ وہ بحری ڈاکو بننے کے منصوبے بناتی رہتی تھی۔

اینی نے میکو کے ساتھ مل کر قزاقی شروع کی اور قزاق بن گئی۔

قزاق بننے کے بعد اینی نے اپنا چولا ہی بدل لیا تھا۔ وہ مردانہ لباس میں رہا کرتی۔ بدن پر پورے ہتھیار سجائے اور مردوں ہی کی طرح مار دھاڑ کیا کرتی۔ اینی نے کئی جہاز لوٹے بالآخر گرفتار ہوگئی۔ اس کے ساتھ میری بھی گرفتار ہوئی تھی دونوں کو موت کی سزا ہوئی۔ لیکن یہ اتفاق تھا کہ گرفتاری کے وقت دونوں ہی حاملہ تھیں۔ رحم کی درخواست کی بنا پر ان دونوں کو شاید قید میں رکھ کر چھوڑ دیا گیا تھا اس کے بعد کیا انجام ہوا یہ کوئی نہیں جانتا۔

سر ہنری مورگن (ویلز):

یہ حیرت کی بات ہونی چاہیے کہ ایک بحری قزاق اور سر کا خطاب لیکن بات کچھ ایسی ہی ہے۔

کیپٹن مورگن کا تعلق برطانیہ سے تھا۔ اس کا زمانہ 1635ء سے 1688ء کا ہے وہ ایک بہادر اور بے جگر قسم کا بحری قزاق تھا۔ اس نے اسپین کے جہازوں کو لوٹنے کا وطیرہ بنا رکھا تھا۔ اس نے اسپین کی بحریہ کو زچ کر کے رکھ دیا تھا۔

مورگن نے چار سو کے قریب جہازوں کو لوٹا۔ اس نے پناما شہر پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ سمندروں پر اس کی دھاک بندھی ہوئی تھی۔

بالآخر مورگن گرفتار ہوا۔ اسے انگلینڈ بھیج دیا گیا لیکن چارلس دوم نے صرف اس بنا پر نہ صرف اس کی سزا معاف کردی بلکہ اسے سر کا خطاب بھی دیا کہ اس نے دشمن کو نقصان پہنچایا تھا۔ تو اس طرح ایک بحری قزاق کو سر کا خطاب ملا تھا۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اسے جمیکا کا گورنر بھی بنا دیا گیا تھا اور اپنی موت تک وہ اس عہدے پر رہا۔ گویا کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ چاہیں کچھ بھی کرلیں خوش نصیبی ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ مورگن بھی ان ہی لوگوں میں ایک تھا۔

سر فرانسس ڈریک (انگلینڈ):

اندازہ لگالیں کہ یہ بحری ڈاکو بھی سر کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ صرف اس لیے کہ اس نے اپنی بحری قزاقی سے

اسپین کو نقصان پہنچایا تھا۔ شاید اس زمانے کا دستور یہ رہا ہو کہ تم چاہے کوئی بھی ہو۔ کیسے بھی ہو۔ بس دشمن کو نقصان پہنچاؤ اور سر کا خطاب پالو۔ اس کا زمانہ 1540ء سے 1595ء کا ہے۔ ملکہ الزبتھ اوّل کے حکم پر اس کو سر کا خطاب دیا گیا تھا۔ یہ ایک بے رحم قزاق تھا۔ اس کا انتقال بد نصیبی کی وجہ سے پناما سٹی میں ہوا تھا۔

فرانکوئس (فرانسیسی):

اس کا زمانہ 1635ء سے 1668ء تک کا ہے۔ یعنی اس دوران اس نے قزاقی کی ابتدا کی اور انتہا کو پہنچ گیا۔ اس کا کردار اور بہت عجیب تھا۔ وہ ایک غریب انسان تھا۔ سادہ دل، معصوم اور ہمدرد۔ لیکن دولت اور طاقت ملتے ہی بے انتہا سخت دل اور بے رحم ہو گیا۔

وہ ایسا شخص تھا جو معاف کرنا جانتا ہی نہیں تھا اور اپنے دشمنوں کو اذیت دے کر مارا کرتا۔ اس شخص کی شہرت اس لیے بھی ہے کہ اس نے سمندر میں بھی لوٹ مار کی اور خشکی پر بھی۔ اس کے ساتھ پوری بٹالین ہوا کرتی تھی۔

اس نے کئی چھوٹے چھوٹے شہروں پر حملے کیے اور پورے شہر کو لوٹ کر واپس چلا گیا۔ چونکہ ٹرانکوس ایک لالچی شخص تھا صرف دولت کے لیے شہروں پر قبضہ کرتا اور لوٹ لینے کے بعد شہر اور شہر والوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر آگے روانہ ہو جاتا تھا۔

ایک بار وہ ایک قیدی کا دل نکال کر کھا گیا تھا اور خود اس کا یہ انجام ہو کہ پناما کے جنگلی قبائل نے اسے پکڑا اور کھا گئے۔ جس نے کسی کا دل نکال کر کھایا تھا بعد میں اسے بھی کھا لیا گیا۔ یہ تھا ایک بے رحم بحری قزاق کا انجام۔

چیونگ پو سائی (1800ء):

اٹھارہویں صدی کا مشہور بحری قزاق۔ اس کا تعلق چین سے تھا۔ یہ ایک بار بحری قزاقوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا۔ قزاق کے سردار نے اس کو اپنا بیٹا بنا لیا اور اپنے انداز سے اس کی تربیت شروع کر دی۔

بچپن ہی میں اس کے جوہر سامنے آنے لگے۔ قزاقی میں اس کا مستقبل بہت روشن نظر آنے لگا تھا اور ہوا بھی یہی۔ بڑے ہو کر وہ بہت بڑا قزاق بن گیا۔ اس کی طاقت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ سو کے قریب بحری جہازوں کا مالک تھا اور پچاس ہزار مسلح سپاہی اس کے ساتھ ہوا کرتے۔ شاید بہت سے ممالک کی سرکاری نیوی بھی ایسی نہیں ہوتی ہو گی۔ بالآخر چیونگ سائی میں پکڑا گیا۔ اس نے چینی حکومت کو پیشکش کی کہ وہ اپنے تجربے سے کام لیتے ہوئے بحری قزاقوں کو گرفتار کروا سکتا ہے۔ اسے بحری قزاقوں کی گرفتاری پر نہ صرف مقرر کر دیا گیا بلکہ کرنل کا عہدہ بھی دے دیا گیا۔ اسی عہدے پر اس کی موت واقع ہوئی۔

چنگ شی (عورت۔ چین سے تعلق):

بحری قزاقوں کی تاریخ میں چنگ شی نے بہت شہرت حاصل کی۔ بلا کی دلیر اور ذہین عورت تھی۔ اس کا زمانہ 1785ء سے 1844ء تک کا ہے۔ یعنی اتنے برسوں تک لوٹ مار کرتی رہی تھی۔ اس کا شوہر بھی بحری قزاق تھا۔ شوہر ہی نے اس کو قزاقی کی تربیت دی۔ سمندروں سے آگاہ کیا۔ وہ ساری تیکنیک بتائی جو قزاقی میں کام آتی ہیں۔

اس کے پاس بھی باقاعدہ بحری طاقت تھی۔ پندرہ سو جہاز اور 80 ہزار مسلح افراد خود اندازہ لگالیں کہ کتنی بڑی بحری قوت اس کے پاس ہو گی۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس نے ایک لڑکے چیونگ پر سائی کی پرورش کی۔ بعد میں اس سے شادی کر لی۔

بالآخر چنگ شی پکڑی گئی۔ حکومت نے کچھ سزا دے کر اس کو معاف کر دیا۔ یہ خود بھی لوٹ مار کی زندگی سے اکتا چکی تھی۔

اس نے چین میں ایک ہوٹل کھول لیا اور آخری دنوں تک اس ہوٹل کو چلاتی رہی۔ ہو سکتا ہے کہ تاریخ میں اور بھی بہت سے بحری قزاق گزرے ہوں یا گزر رہے ہوں۔ لیکن ہم نے صرف ان کا ذکر کیا ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے مشہور رہے ہیں۔

بحری قزاقی ایک بہت بڑا جرم سمجھا جاتی ہے۔ آج سمندروں میں ایسے کئی راستے ہیں جو اس لحاظ سے بہت خطرناک تصور کیے جاتے ہیں اور جہازوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ ان راستوں سے کترا کر نکل جائیں۔

لفظ بحری قزاق مسلم دشمنوں کا اخذ کردہ ہے۔ قازقستان کے لوگ بہت بہادر اور جنگجو تھے۔ ان کی وجہ سے عیسائیوں کو ہر جگہ ہزیمت اٹھانی پڑتی تھی۔ مسلمانوں سے نفرت کی وجہ سے ہی وہ ڈاکوؤں کو قازق یا قزاق کہنے لگے۔ ان کی تقلید میں ہم نے بھی یہ لفظ اردو میں شامل کر لیے۔

قسط نمبر: 236

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

علی سفیان آفاقی

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم وادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزاول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہوئی نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کردیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید وشنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب وصحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستان دردداستاں سرگزشت

سنیما کو متحد ہندوستان میں بائیسکوپ کہا جاتا تھا۔ اس سے پہلے تھیٹر اور اسٹیج ہی تفریح کا بڑا ذریعہ تھے۔ یہ ڈرامے عموماً رات بھر چلا کرتے تھے اور لوگ بستر اور کھانے پینے کا سامان اپنے ساتھ لے کر اسٹیج دیکھنے جاتے تھے۔
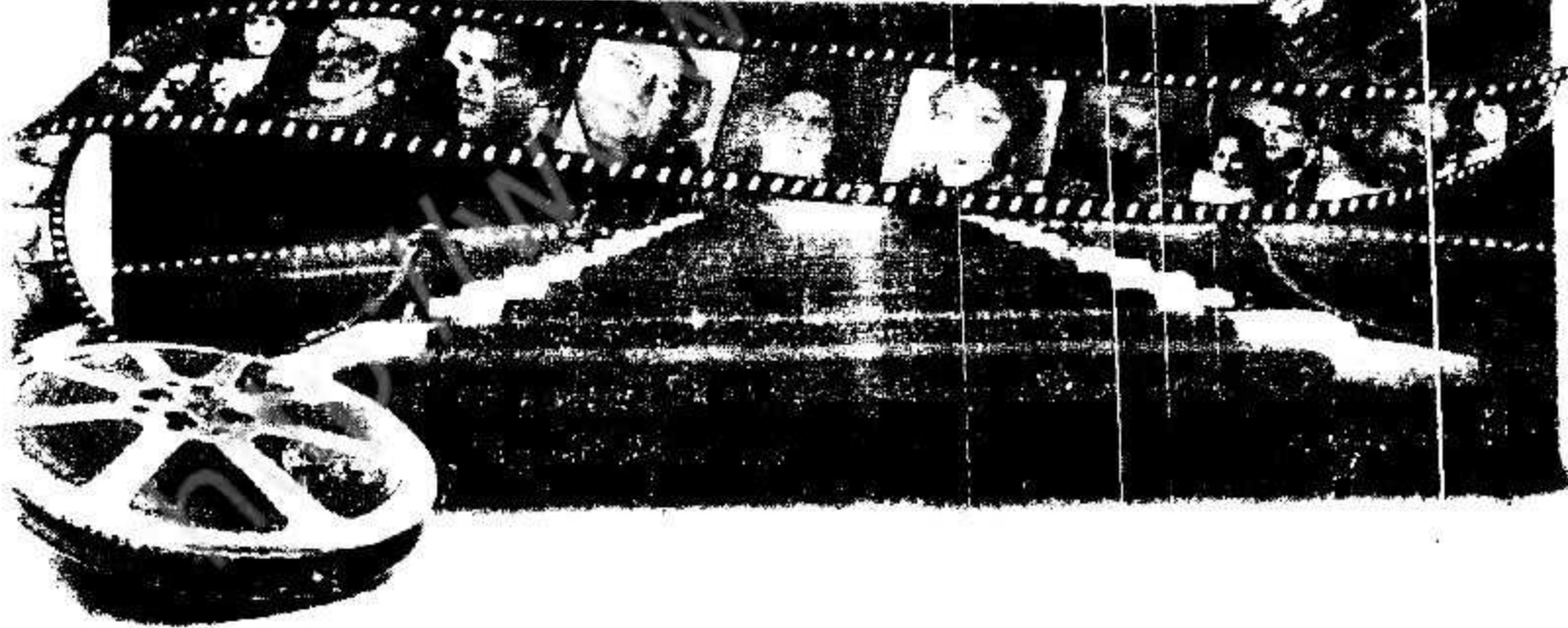
برصغیر میں فلم کا آغاز ہندوستانیوں نے ہی کیا لیکن انہوں نے ٹیکنیکل امداد کے لیے غیر ملکیوں کی خدمات حاصل کیں لہٰذا ابتداء میں جرمن ہدایت کار، ایڈیٹر اور دوسری ٹیکنیک جاننے والے غیر ملکی سے مدد لی گئی ان غیر

ملکیوں نے مقامی افراد کو بہت کچھ سکھایا۔ خصوصاً بمبئی، آگرہ اور کلکتہ کے سینٹرز میں ابتدائی تربیت دینے والے غیر ملکی ہی تھے۔ کیا آپ یقین کرسکتے ہیں کہ 1934ء میں بھی برصغیر والے فلم کی تربیت لینے انگلستان جایا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آغاز ہی سے انہیں برتری حاصل رہی اور انہوں نے بہت معیاری فلمیں بنائیں جن کے موضوعات آج بھی قابل غور ہیں۔

سہراب مودی جیسے قابل اور بڑے پیمانے پر سوچنے والے، بڑے پیمانے پر فلمیں بنائیں۔ مثلاً فلم ''سکندر'' بناتے ہوئے سہراب مودی نے اس کے ساتھ مکمل انصاف کیا اور سکندر کے زمانے کے ملبوسات اور ہتھیار خاص طور پر تیار کرائے۔ سکندر کی نمائش نے سارے ملک میں دھوم مچادی۔ جنہوں نے یہ فلم دیکھی ہے وہ آج تک اس کے مناظر اور مکالمے یاد رکھے ہیں۔

برصغیر کی دوسری عظیم فلم بنانے والے بھی سہراب مودی ہی تھے۔ اس بار انہوں نے ایک ہندوستانی موضوع اپنایا۔ ان کی فلم ''پکار'' آج تک لوگوں کو یاد ہے۔ اس میں نور جہاں کا کردار اداکار دلیپ کمار کی ساس نسیم بانو نے ادا کیا تھا۔ وہ ایک مہذب خاتون تھیں اور اپنے حسن و جمال کی وجہ سے انہیں ''پری چہرہ'' کا خطاب دیا گیا تھا جس کی وہ مستحق بھی تھیں۔ ان کے مقابلے میں شہنشاہ جہانگیر کا کردار چندر موہن نے ادا کیا تھا۔ وہ ایک باوقار اور خوب صورت انسان تھے۔ خاص طور پر ان کی موٹی موٹی آنکھیں اور شاہانہ چال کی وجہ سے وہ درحقیقت ایک شہنشاہ نظر آتے تھے۔ ایسا کردار انہیں بعد میں کبھی ادا کرنے کا موقع نہیں ملا۔

ہندوستانی بادشاہوں میں جہانگیر اپنے عدل و انصاف کی وجہ سے مشہور ہیں۔ اس فلم کی کہانی میں بھی سہراب مودی نے ان کی اس خصوصیت کا تذکرہ کیا۔ غلطی سے ملکہ نور جہاں نے ایک تیر چلایا جس کی وجہ سے ایک دھوبن ہلاک ہوگئی۔

جہانگیر نے اپنے محل کے سامنے ایک بہت بڑے سائز کی زنجیر عدل بنوائی تھی۔ کسی بھی شہری کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ رات یا دن کے کسی وقت بھی زنجیر عدل ہلا دے اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ خواہ ملزمہ ملک کی ملکہ ہی کیوں نہ ہو۔ بدقسمتی سے ہمارے حکمرانوں کا اس کے برعکس جہاں عوام انصاف کی طلب میں در در ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں لیکن کہیں سے انہیں انصاف نہیں ملتا کیوں کہ منصفوں کی قطار میں خود ملزم بیٹھے ہوتے ہیں۔ سہراب مودی کی اس فلم کو ان پرانے زمانے کی خواتین نے بھی دیکھی جنہوں نے کبھی زندگی میں سینما گھر کا رخ تک نہ کیا تھا۔

ہم نے پہلی فلم ''کنگن'' دیکھی تھی۔ وہ بھی خواتین والے ڈبے میں بیٹھ کر اس فلم میں ہیروئن ناراض ہوکر ہیرو کے دیئے ہوئے کنگن ہیرو کو واپس کر کے سمندر میں ڈوبنے جاتی ہے۔ جوں جوں ہیروئن سمندر کی طرف بڑھتی ہے دیکھنے والی خواتین کی آہ وزاری اور دعاؤں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ بالآخر ہیرو اس وقت سمندر تک پہنچتا ہے جب ہیروئن کی ساڑی کا صرف ایک پلو ہی سمندر کی سطح پر نظر آتا ہے لیکن کیوں کہ ہیروئین کو بچانا مقصود تھا اس لیے ہیرو اس کو بانہوں میں اٹھا کر سمندر سے باہر لے آیا اور پھر بہت فلمی خوشی رہنے لگے۔ ہیرو اشوک کمار تھے۔ فلم میں ہیروئین کا نام رادھا تھا مجھے اس قدر اچھی لگی کہ ہر کتاب یا کاپی پر ''رادھا'' لکھ دیا کرتے تھے اور پھر ہماری پٹائی بھی ہوتی۔

اس کے بعد ہم کو اگلی فلم دیکھنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ ہم نے اپنے چچازاد کے ہمراہ فلم ''بغداد کا چور'' دیکھی اور بغداد کے چور پر عاشق ہوگئے۔ بغداد کا چور کوئی مرد نہ تھا۔ یہ ایک خاتون تھیں جو ہمیں بہت اچھی لگیں۔ ان کا کمال یہ تھا کہ جب بادشاہ کی فوجیں ان کو پکڑنے کے لیے محل کی چھت پر پہنچتی ہے تو بغداد کا چور ایک قلابازی لگا کر نیچے فرش پر پہنچ جاتی تھیں فوجی بے چارے دوبارہ نیچے آتے تھے تو بغداد کا چور ایک ہی قلابازی لگا کر اوپر پہنچ جاتی تھیں۔ اس لیے کافی عرصے تک بغداد کا چور (یا چورنی) ہماری ہیروئین رہیں اور ہم دوسری فلم کا انتظار کرنے لگے۔

یہ ایک طویل تذکرہ ہے جس کے لیے ایک علیحدہ کالم کی ضرورت ہے جو وقت آنے پر بیان کی جائے گی۔

تذکرہ ہو جائے لاہور کی گلیوں کا۔ اس زمانے میں لاہور کے بارہ دروازے تھے جن میں سے ٹوٹ پھوٹ اب بہت کم رہ گئے ہیں۔ ہم اپنی قدیم یادگاروں کی قدر نہیں کرتے بلکہ جان بوجھ کر اس کا حلیہ بگاڑ دیتے ہیں۔ پرانے زمانے میں شہر عموماً فصیلوں کے اندر ہوتا تھا رات ہوتے ہی اس کے دروازے بند کر دیے جاتے تھے۔ مقصد شہریوں کے جان و مال کی حفاظت کرنا تھا۔ اب ہمارے بارہ دروازوں میں سے چند ٹوٹے پھوٹے دروازے ہی باقی رہ گئے۔ دروازے کا نام تو ہے مگر دروازہ غائب ہے۔ لوگوں نے مکانیں بنالی ہیں۔ اکبری منڈی بھی ایک دروازہ تھا۔

سہراب مودی

اسی طرح بھاٹی دروازہ سارے لاہور بلکہ پاکستان بھر میں مشہور ہے۔ لیکن اب یہ کھانے پینے کی مزیدار چیزوں کے حوالے سے مشہور ہے اگرچہ اب تو سارا لاہور فوڈ اسٹریٹ بن چکا ہے لیکن بھاٹی کے کھانوں کی بات ہی اور ہے۔

لاہور کے بارہ دروازے تھے جن میں سے اب مندرجہ ذیل باقی رہ گئے:۔

روشنائی گیٹ۔
کشمیری دروازہ۔
مستی گیٹ۔
خضری گیٹ۔
دہلی گیٹ۔
یکی گیٹ۔
اکبری گیٹ۔
موچی گیٹ۔
شاہ عالمی گیٹ۔
لاہوری گیٹ۔
موری گیٹ۔
بھٹی یا بھاٹی گیٹ۔
ٹکسالی گیٹ۔

اس مختصر تعارف کے بعد مزید معلومات حاضر ہیں۔

اکبر اعظم نے شہر کے گرد ایک مضبوط فصیل تعمیر کروائی جس میں تیرہ دروازے رکھے گئے تھے۔ ان دروازوں سے لاہور کی ثقافت اور قدیم تہذیب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ پرانی وضع کے دروازے، بل کھاتی گلیاں اور شکستہ جھروکے لاہور کے شاندار ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔ رنجیت سنگھ نے شہر کے گرد فصیل کی 1812ء میں ازسرنو تعمیر کروائی۔ انگریزوں نے فصیل اور دروازوں کو تباہ کردیا۔ صرف روشنائی دروازہ اصل حالت میں موجود ہے۔ 1947ء کے ہنگاموں میں دوسرے ثقافتی ورثوں کی طرح شاہ عالم دروازہ بھی جل کر تباہ ہوگیا۔

اکثر دروازوں کے نام وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بگڑ چکے ہیں۔ بھاٹی دروازہ تمام دروازوں سے طویل ہے۔ یہ علاقہ علم وادب کا مرکز رہا ہے۔

ماضی کے دریچوں سے لاہور شہر پر ایک نگاہ ڈالیں تو شہنشاہوں کا یہ شہر ایک بلند وبالا حفاظتی حصار کے اندر اپنی خوب صورتیوں اور رعنائیوں میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا ہے جس حکمران نے بھی اس شہر کو پایۂ تخت بنایا، اس نے اس کی حفاظت کو مقدم جانا۔ عہد مغلیہ بالخصوص اکبر اعظم کے دور حکمرانی میں لاہور نے ترقی، حفاظت اور تزئین وآرائش کی ان رفعتوں کو چھوا جو دنیا میں کم کم شہروں کو نصیب ہوتی ہیں۔ اکبر نے شہر کے اردگرد فصیل تعمیر کروائی جس میں نصب کیے جانے والے دروازے ایک طرف حفاظتی نکتہ نظر سے اہم تھے تو دوسری طرف ان کی خوب صورتی اور ناموں کی معنویت مغل فرمانروا کے تخیل کی بلند پروازی کا مظہر تھی۔ فصیلِ شہر اور اس کے مضبوط دروازے لاہور کے شہریوں کو تحفظ کا احساس دلاتے تھے۔ آج اگرچہ فصیل اور زیادہ تر دروازے موجود نہیں مگر پھر بھی ہمارے لیے ایک ایسے ثقافتی ورثے کا درجہ رکھتے ہیں جو ہمارے حال کو ماضی کے ساتھ وابستہ رکھتا ہے۔

لاہور شہر کیسے آباد ہوا؟ اس حوالے سے مختلف آراء ہیں۔ پہلی اور دوسری صدی میں یہاں راجپوت شہزادے حکمرانی کرتے تھے۔ آٹھویں اور نویں صدی میں لاہور طاقت ور براہمن خاندان کا دارالخلافہ بن گیا۔ اس کے بعد تقریباً آٹھ سو سال تک یہاں مختلف مسلمان حکمرانوں نے حکمرانی کی جن میں مغل سرفہرست ہیں۔ 19ویں صدی کے اوائل میں سکھوں نے پنجاب پر قبضہ کر کے لاہور کو پایۂ تخت بنایا لیکن 1839ء میں رنجیت سنگھ کی موت کے بعد انگریزوں کی حکمرانی آگئی۔ مغلیہ دور میں دریائے راوی شہر کی فصیل کے ساتھ بہتا تھا۔ اکبر کی تعمیر کردہ فصیل کو رنجیت سنگھ نے 1812ء میں دوبارہ تعمیر کروایا۔ لیکن 1849ء میں جب انگریز آئے تو انہوں نے فصیل شہر اور ماسوائے

روشنائی دروازے کے تمام دروازے تباہ کردیے۔ 1990ء میں قدیم شہر کے گرد فصیل تعمیر کرنے کا منصوبہ شروع ہوا اور کچھ دیوار بنی بھی لیکن کی وجہ سے منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ قدیم شہر کے زیادہ تر دروازے اب موجود نہیں لیکن ملک کے نامور مصور ممتاز حسن رومی کے تخیل نے ان دروازوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کینوس پر محفوظ کردیا ہے۔ لاہور کے دروازے پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

ذکی گیٹ یا یکی گیٹ:

ذکی گیٹ کا نام پیر ذکی شہید کے نام پر رکھا گیا تھا جو حملہ آوروں کے خلاف لڑتے لڑتے شہید ہوئے تھے۔ آج اس گیٹ کے آثار بھی نظر نہیں آتے اور یہ حوادثِ زمانہ کا شکار ہوچکا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا نام بھی بگڑتے بگڑتے یکی گیٹ بن گیا اور آج یہ یکی گیٹ کے نام سے ہی مشہور ہے۔

دہلی گیٹ:

یہ گیٹ چونکہ اس سڑک پر کھلتا تھا جو لاہور سے دہلی کو جاتی تھی۔ اس لیے اس کا نام دہلی گیٹ رکھا گیا۔ اس گیٹ کی تعمیر مغل دورِ حکومت میں ہوئی لیکن جب مغلیہ سلطنت کا سورج غروب ہوا تو انگریزوں نے نہ صرف اس دروازے کو مسمار کردیا بلکہ آس پاس واقع تاریخی عمارتیں بھی منہدم کردیں۔ اس دروازے کے آثار آج بھی چٹا دروازہ (سفید گیٹ) کے طور پر موجود ہیں جو موجودہ دروازے سے سو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ دروازہ چونکہ ہائی وے پر کھلتا تھا اس لیے شہر میں داخل ہونے کے لیے زیادہ تر یہی دروازہ استعمال ہوتا تھا۔ انگریزوں نے مغلیہ دور کے دروازے کی جگہ 1862ء میں بالکل ایک مغربی طرز کا دروازہ تعمیر کروایا جس کے اردگرد اور اوپر کئی کمرے تھے جو مجسٹریٹس اور وہ میونسپل آفیسرز کے زیرِ استعمال تھے۔ برطانوی عہد کا پہلا کوتوالی بھی اسی دروازے کے اندر قائم ہوا تھا۔ کسی زمانے میں اس دروازے کے باہر دارہ شکوہ کے نام سے منسوب ایک چوک بھی تھا جہاں ان کے محلات اور مشہور گھوڑا منڈی واقع تھی۔

اکبری دروازہ:

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس دروازے کا نام اکبر اعظم کے نام پر رکھا گیا تھا۔ انگریزوں نے عنانِ حکومت سنبھالی تو دوسری تاریخی عمارتوں کی طرح اس دروازے کو بھی مسمار کردیا اگرچہ دوسرے کئی دروازے تو بعد میں انہوں نے تعمیر بھی کروائے لیکن اس دروازے کی تعمیر کو

اکبری گیٹ

درخور اعتنا نہ سمجھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ اکبر اعظم کے نام سے منسوب تھا جن کی ہیبت سے ایک عالم کانپ اٹھتا تھا۔ اس دروازے کے اندر بہت بڑی غلہ منڈی قائم ہے جو اکبری منڈی کہلاتی ہے۔

موتی یا موچی گیٹ:

یہ دروازہ قدیم شہر کے جنوب میں کھلتا تھا۔ یہ بھی دوسرے کئی دروازوں کی طرح آج اپنا وجود کھو چکا اور صرف نام کی حد تک زندہ ہے۔ اس دروازے کے نام کے حوالے سے دو قسم کے خیال پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک نظریہ

دہلی گیٹ

موچی دروازہ

یہ ہے کہ دروازے کا نام اکبر کے ایک ملازم موتی رام کے نام پر رکھا گیا جو اس وقت دروازے کے قریب ہی رہائش پذیر تھا لیکن بعد میں نام بگڑتے بگڑتے موچی دروازہ بن گیا۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ کسی زمانے میں اس دروازے کے اندر ایک بازار تھا جہاں جوتے نہ صرف فروخت ہوتے تھے بلکہ پرانے جوتے مرمت بھی کیے جاتے تھے۔ اسی مناسبت سے اس دروازے کا نام موچی دروازہ پڑ گیا۔ ان دونوں مفروضوں میں کون سا مفروضہ درست ہے یہ تو حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن ایک بات طے ہے کہ یہاں دروازہ ضرور تھا۔

شاہ عالمی دروازہ:

اس دروازے کا اصل نام بھیرانوالہ گیٹ تھا۔ یہ دروازہ مغل شہنشاہ شاہ عالم بہادر شاہ کے نام سے منسوب تھا جو اپنے والد اورنگزیب عالمگیر کے بعد تخت پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے زیادہ تر وقت لاہور میں ہی گزارا تھا اور ان کی وفات کے بعد 1712ء میں اس دروازے کا نام ان کے نام پر رکھ دیا گیا۔ 1947ء میں جو فسادات پھوٹے اس کی آگ میں مسلمانوں کا شاندار ماضی جل کر خاکستر ہوا۔ ان میں یہ دروازہ بھی شامل تھا۔ آج یہ صرف نام کی حد تک زندہ ہے۔ اس دروازے سے ہی قدیم شہر کے اہم علاقوں کا راستہ جاتا تھا۔ اس دروازے کے پاس ہی نواب وزیر خان کی پری محل، حویلی، حویلی میاں خان، ایاز ملک کا مقبرہ اور گردوارہ باولی صاحب واقع تھا۔ آج پرانی عمارتوں میں صرف پری محل مسجد اور سنہری مسجد موجود ہیں جب کہ ملک ایاز کا مقبرہ از سر نو تعمیر کیا گیا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے اس دروازے کو خود شاہ عالم نے اپنی زندگی میں ہی خود سے منسوب کر دیا تھا۔ آج یہاں پاکستان کی سب سے بڑی ہول سیل مارکیٹ قائم ہے۔

لوہاری یا لاہوری دروازہ:

اس دروازے کا نام لاہور شہر کے نام سے ہی منسوب ہے۔ پہلے لاہور شہر کا ایک چوتھائی حصہ ہی آباد تھا جب گیارہویں صدی کے اوائل میں سلطان محمود غزنوی کے وائسرائے ملک ایاز نے شہر کی از سر نو تعمیر کروائی۔ اس دروازے کو لوہاری گیٹ بھی کہتے ہیں کیوں کہ ایک خیال یہ ہے کہ کسی زمانے میں یہاں لوہاروں کی دکانیں تھیں اور اسی مناسبت سے اس دروازے کو لوہاری گیٹ کہا جاتا ہے۔ یہ دروازہ نیو انارکلی بازار کے بالکل سامنے واقع ہے۔ برصغیر کے پہلے مسلمان حکمران قطب الدین ایبک اس دروازے کے باہر تھوڑے ہی فاصلے پر دفن ہیں۔ ملتان سے آنے
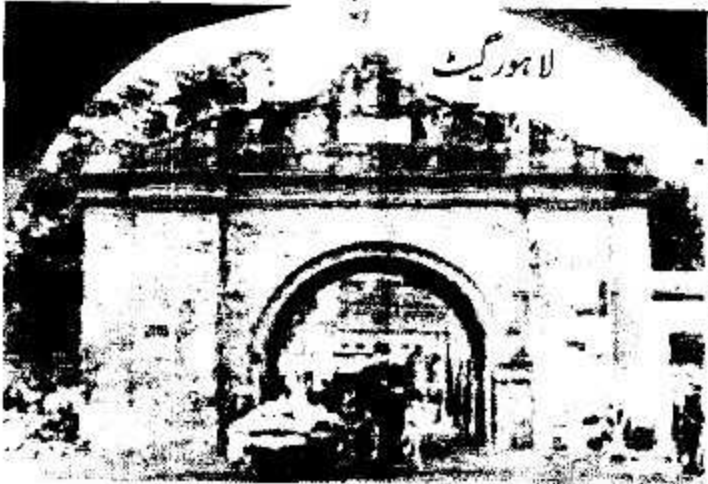
لاہور گیٹ

والے قافلے شہر میں داخلے کے لیے یہی دروازہ استعمال کرتے تھے۔ اس دروازے کے اندر کسی زمانے میں اینٹوں کا ایک قلعہ واقع تھا جو کچا کوٹ کے نام سے تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے جس کے بارے میں خیال ہے کہ یہ پہلا شہر لاہور تھا جس کی بنیاد ملک ایاز نے رکھی تھی۔ جو دروازے بعد میں انگریزوں نے از سر نو تعمیر کروائے وہ زیادہ تر مغربی انداز میں تعمیر ہوئے لیکن لوہاری واحد دروازہ ہے جو اپنی اصل حالت میں تعمیر ہوا۔ 18 ویں صدی کی انارکی کے دوران صرف لوہاری اور دو دوسرے دروازوں کے علاوہ باقی تمام دروازے بند کردیے گئے تھے۔

موری گیٹ:

یہ لاہور کے تیرہ دروازوں میں سب سے چھوٹا دروازہ تھا۔ پنجابی میں چونکہ سوراخ کو موری کہتے ہیں۔ اسی لیے یہ دروازہ موری گیٹ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ عام طور پر شہر کی گندگی باہر پھینکنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

ٹیکسالی گیٹ:

یہ دروازہ بھی دوسرے دروازوں کی طرح معدوم ہو

موری گیٹ

چکا ہے اور صرف نام کی حد تک زندہ ہے۔۔ مغلیہ دور میں یہاں ٹیکسال قائم تھی اور اسی مناسبت سے اسے ٹیکسالی گیٹ کہتے ہیں۔ آج یہاں گیٹ کے آثار موجود ہیں نہ ٹیکسال کے بلکہ یہ علاقہ شہر کا بدنام ترین علاقہ شمار کیا جاتا ہے کیوں کہ اس دروازے کے اندر بازار حسن واقع ہے۔ پنجابی زبان کے نامور شاعر شاہ حسینؒ اور استاد دامن بھی یہیں رہتے تھے اور آج بھی ان کا حجرہ خستہ حالت میں ہی سہی لیکن موجود ضرور ہے جہاں استاد دامن اکیڈمی واقع ہے۔

روشنائی گیٹ:

یہ دروازہ شہر کے شمال میں واقع ہے۔ یہ واحد دروازہ ہے جو اصل حالت میں موجود ہے اور ہمارے شاندار ماضی کی گواہی دیتا ہے۔ یہ بادشاہی مسجد اور شاہی قلعہ کے درمیان واقع ہے جو حضوری باغ میں کھلتا ہے۔ ماضی میں شہزادے، شہزادیاں، درباری اور شاہی ملازم شاہی قلعہ سے شہر میں داخل ہونے کے لیے اسی دروازے کو استعمال کرتے تھے۔ اس دروازے کے اندر واقع زیادہ تر گھر امراء کے تھے جہاں رات کو بلند و بالا عمارتوں میں چراغاں ہوتا تھا اور علاقہ بقعۂ نور بن جاتا تھا۔ اسی حوالے سے اس دروازے کو روشنیوں والا دروازہ یعنی روشنائی گیٹ کہتے ہیں۔ اس کی تعمیر بھی اکبر اعظم نے کروائی تھی اور صرف شرفا ہی اسے استعمال کرتے تھے۔ اورنگزیب عالمگیر نے اسے آبدار خانہ میں شامل کیا اور 1673ء میں اسے بادشاہی مسجد کے صحن میں شامل کرلیا گیا لیکن جب رنجیت سنگھ حکمران بنا تو اس نے اسے باقاعدہ باغ کی شکل دے دی درمیان میں ایک خوب صورت بارہ دری بنوائی جو حضوری باغ کے نام سے آج بھی موجود ہے۔

کشمیری دروازہ:

یہ دروازہ اگرچہ اب بھی موجود ہے لیکن زمانے کے زخم اس کے چہرے پر عیاں ہیں اور یہ ماضی کی شان وشوکت

کشمیری دروازہ

کھو چکا ہے۔ یہ دروازہ چونکہ کشمیر کے رخ پر ہے اس لیے اسی مناسبت سے کشمیری دروازہ کہلاتا ہے۔

مستی دروازہ:

اس دروازے کا اصل نام مسجدی دروازہ تھا کیوں کہ یہاں سے سیدھی سڑک لاہور شہر کی سب سے قدیم مسجد مریم مکانی کی طرف جاتی تھی جو اکبر کی والدہ مریم مکانی کے نام پر بنائی گئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نام مسجدی سے بگڑتے بگڑتے مستی ہوگیا۔ آج دروازے کے آثار بھی معدوم ہو چکے ہیں۔

روشنائی گیٹ

لاہور کا تاریخی کاظمی گیٹ

خضری یا شیرانوالہ دروازہ:

یہ دروازہ راوی کے کنارے کھلتا تھا۔ اس کا نام حضرت خضرؑ کے نام کی مناسبت سے خضری دروازہ رکھا گیا۔ جب رنجیت سنگھ نے دروازے کی از سر نو تعمیر کروائی تو اس نے اس دروازے پر دو سدھارے ہوئے شیر پنجرے میں رکھے تو یہ دروازہ شیرانوالہ گیٹ کے نام سے مشہور ہوگیا۔

بھاٹی دروازہ:

بھاٹی دروازہ شہر قدیم کے جنوب میں واقع ہے۔ اس کی دائیں جانب موری دروازہ اور بائیں جانب ٹکسالی دروازہ ہے۔ بھاٹی دروازے کے دائیں جانب تانگوں کا اڈا اور خالی میدان ہوتا تھا جہاں سرکس لگتا تھا اور بائیں جانب مسجد و مزار غلام رسول ہے۔ یہ بزرگ بلیوں والی سرکار کے نام سے مشہور ہیں۔ حکیم احمد شجاع اپنی کتاب ''لاہور کا چیلسی'' میں لکھتے ہیں: ''بھاٹی دروازے کا اصل نام بھٹی دروازہ تھا اور یہی وہ مقام تھا جہاں مغلوں کی حکومت آنے سے قبل بھٹی قوم کے جنگجو دلیروں نے ملتان کے بعد لاہور آکر پڑاؤ ڈالا تھا۔ دوسرے دروازوں کی طرح اس دروازے کا نام بھی بگڑتے بگڑتے بھٹی سے بھاٹی ہوگیا۔ ایک اور روایت کے مطابق ملک ایاز کے زمانے میں بھٹ قبیلے نے اس دروازے کے اندر رہائش اختیار کی اور اسی مناسبت سے یہ دروازہ بھاٹی دروازے کے نام سے مشہور ہوا۔ غزنوی کے دور میں قدیم شہر یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ لاہور کا سب سے پہلا سنیما گھر بھاٹی دروازے کے باہر قائم ہوا تھا۔ قدیم ''اونچی مسجد'' بھی اسی دروازے کے اندر

بھاٹی گیٹ

واقع ہے۔ فنِ تعمیر کے حوالے سے بھاٹی، خضری اور کشمیری ایک جیسے ہیں۔ لمبائی کے لحاظ سے یہ تمام دروازوں سے طویل ہے۔ انگریز دور میں اس کی از سرِ نو تعمیر ہوئی۔ بھاٹی دروازہ کوچہ فقیر خانہ اور فقیر خانہ میوزیم کے حوالے سے بھی مشہور ہے۔

☆......☆

ائرمارشل نور خان کے دور میں ان کی خواہش پر فضائیہ نے ایک فلم بنائی تھی جس میں پیشہ ور اداکاروں کے علاوہ دوسرے اداکار بھی کام کررہے تھے۔ اشفاق نقوی مزاح نگار ہیں آ-یے ان کی زبانی اس فلم کی روداد سنیے:

یہ قصہ ان دنوں کا ہے جب ائرمارشل نور خان پاک فضائیہ کے سربراہ تھے۔ انہیں اچانک ایک فلم بنانے کی سوجھی۔ بالکل کمرشل فلم وہ جو پردہ اسکرین پر دکھائی جاتی ہے۔ اس کا اولین مقصد تو فضائیہ کی پروجیکشن تھا مگر ساتھ ہی ملکی یک جہتی کا جذبہ بھی دکھایا گیا تھا۔ کہانی کچھ اس طرح تھی کہ مغربی پاکستان کا ایک نوجوان یعنی ہیرو فضائیہ میں فلائیٹ لیفٹیننٹ ہے اور مشرقی پاکستان کے رہنے والی ہیروئن فوج میں نرس بن کر پشاور میں تعینات ہے۔ کسی طرح دونوں کی نگاہیں لڑ جاتی ہیں۔ ادھر ہیرو کی بہن اس کے ایک مشرقی پاکستانی دوست اور فضائیہ کے افسر سے عشق فرمانے لگتی ہے۔ (فلم میں ان کا ایک دوگانہ بھی ریکارڈ کیا گیا جو آدھا اردو اور آدھا بنگلہ میں تھا)۔

اب چونکہ ہم بھی ان دنوں فضائیہ میں جھک مار رہے تھے تو اچانک ایک روز ہم پر حکم نازل ہوا کہ یہ فلم تم بنواؤ گے یعنی بندہ حقیر کی تقدیر میں یہ بھی لکھا تھا کہ فلاں فلاں گھڑی اسے فلمی دنیا کی طرف کوچ کرنا پڑے گا۔ اب مجبوری تھی ہم اس دنیا میں داخل بھی ہوگئے اور بخیر و عافیت لوٹ بھی آئے مگر صرف لوٹ آنے کی حد تک اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں جو ہم پر بیتی وہ تو کچھ ہم ہی جانتے ہیں۔

ہم نے اے۔ جے کاردار کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ لوگ کہتے تھے بڑا ہی ماہر فلم ساز ہے، دنیا کے دس بہترین ڈائریکٹروں میں شمار ہوتا ہے۔ انگلستان میں باقاعدہ ٹریننگ حاصل کرچکا ہے۔ اس کی بنائی ہوئی فلمیں بین الاقوامی میلوں میں انعام حاصل کرچکی ہیں۔ اس کی بیوی لبنان کے کسی وزیر کی بیٹی ہے اور ایک زمانے میں مس لبنان بھی رہ چکی ہے وغیرہ۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران وہ بحریہ میں افسر رہا ہے۔

جنگ ختم ہونے کے بعد جب وہ رہا ہو کر اپنے بھائی اے آر کاردار کے پاس بمبئی پہنچا تو اس نے اسے مدراس بھیجا تاکہ وہاں سے کچھ وصولی کرلائے مگر وہ ایسا گیا کہ کئی ماہ تک غائب رہا۔ معلوم ہوا کہ وہ سر منڈوا کر ایک آشرم میں سادھو بنا بیٹھا ہے۔ قصہ کوتاہ اس کے بارے میں جو کچھ بھی سنا وہ ایک شریف آدمی کو خوف زدہ کرنے کے لیے کافی تھا اور ہم خود کو شریف آدمی ہی سمجھتے تھے بلکہ اب تک سمجھتے ہیں۔

کاردار نے اپنی مدد کے لیے ایک نائب بھی چن رکھا تھا۔ ثنا اللہ گنڈاپور۔ وہ بعد میں نیف ڈیک کا لاہور میں منیجر بھی بن گیا۔ کیمرا مین مرون مارشل تھا۔ اس کا تعلق تو انگلستان کے کسی امیر گھرانے سے تھا مگر فوٹوگرافی کا شوق اسے لے ڈوبا۔ اس نے باقاعدہ ٹریننگ حاصل کر کے کیمرا مین کا پیشہ اختیار کرلیا۔ اس کا یہ شوق جنون کی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ لوگ مذاق سے کہا کرتے تھے کہ اگر مارشل کو سڑک پر جاتے ہوئے کوئی آدمی دکھائے دے جو ہتھوڑے سے کسی بچے کا سر کچل رہا ہے تو وہ بڑھ کر اسے روکنے کی بجائے فوراً اپنا کیمرا نکال کر اس منظر کی فلم بنانی شروع کردے گا۔

اس کی بیوی کراچی میں رہتی تھی۔ اس سلسلے میں ایک مرتبہ اس نے ہم سے شکایت بھی کی۔ کہنے لگی جب مجھے معلوم ہوا کہ کئی روز باہر رہنے کے بعد وہ فلاں دن گھر آئے گا تو میں اس روز خاص طور سے بال بنواتی ہوں اور اچھا سا میک اپ کر کے بیٹھ جاتی ہوں مگر جب یہ گھر میں داخل ہوتا ہے تو ہیلو کہہ کر فرش پر بیٹھ جاتا ہے اور اپنے کیمرے نکال کر ان کے لینز صاف کرنا شروع کردیتا ہے۔ میری طرف دیکھتا بھی نہیں۔ خیر اس بے اعتنائی کا اس محترمہ نے بھی بڑے اچھے طریقے سے بدلہ لیا مگر وہ ایک الگ داستان ہے۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اب ہوا یوں کہ ہمیں اس دیوانے یعنی اے جے کاردار کے ساتھ نتھی کردیا گیا۔ اس کے ذمے یہ کام تھا کہ فلم ڈائریکٹ کرے اور ہمارے ذمے یہ کام کہ اس فلم سازی کے دوران اسے جو مدد درکار ہو وہ فراہم کریں۔ گویا ہم فلم کے پروڈکشن منیجر بنا دیے گئے۔ یہ فلم شروع تو پشاور میں ہوئی مگر رفتہ رفتہ آگے کھسکتی رہی یہاں تک کہ مشرقی پاکستان تک جا پہنچی۔ ظاہر ہے ہم بھی اس کے ساتھ ساتھ کھسکتے بلکہ گھسٹتے رہے اور نتیجتاً کوئی پچیس پاؤنڈ وزن کھو بیٹھے۔

پہلے تو ہم نے اس فلم کے بارے میں مزید معلومات اکٹھا کرنا شروع کیں اور جوں جوں یہ معلومات بڑھتی گئیں

فلم پکار کا ایک منظر

ہماری پریشانیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔

اوّل تو اسی خبر نے مرعوب کر کے رکھ دیا کہ فلم کی کہانی لکھنے والوں میں پروفیسر احمد علی اور زیڈ اے بخاری جیسے لوگ شامل ہیں اور نغمہ نگاروں میں فیض احمد فیض مگر آگے چل کر جب اس فلم میں کام کرنے والوں کی فہرست دیکھی تو ہم بھونچکا رہ گئے۔ اس زمانے کی فلمی دنیا کا کون سا بڑا نام تھا جو اس میں شامل نہیں تھا۔ شبنم، سورن لتا، فریدہ خانم، روزینہ، صاعقہ، مینا شوری،

طارق عزیز، شہزادی تاج، مشرقی پاکستان سے روزی اور دو مرد اداکار خدا کی پناہ۔ ان کے علاوہ آرٹ ڈائریکٹر بھی یعنی جس کے ذمے سیٹ اپ اور مختلف قسم کے لباس تجویز کرنے کا کام تھا وہ تھی بین الاقوامی شہرت یافتہ مصورہ لیلیٰ شہزادہ۔ اسے ہم نے بہت عرصے پہلے جوناگڑھ میں دیکھ رکھا تھا۔ اس کے والد علی بھائی جاویری یعنی جوہری ساتھ والی ریاست جام نگر میں رہتے تھے اور ہندوستان کے پرل کنگ (سچے موتیوں کے بادشاہ) مشہور تھے۔ وہ بحری جہاز لے کر سمندروں کو کھنگالتے اور ان کی تہہ سے موتی نکلواتے۔ انہیں ایک مرتبہ جوناگڑھ کے دیوان (وزیراعظم) نے مدعو کیا اور وہ اپنی انگریز بیوی اور بچیوں لیلیٰ اور نور جہاں سمیت وہاں آن پہنچے۔ یہ دونوں بہنیں وہاں گھڑسواری سے دل بہلانے لگیں۔ ان دنوں ہم بھی جوناگڑھ لانسرز میں لیفٹیننٹ تھے۔ اس لیے کبھی کبھی اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوئے ان کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ لیلیٰ تو اس کے بعد علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے چلی گئی اور بعد کو ایک عیسائی پائلٹ سے شادی کر لی مگر جب یہ فلم بنی تو وہ اپنے پہلے شوہر کو چھوڑ کر ساسا ایڈورٹائزنگ والے شہزادہ احمد شاہ سے شادی کر چکی تھی اور اسے لال میاں کہہ کر پکارتی تھی۔ باقی رہی اس کی بہن نور جہاں تو وہ پاکستان کے اوائل ایام میں اپنی چھوٹی سی سرخ رنگ کی کار کا ہڈ اتار کر شام کو کراچی کے صدر بازار میں بلاوجہ چکر کاٹتی اور دیکھنے والوں کو ترساتی۔ اس نے بعد میں ایک چھوٹے موٹے ایکٹر سے شادی کر لی۔

ہاں تو، اس فلم بنانے کے سلسلے میں ہماری اوّلین ڈیوٹی یہ تھی کہ ان تمام فلمی ستاروں کو سنبھالیں۔ ان کے قیام اور طعام کا انتظام کریں، ان کے ناز نخرے اٹھائیں اور ساتھ ہی یہ حکم بھی کہ انہیں وقت پر شوٹنگ کے لیے پہنچائیں۔ ظاہر ہے اس آخری بات کا یہ قبیلہ ہرگز عادی نہ تھا۔ اگر وہ عادی تھا تو لاڈ کرنے کا اور لاڈ اٹھوانے کا۔

پہلا مرحلہ ان کے قیام کا تھا۔ پشاور ایک چھوٹا سا شہر اور اتنے بہت سے بڑے بڑے مہمان مگر ڈیوٹی آخر ڈیوٹی تھی۔ ان کی رہائش کا انتظام کرنا ہی پڑا۔ ڈین ہوٹل میں کمرے لے کر خواتین کو وہاں فٹ کیا۔ طارق عزیز اور دو بنگالی ایکٹروں کو آفیسر میس میں ٹھہرایا اور خود کار دار اور اس کے دیگر عملے کو پشاور کلب کے حوالے کیا۔ لیلیٰ نے کوئی پرابلم

پیش نہ کی۔ وہ ائر مارشل نور خان کی عزیز تھی اس لیے ائر ہاؤس میں چلی گئی۔ اس وجہ سے ہماری شان تو بڑھ گئی مگر دوستوں نے حسد کرنا شروع کر دیا کیوں کہ ہم کھلے بندوں ان کے گھر میں داخل ہو سکتے تھے۔ چاہے رات کے دو ہی کیوں نہ بجے ہوں۔ آخر لیلیٰ کو لانا اور واپس چھوڑنا بھی تو ہمارے ہی ذمے تھا۔ ویسے بھی لیلیٰ ہم پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو گئی تھی۔

مہمانوں کو ٹھکانے لگا تو دیا مگر شامت آ گئی ہماری دن میں چار مختلف مقامات کا چکر لگانا پڑا۔

پشاور کے عوام کو جونہی خبر ملی کہ ان کے شہر میں ایسی ایسی شہرہ آفاق ہستیاں نازل ہو گئی ہیں تو انہیں شوق دیدار نے برانگیختہ کر کے ہمارے لیے ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا یعنی ان نامور ہستیوں کو نگاہ بد سے بچانے کا۔ اس سلسلے میں پولیس کی مدد طلب کی جو مل تو گئی مگر بذاتِ خود ایک مصیبت ثابت ہوئی۔ سپاہی جو تعینات کیے گئے وہ بھی تو بے چارے دل پشوری کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے خود بہانے بنا بنا کر ان فلمی ستاروں کے کمروں میں جانا شروع کر دیا اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے دوستوں کو بھی دعوت دیدار دینے لگے۔ شبنم کے ساتھ تو خیر اس کے میاں روبن گھوش تھے اور ایک آدھ نے اور بھی دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنی بڑی بی کو ساتھ لے آئی تھیں مگر وہ جو غلطی سے تنہا آ گئیں پریشان ہونے لگیں اور ہمارے سامنے شکایات کے انبار لگ گئے جس کے نتیجے میں ہماری ڈیوٹی میں ایک اور اضافہ ہو گیا یعنی ان کی اشک شوئی کرنا، انہیں یقین دلانا کہ کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ بس بے چارے زیر دیوار کھڑے ہیں تیرا کیا لیتے ہیں وغیرہ۔

ان حالات سے تنگ آ کر ہم نے کاردار سے کہا کہ بھائی ان پری چہرہ لوگوں سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرو جس کا کام نہ ہو اسے واپس لاہور بھیج دو، آخر پشاور کون سا دور ہے جس روز شوٹنگ ہو صبح کی فلائٹ سے بلا لو تاکہ شام کو اپنے گھر لوٹ جائیں۔ ہماری ذمہ داری میں کچھ کمی تو کرو۔ خدا کا شکر کہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور ہم نے بیشتر کو وہاں سے روانہ کر کے اطمینان کی سانس لی۔

فلم کی شوٹنگ ہوتی رہی اور ہم صبح شام ہوائی اڈے کے چکر کاٹتے رہے۔ کبھی کسی کو لینے کبھی کسی کو چھوڑنے۔ ایک مرتبہ ہم کسی پری چہرہ کو ہوائی اڈے سے لے کر آ رہے تھے کہ دیکھا ہماری بیگم پیدل چلی جا رہی ہیں، ہم نے گاڑی روک کر انہیں ساتھ بیٹھنے کو کہا تو انہوں نے منہ بنا کر اور بھی تیز رفتاری سے پیدل چلنا شروع کر دیا۔

ایک صبح صاعقہ کی آمد تھی۔ باقی تمام عملہ موقع واردات پر پہنچ چکا تھا۔ ہمیں اسے ہوائی اڈے سے سیدھے وہاں پہنچانا تھا۔ سین کچھ اس طرح تھا کہ پشاور کے ایک پرانے مکان کی چھت پر صاعقہ اور روزینہ کھڑی ہیں اوپر سے فضائیہ کے تین طیارے گزرتے ہیں جنہیں دیکھ کر یہ دونوں ہاتھ ہلاتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے تین فائٹر پشاور کے رن وے پر تیار کھڑے تھے۔

صاعقہ جہاز سے اتری تو اس کی باجی بھی ساتھ تھی۔ ہم آگے بڑھ کر انہیں کار کی طرف لے جانے لگے تو اس کی باجی بول اٹھی۔ ”لڑکی کی طبیعت خراب ہے، جہاز میں قے کرتی رہی ہے۔“ اب ہم تو جانتے تھے کہ اس قے کا طبیعت کی خرابی سے کوئی تعلق نہیں۔ پرواز کے دوران ایک آدھ جھٹکا لگے تو ایسا ہو ہی جاتا ہے مگر وہ کہاں ماننے والی تھی کہنے لگی، شوٹنگ بعد میں دیکھی جائے گی پہلے لڑکی کو ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔ ہم برے پھنسے۔ ادھر اس کے انتظار میں شوٹنگ نہیں ہو سکتی تھی ادھر اس کا یہ اصرار۔ چاروناچار پی اے ایف اسپتال کا رخ کرنا پڑا۔ ان دونوں کو باہر چھوڑ کر ہم اندر گئے ڈاکٹر صاحب سے سرگوشی کی جو مریضہ لے کر آیا ہوں اس کی طبیعت میں کوئی خرابی نہیں بس جلدی سے تسلی کے لیے کوئی ہلکی سی دوا دے دو تاکہ شوٹنگ میں تاخیر نہ ہو۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم فوراً مریضہ کو اندر لے گئے مگر انہوں نے ہمیں باہر جا کر انتظار کرنے کو کہا۔ چلو کوئی بات نہیں۔ ہم باہر آ گئے اور لگے کرنے انتظار۔ جب وہ انتظار ایک حد سے بڑھنے لگا تو ہم پریشان ہو گئے۔ اِدھر اُدھر ٹہلنے اور جب صبر کا پیمانہ بالکل لبریز ہو گیا تو ہم ڈاکٹر صاحب کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جا دھمکے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ مریضہ کے بازو پر پٹی باندھے اس کا بلڈ پریشر دیکھ رہے ہیں۔ ہم پر نظر پڑی تو دوبارہ خشمگیں نگاہوں سے باہر جا کر انتظار کرنے کا حکم صادر فرما دیا۔ ہم تو اپنا سر پکڑ کر رہ گئے۔ ہم جتنی جلدی میں تھے ڈاکٹر صاحب اتنی ہی دیر کر رہے تھے۔ کوئی مزید آدھ گھنٹے کے بعد مریضہ کمرے سے نمودار ہوئی۔ ہاتھ میں ایک پرچی تھی جس پر کوئی درجن بھر دواؤں کے نام لکھے تھے جنہیں بنواتے بنواتے کوئی آدھ گھنٹا اور صرف ہو جاتا۔ ہم نے اپنے معزز مہمانوں سے درخواست کی کہ آپ شوٹنگ کے لیے چلیے ہم واپس آ کر دوا لے جائیں گے مگر وہ کہاں ماننے والی تھی۔

کہنے لگیں پہلے دوا لیجیے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے میرے سامنے آکر کھانا ہے ڈاکٹر تیرے صدقے (ویسے یہ ڈاکٹر پانچ وقت کے نمازی کیا تہجد گزار بھی مشہور تھے)۔

خیر، یہ شوٹنگ کسی طور اس روز مکمل ہو ہی گئی یہ اور بات ہے کہ کاردار بار بار کٹ کا نعرہ لگاتا کیوں کہ جہاز اوپر سے اس تیزی سے گزرتے کہ کبھی ایک لڑکی ہاتھ اٹھانے میں تاخیر کر دیتی کبھی دوسری۔ بس وائرلیس کے ذریعے جہازوں سے بار بار کہنا پڑتا کہ ایک چکر اور لگاؤ۔ اس وجہ سے اتنی دیر ہوگئی کہ صاعقہ لاہور واپس نہ جاسکی۔

اس رات سب کو بستر استراحت پر لٹانے کے بعد ہم اپنے گھر جاتے ہوئے آفیسرز میس میں سے گزرے۔ رات کے کوئی گیارہ بج رہے تھے۔ دیکھا کہ میس کی بار میں بتیاں جل رہی ہیں۔ ہمیں بڑی حیرت ہوئی کیوں کہ بار تو رات دس بجے بند کرنے کا حکم تھا۔ ہم گاڑی روک کر اندر گئے تو کیا دیکھا کہ وہ تینوں پائلٹ جنھوں نے لڑکیوں کے اوپر سے پرواز کی تھی وہاں اپنا غم غلط کر رہے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی پھٹ پڑے۔ ”سر! آپ نے مروا دیا۔ ہم سے بار بار چکر لگوائے مگر وہ لڑکیاں ہمیں دکھائی تک نہ دیں۔“ ہم فوراً جلال میں آگئے۔ ”اچھا تو یہ بات ہے۔“ ہم نے کہا۔ ”بار مت بند ہونے دینا، ہم ابھی ان کو لے کر آتے ہیں۔“

ہم واپس ڈین ہوٹل آئے۔ روزینہ اور صاعقہ کو جگا کر فوراً تیار ہونے کا حکم دیا اور انہیں اپنی جیپ میں بٹھا کر واپس آفیسرز میس آگئے۔ لڑکوں کی تو باچھیں کھل گئیں اور انہوں نے اونچا میوزک لگا کر ڈانس کرنا شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک تو آگے چل کر ائر چیف مارشل اور فضائیہ کا سربراہ بھی بنا۔ روزینہ یہ سمجھی کہ ہم اسے کسی ذاتی غرض سے جگا کر لائے ہیں۔ وہ ہمارے برابر کاؤنٹر کے اونچے اسٹول پر بیٹھی اپنا پاؤں بڑھا کر ہماری ٹانگ سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ ہم نے فوراً ڈانٹ دیا۔ اگر اس کی یہ حرکت برداشت کر لیتے تو اگلے روز وہ ہمارا حکم کیسے مانتی۔

اب کچھ مینا شوری کے بارے میں سنیے۔ یہ محترمہ جتنے روز شوٹنگ چلتی رہی پشاور ہی میں براجمان رہیں۔ گجرات کی یہ الہڑ پہلے پہل مینا کماری کے نام سے فلم سکندر اعظم میں آئی اور اس کے مکھڑے کے کالے تل پر دنیا فریفتہ ہوگئی۔ بعد میں لارا لپا گرل کے نام سے مشہور ہوئی مگر یہ باتیں اس وقت کی تھیں جب آتش جوان تھا۔ اب تو پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا تھا۔ ان دنوں تو اسے دیکھ کر یہی محسوس ہوا کہ وہ شدید ذہنی کوفت میں مبتلا ہے۔ بار بار اپنے اس بیتے ہوئے زمانے کو یاد کرتی۔ میرے گھر کے گرد راجے مہاراجے چکر لگایا کرتے تھے۔ اس کا تکیہ کلام بن چکا تھا۔ اس کا دل بہلانا بھی ہمارے ہی فرائض میں شامل ہوگیا اور جب اسے پتا چلا کہ اس کا پہلا میاں ظہور راجا ہمارا دوست رہا ہے تو وہ ہم سے اور بھی زیادہ ہمدردیاں طلب کرنے لگی۔ ویسے کاردار نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ مینا کو ہر روز شراب کی ایک پوری بوتل مہیا کر دی جائے۔

چلتے چلتے کچھ ظہور راجا کے بارے میں بھی سن لیجیے۔ یہ نوجوان پنڈی کا رہنے والا تھا اور ایک روز گھر سے فرار ہو کر بمبئی کے فلستان میں پہنچ گیا۔ اس کا والد تھانیدار تھا اور جب اسے معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا ایکٹر بن گیا ہے تو سیخ پا ہوگیا اور زندگی بھر اس کی صورت نہ دیکھنے کی قسم کھالی۔ کافی عرصے کے بعد پنڈی میں ایک فلم لگی جس کا نام تھا مرزا صاحباں۔ اس کا ہیرو ظہور راجا تھا۔ اس کے گھر والوں کو جب معلوم ہوا کہ اس فلم میں ظہور راجا بھی ہے تو اس کی بہنیں اپنے بھائی کو دیکھنے کے لیے تڑپ اٹھیں۔ اس زمانے میں لڑکیاں آج کل کی طرح منہ اٹھائے اکیلی سینما نہیں جایا کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنی والدہ کو ساتھ ملایا۔ وہ بھی اپنے لخت جگر کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہوگئیں مگر پھر وہی ڈر۔ بڑے راجا صاحب سے فلم دیکھنے کی اجازت کیسے لی جائے؟ ایک دن انہیں اچھے موڈ میں دیکھ کر نہ صرف فلم دیکھنے کی اجازت لی گئی بلکہ وہ خود بھی ساتھ چلنے پر آمادہ ہوگئے۔

پورا خاندان سینما گھر پہنچا۔ فلم شروع ہوئی اور ظہور راجا نے اپنا دیدار کرانا شروع کیا مگر آگے چل کر سین آیا جس میں ظہور راجا کی پٹائی ہونے لگتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کی ماں اور بہنیں تو بلبلا اٹھیں مگر بڑے راجا صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے تھانیدارانہ آواز لگائی۔ ”بہت مارو، ممبئی جا کے کنجر بن گیا اے۔“

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے ہماری فلم میں سورن لتا بھی تھی۔ اسے دیکھ کر ہمیں اس کی کئی سال پرانی فلم یاد آگئی جس میں اس کا گانا ”اکھیاں ملا کے، جیا برما کے، چلے نہیں جانا“ زباں زد عام ہوا کرتا تھا۔ اس فلم میں ہمارے دوست کرن دیوان نے ہیرو کا رول ادا کیا تھا۔ اب ہم نے اسے نہایت کم گو، مدبر، سنجیدہ اور انتہائی باوقار پایا۔ وہ اکیلی اپنے کمرے کے برآمدے میں بیٹھی رہتی اور دوسروں کے کمروں کے گرد چکر کاٹنے والوں کا تماشا کرتی۔

کاردار فلم میں لمبے ڈائیلاگ کا قائل نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ریڈیو ڈراموں کی کہانی ڈائیلاگ کے ذریعے آگے چلتی ہے مگر فلم میں تو سیلولائیڈ یعنی تصویر خود بولتی ہے۔ اسی لیے فلموں کے عالمی مقابلوں میں تمام فلمیں بغیر ساؤنڈ ٹریک کے دکھائی جاتی ہیں۔ یہ فلم جو ہم بنا رہے تھے اس میں بھی ڈائیلاگ کا فقدان تھا۔ اسی لیے سورن لتا ایک روز ہم سے پوچھنے لگی۔ ''نقوی صاحب کیا یہ سائیلنٹ فلم بن رہی ہے؟''

اس دوران ہم نے پشاور کلب میں فریدہ خانم پر ایک گانا بھی فلم بند کیا۔ کلام فیض کا ہم کو یہ قاتل سے آئے ہیں اور آواز فریدہ کی۔ بس سماں بندھ گیا مگر مصیبت یہ ہوئی کہ کلب کے تمام ممبران شراب کے نشے میں دھت وہاں آدھمکے اور ہمیں کئی ری ٹیک کرانے پڑے۔

اس فلم کے ایک سین میں شبنم کو بطور فوجی نرس پیش کرنا تھا لہٰذا اس کے لیے وردی درکار تھی۔ ہم فوراً سی ایم ایچ کے نرسنگ ہاسٹل پہنچے اور میٹرن سے اپنا مدعا بیان کیا۔ کہنے لگی وردی تو آپ کو مل جائے گی مگر پہنائیں گے ہم خود۔ آپ فلموں والے (یعنی ہمیں یہ بھی سننا تھا) نرسوں کو بڑے غلط انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اسے وارڈ میں مریضوں کے درمیان اچھلتے کودتے اور گانا گاتے دکھاتے ہیں۔ ہم شبنم کو خود سمجھائیں گے کہ نرس بن کر کس طرح چلنا پھرنا چاہیے۔

شام ہوئی تو حسب ارشاد ہم شبنم کو سی ایم ایچ کے نرسنگ ہاسٹل لے گئے۔ مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وردی پہنانے کی رسم ادا کرنے کے لیے اسپتال کی تمام نرسیں موجود تھیں۔ پھر وہاں پر ایک اور مصیبت کھڑی ہوگئی۔ شبنم خاصی دراز قد ہے اسے کسی کی شلوار پوری نہیں آرہی تھی۔ مجبوراً ہم بھاگ کر اپنے ایک افسر کے گھر گئے اور اس کی دراز قد بیوی کی منت کرکے انھی کی شلوار مستعار لے آئے۔ یہ الگ بات ہے کہ چند روز بعد جب ہم وہ شلوار واپس کرنے گئے تو انہوں نے اسے صحن میں پڑے کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیا۔ خیر باقی تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوگیا مگر اس روز ہماری شوٹنگ کوئی دو گھنٹے تاخیر سے شروع ہوئی۔

ہر فلم کا باقاعدہ اسکرپٹ ہوتا ہے جس میں ہر تفصیل درج ہوتی ہے یعنی فلاں سین اس طرح ہوگا اس میں فلاں فلاں یہ یہ کپڑے پہنے گا۔ اس کے لیے یہ یہ سامان درکار ہوگا وغیرہ مگر ہماری اس فلم کا کم از کم ہمارے پاس کوئی اسکرپٹ نہیں تھا۔ بس ہر بات کاردار کے اپنے دماغ میں تھی۔ بیٹھے بیٹھے کہتا چلو فلاں فلاں کو ساتھ لو آج وارسک میں شوٹنگ کریں گے یا خشک جھیل کے کنارے سین فلمائیں گے۔ ہم حکم کی بجا آوری کرتے۔ ہمیں کچھ معلوم نہ ہوتا کہ اس سین کے لیے کیا کیا سامان درکار ہوگا۔ ایک شام ہم پشاور سے کوئی آٹھ دس میل دور وارسک کالونی پہنچے۔ وہاں فضائیہ کے افسر فیملی کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ شوٹنگ شروع ہوئی اور چلتی رہی۔ رات کوئی بارہ بجے کاردار کہنے لگا کہ دو سپاہی چاہئیں جن کے ہاتھوں میں اسٹین گن ہو۔ سپاہی تو وہاں اس وقت موجود تھے مگر اسٹین گنیں کہاں سے آئیں؟ مجبوراً ہمیں پشاور واپس آکر آرمامنٹ افسر کو نیند سے جگانا پڑا۔ اس نے آکر آرمری کھولی اور دو عدد اسٹین گنیں ہمارے حوالے کیں۔ ہم لے کر گاڑی بھگاتے ہوئے واپس وارسک پہنچے اور وہ اسٹین گنیں پیش کیں۔ کاردار نے ان کی طرف دیکھا تک نہیں۔ کہنے لگا میں نے سین کا وہ حصہ کاٹ دیا ہے اب ان کی ضرورت نہیں۔ ہم تو سر پیٹ کر رہ گئے۔

ایک مرتبہ کاردار کو جو سین فلمانے کی سوجھی وہ بھی وارسک ہی میں تھا۔ اس میں روزی اور اس کی سہیلی شبنم علی الصبح ایک مکان کے سامنے کھڑی دکھائی جاتی ہیں۔ اوپر سے ایک ون او فور طیارے چڑھتے سورج کی طرف پرواز کرتا ہوا گزرتا ہے اور یہ دونوں اسے دیکھ کر ہاتھ ہلاتی ہیں اب باقی تو سب کچھ ٹھیک تھا مگر ون او فور طیارے صرف سرگودھا میں تھے سو ہم نے وہاں کے بیس کمانڈر کو فون کیا۔ ان دنوں ظفر چودھری صاحب وہاں تعینات تھے ہم نے کہا۔ ''سر! کل صبح پانچ بجے ایک ون او فور چاہیے جو وارسک کے اوپر پرواز کرے اسے ہم نیچے سے کنٹرول کریں گے۔'' ظفر چودھری صاحب بھنا گئے۔ کہنے لگے۔ ''کون بول رہا ہے؟'' ہم نے کہا۔ ''فلائٹ لیفٹیننٹ نقوی'' غصے سے بولے۔ ''کس سے بات کر رہے ہو؟'' ہم نے بڑے آرام سے کہا۔ ''بیس کمانڈر سرگودھا سے یہ پی ان سی کا آرڈر ہے۔'' جھنجلا کر بولے۔ ''ڈیم اٹ، صبح پہنچ جائے گا۔''

اب پشاور کی سردی اور اتنی سویرے روانگی ہم نے ڈین ہوٹل کے منیجر کو کڑا حکم دیا کہ صبح چار بجے شبنم اور روزی کو جگا کر ناشتا کرادے۔ لیلیٰ کی فکر نہیں تھی کہ وہ ہمارے ساتھ صبح تین بجے بھی چلنے کو تیار تھی۔ پورا یونٹ وقت پر وارسک پہنچ گیا۔ روزی اور شبنم کو ایک افسر کے گھر کے سامنے کھڑا کیا اور گھر والوں کو سختی سے منع کیا کہ کھڑکیوں میں سے نہ جھانکیں۔ ادھر سورج نمودار ہوتے ہی ون او فور بھی پہنچ گیا۔ وہ اوپر سے اتنی تیزی سے گزرا کہ یہ پری چہرہ لوگ اسے دیکھتے ہی

رہ گئے اور ہاتھ ہلانا بھول گئے۔ مجبوراً اس طیارے کے پائلٹ عارف اقبال سے دو چکر اور لگوانے پڑے۔

شوٹنگ ختم کر کے واپس پشاور پہنچے تو شبنم پوچھنے لگی ”آج کوئی اور کام تو نہیں؟“ ہم نے کہا۔ ”فی الحال تو نہیں۔“ کہنے لگی۔ ”تو پھر مجھے آج لنڈی کوتل میں شاپنگ کرادو۔“ اس وقت تک باڑہ کا بازار نہیں سجا تھا صرف لنڈی کوتل ہی تھا۔ وہاں سے واپسی پر اسلامیہ کالج پشاور کے سامنے لاریوں کی بڑی کڑی چیکنگ ہوتی تھی۔ ہم نے فوراً وردی پہنی اور اپنی سرکاری جیپ میں شبنم اور روبن گھوش کو لنڈی کوتل لے گئے۔ وہاں شبنم نے 28 ہزار کی شاپنگ کر ماری۔ ہم نے مذاق سے کہا کہ آج تو تم نے بہت پیسے خرچ کر ڈالے۔ کہنے لگی۔ ”کوئی بات نہیں یہ تو میں نے رات طارق عزیز سے جیتے تھے۔“ معلوم ہوا کہ ہمارا ڈین ہوٹل کے منیجر کو تڑی لگانا بے سود رہا۔ شبنم تو صبح چار بجے تک تاش کھیلتی رہی تھی۔

پشاور سے ہمارا یونٹ کراچی سے ہوتا ہوا پی آئی اے کے ذریعے ڈھاکا پہنچا۔ وہاں ہماری پریشانیوں میں اتنی کمی ہوئی کہ ہمارے ۔ے صرف مرد ہی مرد تھے۔ خواتین میں سے صرف شبنم اور روزی تھیں جن کے اپنے گھر موجود تھے۔ لیلیٰ کو کاردار کسی خاص مصلحت کی بنا پر پیچھے چھوڑ آیا اور اس کی جگہ ایک مقامی منحوس صورت میک اپ مین کی خدمات حاصل کر لیں جس کا ہمیں آج تک قلق ہے۔

طارق عزیز وغیرہ کو ہم نے ایک بڑا سا ہوٹل نما مکان لے کر ٹھہرا دیا۔ کاردار خود انٹرکان میں چلا گیا اور ہم نے آفیسر میس میں ڈیرہ جما لیا۔ ہم نے پہنچتے ہی ایک ٹیکسی کرائے پر لے لی جس کا ڈرائیور پشاور کا رہنے والا تھا۔ ان دنوں ہم پشتو میں خاصے رواں تھے۔ اس سے گاڑھی چھننے لگی اور وہ رات دن ہماری خدمت میں مصروف رہتا۔ یہ جنوری 1969ء کا ذکر ہے۔ ڈھاکا میں خاصی گڑبڑ تھی اور احتجاجی جلوس نکلتے رہتے تھے اس لیے شہر اکثر کرفیو میں ڈوبا رہتا۔ ہم نے فوراً کرفیو پاس بنوایا، اپنا بھی اور ٹیکسی کا بھی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھوا لیا کہ اس ٹیکسی میں ہمارے علاوہ چار اور مسافر بھی سفر کر سکتے ہیں۔ اس کا فائدہ ایک شام ندیم کو بھی ہوا۔ وہ ان دنوں کسی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں وہاں آیا ہوا تھا۔ ہم کرفیو کے دوران ایک شام انٹرکان پہنچے تو دیکھا کہ وہ رونی صورت بنائے لابی میں گھوم رہا ہے۔ ہمیں دیکھتے ہی منت کرنے لگا کہ مجھے کسی صورت شبنم کے گھر پہنچا دو۔ ہم اسے لے کر ایلیفنٹ روڈ پر شبنم کے گھر چھوڑ آئے۔ اگلے

سلیکون کے کرشمے

7 جولائی 1981ء کو اسٹیفن فیک نامی پائلٹ نے شمسی توانائی سے چلنے والے ہوائی جہاز کے ذریعے رودبار انگلستان عبور کیا۔ اس پرواز میں ساڑھے پانچ گھنٹے صرف ہوئے، طیارے کا نام سولر چیلنجر تھا اور وہ پلاسٹک کا بنا ہوا تھا۔ اس کی دم اور پروں پر سولہ ہزار ننھے ننھے شمسی سیل نصب تھے۔ یہ سولر سیل جسے فوٹو وولٹیک سیل بھی کہا جاتا ہے، سورج کی روشنی بلاواسطہ بجلی میں تبدیل کر دیتے ہیں، انہیں بجلی پیدا کرنے کے لیے دخانی انجن یا جنریٹر استعمال نہیں کرنا پڑتے۔ سولر سیل چارلس فرٹس نامی ایک سائنسداں نے 1889ء میں ایجاد کیے تھے، وہ چھوٹے چھوٹے سکوں کی مانند تھے۔ انہیں بہتر بنانے کی سرتوڑ کوششیں ہوتی رہیں، آخر 1954 میں امریکا کی بیل لیبارٹری کے سائنسدانوں نے ایک ایسا عنصر دریافت کر ہی لیا جو سولر سیل کو بہت زیادہ بہتر بنانے میں ممد ثابت ہو سکتا تھا۔ یہ عنصر تھا سلیکون! جو ریت جیسی معمولی شے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شمسی توانائی ایک بالکل نئی دریافت ہے لیکن ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ تاریخ پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی قدیم کا انسان بھی شمسی توانائی سے آگاہ تھا، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کی زندگی کا زیادہ تر انحصار صرف شمسی توانائی ہی پر تھا۔ تاریخ کے وہ مہذب لوگ جنہوں نے سب سے پہلے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا، یونانی تھے، انہی نے سب سے پہلے توانائی کے اس بے مثل ذریعہ کو اپنا غلام بنایا۔ وہ اپنے گھروں، محلوں اور عوامی چوراہوں کا رخ ہمیشہ جنوب کی طرف رکھتے تھے جہاں سورج کی روشن کرنیں زیادہ شدت اور خاص زاویے سے گرتیں، ان کے بعد رومی تہذیب کو عروج نصیب ہوا تو ان لوگوں نے بھی یونانیوں کی دیکھا دیکھی اپنی رہائش گاہیں اور پلازے انہی کے طریق پر ڈیزائن کیے۔ انہوں نے صاف شیشہ ایجاد کیا جو سورج کی شعاعیں گھروں کے اندر تک لے جانے میں کارآمد ثابت ہوا۔ سورج کی توانائی کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کے لیے انہوں نے جا بجا گرین ہاؤس بنائے جن میں وہ سارا سال سبزیاں اور پھل کاشت کر سکتے تھے۔

مرسلہ: نعمان صفدر، لاہور

روز معلوم ہوا کہ اس رات وہ ستر ہزار روپے ہار بیٹھا ہے۔ ظاہر ہے شبنم اور روبن گھوش سے بھلا کون جیت سکتا ہے۔

ہم نے شوٹنگ میں کام آنے والا بھاری سامان کراچی سے بذریعہ بحری جہاز چٹا گانگ بھجوا دیا تھا تاکہ وہاں سے آگے ڈھاکا پہنچ جائے۔ دو ایک روز انتظار کیا مگر سامان نہ پہنچا۔ کاردار نے ہم سے چٹاگانگ جانے کو کہا۔ مارشل لاء کا زمانہ تھا ہم نے سوچا بندرگاہ والوں پر رعب تو وردی ہی سے بیٹھے گا مگر ہماری وردی پشاور میں پڑی تھی۔ ہمارا ایک پرانا شاگرد پرویز ان دنوں ڈھاکا میں تعینات تھا۔ وہ بھی ہمارے ہی قد کاٹھ کا تھا اس کی وردی پہنی اور فوکر میں سوار ہونے پہنچ گئے۔ کافی عرصے بعد یہی پرویز لاہور بیس پر تعینات تھا۔ وہاں یوم دفاع کے موقع پر فضائی مظاہرہ ہونا تھا جس میں آرمی کا ایک مشاق طیارہ بھی حصہ لے رہا تھا۔ پرویز شوقیہ طور پر اس طیارے کے پائلٹ کے ساتھ بیٹھ گیا مگر تھوڑی ہی دیر بعد وہ طیارہ نیچی پرواز کرتا ہوا ایک ہینگر سے ٹکرا کر پورے مجمع کے سامنے پاش پاش ہو گیا۔

ڈھاکا سے چٹاگانگ جانے والے فوکر کا پائلٹ تو کوئی بنگالی تھا مگر اس میں کیپٹن راحت بھی موجود تھے جو ان دنوں پی آئی اے کے ٹیسٹ پائلٹ تھے۔ ایک زمانے میں وہ پی اے ایف میں تھے اور اکارڈین کے ساتھ بڑے خوب صورت گانے سنایا کرتے تھے۔ ان کا گایا ہوا "ابھی نہ جاؤ چھوڑ کے ابھی تو جی بھرا نہیں" آج تک یاد ہے۔ ان کو گانے کا اس قدر شوق تھا کہ جب وہ پی آئی میں چلے گئے تو خاصے سینئر ہونے کے باوجود نائٹ کوچ پر اپنی ڈیوٹی لگواتے تاکہ اطمینان سے پنڈی سے کراچی تک مائیک پر مسافروں کو گانے سناتے رہیں۔ پچھلے دنوں اخباروں میں کیپٹن ثروت کا ذکر آتا رہا ہے۔ وہی جو جنرل مشرف کو کولمبو سے کراچی لا رہا تھا یہ کیپٹن ثروت انہی کیپٹن راحت کا بیٹا ہے۔

ہم ڈھاکا سے جہاز میں سوار ہوئے تو کیپٹن راحت کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ انہوں نے فوراً ہمیں کاک پٹ میں بلا لیا اور جس پائلٹ کا انہیں ٹیسٹ لینا تھا اسے پیچھے بھیج دیا اور ہم اس کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ جہاز اوپر اٹھا اور ابھی کوئی دس منٹ بھی نہیں گزرے کہ لینڈ کرنے لگا۔ معلوم ہوا کہ ہم... کومیلا پہنچ گئے ہیں مگر لینڈ کرنے کے بعد اس علاقے کی پسماندگی دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ نہ کوئی ٹرمینل نہ کوئی بس، صرف سیڑھی لگانے والے دو آدمی تھے۔ جہاز کا عملہ اتر کر ٹارمک پر کھڑا ہو گیا۔ کومیلا اترنے والے مسافر بھی نکل کر جہاز کے قریب ٹہلنے لگے اتنے میں سائیکل رکشا آکر جہاز کی سیڑھیوں کے قریب رکنے لگے اور وہاں سے سوار ہونے والے مسافر ان میں سے نکل کر جہاز میں داخل ہونے لگے۔ ان خالی رکشاؤں میں وہاں پر اترنے والے مسافر بیٹھ کر اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس جہاز کی واحد ائر ہوسٹس بھی ٹارمک پر کھڑی تھی۔ ہمیں ٹیسٹ پائلٹ سے خوش گپیاں کرتے دیکھ کر ہمارے پاس آئی اور روتی صورت بنا کر کہنے لگی۔ "سر! پی آئی اے والوں سے کہیں کہ ہمارا بھی کچھ خیال کریں۔ مسافر بار بار گھنٹی بجا کر بلاتے ہیں اور اگر کسی کے پاس پہنچنے میں ذرا سی دیر کردوں تو ڈانٹنے لگتے ہیں۔ آپ ہی بتایئے اتنے سارے مسافر اور فلائنگ ٹائم صرف آٹھ منٹ کا۔ میں اس دوران کس کس کے پاس پہنچ سکتی ہوں۔" ویسے یہ ہم نے بھی نوٹ کیا کہ وہاں کے لوگ کچھ زیادہ ہی Deamanding ہیں۔

کومیلا سے روانہ ہوئے تو آگے نسبتاً کچھ لمبا سفر تھا۔ راحت کہنے لگے۔ "تم پہلی بار مشرقی پاکستان آئے ہو تمہیں یہ علاقہ دکھاتا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی وہ جہاز کو بہت نیچے لے گئے۔ ہم نے کہا بھائی یہاں سے تو کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ کہنے لگے اچھا تو یہ لو۔ وہ جہاز کو فوراً سات ہزار فٹ کی بلندی پر لے گئے اور اسے کبھی دائیں اور کبھی بائیں جھکانے لگے۔ نتیجہ یہ کہ پیچھے بیٹھے مسافروں کی چیخیں نکل گئیں۔ یہاں تک کہ جہاز کا اصلی کیپٹن بھاگا ہوا کاک پٹ میں آکر پوچھنے لگا۔ "سر خیریت تو ہے؟"

چٹاگانگ پہنچ کر اس ہوائی اڈے کی زبوں حالی بھی دیکھی۔ وہاں سے ہم سیدھے گودی پر پہنچے اور اپنے سامان کے بارے میں دریافت کیا۔ کہنے لگے سامان آتو گیا ہے مگر ویئر ہاؤس میں پڑا ہے۔ اس وقت دیر ہو چکی ہے صبح آکر نشاندہی کر دیجیے گا۔

اب چٹاگانگ میں کوئی میس تو تھا نہیں اس لیے ہم نے شاہ جہاں ہوٹل میں کمرے لے لیے۔

شام ڈھلے ہم شہر دیکھنے کی غرض سے نکلے۔ ڈھاکا میں تو ہر قسم کی رکشاؤں کی بھرمار ہے مگر وہاں کوئی ایک بھی نظر نہ آیا۔ صرف ٹیکسیاں تھیں۔ ہم نے ایک میں بیٹھ کر ڈرائیور سے کہا کہ شہر کا چکر لگاؤ وہ ہمیں سیدھا وہاں کے بازار حسن میں لے گیا۔ یہ بازار حسن کیا تھا بس چند جھونپڑیاں تھیں جن میں سے چپٹے ناکوں والی کوئی تین تین فٹ کی لڑکیاں نکل کر چم، ہیلو چم چیختی ہوئی ہماری ٹیکسی کے

گرد جمع ہوگئیں۔ ہم نے ٹیکسی والے کو ڈانٹا تو کہنے لگا۔ ''سر یہاں باہر کے ملکوں سے جہاز آتا ہے ان میں سے جو سیلر اترتا ہے اس کو ہم یہیں پر لے آتا ہے۔'' ہم نے کہا۔ ''کم بخت ہم سیلر نہیں ہیں۔ واپس ہوٹل لے چلو۔'' ہوٹل پہنچ کر ہم اس کی سب سے بالائی منزل پر چلے گئے۔ جہاں ایک خوب صورت بار تھا اور اس کی بڑی بڑی کھڑکیوں میں سے پورے شہر کا دلفریب منظر دکھائی دیتا تھا۔

اگلے روز اپنا سامان بھجوا کر ہم ڈھاکا واپس آگئے۔

وہاں قیام کے دوران اور بھی بہت سے لطیفے ہوئے۔ ایک روز جب کرفیو نہیں تھا اور ہماری ٹیکسی کاردار کے حوالے تھی تو ہم نے کہیں جانے کے لیے اپنے بیٹ مین سے کہا کہ رکشا لے آئے۔ وہاں پر ایسے رکشا تھے جن کے آگے سائیکل لگی تھی۔ اس کے علاوہ موٹر سائیکل رکشا بھی تھے۔ اس لیے ہم نے اپنے بنگالی بیٹ مین کو باقاعدہ ہدایت کی کہ موٹر سائیکل رکشا لائے۔ تھوڑی دیر بعد وہ نمودار ہوا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ ''شاب! بے بی آگیا۔ بالکل نیا والا۔'' ہم تو سیخ پا ہوگئے۔ ''ارے گدھے۔'' ہم چلائے۔ ''ہم نے رکشا لانے کو کہا تھا اور تم بے بی لے آئے ہو۔'' ساتھ والے کمرے میں ہمارا ایک بنگالی شاگرد تھا۔ ہماری آواز سن کر وہ دوڑتا ہوا ہمارے کمرے میں داخل ہوا۔ پوچھنے لگا کیا ہوا سر۔ ہم نے بتایا کہ اس کمبخت سے رکشا لانے کو کہا تھا اور یہ کوئی لونڈیا پکڑ لایا ہے۔ ہمارے شاگرد نے بیٹ مین سے بنگلہ میں بات کی اور ہنسنے لگا۔ کہنے لگا۔ ''سر یہاں رکشا تو اس کو کہتے ہیں جو آدمی کھینچتا ہے موٹر سائیکل رکشا کو بے بی ہی کہتے ہیں۔''

ڈھاکا میں ایک مقامی ایم پی اے تھے جو وہاں کے پوش علاقے دھان منڈی میں رہتے تھے۔ ان کی بیگم شوقیہ طور پر فلموں میں بھی کام کرتی تھیں۔ نام تو ان کا نہ جانے کیا تھا مگر انہیں شانی کہتے تھے۔ ایک شام ہم ان کے گھر گئے باتوں باتوں میں خاصی دیر ہوگئی۔ جب ہم اٹھنے لگے تو وہ کہنے لگیں۔ ''تُو کی شاپ آپ اتنا دیر سے کدھر جائے گا۔ آج رات آپ ہمارا ساتھ سو جاؤ۔'' ہم تھوڑے سے چکرائے مگر پھر خیال آیا کہ وہ صرف یہ کہہ رہی ہیں کہ آج رات آپ ہمارے ہی یہاں سو جائیں۔

ایک روز ہم بازار سے گزر رہے تھے کہ دیکھا کہ نوجوان لڑکوں کا بڑا منظم جلوس جارہا ہے۔ وہ چار چار کی ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے تاکہ دفعہ 144 کی خلاف ورزی نہ ہو۔ ساتھ ہی وہ نعرہ لگا رہے تھے۔ ''چو لبے نیں، چو لبے نیں (یعنی نہیں چلے گا نہیں چلے گا) ہم گاڑی روک کر ان کے قریب گئے اور ایک لڑکے سے پوچھا۔ ''کی چالبے نیں'' بڑے معصومانہ انداز سے کہنے لگا۔ ''امی جانی ناں'' یعنی میں نہیں جانتا۔ گویا وہ تو نعرہ اس لیے لگا رہا تھا کیوں کہ اسے وہ نعرہ لگانے کو کہا گیا تھا باقی رہا اس نعرے کا مطلب تو وہ نعرہ لگوانے والا ہی جانے۔

ایک روز کرفیو کے دوران ہم روزی کے گھر اس کی خیریت پوچھنے پہنچ گئے۔ ہم نے کہا کسی چیز کی ضرورت تو نہیں، کرفیو کی وجہ سے تم بازار نہیں جاسکتیں۔ کہنے لگی۔ ''نو کی شاپ کچھ نہیں چاہیے۔ گھر میں تالاب ہے، موسلی پکڑتا اور کھاتا ہے۔''

کاردار کو صبح سویرے سین فلمانے کا بڑا شوق تھا۔ ڈھاکا میں بھی اس نے ایک ایسا ہی پروگرام بنایا کہ شبنم اور طارق عزیز کو ایک ڈولتی ہوئی ناؤ میں بٹھا کر صبح سویرے شاٹ لیا جائے۔ اب وہ سین دریا کے کس حصے میں فلمایا جائے اس مقام کا تعین ضروری تھا۔ لہٰذا ہم نے ڈھاکا کے بیس کمانڈر ذوالفقار علی خان جو بعد میں فضائیہ کے سربراہ بھی بنے ان سے ہیلی کاپٹر دینے کی استدعا کی۔ وہ پہلے تو برہم ہوئے مگر بعد میں ائر ہیڈ کوارٹر پشاور سے بات کرنے کے بعد تیار ہوگئے۔ اس ہیلی کاپٹر میں ہم نے بوڑھی گنگا پر کئی چکر لگائے۔ ایک گوشہ کاردار کو پسند آگیا۔ اب چونکہ اس مقام تک پہنچنا صبح سویرے تو ناممکن تھا اس لیے مشرقی پاکستان حکومت کا ایک اسٹیمر حاصل کیا تاکہ اس میں پورا فلم یونٹ رات گزارے اور تڑکے اپنا کام شروع کردے۔

صدر گھاٹ سے اسٹیمر میں سوار ہوکر چلنے سے پہلے ہم نے ملازم کو ایک روپیا دیا تاکہ ہمارے لیے پان لے آئے۔ ہم نے سوچا ایک روپے کے دو تین پان تو آہی جائیں گے مگر اس نے واپس آکر ہمارے سامنے پورے چالیس پان رکھ دیے اور ساتھ ہی ایک پتے میں لپٹا ہوا کوئی پاؤ بھر چونا۔

اس اسٹیمر میں دو کیبن تھے۔ ایک شبنم اور روبن گھوش کو دے دیا اور دوسرا کاردار اور ہم نے سنبھال لیا۔ باقی تمام لوگوں کو نیچے ہولڈ میں بھیج دیا۔ مشرقی پاکستان کی آدھی آبادی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں رہتی ہے جن کے درمیان میں ایک نیم گولائی کی چھت ہوتی ہے۔ یہ کشتیاں وہاں کے عظیم اور کشادہ دریا یا بوڑھی گنگا کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ چلتی یا کھڑی رہتی ہیں۔ صرف اسٹیمر دریا کے بیچوں بیچ چلتے ہیں اور ان کی اٹھائی ہوئی لہروں سے یہ کشتیاں ڈولتی

رہتی ہیں۔ شام کو کاردار اور ہم اوپر عرشے پر جا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں مغرب کا وقت ہو گیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہر ڈولتی ہوئی کشتی کی ننھی سی چھت پر گھرانے کا سربراہ کھڑا نماز ادا کر رہا ہے۔ عجب رونگٹے کھڑے کرنے والا منظر تھا۔

کچھ دیر بعد چاند ابھر آیا۔ کاردار نے ہم سے کہا کہ نیچے جا کر شبنم اور روبن گھوش کو بلا لاؤ۔ ہم نے جا کر ان کے کیبن میں جھانکا تو دیکھا کہ شبنم تو سو رہی ہے اور رابن سوٹ پہن کر کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہے۔ اسے اوپر آنے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ ہم واپس اوپر پہنچے تو ہمیں تنہا دیکھ کر کاردار پوچھنے لگا کہ کیا ہوا۔ ہم نے کہا ہونا کیا ہے شبنم سو رہی ہے اور روبن بیٹھا پہرہ دے رہا ہے۔

جب وہ مقام آیا جہاں شوٹنگ کرنا تھی تو ہم نے جہاز رکوا دیا۔ قریب ہی کنارے پر ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ رکا ہوا جہاز دیکھ کر وہاں کے لوگوں کو تجسس ہوا اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیاں لے کر جہاز کے قریب آ گئے۔ نئی نئی صورتوں پر نظر پڑتے ہی انہوں نے گانا بھی شروع کر دیا۔ ایک بنگالی ملازم کی مدد سے انہیں سمجھایا کہ ان کی کشتیاں ہمیں صبح سویرے درکار ہوں گی۔ ہم نے بھی اپنی بنگلہ دانی پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ٹا کا دیبن'' یعنی پیسے بھی دیں گے۔ وہ بڑی خوشی سے مان گئے اور اگلی صبح ہمارے بیدار ہونے سے پہلے ہی پہنچ گئے۔

پو پھٹتے ہی ہم نے شبنم اور طارق عزیز کو ایک ناؤ میں سوار کرایا۔ دوسری میں کیمرا مین بیٹھ گیا اور تیسری میں کاردار اور ہم۔ اس تمام تردد کا نتیجہ ایک چھوٹا سا سین تھا جس میں کاردار کی ہٹ دھرمی کے باعث کوئی ڈائیلاگ نہیں تھا۔ بس شبنم اور طارق کو آمنے سامنے بیٹھا دکھایا۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہیں، طارق ناؤ کے کنارے پر اپنی ہتھیلی کھول کر رکھ دیتا ہے اور شبنم اس پر آہستہ سے اپنا ہاتھ جما دیتی ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا، شاٹ ختم اور ہم بدھوؤں کی طرح لوٹ کر اپنے گھر یعنی ڈھاکا واپس آ گئے۔

اللہ اللہ کر کے فلم کی شوٹنگ ختم ہوئی۔ اس کے بعد ہم نے اسے ایڈٹ کرایا اور پھر بڑے فخریہ انداز میں اسے فلم سنسر بورڈ کے سامنے پیش کرنے لاہور پہنچ گئے مگر ہائے رے قسمت۔ انہوں نے فلم دیکھ کر اسے پاس کرنے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ کہ ایک سین جس میں شہزادی تاج کا ڈانس دکھایا گیا تھا اس میں اس کا زیریں لباس گھٹنوں سے ذرا اوپر تھا۔ ان کے اعتراض کی معقول وجہ تو یہ ہو سکتی تھی مگر سنسر والوں کی نظریں اوپر کی بجائے ہمیشہ نیچے کی طرف ہی رہتی ہیں۔ اس وقت تک ائر مارشل نور خان مغربی پاکستان کے گورنر بن چکے تھے اس لیے ہم سیدھے گورنر ہاؤس پہنچے۔ وہاں سامنے ہی ان کی بیگم کھڑی تھیں۔ وہ غصیلی مشہور تھیں مگر اس روز بڑی شفقت سے پیش آئیں۔ پوچھنے لگیں۔ ''نقوی صاحب پان کھائیے گا؟'' ہم نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ''پہلے گورنر صاحب سے ملاقات کرا دیجیے ضروری کام ہے۔'' وہ اندر سے نمودار ہوئے تو ہم نے اپنی بپتا بیان کی اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ایک پنجابی فلم جو پاس ہو چکی ہے اس میں لاچے میں ملبوس ہیروئن کو زمین پر لیٹے ہوئے ہیرو کے سر پر ناچتے دکھایا گیا ہے اور وہ نیچے سے معنی خیز نظریں بنا کر اوپر کو دیکھتا ہے اگر وہ فلم پاس ہو سکتی ہے تو پھر ہم نے کون سا گناہ کیا ہے؟ انہوں نے فوراً ایک نیا سنسر بورڈ تشکیل دینے کا حکم صادر فرمایا جس نے ہماری فلم ڈھائی منٹ میں پاس کر دی۔

اب آیا فلم کی رونمائی کا مسئلہ۔ اس وقت ائر مارشل رحیم خان فضائیہ کے سربراہ تھے۔ انہوں نے صدر جنرل یحییٰ خان کو مدعو کیا اور ساتھ ہی تمام سفیروں اور بڑے بڑے افسروں کو۔ ہم نے فلم دکھانے کا پنڈی کے ایک بڑے سینما گھر میں انتظام کیا۔ فلم ختم ہونے کے بعد جس دروازے سے صدر صاحب کو نکلنا تھا اس کے سامنے ہم نے تمام ایکٹروں اور ایکٹریس کو لائن حاضر کر رکھا تھا۔ صدر صاحب نکلے اور ایکٹرسوں سے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا مگر جاتے جاتے ہم نے انہیں یہ کہتے بھی سنا کہ You have ruined my evening. تم نے میری شام برباد کر دی۔

ہم نے وہ فلم ایک ڈسٹری بیوٹر کے حوالے کی اور اطمینان کا سانس لیا۔ کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ وہ فلم پشاور کے ایک سینما میں لگی ہے۔ ہم نے کہا دیکھیں تو سہی کہ پردہ اسکرین پر ہماری کارکردگی کیسی معلوم ہوتی ہے اور لوگ ہماری انتھک محنت کا کس گرم جوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہم نے پہلا ہفتہ گزرنے دیا۔ سوچا کہ رش کم ہو جائے تو پھر جا کر اطمینان سے دیکھیں گے مگر وائے قسمت اگلے ہفتے اپنی بنائی ہوئی فلم دیکھنے پہنچے تو معلوم ہوا کہ اتر چکی ہے۔

اس معرکۃ الآرا فلم کا نام بتانا تو ہم بھول ہی گئے اس کا نام تھا ''قسم اس وقت کی'' اسی لیے ہم نے قسم کھا رکھی ہے کہ آئندہ کبھی فلم بنانے کے جھنجھٹ میں نہیں پڑیں گے۔

جاری ہے

الوداع

اپنی قومی ایئرلائن کا اپنا مزاج ہے۔ اس ایئرلائن میں برسوں خدمت انجام دینے والے ایک افسر کے شب وروز کی لفظی تصویر کہ وہ کس طرح اور کن کن مراحل سے گزرا۔ کہنے کو یہ زندگی نامہ کی جھلک ہے مگر اپنے اندر بہت کچھ مخفی رکھتا ہے۔

حسن رزاقی

باذوق قارئین کے لیے توشۂ خاص

ہوٹل کا انتخاب رنجیت نے خود کیا تھا۔ ہم وہاں پہنچ گئے۔ مجھے اعتراف ہے کہ فرانس کا کھانا بے انتہا لذیذ ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے کھانوں میں اس کا ثانی مشکل سے ملے گا مگر میرے لیے فرنچ کھانا آرڈر کرنے میں تین مشکلات پیش آتی ہیں۔ پہلی مشکل ہے زبان۔ ظاہر ہے کہ ہر کھانے کا نام فرنچ میں ہوتا ہے پھر یہ کہ کھانے میں خنزیر کا کوئی جزنہ ہو اور سب سے آخر میں یہ کہ اس کے پکانے میں کسی قسم کی شراب استعمال نہ کی گئی ہو۔ یہ سب سے مشکل مرحلہ ہے اس لیے کہ فرنچ کھانوں کے پکانے میں زیادہ تر کسی نہ کسی طرح کی شراب استعمال ہوتی ہے ان تمام کا مشکل کشا رنجیت کی شکل میں موجود تھا۔ کھانا کھا کر ہم دو گھنٹے بعد واپس کانفرنس روم میں پہنچے۔ تین بجنے والے تھے۔ آدھے گھنٹے کام کرنے کے بعد سب لوگ تھک چکے تھے۔ چائے کا دور چلنا لازمی تھا۔ چائے کے بعد آدھے گھنٹے پھر کام ہوا اور اس کے بعد وہی اہم مسئلہ کہ رات کا کھانا کہاں کھایا جائے۔

آج ہم نے جن جن ٹیکنیکل معاملات پر بحث کی تھی اس میں سب کے تشفی بخش جوابات مل چکے تھے سوائے ایک کے۔ جہاز میں ایک انسٹرومنٹ ہوتا ہے جو ADI کہلاتا ہے اس میں دو ڈنڈیاں سی ہوتی ہیں۔ ایک جہاز کا رخ بتاتی ہے۔ دوسری یہ بتاتی ہے کہ جہاز مقررہ بلندی سے اوپر یا نیچے تو نہیں جا رہا ہے۔ بعض ائرلائنز ان دونوں ڈنڈیوں کی معلومات کو ایک ساتھ ملا کر دو ڈنڈیوں کی بجائے ایک ڈنڈی میں تبدیل کروا لیتی ہیں جو V بار کہلاتی ہے اس کی شکل الٹے (۸) سے ملتی ہے۔ سعودیہ کے تمام جہازوں کے ADI V بار کے تحت کام کرتے تھے۔ A-300 میں بھی سعودیہ یہی چاہتی تھی مگر ائر بس اس کے خلاف تھی۔ اس پر گرما گرم بحث ہو رہی تھی کہ اسی دوران میں زیادہ اہم مسئلہ نکل آیا۔ رات کے کھانے کا۔ جب ہوٹل کا مقام طے ہو گیا تو ہوٹل جانے کا وقت ہو چکا تھا۔ صدر دروازے پر ڈرائیور میرا منتظر تھا۔ ''پنا گیٹر کے بچے'' کے لیے پھر عزت افزائی کا موقع تھا۔ ڈرائیور نے اپنے معزز مہمان کو ہوٹل چھوڑا اور اطلاع دی کہ معزز مہمان کو رات کے کھانے کے لیے بھی ڈرائیور آٹھ بجے آ کر لے جائے گا۔ معزز مہمان رات آٹھ بجے ہوٹل کی لابی میں ڈرائیور کا منتظر تھا۔ رات کا کھانا انہی مراحل سے گزرا جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ رات ایک بجے معزز مہمان کو ہوٹل واپس پہنچا دیا گیا۔ رات سونے سے پہلے میں نے وقت کے سود و زیاں کا حساب لگایا جو کچھ اس طرح تھا۔

چائے۔ ڈیڑھ گھنٹا
کھانا دوپہر۔ دو گھنٹے
کھانا رات۔ پانچ گھنٹے
کام۔ ڈھائی گھنٹے

دیکھو یہ میرے خواب تھے دیکھو یہ میرے زخم ہیں
میں نے تو سب حساب جاں برسرِ عام رکھ دیا

میرا پروگرام تولوس میں صرف ایک دن گزارنے کا تھا۔ اب مجھے ایک دن اور بڑھانا پڑے گا۔ اگلے روز بھی وقت کی تقسیم کچھ اسی طرح رہی سارے معاملات حل ہوگئے سوائے V بار کے۔ رات کھانا کھا کر ہوٹل پہنچا تو وہی ایک بجے کا وقت تھا۔ کل صبح مجھے پیرس اور پھر رات میں پیرس سے جدہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔

جدہ پرواز کے دوران میں، میں سوچتا رہا کہ میں کرٹ کو ایک فالتو دن کا کیا حساب دوں گا۔ جرمن ذہن صرف کام کی سوچتا ہے۔ کھانے کے لیے اس کے پاس اتنا فالتو وقت کہاں۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔ اس وقت نیند زیادہ پرکشش ہے۔

تین ہفتے بعد میں دوبارہ تولوس میں کرٹ اور دوسرے لوگوں کے ہمراہ موجود تھا۔ A-300 کی V بار کا مسئلہ حل کرنے ہم لوگوں کو ائربس کے کسٹمر انجینئر کے ہمراہ تھامسن CSF کی تنصیبات پر جانا تھا۔ تھامسن کا دفتر بوندو شہر میں تھا جو تولوس کے شمال مغرب میں ڈھائی سو کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ سفر ائربس کے دو سیٹر جہازوں میں طے کیا گیا۔ تولوس سے بوندو چند منٹ کا سفر تھا۔

تھامسن کی تنصیبات پر پہنچے تو لگتا تھا کہ جیسے کسی کارخانہ یا کاروباری مرکز میں نہیں بلکہ کسی پکنک اسپاٹ پر اترے ہیں۔ ہر طرف ہریالی پیڑ، پودے اور پھول۔ مجھے یہ جگہ دیکھ کر ایک اور کارخانہ یاد آگیا۔ جہاں میرا چند ماہ پیشتر ہی جانا ہوا تھا۔ یہ کارخانہ اسمتھس انڈسٹریز کا تھا۔ یہ کارخانہ اونچی نیچی پہاڑیوں کے درمیان انگلستان کے شہر چلٹنہیم میں واقعہ ہے۔ A-300 کے لیے سعودیہ نے اسمتھس کا فلائٹ مینجمنٹ سسٹم (FMS) منتخب کیا تھا۔ میں اسی کے سلسلے میں چلٹنہیم گیا تھا۔ اسمتھس کا یہ کارخانہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں بنایا گیا تھا۔ یہاں لڑائی میں استعمال کیا جانے والا سامان بنایا جاتا تھا۔ کارخانے کے لیے یہ جگہ دانستہ چنی گئی تھی تاکہ ہٹلر کی فوجوں کے حملے سے بچا جاسکے۔ جرمن فوجوں کو یہ گمان کرنا مشکل تھا کہ جنگی استعمال کے سامان بنانے کا یہ کارخانہ کسی صنعتی علاقے کی بجائے ایسے پر فضا مقام پر بنایا جائے گا اور اونچی نیچی پہاڑیوں کے درمیان چھپا ہوا ہوگا۔

کاروباری گفتگو کے بعد حسبِ دستور تھامسن والے ہم لوگوں کو اپنے ڈائننگ روم میں لے گئے۔ فرنچ کھانا ہمیشہ کی طرح لذیذ تھا۔ میں نے پہلی دفعہ انچودی مچھلی کو تیل میں اچار کی طرح بنا ہوا کھایا۔ پہلی دفعہ والا کھاتہ پھر کھل چکا تھا۔ ایک کا اضافہ کردیا۔

بوندو سے تولوس۔ تولوس میں ائربس کے ہینگر سے ہوٹل۔ آج کا کام ختم۔ لیکن انچودی کا مزہ ہنوز باقی تھا۔

چند دن بعد ایک دفعہ پھر سے تولوس کے سفر کا مرحلہ درپیش تھا۔ اس دفعہ فلائٹ آپریشنز کے کچھ معاملات نمٹانے تھے۔ سعودیہ کے کیپٹن عبدالرؤف میرے ساتھ تھے۔ کیپٹن عبدالرؤف کا خاندان ہندوستان سے تعلق رکھتا تھا۔ تقسیم کے بعد یہ لوگ پاکستان آئے مگر چند سال بعد سعودی عرب جاکر وہاں بس گئے۔ کیپٹن عبدالرؤف اب سعودی شہری تھے۔ ہندوستان پاکستان کے ناطے ان سے میری اچھی دوستی ہوچکی تھی۔

پہلے ہم کو سعودیہ کی پرواز سے جدہ سے پیرس جانا تھا۔ ہم دونوں فرسٹ کلاس میں سفر کررہے تھے۔ کھانے کا دور ختم ہوچکا تھا اب اسکرین پر فلم دکھائی جانے والی تھی۔ ہوسٹس اس کی تیاری میں مصروف تھی۔ ہیڈ سیٹ تقسیم کررہی تھی۔ ہمارے پاس آئی تو کیپٹن عبدالرؤف نے دو تکیوں کی فرمائش کی۔ تکیے آگئے تو ان کو اپنی سیٹ پر جما کر ان پر براجمان ہوگئے۔ جب آرام سے بیٹھ گئے تو مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ’’سامنے والی سیٹ کی پشت میری آنکھوں کے آگے آتی ہے۔ میں ٹھیک سے اسکرین کو نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے تکیے استعمال کرتا ہوں۔‘‘ کیپٹن عبدالرؤف کا قد بہت چھوٹا تھا اگر ایک آدھ انچ اور پستہ قد ہوتے تو پائلٹ نہ بن سکتے تھے۔ اپنے قد سے متعلق کیپٹن نے ایک واقعہ سنایا۔

’’میں ایک فلائٹ کی تیاری کررہا تھا۔ جہاز میں اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا۔‘‘ پائلٹ کاک پٹ کی الٹے ہاتھ والی سیٹ پر بیٹھتا ہے۔ کو پائلٹ دائیں ہاتھ والی سیٹ پر۔ جٹ وے سے داخل ہونے والے مسافر کپتان کو دیکھ سکتے ہیں۔ کیپٹن عبدالرؤف نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

’’ایک معمر خاتون جب جہاز میں داخل ہوئیں تو انہوں نے مجھے کپتان کی سیٹ پر بیٹھے دیکھ لیا۔ ہوسٹس سے پوچھا۔ ’’کیا یہ لڑکا جہاز اڑائے گا۔‘‘

قد کے ساتھ ساتھ کیپٹن عبدالرؤف عمر چور بھی تھے اپنی عمر سے دس سال کم دکھائی دیتے تھے۔

جب ہوسٹس نے اثبات میں جواب دیا تو وہ خاتون

واپس لاؤنج میں چلی گئیں۔ فلائٹ پر باوجود تمام یقین دہانیوں کے جانے سے انکار کردیا۔ فلم ختم ہو چکی تھی۔ جہاز پیرس ائرپورٹ پر لینڈنگ کے لیے اتر رہا تھا۔ ہم نے سیٹ بیلٹ باندھ لیے۔

پیرس ہمارا مستقر نہیں تھا۔ دو گھنٹے بعد ہم لوگوں کو دوسری پرواز سے تولوس جانا تھا۔ کیپٹن عبدالرؤف پہلی دفعہ تولوس آئے تھے۔ میں اب تولوس کا مستقل زائر بن چکا تھا۔ ان کو تولوس گھمانا پھرانا میرا کام تھا مگر اس وقت شام ہو چلی تھی۔ کہیں جانے کا وقت نہیں تھا۔ ہم لوگوں نے نہر کے کنارے ٹہلنے پر اکتفا کیا۔ رات کھانے کے لیے ہم اسٹیک کے ریسٹورنٹ چلے گئے۔ اس جگہ صرف اسٹیک ملتے ہیں، اس اسٹیک ہاؤس کی خاص بات اس کا بنایا ہوا ساس ہے جو ان کی اپنی ترکیب سے بنایا جاتا ہے اور اسٹیک کے ذائقے کو دوبالا کردیتا ہے۔ اتنا لذیذ اسٹیک۔ ساس میں نے اور کہیں نہیں کھایا۔

اگلے روز ناشتا ختم کرنے کے بعد ہم لوگ لابی میں ائربس کی بھیجی ہوئی سواری کا انتظار کررہے تھے کہ اچانک آواز آئی۔ بون ژور موسیو رضا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ تو موسیو ایٹلاں کا مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ موسیو ایٹلاں کو سراغ رساں ہونا چاہیے تھا مگر شومیٔ قسمت سے وہ سیلز مین بن گئے تھے۔ ان کی کمپنی A-300 اور A-310 کے لیے کاک پٹ انسٹرومنٹ بناتی تھی جو وہ سعودیہ کو بیچنا چاہتے تھے۔ شاید انہوں نے ائربس کسٹمر سپورٹ میں جان پہچان بنا لی تھی اس لیے کہ جب بھی میرا تولوس جانا ہوتا تو وہ ائرپورٹ پر موجود ہوتے حالانکہ ان کا دفتر پیرس میں تھا۔ میں نے ان سے ہاتھ ملایا۔ انہوں نے دعوت دے دی۔ ’’آج رات کا کھانا آپ اور کیپٹن رؤف میرے ساتھ کھائیں۔‘‘

’’ہم معذرت چاہتے ہیں اس لیے کہ ہم لوگ آج شام ہی پیرس چلے جائیں گے۔‘‘ موسیو ایٹلاں کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ’’کوئی بات نہیں ہم رات کا کھانا ایک ساتھ پیرس میں کھا سکتے ہیں۔ آپ کس فلائٹ سے واپس جارہے ہیں۔ میں بھی اپنی پیرس کی بکنگ کروالوں۔‘‘ میں نے ان کو فلائٹ کی تفصیل بتادی۔

’’ارے یہ کیسا اتفاق ہے۔‘‘ موسیو ایٹلاں نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

’’میری سیٹ، تو پہلے سے ہی اسی فلائٹ پر بک ہے۔‘‘

یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا۔ یہ حرکت موسیو ایٹلاں پہلے بھی کرچکے تھے۔ وہ ائربس کے دفتر سے ہمارا پروگرام معلوم کرکے اسی فلائٹ میں پہلے بھی اپنی سیٹ بک کروا چکے تھے۔ جس فلائٹ سے ہم لوگ سفر کررہے تھے۔ CIA کو ان کی خدمات حاصل کرلینی چاہیے تھیں۔

پیرس ائرپورٹ پر موسیو ایٹلاں نے کہا۔ ’’اتفاق سے میں نے ’’لے کانگریس‘‘ میں پہلے ہی سے ایک میز بک کروا رکھی ہے آپ دونوں نو بجے تک وہاں پہنچ جائیں۔‘‘ یہ دوسرا اتفاق تھا۔

لیکن پیرس پہنچ کر اس دوسرے اتفاق کا فائدہ اٹھانے سے پہلے ہم لوگوں کو بلاناک میں ائربس کے دفاتر پہنچ کر وہ کام مکمل کرنے تھے جن کے لیے ہم تولوس آئے تھے۔ ائربس کا ڈرائیو گاڑی لے کر آچکا تھا ہم لوگ گاڑی میں بیٹھ کر بلاناک کے لیے روانہ ہوگئے۔

ائربس کے کانفرنس روم میں چائے کافی کا حسب معمول زبردست اہتمام تھا۔ ائربس کے کسٹمر مینیجر فلی پروسٹ نے پوچھا۔ ’’موسیو رضا کی چائے یا کافی؟‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’نہ چائے نہ کافی۔ آج صرف کام۔‘‘

فلی کے نزدیک بڑی بے عزتی کی بات تھی کہ میں نے چائے کی پیالی ٹھکرادی تھی۔ میں نے وضاحت کی۔ فلی میں چائے ضرور پیوں گا۔ میں تمہارے ساتھ صرف کھلواڑ کررہا تھا۔ دراصل کیپٹن رؤف کو پرسوں فلائٹ پر جانا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم فلائٹ آپریشن سے متعلق تمام کام آج نمٹا کر کل واپس جدہ روانہ ہوجائیں۔ ورنہ کیپٹن رؤف اپنی فلائٹ نہیں لے جاسکیں گے۔

’’اوہ یہ بات ہے۔‘‘ فلی کی مسکراہٹ دوبارہ واپس آگئی مگر زیادہ دیر کے لیے نہیں۔ میں نے اپنی بات مکمل کی۔ ’’میرے خیال سے آج ہم لنچ کے دوران میں بھی کام کریں گے کیا یہ ممکن ہے کہ ریسٹورنٹ جانے کی بجائے یہیں لنچ کرلیں۔‘‘

میں نے ائربس کی ٹیم کے دو گھنٹے کے لنچ کے پروگرام پر پانی پھیر دیا تھا۔ بے دلی سے جواب ملا۔ ’’ٹھیک ہے ہم لنچ باکس کا آرڈر دے دیں گے۔‘‘

چار بجے کے لگ بھگ ہماری میٹنگ ختم ہوئی تو فلی نے کہا۔ ’’موسیو رضا کی اب ہم مینٹیننس ٹریننگ سمیولیٹر دیکھنے چلتے ہیں۔‘‘ میں نے اثبات میں سر ہلایا مگر کیپٹن

رؤف، کچھ اور ہی پروگرام بنائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے اردو میں مخاطب کیا۔ ''آپ سیمولیٹر بعد میں دیکھ لیجیے گا۔ مجھے دوبارہ تولوس آنے کا موقع ملے یا نہ ملے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہینگر میں جو جہاز بن رہا ہے اس کا کاک پٹ دیکھوں۔'' جہاز کے کپتان شاید خواب میں بھی صرف کاک پٹ ہی دیکھتے ہوں گے۔ کیا یہ ممکن ہے؟ میں نے فلی سے پوچھا۔ فلی نے جواب دیا۔ ''اگر کپتان کی یہی خواہش ہے تو ضرور پوری ہوگی۔ ہم دونوں فلی کے ساتھ اسمبلی ہینگر روانہ ہوگئے۔ جہاں ائرفرانس کے لیے جہاز تکمیل کے آخری مراحل میں تھا۔

کاک پٹ میں داخل ہوئے تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اسٹار بورڈ یعنی جہاز کی دائیں سائیڈ پر فلائٹ انجینئر کی پینل بنی ہوئی تھی۔

جہاز کا سامنے کا رخ فارورڈ کہلاتا ہے۔ پچھلا رخ آفٹ دایاں رخ اسٹار بورڈ اور بایاں رخ پورٹ کہلاتا ہے۔ فلائٹ انجینئر کی پینل اسٹار بورڈ رخ پر ہوتی ہے لیکن نئے A-300/A-310 میں فلائٹ انجینئر پینل کا کیا کام؟ اس میں تو فلائٹ انجینئر کا وجود ہی نہیں ہے۔ یہ تو FFCC ہے فارورڈ فیسنگ کرو کاک پٹ یعنی اس کا کاک پٹ کا عملہ صرف پائلٹ اور کو پائلٹ پر مشتمل ہے جن کا رخ سامنے کی طرف ہوتا ہے۔ فلائٹ انجینئر، جس کا رخ دائیں جانب ہوا کرتا تھا نئے A-300 میں اس کی ضرورت کو ختم کر دیا گیا تھا۔ پھر اس جہاز میں فلائٹ انجینئر پینل چہ معنی؟ فلی نے اس کی وضاحت کی۔

دراصل یہ جہاز ائرفرانس کے لیے بنایا جارہا ہے۔ ان کی یونین بہت طاقت ور ہے۔ اس لیے ہم کو خاص طور سے ان کے جہازوں میں فلائٹ انجینئر کی پینل بنانا پڑا۔ اس سے ہمارے جہاز کے ڈیزائن پر بھی بہت اثر پڑا اس لیے کہ ہم کو پائلٹ کی پینل سے چند چیزیں نکال کر یہ نئی پینل بنانا پڑا۔ ائرفرانس نے اس تبدیلی کی بھاری قیمت ادا کی ہے۔ وہ اپنی یونین کے آگے بے بس ہیں۔

جہاز میں صرف اس کے رخوں..... فارورڈ آفٹ وغیرہ کا ہی نہیں بلکہ اس کی باہر لگی ہوئی لائٹوں کا بھی اپنا ایک مقررہ ضابطہ ہے۔ جس سے انحراف نہیں کیا جاسکتا۔ جہاز کے پروں کے سروں ونگ ٹپ پر نیویگیشن لائٹیں لگی ہوتی ہیں۔ پورٹ طرف والی لائٹ سرخ رنگ کی ہوتی ہے جب کہ اسٹار بورڈ رخ والی لائٹ ہرے رنگ کی ہوتی ہے اگر زمین پر رات کے وقت ایک سے زیادہ جہاز ہوں تو پائلٹ اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ اس کی سمت آرہے ہیں یا دوسری سمت جارہے ہیں۔ یہ لائٹیں حق راہ داری (Right of way) کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ جہاز کی دم کے بالکل آخری سرے پر سفید لائٹ لگی ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ جہاز میں بیکن یا اسٹروب لائٹ۔ ٹیکسی لائٹ اور لینڈنگ لائٹیں بھی لگی ہوتی ہیں جو جہاز کے اترنے اور رن وے پر ٹیکسی کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ جس وقت جہاز کے انجن اسٹارٹ کرنے ہوتے ہیں۔ اس وقت بیکن لائٹ جلا دی جاتی ہے تاکہ زمینی عملہ کو معلوم ہو جائے کہ اب انجن اسٹارٹ ہوں گے اور جہاز حرکت میں آئے گا۔ بیکن لائٹ پرواز کے پورے دورانیہ میں جلتی رہتی ہیں۔ یہ وہ لائٹیں ہیں جو جہاز کی چھت پر اور فیوز لاج کے نچلے حصے میں لگی ہوتی ہیں۔

کیپٹن عبدالرؤف کی کاک پٹ دیکھنے کی لگن بے جا نہیں تھی۔ یہ روایتی کاک پٹ نہیں تھا۔ ڈیجیٹل ایویانکس کے استعمال کی وجہ سے کاک پٹ میں لگے ہوئے اہم انسٹرومنٹ اب میکینکل نہیں رہے تھے ان کی جگہ CRT کیتھوڈ رے ٹیوب استعمال کیے جارہے تھے۔ CRT کی سب سے عام مثال TV سیٹ کی اسکرین ہے۔ جہاز کے ان انسٹرومنٹ کو چھوٹی سی TV اسکرین کی طرح تصور کریں کہ جن پر انسٹرومنٹ کا عکس تصویری صورت میں ظاہر ہوتا۔ کل ملا کر ایسی چھ اسکرین استعمال کی گئی تھیں چونکہ یہ تمام اسکرین شیشے کی تھی ان میں کوئی میکینکل پرزہ شامل نہیں تھا یہ کاک پٹ گلاس کاک پٹ کہلائی۔

ائربس نے ایک اور جدت پیدا کی تھی جہاز کے فلائٹ کنٹرول کے سگنل بجلی کے تاروں کے ذریعے بھیجنا۔ فلائٹ کنٹرول جہاز کے وہ پارٹ ہیں جو جہاز کو اوپر اٹھانے نیچے لانے اور دائیں بائیں موڑنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اب تک یہ کام کنٹرول اسٹک کے ذریعے لیا جاتا تھا۔ کنٹرول اسٹک ایک ادھ کٹے گاڑی کے اسٹیئرنگ وہیل کی طرح ہوتی ہے جو پائلٹ اور کو پائلٹ کی سیٹوں کے آگے لگی ہوتی ہیں۔ بجلی کے استعمال کے باعث اب کنٹرول اسٹک کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ یہ کام اب ایک جوائے اسٹک سے لیا جاتا تھا ویسی ہی جوائے اسٹک جو کمپیوٹر گیم کھیلنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

کیپٹن رؤف آپ کو مزید ٹیکنیکل تفصیلات سے نہیں

دکھلائیں گے۔ ان کا کاک پٹ کا معائنہ ختم ہو چکا ہے۔ ہم لوگ جہاز سے باہر آچکے ہیں۔ ہمارا رخ ائرپورٹ کی طرف ہے جہاں سے ہم کو پیرس کے لیے روانہ ہونا ہے۔ میرے خیال میں آپ جان گئے ہوں گے یا ہوں گی کہ تولوس ائرپورٹ پر کون ہمارا منتظر تھا۔ جی ہاں آپ ٹھیک سمجھے/ سمجھیں۔ موسیو ایطلاں۔ انہوں نے مسکرا کر ہمارا استقبال کیا۔ فلائٹ کی اڑان کا اعلان ہو چکا تھا۔ ہم لوگوں نے جلدی جلدی اپنے بورڈنگ کارڈ لیے اور جہاز کا رخ کیا۔ دو ہفتے بعد مجھے ایک بار پھر سے تولوس آنا ہوگا۔

ائربس کی اس میٹنگ میں سعودیہ کے ساتھ ساتھ کویت ائرویز کے ارکان بھی شامل ہوں گے کویت ائرویز نے ائربس کے A-310 کے طیارے خریدے تھے۔ A-300-600 اور A-310 بہت سے سسٹم وغیرہ مشترک تھے اگر دو یا زیادہ ائرلائنز ساتھ مل کر مذاکرات کریں تو کامیابی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ سعودیہ اور کویت ائرویز دونوں AATC کے رکن تھے۔ دونوں نے تقریباً ایک ساتھ ائربس کے جہاز خریدے تھے۔ دونوں ائرلائنز ایک ساتھ مل کر مذاکرات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتی تھیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب ہم لوگوں نے A-300 کا کام ابھی شروع ہی کیا تھا۔ دنیائے عرب کی چند ائرلائنز نے فنی اشتراک کے لیے ایک جماعت بنائی جس کا نام عرب ائرلائنز ٹیکنیکل کنسورشیم (AATC) رکھا گیا۔ اس میں آٹھ ائرلائنز شامل تھیں۔ سعودیہ، گلف ائر، کویت ائرویز، مڈل ایسٹ ائرلائنز، رائل جارڈینین، تیونس ائر اور رائل ائرموراک۔

اس سے پہلے یورپ کی پانچ ائرلائنز نے ایسی ہی ایک تنظیم قائم کر رکھی تھی جو ATLAS گروپ کہلاتی تھی۔ AATC کچھ انہی خطوط پر قائم کی گئی تھی گو کہ AATC کے عزائم کا دائرہ ATLAS سے وسیع تر تھا۔

AATC کی پہلی میٹنگ میں، میں شریک نہ تھا۔ دوسری میٹنگ اردن کے شہر عمان میں تھی۔ سعودیہ کی ٹیم میں شرعبی، کرٹ اور میں شامل تھا۔ اس میٹنگ کا بنیادی مقصد مستقبل کا دائرہ عمل ترتیب دینا تھا۔

دوپہر کھانے کے لیے میزبان رائل جورڈینئس ائرلائنز (RJ) نے ایک مقامی ہوٹل میں بندوبست کر رکھا تھا۔ رات کا کھانا ان کے اپنے کلب میں تھا۔ کھانے سے پہلے موسیقی کا بندوبست تھا پہلے ڈانس میوزک اپنے عروج پر تھا سب کا خیال تھا کہ ابھی پردہ اٹھے گا اور تھرکتی ہوئی بیلے ڈانسر اسٹیج پر نمودار ہوگی۔ سب کا خیال غلط نکلا، تان کھانے پر ٹوٹی۔ دل ہی دل میں سب نے RJ کو اپنے مقدور بھر برا بھلا کہا۔ حالانکہ زبان سے سب RJ کا شکریہ ادا کررہے تھے۔

دو دن بعد میٹنگ ختم ہوئی تو اس کے منٹس آف میٹنگ لکھنے کی ذمہ داری سعودیہ کو سونپی گئی۔ میں نے اور کرٹ نے ہوٹل آکر منٹس لکھے۔ اس میٹنگ میں تین چار اہم باتوں پر اتفاق ہوا تھا۔

1۔ سعودیہ اور RJ دونوں کے پاس L-1011 جہاز تھے۔ جن کے مواصفات 90 فیصد ایک جیسے تھے۔ ان کو ملا کر ایک مکمل مواصفات بنایا جائے جو دوسری ائرلائن استعمال کر سکیں۔

2۔ آیندہ جہازوں کی خریداری مشترکہ طور پر کی جائے تا کہ زیادہ جہازوں کی خریداری کے سبب بہتر سودے ہو سکیں۔

3۔ شریک ائرلائنز اپنا کام باہر بھیجنے کی بجائے ایک دوسرے کے ہینگر اور مہارت استعمال کریں۔ وغیرہ وغیرہ۔

جب منٹس کی لکھائی ہو چکی تو میں نے کرٹ سے کہا کہ اس میں ایک جز کا اضافہ کردیں۔ کرٹ نے پوچھا ”کیا“ تو میں نے جواب دیا۔ یہ لکھ دیں کہ تمام شریک ائرلائنز نے رائل جارڈینئس کی روایتی عرب میزبانی کو بہت سراہا۔

کرٹ نے ٹھٹھہ لگایا پھر قلم میز پر رکھ کر اپنے مخصوص انداز میں عینک کی ایک ڈنڈی کو اپنے ہونٹوں میں دبایا اور کہا ”حسن تم مجھ سے بھی بڑے گولی باز ہو۔“ پھر یہ جملہ منٹس میں بڑھا دیا۔ گولی باز والا جملہ نہیں مہمان نوازی والا۔ رات کھانا کھانے کے بعد جب کرٹ منٹس تمام شرکاء کو سناتے ہوئے روایتی عرب مہمان نوازی پر پہنچے تو کمرا تالیوں سے گونج اٹھا۔

اگلے ایک سال AATC کے اجتماع کا سلسلہ جاری رہا۔ سعودیہ میں تبدیلی آئی کہ شرعبی سعودیہ سے باہر ہو چکے تھے امین الشوریٰ دوبارہ جنرل مینیجر انجینئرنگ کے عہدے پر فائز تھے۔ AATC کی اگلی میٹنگ تیونس میں تھی۔ مجھے اور امین کو اس میں شرکت کرنا تھا۔ سعودیہ کے جنرل مینیجر پلاننگ پہلے ہی تیونس جا چکے تھے۔

سعودیہ کی تیونس کی پرواز پر L-1011 جہاز اڑتے تھے۔ بیچ میں یہ پرواز لیبیا کے شہر ترپولی میں رکتی تھی۔ جہاز ترپولی ساتھ خیریت سے پہنچ گیا لیکن یہ خیریت زیادہ دیر قائم رہنے والی نہ تھی۔ ایک گھنٹا قیام کے بعد مسافروں کو تیونس جانے کے لیے دوبارہ سوار کرائے جانے کا اعلان ہونا چاہیے تھا جو نہ ہوا۔ ایک گھنٹا مزید گزر گیا تو امین نے سعودیہ کے گراؤنڈ انجینئر کو بلایا کیوں کہ ٹریفک کے لوگوں نے بتایا تھا کہ جہاز کی تاخیر فنی خرابی کی وجہ سے ہے۔

گراؤنڈ انجینئر نے بتایا کی اسپارک پلگ میں جانے والی ہائی ٹینشن کیبل شارٹ ہوگئی ہے۔ تیونس اسٹیشن پر یہ کیبل موجود نہیں ہے اور نہ ہی فلائی اوے کٹ میں موجود ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ تیونس میں L-1011 کے پرزوں کی پولنگ بھی نہیں ہے۔

اسپارک پلگ گاڑی کے پلگ کی طرح جہاز کے انجن اسٹارٹ کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

فلائی اوے کٹ (FAK) وہ چند اہم پرزہ جات ہیں جن کی ایک جہاز کو ضرورت پڑسکتی ہے۔ یہ پرزہ جات بکسوں میں بند کر کے جہاز کے ساتھ روانہ کیے جاتے ہیں تاکہ وقت ضرورت استعمال کیے جاسکیں۔

پولنگ وہ نظام ہے جس کے تحت ہر ائرپورٹ پر مختلف ائرلائنز پرزہ جات کا ایک اسٹور قائم کرتی ہیں اور وقت ضرورت ممبر ائرلائن پول میں سے مختلف پرزہ جات چند دن کے لیے ادھار لے سکتی ہے تاکہ ان کا جہاز اگر اس اسٹیشن پر خراب ہو جائے تو وقتی طور پر اس کو قابل پرواز بنایا جاسکے۔ ترپولی کے اسٹیشن پر چونکہ سعودیہ کے علاوہ کسی اور ائرلائن کا L-1011 جہاز نہیں اترتا تھا۔ وہاں L-1011 کا پول موجود نہ تھا۔ ایک اور ضروری بات۔ جہاز کی بعض خرابیاں ایسی ہوتی ہیں جن کا جہاز کی یا مسافروں کی حفاظت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ایسے نقص ہوں تو جہاز کو اڑایا جاسکتا ہے مگر ہائی ٹینشن کیبل خراب ہو تو جہاز نہیں اڑایا جاسکتا۔ یہ جہاز صرف اس صورت میں اڑ سکتا تھا کہ جدہ سے کیبل تیونس پہنچائی جائے۔

چھبیس گھنٹے ہم لوگوں نے سوتے جاگتے بیٹھے ٹہلتے کسی نہ کسی طرح گزارے۔ اب سعودیہ کا امدادی طیارہ آچکا تھا جو ہم کو تیونس لے جائے گا۔

تیونس ائرپورٹ پر ہمارے جنرل مینیجر پلاننگ جوفی صاحب موجود تھے۔ انہوں نے حکم دیا۔ ”آپ لوگوں کو ایک گھنٹا دیا جاتا ہے کہ نہا دھو کر تیار ہو جائیں۔ ہم کو ٹھیک ایک گھنٹے بعد رات کے کھانے پر جانا ہے۔“

اگر یہ کھانا صرف سعودیہ کے لیے ہوتا تو اس کو ٹالا جاسکتا تھا مگر یہاں تو پانچ چھ اور ائرلائنز کے مندوب بھی مدعو تھے۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم ہوٹل میں موجود تھے۔

لگتا تھا کہ ہوٹل کی عمارت پہلے رہائشی گھر کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ ایک بڑے احاطے کے اندر یہ ہوٹل تھا۔ ایک سے زیادہ کھانے کے کمرے تھے۔

ہال میں AATC کے علاوہ دس پندرہ لوگ اور ہوں گے۔ کھانے سے پہلے موسیقی کا پروگرام تھا۔ بیلی ڈانسنگ کی موسیقی اپنے عروج پر پہنچی تو دو رقاصائیں ہال میں داخل ہوئیں۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ہال میں بیٹھی ہوئی دو تین لڑکیوں نے اپنی کمر کے گرد دوپٹا نما کپڑا باندھا اور رقاصاؤں کے ساتھ شریک ہوگئیں۔ ان کی مہارت رقاصاؤں کے لیے چیلنج تھی۔ افسر اور ماتحت کا فرق مٹ چکا تھا۔ امین اور جوفی نے تالیاں پیٹ پیٹ کر اور میں نے منہ میں انگلیاں ڈال کر زوردار سیٹیاں بجا بجا کر دادی۔ پورے ہال میں سماں بندھا ہوا تھا۔ پھر رقص تھم گیا۔ کھانا آچکا تھا۔ ہوٹل واپس پہنچے تو رات کے تین بج رہے تھے۔

میٹنگ میں مزید امور کے ساتھ یہ بھی طے ہوا کہ سعودیہ اور تیونس ائر کو انجن کی مرمت اور اوور ہالنگ overhonling میں تعاون کی ضرورت ہے۔ میں اور سعودیہ کے مینیجر پاور پلانٹ طارق قطب تیونس آکر اس معاملے کو آگے بڑھائیں گے مگر اس سے پہلے AATC کے تعاون کا ایک اور موقع نکل آیا۔

سعودیہ کے ہینگر میں فالتو کام آگیا تھا چند ماہ کے لیے ساٹھ ستر میکینکس کی ضرورت تھی۔ مڈل ایسٹ ائرلائنز (MEA) کے حالات ان دنوں بہت خراب تھے۔ بیروت کا امن غارت ہو چکا تھا امن کی جگہ گولہ بارود نے لے لی تھی۔ MEA کے اپنے جہاز بیروت میں پارک نہ کیے جاسکتے تھے ہینگر میں کام نہ تھا۔ ان کے میکینک بے کار تھے۔ سعودیہ ان میکینکس کو استعمال کرسکتی تھی۔ سعودیہ کی ٹیم کے سربراہ جوفی صاحب تھے ان کے ساتھ میں اور MEA کے ایک سابقہ سپروائزر ڈکرن۔ جو اب سعودیہ کے لیے کام کررہے تھے۔ شامل تھے۔ بیروت جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ میٹنگ قبرص کے شہر لارناکہ میں رکھی گئی۔

لارنا کہ میں ساحل سمندر پر ایک بنگلہ ہے جو نکے بیچ کہلاتی ہے۔ یہاں پر ہم نے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ کرایہ ہوٹل ساٹھ ڈالر یومیہ۔ میٹنگ ہوٹل کے کانفرنس ہال میں ہوئی۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے خواہش مند تھے تمام معاملات طے ہوگئے۔ کنٹریکٹ پر اگلی میٹنگ میں دستخط ہوں گے جو ایتھنز میں ہوگی۔

رات کا کھانا ہوٹل میں ہی تھا۔ کھانے کے بعد میٹھے کی باری تھی۔ میٹھے میں اور چیزوں کے علاوہ فلیم بے بھی شامل تھا۔ یہ میں نے پہلی بار سنا تھا۔ پہلی بار والا کھاتہ ایک سے بڑھ گیا۔

فلیم بے کیلے کی ایک لمبی پرت کاٹ کر اس کو بعض چیزوں میں ہلکا ساتل کر بنایا جاتا ہے۔ جب یہ تیاری کو پہنچ جاتا ہے تو فرائی پین میں کوئی چیز چھڑکی جاتی ہے جس سے پین میں نیلا شعلہ اٹھتا ہے پھر فلیم بے تیار۔ یہ تمام کارروائی مہمانوں کے سامنے کی جاتی ہے۔

میں فلیم بے کھارہا تھا اور ڈکرن میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے تو جواب ملا ''راز کی بات ہے بعد میں بتاؤں گا۔'' جیسے ہی میں نے فلیم بے ختم کیا تو ڈکرن کی زبان کھل گئی۔ ''تم نے ابھی شراب کھائی ہے۔ جس چیز سے فلیم بے میں شعلہ اٹھا تھا وہ شراب تھی۔''

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' میں نے پوچھا
جواب ملا ''مزہ کرکرا ہوجاتا۔''

جدہ واپس آکر میں کنٹریکٹ تیار کر چکا تھا۔ اس کو سعودیہ کے شعبہ قانون سے منظور بھی کروا چکا تھا۔ صرف میکینکس کے ویزا کا مسئلہ تھا۔ اس کے حل ہونے کے بعد ایتھنز روانگی تھی۔ کنٹریکٹ پر منگل کے دن دستخط ہو چکے تھے بدھ کا دن سفر میں شمار ہوتا۔ اس کے بعد جمعرات اور جمعہ کی چھٹی تھی۔ دفتر ہفتے کے دن پہنچنا تھا۔ میں یہ دو دن یونان میں گزارنے کا پروگرام بنا کر آیا تھا۔

کنٹریکٹ پر دوپہر کو دستخط ہو چکے تھے۔ میں سہ پہر کو ایتھنز کے نزدیک ایک جزیرہ ہڈرا چلا گیا۔ ہڈرا جانے کے لیے ہوور کرافٹ کی سہولت موجود تھی۔ ہوور کرافٹ چونکہ براہ راست پانی پر نہیں چلتے ہیں بلکہ ہوا کی ایک تہہ پر چلتے ہیں ان کی رفتار کشتی کے مقابلے میں بہت تیز ہوتی ہے یہ ہوورکرافٹ غالباً فلائنگ ڈولفن کے نام سے مشہور تھے۔

ہڈرا میں، میں سمندر کے کنارے ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ ورانڈے سے ساحل سمندر کا منظر دلکش لگتا تھا۔ کھانے کے لیے میزیں بھی ورانڈے ہی میں لگائی گئی تھیں۔ میں تھوڑی دیر سمندر کا منظر دیکھتا رہا۔ پھر بازار گھومنے نکل گیا۔ واپس آیا تو رات ہوچکی تھی کھانا کھا کر کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں گرمی ہورہی تھی۔ پنکھا چلانا چاہا تو پنکھا کمرے میں تھا ہی نہیں۔ باہر سمندر کی ہوا چل رہی تھی گرمی کا پتا نہ چلتا تھا۔ کھڑکی کھولی کہ شاید ہوا اندر آئے تو کمرا ٹھنڈا ہو جائے۔ کھڑکی میں سلاخیں غائب اور کھڑکی بالکل سڑک کے ساتھ کھلتی تھی۔ لوگ اس کمرے میں کیسے رہتے تھے معلوم نہیں ہوٹل والے سے شکایت کی تو پتا چلا کہ وہاں پنکھوں کا رواج نہیں ہے۔ دوسرا کوئی کمرہ بھی خالی نہ تھا۔ زندگی میں پہلی دفعہ میں ایک رات میں چھ دفعہ نہایا۔ دوسرے دن جزیرہ میکانوس جانا تھا۔

میکانوس کے ہوٹل میں کمرا لینے سے پہلے میں نے اس سے پوچھا۔ ''آپ کے پاس کمروں میں پنکھے ہیں؟'' وہ کچھ حیران ہوا پھر جواب دیا۔ ''جی ہاں ہیں۔ مگر کیوں؟'' میں اس کو اس ''کیوں'' کا کیا جواب دیتا۔

سامان کمرے میں رکھ کر میں سیڑھیوں سے نیچے آرہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی حیران پریشان نیچے والے فلور سے اوپر آرہی تھی۔ جب ہم دونوں آمنے سامنے ہوئے تو اس نے کہا۔ ''میں بھٹک گئی ہوں مجھے باہر جانے کا راستہ نہیں مل رہا ہے کیا آپ میری مدد کرسکتے ہیں؟'' میرا دل چاہا کہ اس کو گود میں اٹھا کر ناچوں کہ دنیا میں میرے علاوہ اور بھی لوگ ہیں جو سیڑھیوں پر بھٹک سکتے ہیں۔ گود میں اٹھانے کا موقع تو نہ تھا میں نے باہر جانے والے راستے کی طرف اشارہ کردیا دراصل وہ باہر کے راستے کے بجائے بیسمنٹ میں چلی گئی تھی۔

وہ باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھی پھر پلٹ آئی۔ ''میں بھی کتنی بدتمیز ہوں کہ آپ کا شکریہ بھی نہ ادا کیا۔ میرا نام جولی ہے۔'' ''حسن'' میں نے اپنا نام بتایا۔

''میں دراصل اپنے میاں کے ساتھ بیچ جارہی تھی مگر اپنے ساتھ کچھ چیزیں لے جانا بھول گئی تھی۔ وہ لینے واپس آئی تو راستہ بھٹک گئی۔ اب میں جارہی ہوں۔ میرا شوہر ناراض ہوگا کہ دیر ہوگئی۔ وہ بہت غصہ ور اور سخت مزاج ہے۔ کیا آپ بھی بیچ پر جارہے ہیں؟''

''بعد میں۔ ابھی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ جولی چلی گئی۔

میں نے شہر گھومنے کے بعد بیچ کا رخ کیا۔ وہاں داخل ہوا تو آواز آئی۔ ''حسن ہمارے پاس آجاؤ۔'' یہ جولی کے علاوہ اور کون ہوسکتا تھا۔ ساتھ میں اس کا میاں تھا وہ دونوں مجھ سے کچھ فاصلے پر تھے۔ جولی جب ہوٹل میں ملی تھی تو وہ ایک ہلکے لال رنگ کے بہت عمدہ تراش کے ایڑیوں تک کے گاؤن میں ملبوس تھی۔ اب یہ لوازمات غائب ہو چکے تھے۔ ''حسن خود بے تاب تھا جلوہ دکھانے کے لیے'' مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔

میں ان کی طرف بڑھ گیا۔ ''یہ میرا میاں ہے ڈیوڈ، تم یہاں بیٹھ جاؤ۔'' جولی نے اپنے میاں کا تعارف کروایا۔ میں نے ڈیوڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میرے ہاتھ کو نظر انداز کر کے اس نے جولی کو ڈانٹا۔ ''یہاں بھی دوست بنا لیے تم نے۔ منع کیا تھا تم کو۔'' پھر میری طرف خونخوار نظروں سے دیکھا۔ میں نے عافیت اسی میں جانی کہ آگے بڑھ جاؤں مجھے اپنی ہڈیاں تڑوانے کا کوئی شوق نہ تھا۔

AATC کی تیونس والی میٹنگ میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ سعودیہ اور تیونس ائر انجن کی مرمت میں تعاون کریں گے۔ اس کی بنیادی وجہ بوئنگ B-737 کے انجن ماڈل JT8D کی مرمت کا خرچا تھا۔

سعودیہ کے JT8D انجن ''لفت ہنسا'' کے پاس اوور ہال ہوتے تھے اور تیونس ائر کے ''سبینا'' کے پاس۔ سعودیہ ان انجنوں کی مرمت کی جو قیمت ادا کرتی تھی وہ تیونس ائر کی قیمت سے زیادہ تھی۔ میں اور طارق قطب اس گتھی کو سلجھانے تیونس پہنچ گئے۔ تمام معاملات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا اندازہ یہ ہوا کہ سعودیہ کے اور تیونس ائر کے جہاز جس ماحول میں اڑتے ہیں اس میں بہت فرق ہے اور دونوں ائر لائنز کی پروازوں کے دورانیے میں بھی فرق ہے۔

سعودیہ کے انجن صرف سعودی عرب میں ہی اڑتے تھے یہاں پر ریت اور سلفی ڈیش کی وجہ سے انجن کے بلیڈ جلدی خراب ہوتے تھے۔ اس لیے ان کو جلد بدلنا پڑتا تھا۔ جو ایک بڑا خرچا تھا۔

اس کے علاوہ سعودیہ کی داخلی پروازوں کا دورانیہ اوسطاً صرف ایک گھنٹا تھا۔ جس کی وجہ سے انجن کی طاقت ٹیک آف کے وقت زیادہ استعمال ہوتی جس کا انجن کی مرمت کی قیمت پر اثر پڑتا تھا۔ تیونس ائر کی پروازوں کا اوسط دورانیہ دو گھنٹے سے بھی زیادہ تھا اس لیے ان کا مرمت کا خرچا کم تھا۔ تیسرے دن ہماری واپسی تھی۔ ہمارے ٹکٹ بلا قیمت تھے۔ تیونس ائر نے جاری کیے تھے۔ ائر لائنز کاروبار کے سلسلے میں یہ بلا قیمت ٹکٹ ایک دوسرے کے ملازمین کو جاری کرتی رہتی ہیں ان کی وقعت ایسی ہی ہوتی ہے جیسی قیمت والے ٹکٹ کی ہوتی ہے۔ اس پر سفر کرنے والے مسافر کو آف لوڈ نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے ٹکٹ اکانومی کے تھے مگر تیونس ائر کے مینیجر ہم کو ائر پورٹ چھوڑنے آئے تھے۔ انہوں نے ہم لوگوں کو اپ گریڈ کر کے فرسٹ کلاس کے بورڈنگ کارڈ دلوائے تھے۔ اپ گریڈ کیے ہوئے مسافر کو بھی آف لوڈ نہیں کیا جاسکتا اگر ایک بار بورڈنگ کارڈ جاری کر دیا جائے۔

جہاز کی پرواز میں آدھا گھنٹا باقی تھا۔ میں اور طارق باتوں میں مصروف تھے کہ ایک اسٹیورڈ ہمارے پاس آیا ہمارے ٹکٹ چیک کیے۔ قصہ مختصر یہ کہ اس نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے مجھے اور طارق کو جہاز سے اتار دیا۔ طارق نے اترنے کے بعد اسٹیورڈ کی شکایت کی اس کے خلاف کارروائی کی گئی وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس سب کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے تیونس کے دو اور ساحلی شہر حمامات اور سوسی گھومنے کا موقع مل گیا۔

تیونس کی میٹنگ کے بعد یہ لازمی ہو گیا تھا کہ JT8D کی مرمت کے اخراجات کا مزید جائزہ لیا جائے۔ جس کے لیے SABENA سے رابطہ قائم کیا گیا وہ لوگ جدہ آئے۔ بات مزید آگے بڑھانے کے لیے سعودیہ کی ٹیم کو SABENA کی انجن شاپ کا معائنہ کرنا تھا۔ اس کام کے لیے ہم لوگوں کو برسلز جانا پڑا۔ بات نہ بنی۔ سعودیہ کے انجن پرانی ایجنسی کے پاس ہی جاتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد یہ کنٹریکٹ ائر کینیڈا کو مل گیا۔ اب مجھے ہر چھ مہینے بعد سہ ماہی جائزہ میٹنگ کے لیے مونٹریال جانا تھا۔ سعودیہ کے خرچے پر۔ وہاں سے ٹورنٹو جایا جاسکتا تھا۔ سعودیہ کے خرچے پر۔ AATC کو برقرار رکھنے کے لیے جس جذبے کی ضرورت تھی وہ موجود نہ تھا چند سال بعد AATC داستان پارینہ بن چکی تھی۔

AATC کے داستان پارینہ بننے میں ابھی چند سال باقی تھے آج AATC زندہ تھی۔ بھرپور طور پر سانس لے رہی تھی اور آج کی ائربس کی میٹنگ AATC کے پرچم تلے ہی منعقد کی گئی تھی سعودیہ اور کویت ائرویز آج ایک ساتھ مل کر ائربس کا سامنا کر رہے تھے۔ یہ میٹنگ تین دن جاری رہی جس میں بہت سے امور زیر بحث آئے جن میں

سے کچھ طے پا گئے، کچھ پر اتفاق نہیں ہو سکا۔

ایک اہم مسئلہ جہاز کی لینڈنگ کیٹگری کا تھا۔ ائربس نے جب جہاز کی فروخت سے قبل مذاکرات کیے تھے تو انہوں نے کہا تھا کہ جہاز آٹو لینڈنگ کے لیے سرٹیفائی کیا گیا ہے لیکن جب مواصفات کا تفصیلی کام شروع ہوا تو ائربس کا موقف تھا کہ جہاز آٹو لینڈ کر سکتا ہے مگر اس سہولت کے لیے سعودیہ کو مواصفات کی تبدیلی کے لیے چینج رکوسٹ جاری کرنی پڑے گی جس کی بھاری قیمت ہو گی۔ سعودیہ چینج رکوسٹ جاری کرنے کو تیار تھی لیکن قیمت نہیں دینا چاہتی اس لیے کہ سعودیہ کا خیال تھا کہ ائربس نے جہاز بیچتے وقت یہ چیز واضح طور پر سعودیہ کو نہیں بتائی تھی بلکہ اس سہولت کو اس طرح پیش کیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ آٹو لینڈنگ کی سہولت جہاز کی قیمت میں شامل ہے۔ ائربس کو سعودیہ اور کویت ائرویز کے آگے ہار ماننی پڑی۔

سعودیہ کی ائربس سے ایک انوکھی فرمائش تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ کاک پٹ کے نیچے کا وہ حصہ جہاں ایویانکس کے کمپیوٹر وغیرہ نصب کیے جاتے ہیں وہاں پر ٹھنڈی ہوا کا بندوبست کیا جائے۔ ائربس والوں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”مگر وہاں پر آپ ٹھنڈی ہوا کا کیا کریں گے؟“

خلیج کے ممالک میں ایک بہت بڑا مسئلہ ہے گرمی...... بے تو شا گرمی۔ گرمی کا موسم جب اپنے عروج پر ہوتا ہے تو ان ممالک میں کھلے میدان میں درجۂ حرارت پچاس ڈگری سینٹی گریڈ سے بھی تجاوز کر جاتا ہے۔ جہاز کے اندر جہاں ایویانکس کی تنصیبات ہوتی ہیں۔ ہیٹ سوک کی وجہ سے درجۂ حرارت باہر کھڑے ہوئے جہاز میں ستر ڈگری سینٹی گریڈ سے بھی تجاوز کر جاتا ہے جس کی وجہ سے ایویانکس کے یونٹ کی کارکردگی متاثر ہوتی، ان میں سے اکثر کام کرنا بھی چھوڑ سکتے ہیں۔ سعودیہ آزمانا چاہتی تھی کہ اگر ایویانکس بے (Bay) میں ٹھنڈی ہوا کا بندوبست کیا جائے تو اس کا کیا اثر ہوگا۔

”مگر ٹھنڈی ہوا کے ساتھ ساتھ نمی بھی آئے گی جس سے کروژن یعنی زنگ لگنے کا خطرہ بڑھ جائے گا۔“ ائربس نے جواب دیا۔

سعودیہ نے جواب دیا۔ ”ہم اس آزمائش کے لیے تیار ہیں۔ جب تک ہم ٹھنڈی ہوا چھوڑیں گے نہیں ہم کو معلوم نہیں ہوگا کہ اس کے منفعت بخش اور مضر اثرات کیا ہیں۔“

ائربس نے اس کا قیمتاً بندوبست کر دیا۔

آج میٹنگ کا آخری دن تھا۔ ہم لوگ لنچ سے فارغ ہو کر واپس کانفرنس روم پہنچے تو تین بج رہے تھے۔ تین بجے سب سے اہم کام چائے کا دور ہوتا ہے۔ چائے ختم کرنے کے بعد ہم لوگ اس دورے کا آخری کام نمٹا سکتے ہیں۔ ٹریننگ سمیولیٹر کا معائنہ۔

جہاز کی خریداری کے کنٹریکٹ میں کئی جز ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک جز کسٹمر سپورٹ کہلاتا ہے۔ اس میں ان تمام چیزوں کا معاہدہ ہوتا ہے جو جہاز ساز کمپنی ائرلائن کو مہیا کرے گی۔ ان چیزوں میں سے ایک چیز ہوتی ہے ٹریننگ۔ یہ ٹریننگ فضائی عملہ اور زمینی عملہ دونوں کے لیے ہوتی ہے۔ مکینک کی ٹریننگ کے لیے جو ساز و سامان دیا جاتا ہے اس میں سسٹم ٹرینرز شامل ہوتے ہیں۔ یہ بڑے بڑے بورڈ ہوتے ہیں جن میں مختلف سسٹم جیسے ہائیڈرالک، الیکٹریکل وغیرہ کی تفصیل ہوتی ہے جس کی مدد سے مکینک اس سسٹم کی کارکردگی کو سمجھ سکتا ہے۔ ائربس کو سعودیہ کو ایسے پانچ چھ سسٹم ٹرینرز دینے تھے۔

ان سسٹم ٹرینرز کی بجائے ائربس نے ایک نئی جدت پیدا کی تھی۔ انہوں نے جہاز کا ڈھانچا بنا کر اس کے کاک پٹ میں وہ تمام چیزیں نصب کر دی تھیں جو جہاز میں اور کاک پٹ میں ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ٹریننگ میں بہت آسانی پیدا ہو گئی۔ سمیولیٹر semulator بہت کام کی چیز ثابت ہوئی۔ سعودیہ اور کویت ائرویز دونوں نے ائربس کا شکریہ ادا کیا۔ میٹنگ ختم ہو چکی تھی مواصفات کے سارے مسائل حل ہو چکے تھے۔ اب صرف BFE پر کام کرنا باقی تھا۔

یہاں یاد دہانی کرا دوں کہ BFE وہ کمپونٹ ... سسٹم ہوتے ہیں جن کی فراہمی ائرلائن کے ذمہ ہوتی ہے۔ A-300-600 کی BFE کے انتخاب کے لیے کافی وقت باقی تھا۔ B-747 کے لیے زیادہ وقت نہ ہونے کی وجہ سے ہم B-747 کی BFE پر اتنی توجہ نہ دے سکے تھے۔

پندرہ بیس وینڈر تھے جن سے ہم کو مذاکرات کرنے تھے۔

پروگرام یہ بنا کہ میں اور کرٹ دو ہفتے کے لیے پیرس جائیں گے۔ تمام وینڈرز سے ہوٹل کے کانفرنس روم میں ملاقات اور مذاکرات ہوں گے۔ ان مذاکرات میں صرف تکنیکی امور زیرِ بحث ہوں گے۔ کمرشل مذاکرات بعد میں

ہوں گے۔

پیرس کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ اکثر وِنڈر یورپ کے تھے گو کہ بعض وِنڈر امریکا کے تھے اور حسبِ ضرورت تولوس سے ائربس کے متعلقہ نمائندوں کو شرکت کے لیے بلایا جاسکتا تھا۔ کرٹ اور میں ہر وِنڈر سے ملیں گے اور ہمارے دوسرے انجینئر صرف اپنے متعلقہ وِنڈر سے ملیں گے۔ مثلاً کریم صرف ایویانکس کے وِنڈر کی میٹنگ میں موجود ہوگا۔

میٹنگ کی تفصیل تکنیکی طور پر پیچیدہ اور غیر دلچسپ ہو گی۔ یہاں صرف طریقہ کار بتانا مقصود ہے۔ دن کے وقت ہم ایک وِنڈر سے ملتے دوپہر کو وہ ہم لوگوں کو کھانے کے لیے لے جاتے۔ ہماری شرط صرف اتنی تھی کہ ڈیڑھ گھنٹے میں کھانے سے فراغت ہو جانی چاہیے۔ دن کی میٹنگ ہم نے زیادہ تر امریکی وِنڈر کے ساتھ رکھی تھی کہ ان کو ڈیڑھ گھنٹے میں کھانے کا وقفہ ختم ہو جانے پر کوئی ملال نہ ہوتا تھا۔ فرانسیسی وِنڈر کی بات الگ تھی۔ ان سے ہم سہ پہر میں ملتے اور رات کے کھانے کے لیے ان کے اسیر ہوتے۔ اگر کسی دن اتفاق سے بارہ بجے سے پہلے فراغت حاصل ہو جائے تو شکر ادا کرتے لیکن یہ ناشکری ہوگی اگر یہ اعتراف نہ کیا جائے کہ ان دو ہفتوں میں جو بہترین نعمتیں کھانے کو ملیں وہ زندگی میں کسی اور دو ہفتے میں نہ ملی تھیں۔

جدہ واپس پہنچے تو یہاں پانسہ پلٹا ہوا تھا۔ امین الشوریٰ شرعی کی جگہ براجمان تھے اور شرعی نہ صرف انجینئرنگ سے ہی بلکہ سعودیہ سے بھی باہر تھے۔ امین ذہانت کے اعتبار سے اور بحیثیت انجینئر شرعی سے بہتر تھے۔ مگر شرعی کے ساتھ میرے پچھلے ڈیڑھ دو سال بہت اچھے گزرے تھے۔ مجھے شرعی کے جانے کا دکھ ہوا۔ سعودیہ سے الگ ہونے کے باوجود میری اور شرعی کی دوستی مضبوطی سے قائم رہی۔ جب بھی ہماری ملاقات دنیا کے کسی بھی کونے میں کسی کانفرنس یا دوسرے اجتماع میں ہوتی تو میں کم از کم ایک وقت کے کھانے پر ان کا مہمان ہوتا۔ وہ بڑے تھے میں چھوٹا۔ بڑے چھوٹوں کو کھلاتے ہیں۔ ان سے کھاتے نہیں شرعی عرب کے اس اصول پر سخت پابندی سے قائم تھے۔ شرعی دنیا میں وہ واحد آدمی ہیں جنہوں نے میرے پیچھے روزہ کھول کر مغرب کی نماز ادا کی۔ یہ حق انہوں نے اپنے چھوٹے کو خاص طور سے تفویض کیا تھا۔ میں ان کا شکر گزار ہوں۔

امین کے ساتھ شروع کا دور آزمائش کا دور تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں ایک تو یہ کہ امین کو دنیا کی ہر چیز کا منفی پہلو اجاگر کرنے میں جو ملکہ حاصل تھا وہ شاید دنیا میں کسی اور کو نہ تھا۔ دوسرے فلائیڈ امین کا منظورِ نظر تھا اور کرٹ سوتیلی اولاد۔ حالانکہ فلائیڈ نے امین کو ''زہریلا بونا'' کا خطاب دے رکھا تھا امین کا قد چھوٹا تھا۔

میں اور جیری کرٹ کے ماتحت تھے لہٰذا ہم دونوں سپنولوں سے کسی طرح کم نہ تھے مگر جب امین کے ساتھ کئی سال کام کیا تو پتا چلا کہ امین سے بدتر دشمن کوئی نہیں اور اسی طرح امین سے بہتر اور پُرخلوص دوست کوئی نہیں۔

پیرس میں ہم نے BFE کے ایک رخ پر وقت صرف کیا تھا۔ فنی رخ، کمرشل مذاکرات ابھی باقی تھے۔ فنی رخ کو ترجیح اس لیے دی جاتی ہے کہ اگر آپ فنی طور پر کسی چیز سے مطمئن نہیں ہیں تو چاہے آپ کو کمرشل میں چاند بھی دے دیا جائے تو وہ چیز نہیں خریدی جائے گی۔ یہ سعودیہ کا اصول نمبر ایک تھا جس پر ہم سختی سے کاربند تھے۔ اسی اصول کے تحت بعض وِنڈر سے مزید بات چیت کی ضرورت نہ تھی۔

ہوابازی کی دنیا میں دو نمائشیں بہت اہم ہوتی ہیں۔ ایک فارنبرا ائرشو اور دوسرا پیرس ائرشو یہ نمائشیں ملٹری اور سول دونوں طرح کی ہوابازی کے شائقین میں یکساں مقبول ہیں۔ اب دبئی ائرشو بھی خاصا مقبول ہو چکا ہے۔ یہ شاید 1981ء میں پہلی دفعہ منعقد ہوا تھا۔

عام لوگ یہاں جہازوں کو اور جہازوں کے کرتب کو دیکھنے آتے ہیں لیکن دنیائے ہوابازی کے لوگ یہاں کاروبار کرنے آتے ہیں۔ اکثر اوقات بڑے بڑے آرڈر بچا کے رکھے جاتے ہیں کہ ان کا اعلان ائرشو کے دوران کیا جائے گا۔ شو کے دوران کروڑوں ڈالر کا کاروبار ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں اگر ہوابازی کے شعبے میں کوئی بھی کمپنی اگر کسی حیثیت والی کمپنی ہے تو وہ ضرور اس میں شرکت کرے گی۔ ان سب کے اسٹال ہوتے اور ساتھ ہی ساتھ شلیے۔ تمام کاروبار ان شلیے میں ہوتا ہے۔ خاص خاص مہمان دوپہر کھانے پر شلیے میں مدعو ہوتے ہیں۔

پیرس ائرشو BFE کے کمرشل معاملات و مذاکرات کے لیے بہترین موقع تھا ہم لوگوں نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔

پیرس میں جس زمانے میں ائرشو ہوتا ہے اسی زمانے میں ٹینس کا مشہور فرنچ اوپن بھی ہوتا ہے۔ ہوٹل اگر پہلے سے بک نہ ہو تو ٹھہرنے کی جگہ حاصل کرنا ''لانا ہے جوئے

شیر کا" ہو جاتا ہے۔ ہمارا ائرشو جانے کا فیصلہ دیر سے ہوا تھا۔ بڑی کوششوں کے بعد پیرس کے ہالی ڈے ان میں جگہ ملی۔ یہ ہوٹل پیرس کے گنجان علاقے میں ہے جہاں کار پارک نہیں بن سکتا۔ ان کا کار پارک اوپری منزلوں پر تھا۔ جب بھی کار پارک اوپری منزل پر بنائے جاتے ہیں تو گاڑیوں کو وہاں لے جانے کے لیے راستہ بھی بنایا جاتا ہے لیکن یہاں اتنی جگہ نہ تھی اور شاید عمارت بھی بہت پہلے کی بنی ہوئی تھی۔ ان تمام مشکلات کا ایک انوکھا حل نکالا گیا تھا۔ ہوٹل میں آ کر گاڑی ایک بڑی لفٹ میں لے جانا پڑتی تھی۔ وہ لفٹ گاڑی کو اوپر پارکنگ لاٹ میں لے جاتی تھی۔ لفٹ کا سامنے کا دروازہ کھلتا اور گاڑی باہر۔ یہ انوکھا پارکنگ کا انتظام میں نے اور کہیں نہیں دیکھا۔

گاڑی ہم نے کرائے پر لی تھی اس کا چلانا میری ذمہ داری تھی اور ساتھ ہی یہ بھی ذمہ داری تھی کہ کسی بھی دن بغیر بھٹکائے ہوئے اپنے ساتھیوں کو ائرشو نہ پہنچاؤں۔ اس ذمہ داری کو میں نے بڑی لگن اور خوبی سے نبھایا۔ حالانکہ دو تین لوگ اور بھی گاڑی میں بیٹھے ہوتے تھے لیکن ہر غلط موڑ کی ذمہ داری میرے اوپر ڈال دی جاتی۔ میں ویسے بھی بھٹکنے اور بھٹکانے میں اپنا ثانی آپ ہوں پھر سونے پر سہاگا سڑکوں کے نام اور پیرس والوں کا سائن بورڈ لگانے کا انداز۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح یہ مرحلہ طے ہو جاتا۔ کسی ایک دن بھی ایسا نہ ہوا کہ ہم شو کا ٹائم ختم ہونے کے بعد وہاں پہنچے ہوں۔

ملاقاتیں حسب معمول جاری تھیں جس کسی کے ساتھ صبح کی میٹنگ Meeting ہوتی کھانا ہم انہی کے شیلے میں کھاتے۔ ہماری حتی الامکان کوشش تھی کہ رات کے کھانے میں نہ پھنسیں کیوں کہ رات کو پیرس ہم اپنے طور پر گھومنا چاہتے تھے مگر انسان کی ہر خواہش پوری نہیں ہوتی۔

ایک وینڈر تھے کہ اگر ہم ان کا سارا سامان خرید لیتے تو ہر جہاز پر تقریباً پانچ لاکھ ڈالر کا سامان لگتا۔ سعودیہ نے کل گیارہ A-300 خریدے تھے۔ وہ لوگ بصد اصرار ہم لوگوں کو کھانے کے لیے ایک جگہ لے گئے جس کا نام تھا "بوادے بولون" یہاں پر ایک ریسٹورنٹ تھا جس کا نام تھا پیرے کیٹلاں۔ اس کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں پر کھانے کی قیمتیں ہر مینو پر نہیں، ہوتیں صرف ایک مینو پر ہوتی ہیں جو صرف میزبان کو دیا جاتا ہے۔ اس کی خاص وجہ تھی کہ آج سے تیس سال پہلے بھی وہاں پر ایک آدمی کا کھانا سو ڈالر کے لگ بھگ بھی ہو سکتا تھا لیکن ساڑھے پانچ ملین ڈالر کے کنٹریکٹ کے لیے یہ سودا مہنگا نہ تھا۔

کھانا کھا کر باہر نکلے تو ہمارے میزبان نے کہا کہ اگر آپ کو بوادے بولون کی بہت ہی خاص چیز دیکھنی ہو تو الٹے ہاتھ سے مڑ کر آگے جنگل کی طرف جانے والی سڑک پر نکل جائیں۔ آپ کا وقت بہت اچھا گزرے گا۔ ہم یہ غلطی کر بیٹھے۔

جیسے ہی سڑک جنگل میں داخل ہوئی کئی لڑکیوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر ہم کو اپنی طرف بلانا چاہا۔ ویسے تو یہ عام سی لڑکیاں تھیں لیکن ان میں ایک خاص بات تھی وہ کپڑوں سے بے نیاز تھیں۔ ہاں ان میں سے جو چند ایک شریف زادیاں تھیں انہوں نے کمر سے نیچے تھوڑا بہت کپڑوں کا تکلف کر رکھا تھا مگر یہ نظارہ میرے لیے آخری نظارہ نہ تھا۔ جب بھی ہمارا کوئی انجینئر جدہ سے اپنے متعلقہ وینڈر سے مذاکرات کے لیے آتا تو کرٹ کا اصرار ہوتا کہ وہ اس نظارے سے محروم نہ رہ جائے۔ اس کو وہاں لانے لے جانے کی ذمہ داری میری تھی۔ گاڑی میں چلا رہا تھا۔

مجھے پیرس کا پہلا کیبرے بھی کرٹ نے دکھلایا۔ ہم ایک شیلے میں میٹنگ میں مصروف تھے کہ کرٹ نے کہا کہ ہم کو بہت ضروری کام سے جانا ہے یہ میٹنگ پانچ بجے سے پہلے ختم ہو جانی چاہیے۔ میٹنگ پانچ بجے سے پہلے ختم ہو گئی۔ میں نے کرٹ سے پوچھا کہ ایسے کون سے ضروری کام سے جانا ہے تو اس نے کہا تم کو جلد معلوم ہو جائے گا آج تم لوگ میرے مہمان ہو کھانا میری طرف سے۔ کھانا ختم کرنے کے بعد کرٹ نے کہا۔ "اب فولی برژے" چلو Follie Berger اب میری سمجھ میں آیا کہ اتنا اہم کون سا کام ہے۔ کرٹ نے پہلے سے ہی چار سیٹیں بک کروا رکھی تھیں ہم نے ٹکٹ کاؤنٹر سے ٹکٹ لیے اور ہال میں داخل ہو گئے۔ سب سے آگے والی قطار کی طرف چلو میں بڈھا آدمی ہوں دور سے یہ لڑکیاں مجھے صاف نظر نہیں آئیں گی۔ کرٹ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تو اس بڑھاپے میں تم کو جوان لڑکیاں دیکھنے کا شوق کیوں چرایا۔" میں نے چھیڑا۔

"صرف میں بڈھا ہوں میرا دل جوان ہے۔ تم بھی اپنا دل جوان رکھا کرو۔"

کرٹ کا انتقال ہارٹ فیل کے سبب ہوا۔

ہال بہت بڑا تھا لاتعداد لوگ تھے زیادہ تر سیاح۔

شو کی ابتدا ایک گانے سے ہوئی۔ پورا ہال روشنیوں

سے جگمگا اٹھا۔ صوتی اثرات غضب کے تھے۔ سازوں کی آواز اثر انگیز گلوکارہ ایک رسی کی سیڑھی کے ذریعے اوپر سے اسٹیج پر اتری۔ اس کے گانے نے سماں باندھ دیا۔ لگتا تھا پورے ہال میں بجلیاں دوڑ رہی ہیں۔ اتنا سحر انگیز گانا نہ میں نے پہلے سنا تھا اور نہ اس کے بعد۔ شو کئی گھنٹے کا تھا۔ رات دیر سے ہوٹل واپسی ہوئی۔

صبح اٹھ کر میں نے ایک دفعہ پھر لوگوں کو بھٹکانے کے فرائض انجام دیے۔ معمول کے مطابق کام چلتا رہا۔ آج پھر رات کا کھانا ٹالنا مشکل ہو گیا۔ کھانے کا انتظام ایک چھوٹے سے ہوٹل میں تھا۔ پندرہ بیس مہمانوں کا پورا کمرا بک تھا۔ ہمارے ایک ساتھی نے لطیفہ سنانا شروع کر دیا۔

ایک دفعہ ایک بار میں اشتہار لگا تھا کہ جو کوئی جارج کو ہنسائے گا اس کو سو ڈالر انعام ملے گا۔ ایک آدمی نے شرط لگائی اور اس کمرے کی طرف گیا جہاں جارج تھا۔ جارج آدمی نہ تھا ایک گدھا تھا۔ وہ آدمی جارج کو لے کر باہر نکلا تو جارج دولتیاں مار مار کر قہقہے لگا رہا تھا۔ آدمی نے سو ڈالر لیے اور چلا گیا۔ دوسرے دن وہی آدمی پھر بار میں آیا تو اب کی دفعہ اشتہار لگا اس پر لکھا تھا جو آدمی جارج کو رلائے گا۔ اس کو سو ڈالر انعام ملے گا۔ اس آدمی نے شرط لگائی اور کمرے میں گیا جب باہر نکلا تو جارج دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ بار کے مالک نے آدمی کو سو ڈالر دیے اور سو ڈالر اوپر سے اور دیے اور کہا کہ سو ڈالر صرف اس لیے ہیں کہ یہ بتاؤ کہ تم نے جارج کو کیسے ہنسایا اور کیسے رلایا۔ جب اس آدمی کا جواب ہمارے ساتھیوں نے سنا تو پورا کمرا قہقہوں سے گونج اٹھا۔ (وہ جواب قابلِ اشاعت نہیں ہے) سب ہنس رہے تھے سوائے ہمارے میزبان کے۔ لطیفہ سنانے والے نے کہا۔ ''یار سب ہنس رہے ہیں مگر تم خاموش ہو کیا بات ہے۔''

جواب ملا۔ ''میرا نام جارج ہے۔'' اس پر پہلے سے بھی زیادہ زوردار قہقہوں نے پورے کمرے کو ہلا کر رکھ دیا۔

لمبی کہانی کو مختصر کرتے ہوئے صرف اتنا بتانا ہے کہ ایک کے بعد ایک BFE ائربس کو مقررہ وقت پر ڈیلیور کروا دیے گئے۔ ہماری BFE کی ذمہ داری ختم ہو چکی تھی۔ سوائے ایک کے، سیٹوں کا انتخاب ابھی باقی تھا۔

سعودیہ نے جس وقت B-747 کی سیٹوں کا انتخاب کیا تھا اس وقت ہمارے پاس وقت اتنا نہیں تھا کہ سیٹیں بنانے والے مختلف وینڈر سے رابطہ کر کے باقاعدہ مذاکرات کے ذریعے سیٹ بنانے والی کمپنی کا انتخاب کیا جاتا۔ سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ جو کمپنی سعودیہ کے دوسرے جہازوں کے لیے سیٹیں بنا رہی تھی اسی کمپنی کو B-747 کی سیٹوں کا کام بھی دے دیا جائے لیکن A-300 کی بات اور تھی۔ A-300 کی سیٹوں کے انتخاب کے لیے ہمارے پاس وقت ہی وقت تھا۔ اس وقت کو استعمال کرتے ہوئے سعودیہ نے اپنے ذاتی سیٹ کے مواصفات تیار کیے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنی ضروریات کے مطابق خریداری کا کنٹریکٹ اور ٹینڈر تیار کر کے یورپ، جاپان اور امریکا کی سیٹ تیار کرنے والی کمپنیوں کو بھجوا دیا۔ اب ان کمپنیوں کی باری تھی کہ وہ معہ اپنی بنائی ہوئی سیٹوں کو جدہ لا کر سعودیہ کے مینجمنٹ کے سامنے پیش کریں۔ سیٹوں کا انتخاب اور جہاز کی اندرونی آرائش وہ چیزیں ہیں کہ ائرلائن مینجمنٹ کا ہر فرد اس میں اپنا حصہ ڈالنا چاہتا ہے۔ سرخرو ہونا چاہتا کہ اس نے جہاز کے انتخاب میں اپنا کردار ادا کیا۔ باقی چیزوں میں وہ لوگ نامحرم ہوتے ہیں کہ ان دوسری چیزوں کے لیے ٹیکنیکی معاملات کا جاننا ضروری ہوتا ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ اعزاز صرف پائلٹ، انجینئر اور مارکیٹنگ کے چند افراد کے حصے میں ہی آسکتا ہے۔

سیٹ کے چناؤ کا مقابلہ تگڑا تھا۔ چھ، سات وینڈر ملوث تھے۔ آخر کار یہ کنٹریکٹ فرانس کی کمپنی سکما (Sicma) کو سونپا گیا۔ مواصفات کا کام اب مکمل ہو چکا تھا۔ جہاز بننا شروع ہو چکے تھے لیکن بیچ بیچ میں... مسائل اپنا سر ابھارتے رہتے تھے۔ ایک بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ FMS کا مسئلہ۔

FMS فلائٹ مینجمنٹ سسٹم کا عمودی، ورٹیکل نیویگیشن وقت پر مکمل نہیں ہو سکتا تھا جس کی وجہ سے پائلٹ کا کام بھی بڑھ جاتا اور ایندھن کی متوقع بچت پر بھی اثر پڑ سکتا تھا لیکن اس مسئلے کی وجہ سے جہازوں کی ڈیلیوری میں تاخیر نہیں کی جاسکتی تھی۔ FMS فی الحال بغیر ورٹیکل نیویگیشن کے نصب کیا جائے گا۔ پھر جب ورٹیکل نیویگیشن کا حصہ مکمل ہو جائے گا تو اس کو FMS کمپیوٹر میں لگا دیا جائے گا لیکن اس کوتاہی کو ائربس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔

FMS کے بعد مزید کوئی قابلِ ذکر واقعہ نہیں ہوا۔ تمام A-300-600 جہاز سعودیہ کے بیڑے میں شامل ہو چکے تھے۔ میری مواصفات کی ذمہ داری پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔

☆☆☆

گیارہواں اور آخری ائربس A-300-600 جدہ پہنچ چکا تھا۔ جس مقصد کے تحت انجینئرنگ کو دو دھڑوں میں تقسیم

کیا گیا تھا۔ وہ مقصد یعنی سعودیہ کے۔ لیے دو (2) نئی طرح کے جہاز خریدنا۔ پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ اب مواصفات پر کام کرنے والے انجینئروں کے پاس زیادہ کام نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ دنیا میں ''کوالٹی'' (Quality) سے متعلق ایک نئی سوچ نے جنم لیا تھا۔ اس نئی سوچ کا نام کوالٹی ایشورنس (Assurance) رکھا گیا۔ اس سے پہلے سارا زور کوالٹی کنٹرول پر تھا۔

کوالٹی کنٹرول کا مقصد یہ تھا کہ جو چیز معیار کے مطابق نہیں بنائی گئی ہے یا جو کام معیار کے مطابق نہیں کیا گیا ہے اس کی گرفت کر کے یا تو وہ چیز دوبارہ بنائی جائے یا مسترد کر دی جائے اور جو کام ٹھیک طرح سے نہیں کیا گیا ہے اس کو دوبارہ ٹھیک طرح سے کیا جائے۔ اس طرز عمل میں خرابی یہ ہے کہ چیز چونکہ بن چکی ہوتی ہے یا کام ختم ہو چکا ہوتا ہے اس کے دوبارہ بنانے یا ٹھیک کرنے یا کام کو دوبارہ کرنے میں وقت اور پیسہ دونوں کا ضیاع ہوتا ہے۔ اس زیاں کو کم سے کم سطح پر رکھنے کے لیے کوالٹی ایشورنس کی سوچ نے جنم لیا۔

کسی کام کے کرنے سے پہلے ہی یا بنانے سے پہلے ہی کوالٹی ایشورنس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ان امور کا احاطہ کیا جائے جو اس کام میں یا اس چیز میں نقص کے امکانات پیدا کر سکتے ہیں اور پھر ان امور کا سدباب کیا جائے۔ کوالٹی ایشورنس صرف چیزوں کے بنانے یا تکنیکی امور تک ہی محدود نہیں ہے۔ اس کا اطلاق زندگی کے ہر شعبے پر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک دفتر میں کام کن اصول کے تحت کیا جاتا ہے۔ ان اصولوں میں بہتری لائی جا سکتی ہے۔ یا یہ کہ ایک لائبریری میں کتابیں کس طرح سے ہینڈل کی جاتی ہیں۔ اس کے طریق کار کو بھی بہتر بنایا جا سکتا ہے دغیرہ وغیرہ۔ سعودیہ کی اعلیٰ قیادت نے فیصلہ کیا کہ سعودیہ کے ٹیکنیکل ڈویژن میں کوالٹی ایشورنس کا شعبہ قائم کیا جائے۔ اس شعبے کو تشکیل دینے کی ذمہ داری کرٹ اور فلائیڈ کو سونپی گئی۔ کرٹ اپنے اس پروجیکٹ میں مصروف ہو گیا۔ میرے پاس کوئی خاص کام نہیں تھا۔ میں نے ایک ہفتہ کی چھٹی کی درخواست دے دی۔ اگر چھٹی منظور ہو گئی تو میرا افریقا جانے کا پروگرام تھا۔ تنزانیہ اور کینیا۔ میں شمالی افریقا یعنی مصر، تیونس اور مراکش جا چکا تھا مگر ''کالا'' افریقا نہ دیکھا تھا۔ چھٹی منظور ہو گئی۔

SAS کی پرواز جدہ سے تنزانیہ کے شہر دارالسلام جاتی تھی۔ SAS سعودیہ کے ملازمین کو 90 فیصد ڈسکاؤنٹ پر ٹکٹ جاری کرتی تھی۔ مجھے صرف دس فیصد کرایہ دینا تھا۔ یہ ٹکٹ سعودیہ کے دفتر سے ہی بن جاتے تھے۔ دو دن تنزانیہ سرنگیٹی پارک دیکھنے کے لیے پھر نیروبی، کینیا۔

جدہ ائرپورٹ پر میں نے SAS کے کاؤنٹر پر اپنا ٹکٹ پیش کیا۔ میرے ساتھ صرف ایک ہینڈ بیگ تھا۔ میں بورڈنگ کارڈ کا انتظار کر رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی ''انکل''۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک پیاری سی پاکٹ سائز گڑیا جیسی لڑکی کھڑی تھی۔ ''جی!'' میں نے جواب دیا۔

''انکل! آپ سعودیہ میں کام کرتے ہیں؟''

''جی بیٹا! میں سعودیہ میں کام کرتا ہوں۔''

اب کام کی بات۔ ''انکل! میں بھی سعودیہ میں کام کرتی ہوں میرا نام زینا پٹوا ہے میں تنزانیہ میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی ہوں۔ یہاں پر میں سعودیہ سٹی کے ائرہوسٹس کمپاؤنڈ میں رہتی ہوں۔'' پھر آمدم برسر مطلب۔ ''میں گھر جا رہی ہوں میرا ایک فالتو سوٹ کیس ہے، کیا آپ اس کو چیک ان کروا دیں گے آپ کے ساتھ کوئی سامان نہیں ہے۔''

یہ لمحۂ فکریہ تھا۔

دنیا بھر میں ایسے لاتعداد واقعات ہو چکے تھے جہاں پر بھولی بھالی معصوم گڑیاں اسمگلنگ کے سلسلے میں اپنے شکار کے حق میں زہر کی پڑیاں ثابت ہو چکی تھیں۔ خاص طور سے منشیات کی اسمگلنگ کے ضمن میں۔ جدہ سے منشیات یا اور دوسری چیزوں کا خطرہ تو نہ تھا لیکن سونا خوب اسمگل ہوتا تھا۔ جدہ میں سونے کے کاروبار پر یا لانے لے جانے پر کوئی پابندی نہ تھی لیکن دنیا کے تقریباً نوے فیصد ملکوں میں سونا لانے لے جانے پر پابندی ہے۔ میرے ایک ساتھی جلال صاحب خود اس کا شکار ہوتے ہوتے بچے تھے۔

جلال صاحب کے ایک قریبی دوست نے ان کو ایک کریم کی شیشی دی کہ یہ میری بیوی کو دے دیجیے گا۔ جلال صاحب نے شیشی لے لی پھر بعد میں سوچا کہ ایک معمولی کریم کی شیشی جدہ سے پاکستان کیوں بھیجی جا رہی ہے اس شک کی بنا پر انہوں نے شیشی کھول کر کریم کے اندر انگلی ڈالی تو وہ کسی سخت چیز سے ٹکرائی۔ یہ سخت چیز دس تولہ سونے کی ڈلی تھی۔

میں نے زینا سے (اصل میں یہ زینت ہے) پوچھا۔

''تمہارا باقی سامان کہاں ہے؟''

''وہ تو چیک ہو چکا میں اپنا بورڈنگ کارڈ لے چکی ہوں۔''

میں نے ایجنٹ سے کہا کہ ''سامان میں اپنے نام سے چیک نہیں کراؤں گا۔ اگر میرے ٹکٹ کے وزن کا الاؤنس استعمال کرتے ہوئے یہ سوٹ کیس زینت کے نام سے ہو سکتا ہے تو بے شک کر دیں۔ میرا اس سوٹ کیس سے کوئی تعلق نہیں

ہونا چاہیے۔''

سوٹ کیس چیک ان ہو گیا۔ میں زینت کے ساتھ پاسپورٹ پر ٹھپا لگوا کر لاؤنج میں چلا گیا۔

جہاز میں زینت کی سیٹ میری سیٹ سے تین چار قطار آگے تھی۔ آدھا سفر گزرا ہو گا کہ زینت نے مجھے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ اس کے برابر دو سیٹیں خالی تھیں میں وہاں بیٹھ گیا۔

''انکل آپ کے پاس کھلے ڈالر ہیں؟''

''ہیں مگر شاید بیس پچیس، میں سفر میں سیاحی چیک لے کر چلتا ہوں مگر کیوں؟''

''اس لیے کہ تنزانیہ میں ڈالر کی بہت قدر ہے۔ کھلے بازار میں ڈالر کے عوض آٹھ گنی دس گنی مقامی کرنسی ملتی ہے۔ آپ ٹیکسی والے کو بھی ڈالر دیجیے گا۔ سیاحی چیک میں آپ کو نقصان ہو گا۔'' یہ افریقا میں سفر کرنے کا پہلا سبق تھا۔

دارالسلام ائرپورٹ، پر زینت کے انتظار میں تنزانیہ کی ائر لائن کا ایک ملازم موجود تھا۔ اس نے میرا بھی پاسپورٹ لے لیا۔ امیگریشن کروایا۔ زینت کا سامان لیا اور ہال سے باہر آ گئے۔ زینت کو ائرپورٹ پر ہی رکنا تھا۔ ہم صبح کے وقت پہنچے تھے زینت کی فلائٹ سہ پہر کو تھی۔ میں زینت کو وہیں چھوڑ کر باہر آ گیا۔

مشرقی افریقا میں بہت سے لوگ غیر منقسم ہندوستان سے آ کر بس گئے تھے۔ اب یہ سب یہیں کے شہری ہیں۔ مجھے جو ٹیکسی والا ملا وہ بھی ایک سابقہ ہندوستانی نوجوان تھا۔

''آپ کرایہ ڈالر میں دیں گے یا مقامی کرنسی میں۔ ڈالر میں دیں گے تو دو ڈالر مقامی کرنسی میں جو رقم اس نے بتائی وہ تقریباً بیس ڈالر بنتی تھی۔''

''میں تم کو کرایہ ڈالر میں دوں گا۔ مجھے کسی صاف ستھرے ہوٹل پہنچا دو۔''

ٹیکسی کرنے سے پہلے میں ائرپورٹ کے مقامی بینک سے دو سو ڈالر کے عوض مقامی کرنسی لے چکا تھا۔ ہوٹل معقول تھا مگر وہاں کاؤنٹر پر ایک بورڈ لگا تھا۔ ''کرایہ پچیس ڈالر یومیہ ایڈوانس دینا ہو گا۔ صرف امریکی ڈالر لیے جاتے ہیں۔ مقامی کرنسی قبول نہیں کی جائے گی۔''

میں ڈالر دینے کے لیے تیار تھا لیکن میرے پاس سو ڈالر سے کم کا کوئی سیاحی چیک نہ تھا۔ ہوٹل والا مجھے بقایا پچھتر ڈالر مقامی کرنسی میں دے رہا تھا۔

میں نے سوٹ کیس اٹھایا اور باہر آ گیا کہ میں ''دارالسلام'' کی سلامتی کو خیر باد کہہ کر سیدھا سرنگیٹی پارک چلا جاؤں گا۔ سرنگیٹی کا ٹکٹ لیا۔ بس چار گھنٹے بعد جائے گی۔ میں شہر کے مرکز کی طرف چلا گیا۔ عجیب بے ہنگم شہر تھا ہر طرف گندگی، سلم ایک تاریکی سی چھائی ہوئی تھی میں نے سرنگیٹی کی سیر کو الوداع کہا اور تنزانیہ رکنے کی بجائے سیدھا نیروبی جانے کا پروگرام بنایا۔ سرنگیٹی کا ٹکٹ واپس کرنے گیا تو آدھے پیسے ملے۔ وجہ یہ کہ انہوں نے ٹکٹ مجھے بلیک میں دیا تھا۔

شہر کے بینک میں مقامی کرنسی کو ڈالر میں واپس بدلوانے گیا۔ انہوں نے انکار کر دیا کہ جہاں سے آپ نے ڈالر بدلوائے تھے وہیں سے واپس مل سکتے ہیں اور کوئی بینک نہیں دے سکتا۔

''تنزانیہ ائر لائن کے دفتر جا کر نیروبی کی سیٹ بک کروائی۔ ائرپورٹ کی راہ لی۔ ائرپورٹ پہنچ کر بینک گیا کہ مقامی کرنسی بدلوا لوں۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ وجہ ایک دفعہ بدلوائے گئے ڈالر واپس نہیں مل سکتے۔'' وہ مقامی کرنسی آج تک میرے پاس کہیں پڑی ہوئی ہے۔

چیک ان کاؤنٹر کی طرف بڑھا تو زینت دکھائی دی۔

''تمہاری فلائٹ ابھی تک نہیں گئی۔''

تاخیر ہو گئی ہے دو گھنٹے بعد جائے گی۔'' آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔'' زینت نے پوچھا۔

میں نے مختصر الفاظ میں اپنی کتھا سنائی۔ ''اب میں نیروبی جا رہا ہوں۔''

نیروبی پہنچ کر کھلی اور صاف فضا میں سانس لینے کا احساس ہوا۔ ایسٹ افریقا میں شاید کینیا ہی ایک ایسا ملک رہ گیا ہے جہاں پر سیاحوں کے لیے ہر طرح کی سہولیات موجود ہیں۔ سیاح یہاں پر بغیر ان خدشات کے کہ جو دوسرے افریقی ممالک ہیں سہولت کے ساتھ گھوم پھر سکتے ہیں۔

نیروبی کی پرواز کے دوران میں میرے برابر والی سیٹ پر ایک صاحب بیٹھے تھے جن کا نام ارجن تھا ان کا خاندان بھی برٹش انڈیا کے زمانے میں یوگنڈا میں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ عیدی امین نے جب یوگنڈا سے ایشیائی باشندوں کو نکالا ہے تو ارجن صاحب کا خاندان بھی متاثر ہوا لیکن بعد میں حالات کچھ بہتر ہو گئے۔ ارجن صاحب کا یوگنڈا کے شہر کمپالا میں ایک درمیانے درجے کا ہوٹل تھا۔ بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بیٹا ایک بیٹی تھی۔ ہندوستان میں بیٹی کی شادی کر کے واپس کمپالا جا رہے تھے۔ براستہ نیروبی۔

میں نے ارجن صاحب کو اپنا دارالسلام کا تجربہ بتایا۔ ان کا کہنا تھا کہ زیادہ تر سیاح افریقا کے متعلق بغیر ضروری معلومات حاصل کیے ہوئے افریقا پہنچ جاتے ہیں کہ یہ

سیاحوں کی جنت ہے۔" "ایسا نہیں ہے۔" انہوں نے کہا۔ "افریقا میں اب بہت کم ایسے ممالک ہیں جہاں سیاح بے خوف وخطر سفر کرسکیں۔ خطرات کے علاوہ سیاحوں کی سہولیات کا بھی فقدان ہے۔" "آپ نے اچھا کیا کہ نیروبی آگئے۔ اب ایسٹ افریقا میں صرف کینیا ہی ایسا ملک ہے جہاں سیاحت کی ہر طرح کی سہولتیں میسر ہیں۔ پھر خبردار کیا۔" اندھیرے کے بعد نیروبی کی تاریک گلیوں کی طرف مت جائیے گا۔ وہاں لوگ لوٹ لیے جاتے ہیں۔ بڑی اور روشن سڑکوں پر یہ خطرات نہیں ہوتے۔"

ارجن صاحب نے مجھے اپنا کارڈ دیا اور ایک ہوٹل کا پتا بتایا۔ "آپ وہاں جاکر موہن صاحب سے میرا حوالہ دے کر بات کرلیجیے گا۔ وہ آپ کی سفاری کا بھی بندوبست کردیں گے۔ سفاری افریقا گھومنے کا بہترین طریقہ ہے۔ درندوں کے زیادہ نزدیک مت جایئے گا۔" ہدایت نامہ ختم ہوا۔

موہن صاحب گرمجوشی سے ملے۔ اپنے ایک جاننے والے ٹریول ایجنٹ کو فون کرکے سفاری کا بھی بندوبست کردیا۔ یہ سفاری پانچ یا چھ جگہ جاتی تھی میرے پاس اتنا وقت نہ تھا طے یہ ہوا کہ تین جگہ دیکھنے کے بعد میں موombاسہ میں ان سے جدا ہوجاؤں گا۔ وہاں سے نیروبی واپسی میرا اپنا ذمہ ہوگا۔ جن تین جگہوں پر ہم گئے ان کے نام مجھے یاد نہیں۔ زندگی میں کبھی حالاتِ زندگی لکھنے کی نوبت آئے گی یہ سوچا بھی نہ تھا۔ کبھی کوئی ڈائری یا اور کوئی یادداشت والی چیز کے لوازمات محفوظ نہیں کیے۔ جو کچھ ذہن میں محفوظ رہ گیا ہے رقم کردیتا ہوں۔ غلطیوں کا اور غلط یادداشت کا خطرہ رہتا ہے۔

رات کا کھانا کھانے کمرے سے باہر آیا تو موہن صاحب نے کہا۔ "کھانا آپ یہیں کھالیں نزدیک میں کوئی معقول ریسٹورنٹ نہیں ہے۔ رات کے وقت زیادہ دور اکیلے پیدل جانا مناسب نہیں ہوگا۔ کھانے کے بعد اگر آپ باہر جانا چاہیں تو مین روڈ پر رہیے گا زیادہ دور نہ جایئے گا۔ سامنے ایک بار ہے۔ وہاں افریقی دھنوں پر ڈانس ہوتا ہے۔ غیر ملکی شراب کے ساتھ دیسی شراب بھی ملتی ہے۔ اچھی جگہ ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا دیسی شراب کے ساتھ دیسی کوکا کولا بھی ملتی ہے۔" جواب ملا۔ "کیوں نہیں۔"

مجھے مختلف ملکوں کی موسیقی سننے کا شوق ہے۔ میں جس زمانے میں کینیڈا میں منٹز (Muntz) کمپنی میں کام کرتا تھا۔ وہاں پر کئی ملکوں کی موسیقی کے کیسٹ اور 8 ٹریک (یہ ایک طرح کے کیسٹ ہوتے تھے جو کینیڈا اور امریکا میں استعمال ہوتے تھے) بکا کرتے تھے۔ میرے پاس ان کا اچھا خاصہ ذخیرہ جمع ہوگیا تھا۔ ہر ملک کی موسیقی کا اپنا لطف ہے۔ سوائے اوپیرا کے کہ جس کو سمجھنا کار دارد ہے۔ سننے کے بعد کان کئی دن تک جھنجھناتے رہتے ہیں۔

افریقی موسیقی کا سماں بندھ گیا۔ ہوٹل واپسی آدھی رات کے بعد ہوئی۔ کل سفاری پر جانا تھا۔ سفاری پر جانے والی گاڑی صبح ہوٹل پہنچ چکی تھی۔ یہ ایک مائیکروبس تھی جس کی چھت کے بیچ کے حصے کو کاٹ کر اس کو لوہے کے ڈنڈوں پر اس

فالتو پوڈ Pod

ہوائی جہاز کے انجن اس کے پروں پر جہاں نصب کیے جاتے ہیں وہ جگہ پوڈ کہلاتی ہے۔ ہر انجن کا الگ الگ پوڈ ہوتا ہے۔ بوئنگ 747 میں چار انجن ہوتے ہیں ہر انجن کا اپنا الگ الگ پوڈ ہوتا ہے۔ اس طرح 747 میں کل چار پوڈ ہوتے ہیں۔ جہاز کے انجن بہت بھاری ہوتے ہیں۔ 747 کے ایک انجن کا وزن کئی ہزار کلوگرام ہوتا ہے۔ یہ بھاری بھرکم انجن جب جہاز پر نصب نہ ہو تو اس کو اس کے اپنے انجن اسٹینڈ پر رکھا جاتا ہے۔ انجن اسٹینڈ بہت بڑے اور بہت وزنی ہوتے ہیں۔ اگر فالتو (اسپیئر) انجن کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ہو مثلاً جب انجن کو مرمت کے لیے بھیجنا ہو تو انجن اپنے اسٹینڈ پر لاد کر بھیجا جاتا ہے۔ اگر یہ مرمت دوسرے شہر میں ہو تو بڑے ٹرک استعمال کیے جاسکتے ہیں اور اگر ملک سے باہر کروانی ہو تو انجن اور اسٹینڈ کو مال بردار ہوائی جہاز سے لے جایا جاتا ہے لیکن ایک طریقہ ہے جس کے استعمال سے انجن کو اس کے اسٹینڈ سے نجات دلائی جاسکتی ہے۔ مال بردار جہاز کی زحمت سے بچا جاسکتا ہے۔ اس طریقے کو استعمال کرنے کے لیے جہاز کے پر (ونگ) میں ایک فالتو پوڈ بنایا جاسکتا ہے جس کی قیمت ائرلائن کو الگ سے ادا کرنی پڑتی ہے مگر اس کا فائدہ یہ ہے کہ انجن اور اسٹینڈ کو مال بردار جہاز میں لاد کر بھیجنے کی بجائے اس کو فالتو پوڈ میں لگا کر بھیجا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مال بردار جہاز کے کرائے کی بچت بھی ہو جاتی ہے اور مال بردار جہاز کی پرواز کا انتظار بھی نہیں کرنا پڑتا، ایک پنتھ دو کاج۔

طرح جوڑا جاتا ہے کہ جب اس کو دھکا دیا جائے تو چھت کا یہ حصہ ڈیڑھ دو فٹ اوپر اٹھ جاتا ہے اور سفاری کے سیاح کھڑے ہو کر چھت کے چاروں طرف سے منظر دیکھ سکتے ہیں۔ اگر گاڑی سے باہر نکل کر دیکھیں تو اس میں درندوں کے حملے کا خطرہ ہوسکتا ہے۔

ہماری گاڑی میں ڈرائیور کے علاوہ کل چھ افراد تھے سب سعودی عرب سے آئے تھے۔ میرے علاوہ تین انگریز نرسیں تھیں جو ریاض کے اسپتال میں کام کرتی تھیں اور دو بھائی تھے۔ ان میں سے ایک، دسویں جماعت کا طالب علم تھا اور دوسرا بھائی نویں جماعت کا۔ یہ دونوں پاکستانی تھے۔

سفاری عام سفاریوں کی طرح تھی۔ مخصوص مقامات تھے جہاں مختلف جانور رہتے تھے لوگ ان کو شوق اور تجسس سے دیکھ رہے تھے۔ کراچی کے گاندھی گارڈن میں اور سفاری میں فرق یہ تھا کہ وہاں جانور پنجرے میں ہوتے ہیں اور لوگ آزاد۔ سفاری میں آدمی قید تھے اور جانور آزاد۔

افریقا کے راستے کے جنگلوں کے مناظر دلکش تھے۔ مجھے جانوروں سے زیادہ ان میں دلچسپی تھی۔

راستے میں ایک جگہ ڈرائیور نے گاڑی روکی۔ سڑک کے کافی نیچے دریا بہہ رہا تھا۔ ”یہاں پر کبھی کبھی مگرمچھ آتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”شاید ہماری قسمت آج اچھی ہو۔“ قسمت اچھی تھی ڈرائیور نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ ”وہاں دیکھو ادھر۔“ دونوں لڑکے دوڑ کر ادھر گئے۔ ان کی آواز سن کر مگرمچھ نے پانی میں ڈبکی لگا دی۔ سب کو بہت افسوس ہوا سوائے میرے۔ اس کی تین وجوہات تھیں ایک، تو یہ کہ میں تھائی لینڈ میں ایک سے زیادہ دفعہ ہر سائز کے مگرمچھ کے فارم پر بہت نزدیک سے دیکھ چکا تھا۔ دوسرے یہ کہ اگر کراچی میں مگرمچھ دیکھنے کا شوق ہو تو منگھو پیر دور نہیں اور تیسری اور سب سے اہم وجہ کہ پاکستان کے سیاسی اکھاڑے میں ایسے ایسے مگرمچھ ہیں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا مگرمچھ ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یہ مگرمچھ عوام کی دولت کو ہڑپ کرتے رہتے ہیں اور مگرمچھ کے آنسو بہاتے رہتے ہیں۔ ان مگرمچھوں کی ایک خصوصیت اور بھی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو حتمی اور یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہ کروڑ عوام کیا چاہتے ہیں۔ صرف ایک عوام ہی بے چارے ہیں کہ جن کو نہیں معلوم کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

اگلے دن دوسری سفاری پر جانا تھا۔ اس سفاری میں دن سے زیادہ رات اہم تھی۔ ہوٹل کے پچھواڑے بہت بڑا ورانڈہ تھا۔ یہاں پر مہمانوں کے لیے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ لائٹیں ہر طرف کی بجھا دی گئی تھیں۔ ورانڈے سے کئی سو گز کے فاصلے پر دو بڑی سرچ لائٹیں لگی ہوئی تھیں جن کی روشنی دریا میں اس جگہ پڑتی تھی جہاں جانور پانی پینے آتے تھے۔ مکمل تاریکی کے باعث ماحول پُراسرار اور حسین ہوگیا تھا۔ جانور اپنے اپنے وقت پر اور اپنے اپنے گھاٹ پر پانی پینے آتے۔ لگتا تھا اس معاملے میں انہوں نے کوئی ان کہا معاہدہ کر رکھا تھا کہ صرف اپنے وقت پر اور صرف اپنے گھاٹ پر پانی پیئں گے۔ مجھے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان پانی کی تقسیم کا معاہدہ یاد آگیا۔ کیا ہم ان جانوروں سے بھی گئے گزرے ہیں۔

چوتھے دن سفاری پر جاتے ہوئے ڈرائیور نے مجھے موم باسہ کے ہوٹل پر اتار دیا۔ باقی لوگ آگے بڑھ گئے۔ ہوٹل سمندر کے کنارے تھا۔ سفید چمکیلی ریت ہوٹل کی سفید عمارت اور سینکڑوں ناریل کے درخت دلفریب منظر پیش کررہے تھے۔

میں نے سامان کمرے میں رکھا۔ پچھلے تین دن کے دوران سارے کپڑے میلے ہوچکے تھے ان کو دھلوانا تھا۔ میں نے ریسپشن فون کرکے لڑکے کو بلوایا۔ ”مجھے یہ کپڑے ارجنٹ دھلوادو شام تک مل جائیں۔“

”شام تک ملنا مشکل ہے۔ کیا میں خود ان کو دھو دوں۔“

”دھو دو مگر صاف پانی استعمال کرنا۔ میں نیچے کھانا کھانے جارہا ہوں۔ تم کمرا بند کردینا۔“ میں نیچے کھانا کھانے چلا گیا۔

واپس کمرے میں آیا تو میری قمیصیں دھل چکی تھیں۔

”صاف پانی سے دھویا۔“ میں نے اس سے پوچھا۔ جواب ملا۔ ”جی بالکل۔“ پھر اس نے کموڈ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسی میں دھوئے ہیں پانی بالکل صاف تھا۔“

”ارے کمبخت! اس نجس پانی سے دھوئے ہیں اور کہتا ہے صاف ہے۔“ میں اس پر برس پڑا۔

اس کا جواب تھا کہ میرا ناراض ہونا غلط تھا۔ ”آپ نے صاف پانی کہا تھا میں نے صاف پانی استعمال کیا ہے۔ گندہ مٹی والا پانی تو لانڈری والے استعمال کرتے ہیں جو وہ نالہ سے لیتے ہیں جس میں مٹی بھری ہوتی ہے۔ یہ پانی اس سے بہت زیادہ صاف ہے۔“ میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ میں نے کہا۔ ”تم بھی دفع ہوجاؤ اور یہ قمیصیں بھی ساتھ لے جاؤ۔“ اس کا اب بھی اصرار تھا کہ پورے موم باسہ میں اس سے زیادہ صاف پانی نہیں مل سکتا۔

بس دو دن گزار کر نیروبی آ گیا۔

☆......☆

میرے ملک ملک پھرنے کے تجربے نے مجھے یہ بتایا تھا کہ کسی شہر یا ملک کو دیکھنے کے دو طریقے ہیں یا تو پیکیج ٹور لے لیا جائے، یا پھر وہاں کے عام شہری کی طرح بسوں پر اور پیدل گھوما جائے۔ مجھے مختلف ممالک کے لوگوں کے طرزِ زندگی اور رہن سہن دیکھنے کا شوق ہے۔ میں ہر جگہ پیدل بہت گھومتا ہوں۔ ویسے تو پیدل گھومنے کے لیے، میرا پسندیدہ شہر پیرس اور سب سے زیادہ ناپسندیدہ لندن ہے۔

نیروبی آ کر میں اسی طرز پر گھومنے نکل گیا۔ ایک محلّہ میں پہنچا تو وہاں ایک نوجوان سے ملاقات ہوگئی۔ ''کیا آپ سیاحت کے لیے آئے ہیں۔'' اس نے پوچھا پھر اپنی خدمات پیش کیں۔ ''میں آپ کو گھما سکتا ہوں۔'' گھمانے کے ویسے تو کئی خطرناک معنی بھی ہو سکتے ہیں لیکن یہ لڑکا دیکھنے میں ٹھیک لگ رہا تھا۔ وہ مجھے گلیوں میں گھماتا رہا اور وہاں کے لوگوں کی باتیں بتاتا رہا۔ پھر ایک چار دیواری کے پاس جا کر رک گیا۔

''کیا آپ ہمارے یہاں کے روایتی رقص دیکھنا پسند کریں گے؟'' میں سوچ میں پڑ گیا اس لیے کہ میں مومباسہ میں ایک کئی گھنٹے کا شو دیکھ چکا تھا۔ پھر میں نے اس سے تفصیل پوچھی۔ اس نے چار دیواری کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے اندر انتظام ہے آپ چاہیں تو رقص کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ پندرہ بیس منٹ لگیں گے۔ یہیں کے مقامی لڑکے لڑکیاں رقص کریں گے۔ ان کو جمع کرنے کا وقت چاہیے وہ لوگ تیاری میں لگ گئے۔ میں اس لڑکے کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ راستے میں چند بہت بڑے بڑے درخت دکھائی دیے۔ اس میں کچھ عجیب طرح کے چھوٹے چھوٹے پھل لٹک رہے تھے۔ ''یہ کیا ہے؟''

''جی یہ کاجو کے درخت ہیں۔ توڑوں، آپ کھائیں گے۔'' میں نے منع کر دیا نا معلوم کیوں میرا خیال تھا کہ کاجو چھوٹے پودوں پر لگتے ہوں گے مگر یہ درخت تو امرود کے بڑے درختوں سے بھی زیادہ بڑے تھے۔ کاجو سری لنکا میں بھی بہت ہوتا ہے۔ وہ لوگ اس کو کجو پکارتے ہیں۔ کئی سال بعد جب میں اور موسیٰ نوریلیا میں، چائے کے باغات گھومنے جا رہے تھے تو راستے میں ایک چھوٹا شہر پڑتا تھا جس کا نام تھا، ''کجو گمبا'' وہاں سڑک پر لڑکے لڑکیاں کاجو بیچ رہے تھے جو وہاں کی مقامی پیداوار تھی۔

آدھے گھنٹے بعد واپس آئے تو رقص کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ افریقی ڈھول پیٹے جا رہے تھے۔ رقاصوں نے کمال کے فن کا مظاہرہ کیا۔ ایک گھنٹا لگتا تھا پانچ منٹ میں گزر گیا۔ ان لوگوں نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ میں ان کا مہمان تھا وہ مہمانوں سے پیسے نہیں لے سکتے تھے۔ لڑکے نے بھی پیسے نہ لیے۔ مہمان سے پیسے لینا بےعزتی کی بات تھی۔ میں شرمندہ ہو رہا تھا۔

☆......☆

کل رات میں نیروبی سے واپس جدہ آ چکا تھا۔ اپنے دفتر میں امانڈو کو اپنے افریقا کے سفر کی روئیداد سنا رہا تھا کہ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ''میرے دفتر میں آجاؤ۔'' یہ کرٹ کی آواز تھی۔ میں اپنی افریقا کی داستان ادھوری چھوڑ کر کرٹ کے دفتر کی طرف چل پڑا۔

''افریقا کیسا تھا؟'' کرٹ نے پوچھا۔

''ویسا ہی جیسا تم چھوڑ کر آئے تھے۔'' کرٹ سعودیہ آنے سے پہلے چند سال ایتھوپیا کی ائرلائن میں نوکری کر چکا تھا۔ اکثر وہاں کے قصے سنایا کرتا تھا۔

''تمہاری عیاشی کا ہفتہ ختم ہو چکا۔ اب اپنا رزق حلال کرو۔'' کرٹ کو سعودی عرب آ کر رزق حلال اور حرام سے آشنائی ہو چکی تھی۔

''میں نے پچھلے چار پانچ سال میں خوب رزق حلال کمایا ہے اب میرا حق بنتا ہے کہ میں اپنی باقی زندگی عیش کرنے میں گزار دوں۔'' میں نے کرٹ کو جواب دیا۔

کرٹ نے ایک آرگنائزیشن چارٹ (Organigation Chart) میرے آگے کر دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے چارٹ تھامتے ہوئے پوچھا۔

''یہ انجینئرنگ اور کوالٹی کا نیا سیٹ اپ ہے۔ تمہارا شعبہ بند کر دیا جائے گا۔ تمہارے ماتحت کام کرنے والے انجینئر فلائیڈ کے پاس چلے جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے لیکن میرا کیا بنے گا؟''

''تم میرے ساتھ کوالٹی کے شعبے میں چلو گے۔ مجھے کوالٹی ایشورنس کا ڈائریکٹر بنایا جا رہا ہے تم منیجر کوالٹی ایشورنس ہو گے۔''

''لیکن......!'' میں نے احتجاج کیا مجھے تو ایشورنس کی الف بے کا بھی پتا نہیں ہے۔''

''تم کو مواصفات اور کنٹریکٹ کی الف ب کا پتا تھا؟'' کرٹ نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے کرٹ کو جواب دیا۔

''اب ہے؟'' اس نے جواباً پوچھا۔ ''ہاں ہے۔'' میں

نے اقرار کیا۔
”تو کوالٹی ایشورنس کا بھی ہو جائے گا کیس کلوزڈ۔“ میں نے اپنا ہاتھ اس۔کے سامنے بڑھا دیا۔”ہیل ہٹلر۔“ پھر ہنستا ہوا اپنے دفتر واپس آ گیا۔ کرٹ جرمن نژاد تھا۔

کرٹ اور فلائیڈ کا بنایا ہوا ٹیکنیکل ڈویژن کا نیا چارٹ جب منظوری کے لیے عرنان وباغ وی پی ٹیکنیکل کے پاس گیا تو اور سب تو منظور ہو گیا سوائے میرے مینیجر کوالٹی ایشورنس بنانے کے۔ اب میرے پاس تین راستے تھے۔ فلائیڈ کے ساتھ بحیثیت ماسٹر انجینئر کام کروں یا کینیڈا واپس چلا جاؤں یا پاکستان واپس چلا جاؤں۔ میں نے پاکستان واپس جانے کا سوچ لیا لیکن جس خالق نے انسان کو بنایا ہے اس۔نے اس انسان کے رزق کا بندوبست بھی فرمایا ہے۔ جیری جو پچھلے تین سال سے بحیثیت مینیجر ٹیکنیکل کنٹریکٹ کام کر رہا تھا اس نے استعفیٰ دے دیا۔ یہ عہدہ مجھے سونپ دیا گیا۔

میں نے جب جیری کا کام سنبھالا تو اس نے کہا۔”یہ کام میں نے تم سے ہی لیا تھا اب واپس تم ہی کو سونپ رہا ہوں۔ یہ تم ہی کو مبارک ہو۔ میں مہذب دنیا میں واپس جا رہا ہوں۔“ یہ اس کی ناشکری تھی۔

سعودی عرب میں رہنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا تھا کہ زیادہ تر گورے سعودی عرب۔کے ناشکرے تھے۔ وہ اسی دھرتی سے اپنا رزق کماتے تھے اور اس سرزمین کو اور اس کے باشندوں کو پس ماندہ اور نیم تہذیب یافتہ گردانتے تھے۔ ان کا مذاق اڑاتے تھے لیکن جیری اس مہذب دنیا میں صرف دو سال گزارنے کے بعد سعودی عرب واپس آ چکا تھا اور میرے سامنے 2005ء تک ریاض سعودی عرب میں ملازمت کر رہا تھا۔

سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ سعودیہ کے رولس رائس کے RB-211 انجنوں کی مرمت اور اوورہال کا کنٹریکٹ برٹش ائرویز (BA) کے پاس تھا۔ یہ بہت بڑا کنٹریکٹ تھا اور ہر تین مہینے بعد اس کی کارکردگی کا جائزہ میٹنگ ہوا کرتی تھی۔ یک سہ ماہی جدہ میں اور ایک سہ ماہی لندن میں۔ میرے مینیجر کنٹریکٹ بننے کے چار دن بعد ہی یہ میٹنگ جدہ میں منعقد ہونے والی تھی۔ اس کے لیے میری معلومات اور تیاری فرے بھی کم تھی۔ اس سے پہلے یہ میٹنگ کرٹ کے ماتحت اکرتی تھی کین ہارمن کرٹ۔کے ساتھ ہوتا تھا وہ انجن کا ماہر ۔اب یہ میٹنگ مجھے سنبھالنی تھی۔

BA (برٹش ائرویز) کی میٹنگ میں میری کارکردگی کا ازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ میٹنگ ختم ہونے کے اگلے روز کین (Ken) میرے دفتر میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹی سی کتاب تھی اور ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ ”حسن تم کو اس کتاب کو پڑھنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد تم کو معلوم ہو جائے گا کہ جہاز کا انجن کیا چیز ہوتی ہے اور اس کی مرمت کیسے کی جاتی ہے۔“ میں نے کتاب لے لی اور کین کا شکریہ ادا کیا۔ اگلی میٹنگ تین مہینے بعد لندن میں ہونی تھی۔ لندن کی میٹنگ کے لیے میں ہر طرح سے تیار تھا۔ اس میٹنگ کے بعد کین کو مجھے ایک اور کتاب دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

BA کے کنٹریکٹ کی آخری میٹنگ جدہ میں منعقد ہوئی تھی۔ میٹنگ کے اختتام پر BA کے وفد کے ارکان کو ہوٹل واپس پہنچانا میری ذمہ داری ٹھہری۔ میں راستہ بھٹکنے میں ماہر ہوں۔ اگر راستے بھٹکنے کا کوئی عالمی گولڈ میڈل ہوتا تو وہ یقیناً مجھے مل چکا ہوتا۔ افسوس کہ ایسا کوئی عالمی انعام نہیں ہے۔ گنیز ورلڈ ریکارڈ والے بھی اس طرف توجہ دے سکتے ہیں۔ BA کے وفد کو مجھے جس ہوٹل میں چھوڑنا تھا وہ کورنیش.....ساحل سمندر..... پر بنایا گیا تھا۔ وہاں پہنچنے کے لیے مین روڈ سے ایک موڑ سروس روڈ پر لینا پڑتا تھا۔ اس موڑ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب میں کورنش کے آخری سرے کے قریب پہنچ گیا تو مجھے یقین ہو چکا تھا کہ میں ایک دفعہ پھر بھٹک چکا ہوں۔ اپنی خفت پر پردہ ڈالنے کے لیے میں نے گاڑی کو روک کر BA کے وفد کے قائد کو مخاطب کیا۔

”آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہوٹل پہنچنے کا سب سے آسان اور سب سے پہلے پہنچانے والا طریقہ کون سا ہے؟“

وہ بے چارہ حیران ہوا پھر نفی میں سر ہلایا۔ میں نے اس کو طریقہ سمجھایا۔

”سب سے پہلے آپ ہوٹل کے جائے وقوع سے تین کلومیٹر آگے نکل آئیں۔ پھر گاڑی روک کر غور کریں پھر یوٹرن لے کر دوبارہ ہوٹل تلاش کریں۔“ وہ لوگ ہنسنے لگے میں نے گاڑی واپس موڑلی۔

اس طریق کار کو سننے کے بعد آپس کا حجاب ٹوٹ چکا تھا۔ BA کے ایک مندوب نے مجھے ایک لطیفہ سنایا۔ کہنے لگا۔”ایک دفعہ ایک فرانسیسی، ایک امریکی، ایک روسی اور ایک پاکستانی ایک ہوائی جہاز میں دنیا کے گرد چکر لگانے نکلے۔“ فرانسیسی نے جہاز کے باہر ہاتھ نکالا پھر کہا۔”میرا ملک آ گیا۔ لوگوں نے پوچھا تم کو کیسے پتا چلا تو اس نے جواب دیا۔”میں نے ایفل ٹاور کو چھوا۔ پھر اسی طرح روسی نے ہاتھ باہر نکال کر

کہا یہ میرا ملک آ گیا۔ میں نے ریڈ اسلوئر کو چھوا۔ اس کے بعد امریکی نے کہا کہ میرا ملک آ گیا میں نے ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کو چھوا آخر میں پاکستانی کی باری تھی اس نے ہاتھ باہر نکال کر کہا۔ ''میرا ملک آ گیا'' جب لوگوں نے پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ ''کسی نے میرے ہاتھ سے میری گھڑی اتار لی۔'' سب لوگ ہنسنے لگے میں شرمندہ ہو رہا تھا۔ اب تک میں ایسے لطیفے سعودی عرب میں مقیم لوگوں سے سنتا تھا لیکن آج لندن کا باسی مجھے ایسے لطیفے سنا رہا تھا۔ ہماری ایمانداری کے چرچے ہر جگہ سنے جاسکتے ہیں۔ ہم کو کیسے کوئی گرائے گا؟

ہم نے خود کو گرا لیا ہے وہاں گرنے والے جہاں سنبھلتے ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی سعودیہ کے تمام انجن مرمت کے لیے باہر بھیجے جاتے تھے۔ بوئنگ B-737 کے انجن ماڈل (JT8D) ایک فرانسیسی کمپنی Snecma میں مرمت ہوتے تھے۔ پھر جب یہ کنٹریکٹ اسکما (Snecma) سے ختم ہوا تو یہ جرمن ائرلائن لفت ہنسا کو دے دیا گیا۔ لفت ہنسا کے کنٹریکٹ میں ایک گارنٹی یہ بھی تھی کہ سعودیہ کے JT8D انجن کی مرمت کا سالانہ خرچا ایک خاص حد سے تجاوز نہیں کرے گا اور اگر کرتا ہے تو لفت ہنسا اضافی خرچا سعودیہ کو واپس کرے گی۔ سال کے اختتام پر حساب لگایا کہ اس سال کا خرچا اس حد سے تجاوز کر چکا تھا۔ سعودیہ نے اپنا مطالبہ لفت ہنسا کو بھجوا دیا کہ اضافی پیسے سعودیہ کو واپس کیے جائیں۔ لفت ہنسا نے جواب دیا کہ یہ حساب کتاب ہر سال نہیں ہوگا بلکہ جب یہ کنٹریکٹ ختم ہوگا اس وقت یہ حساب کیا جائے گا۔ عدنان نے مجھے اپنے دفتر بلایا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ یہ حساب کنٹریکٹ کی مدت ختم ہونے کے بعد ہوگا۔''

''یہ بات کنٹریکٹ میں مبہم ہے واضح نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے تم لفت ہنسا کو لکھ دو کہ نوٹس کی مدت ختم ہونے پر یہ کنٹریکٹ ختم کر دیا جائے گا۔'' نوٹس کی مدت 60 دن یا 90 دن تھی۔ اگلے ہفتے لفت ہنسا کی ٹیم جدہ میں موجود تھی۔ معاملات مل جل کر طے کر لیے گئے۔ لفت ہنسا یہ کنٹریکٹ نہیں کھونا چاہتی تھی۔ عدنان کو ایسے فیصلے کرنے میں ملکہ حاصل تھا۔

جب سعودیہ نے ائربس A-300 کے لیے پریٹ اینڈ وٹنی کے JT9 انجن خریدے ہیں تو اس میں پریٹ نے ایک ذمہ داری لی تھی کہ اگر ایسی صورتِ حال پیش آئے کہ سعودیہ کے تمام اسپیئر انجن یا تو زیرِ مرمت ہوں یا قابلِ پرواز نہ ہوں اور سعودیہ زیرِ داسپیئر سے دوچار ہو تو پریٹ سعودیہ کو تیس دن کے لیے مفت لیز انجن فراہم کرے گی۔ تیس دن کے اختتام پر یا سعودیہ کے اپنے ایک یا زیادہ انجن قابلِ پرواز ہو جانے پر جو بھی پہلے وقوع پذیر ہو۔ سعودیہ یہ انجن پریٹ کو واپس کر دے گی۔

اتفاق سے ایک ایسا وقت آ گیا کہ سعودیہ کے پاس ایک بھی قابلِ پرواز اسپیئر انجن نہیں تھا۔ پریٹ نے اپنی ذمہ داری نباتے ہوئے سعودیہ کو ایک لیز انجن فراہم کر دیا۔ تیس دن گزر گئے مگر سعودیہ کا اپنا ایک بھی اسپیئر انجن قابلِ پرواز نہیں بنایا جاسکا۔ آج لیز انجن پریٹ کو واپس کرنا تھا۔ عدنان نے مجھے بلایا۔ ''انجن لیز کرنے کی کیا کیا شرائط ہیں۔'' عدنان نے دریافت کیا۔

''تیس دن کے بعد یہ انجن قابلِ پرواز حالت میں پریٹ کو سعودیہ کے خرچے پر واپس کر دیا جائے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

عدنان نے انجن شاپ کے مینیجر کو مخاطب کیا۔ ''انجن کو نا قابلِ پرواز بنا دو۔'' یہ انجن اس وقت تک نا قابلِ پرواز رہا جب تک سعودیہ کا اپنا ایک انجن قابلِ پرواز نہیں بنا لیا گیا۔

B-737 کے JT8D انجن کا کنٹریکٹ لفت ہنسا سے ختم ہو چکا تھا۔ اب یہ کنٹریکٹ ائرکینیڈا کو دے دیا گیا تھا۔ کین ہارمن اور میں میرے دفتر میں JT8D انجن کی اگلی سہ ماہی میٹنگ کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ میٹنگ مانٹریال میں ائرکینیڈا کے ساتھ ہونے والی تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے عدنان کی آواز آئی۔ ''میں ایک انجن کی مرمت کا کنٹریکٹ بھیج رہا ہوں۔ اس کا تجزیہ کر کے مجھے چھٹی سے پہلے بھجوا دینا۔'' پھر مزید ہدایت۔ ''ایک ضروری بات سب اعداد و شمار پینسل سے لکھنا صرف ایک کاپی بنانا۔''

''حاضر حضور۔''

عدنان کا سیکریٹری کنٹریکٹ میرے دفتر پہنچا گیا۔ عدنان سعودیہ کے VP ٹیکنیکل تھے۔ یہ کنٹریکٹ ایک یورپی ائرلائن اور یمن ائرویز کے درمیان تھا۔

یمن کے باشندوں کو سعودی عرب میں خاص مراعات حاصل تھیں جو کسی اور قومیت کے باشندوں کو حاصل نہ تھیں۔ ان کو کام کرنے کی آزادی تھی اور کاروبار کرنے کے لیے کفیل کی شرط بھی نہ تھی۔

(جاری ہے)

عیارِ اعظم

سید احتشام

جرم کی تاریخ جتنی پرانی ہے اتنی ہی اقسام ہیں مجرموں کی۔ایسے ایسے مجرم گزرے ہیں کہ ان کے بارے میں پڑھ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سفّاک ہی نہیں عیاری و مکاری میں بھی بعض مجرم منفرد نظر آتے ہیں۔ زیرِ نظر مجرم بھی ایک ایسا ہی شخص تھا۔ اس نے آدھے یورپ کو دہلا دیا تھا۔ عیاری کی ایسی ایسی چالیں چلتا تھا کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔
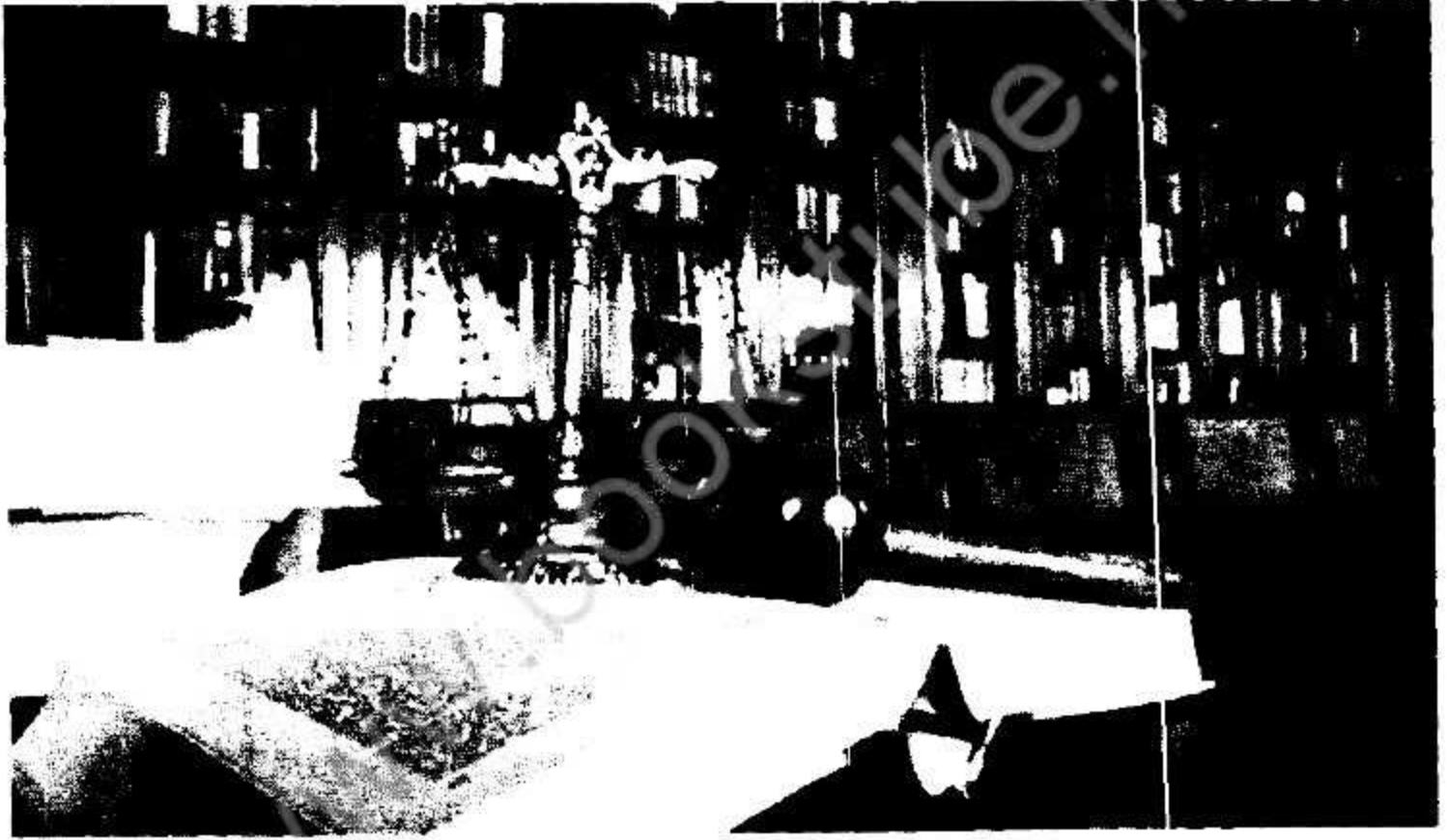
عالمی پیمانے پر مشہور مجرم کی عیاری کا قصہ

جرائم کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود انسان کی تاریخ اور یہ تاریخ ایک سے بڑھ کر ایک عیار اور شاطر مجرموں سے بھری پڑی ہے لیکن تمام ماہر جرائم اس بات پر متفق ہیں کہ جرائم کی پوری تاریخ میں وکٹر لسٹیگ Victor Lustig جیسا مکار مجرم پیدا نہیں ہوا۔ وہ قانون سے بچ نکلنے کے بے مثال ہتھکنڈوں سے پوری طرح لیس تھا۔ اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ چھیالیس مرتبہ گرفتار ہوا اور ایک مرتبہ بھی اسے مجرم ثابت نہیں کیا

جاسکا۔

ان دنوں میں یعنی جیمز ایف جانسن ...... یو ایس سیکرٹ سروس کا ایک ایجنٹ ہوا کرتا تھا۔ مجھے اس کیس میں ایک مرکزی کردار ادا کرنا پڑا جس نے بالآخر اس ماسٹر کرنس کو قانون کے شکنجے میں جکڑ کر انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔

وہ گرگ دیدہ شخص جو خود کو کاؤنٹ وکٹر لسٹیگ کہتا تھا قانون کو چکر دینے کی عیارانہ صلاحیتوں سے مالا مال تھا۔ اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ اس کا اصلی نام تھا یا نقلی کیوں کہ اس کے علاوہ اس کی دیگر تیئس عرفیت تھیں۔ وہ کسی تو یمی فسوں کاری سے حرکت کرتا اور نہایت سفاکی سے شکار پر شکار کیے چلا جاتا۔ وہ یو ایس سیکرٹ سروس ہی تھی جو بالآخر اسے ہمیشہ کے لیے سلاخوں کے پیچھے بھیجنے میں کامیاب ہوئی۔ اسے سینتالیسویں مرتبہ گرفتار کر کے کیفر کردار تک پہنچانے میں میرا تعاون شامل تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس فیصلہ کن اور ناقابلِ فراموش آپریشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہمیں انتھک محنت کرنی پڑی تھی۔ اس کی زبانی سنی باتوں کو اپنے انداز میں پیش کر رہا ہوں۔

☆☆☆

وہ مے پرستوں اور بادہ خواروں کی ایک پُرشور اور ہنگامہ خیز مخلوط پارٹی تھی۔ مستیاں اور رنگینیاں شباب پر تھیں۔ جام سے جام اور بدن سے بدن ٹکرا رہے تھے۔ فضا سگریٹ کے مرغولوں سے کثیف ہو رہی تھی۔ شرکاء کے ہجوم میں ایک درجن سے زائد نوخیز اور پُرشباب حسینائیں فلمسازوں کو لبھانے اور رجھانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھیں تاکہ انہیں کسی فلم میں ہیروئن کا چانس مل جائے۔ یہ ہالی ووڈ کی روایتی محفل تھی جس میں شوخ و شنگ حسینائیں پینے والوں کو نظروں سے بھی پلا رہی تھیں۔

تمام شرکائے محفل میں ایک شخص ایسا تھا جو سب سے جدا اور بالکل منفرد نظر آ رہا تھا۔ وجیہہ، بردبار اور پُروقار۔ اس کے جسم پر انگریز نوابوں کے طرز کا روایتی سوٹ تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں جام اٹھائے شرکائے محفل کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک نوخیز حشر بدامان پر پڑی۔ وہ شخص آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھا اور قریب پہنچ کر اس کے سامنے کورنش بجا لایا۔ ”مجھے کاؤنٹ وکٹر لسٹیگ کہتے ہیں۔“ اس نے نہایت شیریں لہجے میں اپنا تعارف کرایا۔

لفظ کاؤنٹ یعنی نواب پر اس مہ وش کی نیم باز آنکھیں پھیل گئیں اور اس وقت تو مزید پھیل گئیں جب اس نواب نے یہ بتایا کہ وہ ایک پروڈیوسر ہے۔ وہ فتنہ سامان صرف اٹھارہ برس کی تھی اور اس کا پیشہ وارانہ اعزاز محض ایک بی کلاس کی فلم تک ہی محدود تھا۔ لہٰذا جب اس پروقار اجنبی نے اس شوخ کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہا کہ اسے اس میں بے پناہ صلاحیتیں نظر آ رہی ہیں اور یہ کہ وہ اس ناتراشیدہ ہیرے کو تراش خراش کر براڈوے کا ایک ایسا اسٹار بنا سکتا ہے جس کی جگمگاہٹ نگاہوں کو خیرہ کر دے گی تو وہ حسن مجسم اور معصومیت کی پیکر پوری کی پوری اس کے شیشے میں اتر گئی۔

☆☆☆

اگلے چند دنوں تک وکٹر اور اسٹیلا سوہن، ہوانا کی سیر کرتے رہے۔ وقتاً فوقتاً قمار بازی بھی کی اور اس طرح خود کو نمایاں کرتے رہے۔ جلد ہی وکٹر کی توجہ سنہرے بالوں والے ایک جیم شحیم امریکی نوجوان پر مرتکز ہو گئی جس کی شخصیت ڈرامائی تاثر کی حامل تھی۔ وکٹر نے سوچا کیا اسے کبھی تھیٹر کے کیڑے نے کاٹا تھا؟ اگر یہ بات تھی تو وہ وکٹر کا موزوں ترین شکار تھا جس کی اسے تلاش تھی۔ اس نوجوان امریکی سے تعارف حاصل کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ اس کا نام رونالڈ ڈاج تھا اور وہ ایک مالدار سیلز مین تھا۔

”تمہیں ایک بات بتاؤں۔“ وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ ”مجھے تمہارے خطاب سے زیادہ براڈوے کے پروڈیوسر ہونے نے متاثر کیا ہے۔ مجھے شروع ہی سے تھیٹر میں کام کرنے کا بے حد شوق تھا۔ میں کالج کے ڈراموں میں حصہ لیا کرتا تھا۔ میں نے بڑی جانفشانی سے اپنے آبائی شہر میں چھوٹے چھوٹے تھیٹریکل گروپس تشکیل دیے تھے۔ پھر بھی میں وہ مقام حاصل نہ کر سکا جس کا میں آرزومند تھا۔“ اس کا لہجہ مایوسی میں ڈھل گیا۔

وکٹر بڑی ہمدردی اور توجہ سے اس کی داستان حسرت سنتا رہا اور پھر اپنے شکار کے شوق اور جنون کا اندازہ کر کے اس نے بڑی شائستگی سے موضوع بدل دیا۔ جیسا کہ اسے توقع تھی اس دن کے بعد ڈاج پورے ہوانا میں اس کے ساتھ نظر آنے لگا۔ وہ وکٹر کی عیش و نشاط کی زندگی سے مسحور ہو گیا تھا اور ویسی ہی ہوشربا زندگی بسر کرنے کے خواب دیکھنے لگا تھا اور اس خواب کی تعبیر کو پانے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار تھا۔ وکٹر بڑے محتاط انداز میں اس کے آتشِ شوق کو بھڑکاتا رہا۔

"مسٹر ڈاج۔" وہ محتاط لہجے میں گویا ہوا۔ "میں بے شک ایک کھیل پیش کرنے پر بے حد سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں لیکن ریہرسل میں صرف ایک شے مانع ہے۔"

"وہ کیا؟" ڈاج نے گہرے اشتیاق سے پوچھا۔

"بات دراصل یہ ہے مسٹر ڈاج کہ ایک محتاط اندازے کے مطابق پروڈکشن کی کل لاگت ستر ہزار ڈالر ہے اور پچاس ہزار اب بھی کم پڑ رہے ہیں لیکن بے شک کسی بھی فرد کو انچاس فی صد سے زیادہ رقم کی سرمایہ کاری کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔" اس کا لہجہ رازدارانہ تھا۔

"تو بات ہو گئی۔" ڈاج وفور جذبات سے چیخ پڑا۔

"میں چونتیس ہزار ڈالر اس میں لگاؤں گا۔"

وکٹر ہچکچایا۔ "دیکھو رونالڈ۔" وہ بڑی اپنائیت سے بولا۔ "تم میرے دوست ہو اور میں ایک دوست سے رقم لینا پسند نہیں کرتا۔ بالخصوص ایک ایسے کاروبار میں جو درحقیقت ایک قسم کا جوا ہے، اور جوئے میں کچھ بھی ممکن ہے۔ اگر وہ کھیل پٹ گیا تو ہم دیوالیہ ہو جائیں گے۔ ایمان سے میں تمہیں براڈوے، پروڈکشن میں سرمایہ کاری کا مشورہ نہیں دوں گا۔"

ڈاج کی آنکھوں پر پٹی بندھ گئی۔ وہ وکٹر سے زور و شور سے بحث کرنے لگا۔ "سنو وکٹر میں تھیٹر کا بے حد شائق ہوں اور یہ رسک لینے کو بالکل تیار ہوں۔" وہ بولا۔

"میں تم سے بحث کر کے نہیں جیت سکتا۔" وکٹر نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

"اب معاہدے کی کیا صورت ہو گی؟" ڈاج نے پوچھا۔ "کیونکہ یہاں نہ تو ہمارے درمیان کوئی معاہدہ طے پا سکتا ہے اور نہ ہی میں اتنی بڑی رقم ادا کر سکتا ہوں۔"

"یہ قابل فہم ہے۔" وکٹر نے اتفاق کیا۔ "ظاہر ہے کوئی شخص اتنی بڑی رقم لے کر غیر ممالک کی سیر و تفریح کے لیے نہیں نکلتا۔"

"درست۔" ڈاج نے کہا۔ "تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ تم رہوڈ آئی لینڈ میں میرے شہر پروویڈینس پہنچو۔ میں اس دوران میں اپنے حصے کی رقم کا جلد از جلد بندوبست کر لوں گا اور ہم مل بیٹھ کر معاہدے کی تفصیلات طے کر لیں گے۔"

"یہ مناسب رہے گا۔" وکٹر نے اتفاق کیا۔ "لیکن ایک بات کا خیال رکھنا جب تک کل رقم کی ادائیگی نہیں ہو گی تب تک کوئی معاہدہ نہیں ہو گا۔"

"مجھے منظور ہے۔" ڈاج نے پرجوش لہجے میں کہا۔

اس کے دوسرے ہی دن ڈاج کیوبا سے اپنے آبائی شہر پروویڈینس لوٹ گیا۔ وکٹر، اسٹیلا کے ساتھ وہیں قیام پذیر رہا لیکن فون پر ان دونوں کا رابطہ تھا۔ وکٹر باتوں ہی باتوں میں ڈاج کو اشارے کنائے سے یہ بتاتا رہا کہ یہ اس کی زندگی کا پہلا اور آخری موقع ہو سکتا ہے۔ کہیں یہ موقع اس کے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ اسی طرح تین ہفتے گزر گئے۔ تب ایک دن وکٹر نے اسٹیلا کو بتایا کہ وہ "کاروباری دورے" پر امریکا جا رہا ہے۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔" اسٹیلا نے کہا۔

"یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں۔" وکٹر نے درشتی سے جواب دیا۔

"میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ خدا کے لیے تم مجھے یہاں تنہا چھوڑ کر مت جاؤ۔" اسٹیلا کی حسین آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ میرا کام سب سے اہم ہے اور میرا فیصلہ اٹل ہے۔" وکٹر کا لہجہ سفاک تھا۔

وہ اسٹیلا کو ہوٹل میں بے یار و مددگار چھوڑ کر پروویڈینس روانہ ہو گیا۔ اسٹیلا روتی بلکتی ہی رہ گئی۔

☆☆☆

پروویڈینس پہنچ کر وکٹر نے ایک ہوٹل میں قیام کیا اور ڈاج کو فون پر اپنی آمد کی اطلاع دی۔ ڈاج اس کا فون موصول کر کے خوشی سے ناچ اٹھا۔ "تم کتنی دیر میں پہنچ رہے ہو؟" وکٹر نے پوچھا۔

"میں ایک گھنٹے کے اندر پہنچ رہا ہوں۔"

"رقم ساتھ لانا نہ بھولنا۔" وکٹر نے یاد دہانی کے طور پر کہا۔

"تم فکر مت کرو۔ میں نے رقم کا بندوبست کر لیا ہے۔" ڈاج نے جواب دیا۔

"گڈ لک۔" وکٹر بولا۔ "میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

اس کے ایک گھنٹے کے بعد ڈاج کاؤنٹ کے ہوٹل روم میں تھا۔ کاؤنٹ وکٹر نے اپنے حصے کے چھتیس ہزار ڈالر گڈیوں کی شکل میں ڈاج کے سامنے رکھ دیے۔ "یہ میرے حصے کے چھتیس ہزار ڈالر ہیں۔ چاہو تو گن لو۔"

"نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" ڈاج نے کہا اور اپنے حصے کے چونتیس ہزار ڈالر نکال کر سامنے رکھی ہوئی

میز پر رکھ دیے۔ وکٹر نے اپنی اور اس کی گڈیاں اٹھا کر اپنے بریف کیس میں رکھیں اور بریف کیس مقفل کر کے الماری کے ایک شیلف میں رکھ دیا۔ ''اب اس خوشی میں چھوٹا موٹا جشن ہو جائے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''تم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔'' ڈاج نے خوش ہو کر کہا۔

''قریب ہی ایک بے حد پُرسکون بار ہے، وہیں چلتے ہیں۔'' وکٹر نے کہا۔

دونوں ہوٹل سے نکل کر پینے پلانے کی غرض سے اس بار میں پہنچ گئے لیکن ابھی وہ اطمینان سے بیٹھ بھی نہ پائے تھے کہ وکٹر کے ہوٹل کا بیل بوائے وہاں آ دھمکا۔ ''کاؤنٹ لسٹیگ آپ کے لیے لندن سے ایک فون کال ہے۔''

''یہ کال ممکن ہے کھیل کے حقوق برائے انگلستان کے سلسلے میں ہو۔'' وکٹر خوش ہو کر بولا۔ ''میں ابھی آیا، دعا کرتے رہو۔''

اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے بار سے نکل گیا۔ ڈاج اس کے انتظار میں بیٹھا دعا کرتا رہا۔ لمحے آہستہ آہستہ بیت رہے تھے۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ڈاج کے اضطراب میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس طرح آدھا گھنٹا گزر گیا۔ ڈاج پریشان ہو کر اٹھا اور بار سے نکل کر واپس وکٹر کے ہوٹل پہنچ گیا۔ وکٹر کا کمرا بالکل خالی تھا۔ نہ وہاں کوئی کپڑا تھا، نہ سوٹ کیس اور نہ ہی رقم۔ وکٹر رفو چکر ہو گیا تھا۔ غصے کے مارے، ڈاج کا خون کھول اٹھا۔ اس نے فوراً پولیس کو مطلع کر دیا۔ یہاں پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وکٹر ایک بنیادی غلطی کر بیٹھا تھا۔ مجرمانہ کھیل کا ایک اصول یہ ہے کہ شکار سے رقم کسی ایسے بہانے سے اینٹھی جاتی ہے کہ وہ فوراً پولیس کے پاس نہ جا سکے۔ جہاں تک ڈاج کا تعلق تھا تو اس معاہدے میں کوئی غیر قانونی بات نہیں تھی۔ براڈوے کا پروڈیوسر بننے کی اس کی آرزو ندامت سے بالاتر تھی۔ اس نے اتنی تیزی سے پولیس کو حرکت دے دی تھی کہ وکٹر، پروویڈنیس کے ریلوے اسٹیشن پر ہی پکڑا جاتا مگر اس نے یہ چالاکی کی کہ ریلوے اسٹیشن کا رخ کرنے کی بجائے ایک مسروقہ کار میں، قصباتی سڑکوں سے راہِ فرار اختیار کر کے مونٹریال پہنچ گیا اور وہاں اپنے مجرم شناساؤں کے ہاں جا پہنچا۔

لیکن ڈاج کے غم و غصے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ تنہا وکٹر کے تعاقب میں واپس کیوبا ہوتا پہنچ گیا۔ وہاں اسے اسٹیلا بہت ہی برے حال میں ملی۔ وکٹر ہوٹل کا بل ادا کیے بغیر اسے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ چونکہ اسٹیلا ہسپانوی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں بول سکتی تھی چنانچہ ہوٹل والوں نے اسے ہوٹل میں برہنہ رقص کرنے والیوں کے طائفے میں شامل ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ ٹوٹ کر بکھر گئی تھی اور خود اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی۔ وکٹر نے اس کی روح کو کچل دیا تھا۔ ڈاج اس سے ملا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ڈاج نے اسے دو سو ڈالر دیے اور مشورہ دیا کہ وہ اپنے گھر لوٹ جائے۔ پھر وہ واپس پروویڈنیس چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اتنا بڑا طوفان کھڑا کر دیا کہ وکٹر کو مونٹریال بھی غیر محفوظ لگنے لگا۔ چنانچہ وہ جعلی پاسپورٹ بنوا کر ایک مال بردار بحری جہاز میں سوار ہو کر فرانس پہنچ گیا۔

☆☆☆

فرانس میں قیام کے دوران میں وہ واپس امریکا پہنچنے کی ترکیبیں لڑانے لگا۔ اس زمانے میں امریکا اس جیسے ''باکمال'' لوگوں کے لیے بہترین شکار گاہ تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ امریکا کی اہم بندرگاہوں کی سخت نگرانی ہو رہی ہوگی کیونکہ ڈاج پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے آدھی درجن ریاستوں کی پولیس کو متحرک کر دیا تھا۔ لیکن مئی 1927ء تک وہ اس کا ایک دلیرانہ حل ڈھونڈ چکا تھا۔ اس ماہ کے اوائل میں وہ چھپ چھپا کر نیویارک جانے والے ایک بحری جہاز ماریطانیہ میں سوار ہو گیا۔ دوسرے دن اس نے سمندری سفر کے دوران میں جہاز کے ریڈیو روم سے نیویارک میں یو ایس سیکرٹ سروس کے ریزیڈنٹ ایجنٹ کو ایک پیغام بھیجا۔ پیغام میں یہ تحریر تھا۔ ''میرے پاس تمہارے لیے ایک نہایت اہم اطلاع ہے۔ میرا بحری جہاز ماریطانیہ بدھ کو وہاں لنگر انداز ہوگا۔ کاؤنٹ وکٹر لسٹیگ۔''

یہ پیغام بھیجنے کے بعد وہ بالکل مطمئن ہو گیا اور باقی سفر اس نے نہایت اطمینان سے کیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ سیکرٹ سروس والوں کی دو خاص ذمے داریاں تھیں۔ صدر کی حفاظت کرنا اور جعلسازوں کو پکڑنا۔ جب یہ پیغام ہمارے سیکرٹ سروس والوں کو پہنچا تو وہ یہی سمجھے کہ کاؤنٹ لسٹیگ کے پاس جعلسازی سے متعلق اہم اطلاعات ہوں گی چنانچہ انہوں نے ماریطانیہ کے لنگر انداز ہونے سے پہلے ہی اپنے دو ایجنٹوں کو پائلٹ بوٹ میں ماریطانیہ میں سوار ہونے کے لیے بھیج دیا۔ دونوں ایجنٹ کشتی میں سوار ہو کر کھلے سمندر میں پہنچ گئے اور نیویارک کی طرف گامزن بحری

جہاز میں سوار ہوگئے۔

وکٹر نے کسی نواب کی سی شان سے ایک فرسٹ کلاس کیبن میں ان کا استقبال کیا اور پھر گویا ہوا۔ ''میں اس وقت تم لوگوں سے بات نہیں کرسکتا کیونکہ میں اپنا سامان باندھنے اور اپنے دوستوں کو الوداع کہنے میں مصروف ہوں۔ اب ہم لنگر انداز ہونے ہی والے ہیں میں بخوشی تمہارے آفس پہنچ جاؤں گا۔ تاہم مجھے ایک چھوٹی سی مشکل پیش آسکتی ہے۔'' وہ پُرخیال انداز میں ہچکچا کر رک گیا۔

''وہ کیا؟'' ایجنٹوں نے پوچھا۔

''میں پروویڈینس میں ایک غلط فہمی میں ملوث ہوگیا تھا اور وہاں کی پولیس ممکن ہے مجھ سے سوال و جواب کرنے کی منتظر ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مجھے واپس رموڈ آئی لینڈ جانا پڑے۔''

سیکرٹ ایجنٹوں کو پروویڈینس میں پیش آنے والے اس واقعے کا کوئی علم نہیں تھا۔ چنانچہ ایجنٹ پیٹر ربانو نے بلا سوچے سمجھے جواب دیا۔ ''اگر تمہارے پاس جعلسازی یا محترم صدر کے بارے میں ایسی کوئی اطلاع ہے جس سے ان کی جان کو خطرہ لاحق ہو تو یہ معاملہ سب سے اہم ہے۔ باقی چیزوں سے بعد میں بھی نمٹا جاسکتا ہے۔''

''معزز حضرات! میں یہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔'' وکٹر نے بڑی معصومیت سے کہا۔

جیسا کہ اسے توقع تھی جب ماریطانیہ لنگر انداز ہوا تو نیویارک کا ایک سراغ رساں اسے حراست میں لینے کے لیے وہاں موجود تھا لیکن اس موقع پر سیکرٹ ایجنٹ پیٹر ربانو نے مداخلت کی۔ اس نے اپنا سیکرٹ سروس کا بیج سراغ رساں کو دکھایا اور وضاحت کی کہ یہ وفاقی حکومت کا کیس ہے۔

سراغ رساں نے شانے اچکائے۔ ''اگر یہ تم لوگوں کا کیس ہے تو میرے خیال میں یہ تمہارا ہے۔'' اس نے کہا اور بندرگاہ سے نکل گیا۔

☆☆☆

نیویارک کے سیکرٹ سروس آفس پہنچ کر وکٹر کی جان میں جان آئی۔ یہاں اسے اپنی چرب زبانی کے جوہر دکھانے تھے۔ وہ سیکرٹ سروس والوں سے بے حد تعاون کرتا نظر آرہا تھا۔ وہ بے تحاشا بولتا چلا گیا لیکن اس کے منہ سے ایسی بہت کم اطلاعات نکلیں جو کام کی ہوں۔ اس دوران میں ربانو نے لنچ کا آرڈر دے دیا اور لنچ کے بعد ایک بار پھر تفتیش کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پیٹر ربانو اس پُراعتماد شخص کے منہ سے کام کی باتیں اگلوانا چاہتا تھا لیکن چار گھنٹے پھر پانچ گھنٹے اور پھر چھ گھنٹے گزر گئے۔ وکٹر کے چہرے سے نہ تو تھکن ظاہر ہورہی تھی اور نہ ہی اس کی پیشانی پر ناگوار شکنیں نمودار ہورہی تھیں۔ حالانکہ ربانو اس پر سوالات کی بوچھاڑ کررہا تھا اور اس کے جواب میں وہ مسلسل اپنی چرب زبانی سے اسے مات پر مات دیے جارہا تھا۔

''بدقسمتی سے۔'' وہ ایک سوال کے جواب میں بولا۔ ''کچھ نام میرے ذہن سے پھسل گئے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کے تعاون سے مجھے وہ نام یاد آجائیں گے۔ میں یہاں رضاکارانہ طور پر آیا تھا اور اگر ضرورت پڑی تو میں بخوشی چوبیس گھنٹے آپ سے تعاون کرنے کو تیار ہوں۔ اب آخری سوال کیا تھا؟''

ربانو! ایک ایسے شخص کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا جو اس سے تعاون کرنے کی بھرپور کوشش کررہا تھا۔ اس طرح آدھی رات ہوگئی۔ ربانو کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔ وکٹر بے تکان بولے جارہا تھا۔

☆☆☆

یوں وہ اپنے منصوبے پر ٹھیک عمل کرکے ڈاج کے پہرے داروں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ بعد میں جب وہ جعلسازی میں ملوث ہوا تو سیکرٹ سروس والے اس کے پیچھے لگ گئے۔ اس دوران میں وہ پوری سنجیدگی سے اس کے ماضی کو کھنگالنے لگے۔

وکٹر نے اپنی مجرمانہ زندگی کے ابتدائی تجربات پہلی جنگِ عظیم سے پہلے، بحری جہازوں پر حاصل کیے جو بین الاقوامی امراء اور روسا کا من پسند مسکن تھا۔ وہ چیکوسلواکیہ کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوا تھا جہاں سے وہ نوعمری ہی میں بھاگ گیا تھا۔ اس نے کچھ عرصہ پیرس میں ایک چھوٹے موٹے چور اچکے کی حیثیت سے گزارا اور جلد ہی اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ راتوں رات امیر بننے کے لیے قمار بازی سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔

اپنے تیسرے بحری سفر کے دوران میں اس کی ملاقات اس بحری جہاز میں ایک اور شاطر پیشہ ور پتے باز سے ہوئی جو اسی ارادے سے سفر کررہا تھا جس ارادے سے وکٹر سفر کررہا تھا۔ وہ لمبے قد کا ایک دبلا پتلا آدمی تھا۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں چابک دستی سے پتے بدل دیتیں کہ وکٹر کو بھی یقین نہ آتا کہ پتے بدل دیے گئے ہیں۔ جب وہ ایک

دوسرے سے متعارف ہوئے تو وکٹر کو معلوم ہوا کہ وہ نکی آرٹسٹائن تھا، اس دور کا سب سے ماہر جواری چنانچہ دونوں شاطر آپس میں گہرے دوست بن گئے اور پارٹنر کی حیثیت سے پورا سال انہی بحری جہاز پر امراء اور روسا کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے رہے۔ وکٹر نے نکی سے بہت گر سیکھے۔

''پہلے خود کو شکار کے حصول کے لیے ممکن بناؤ۔'' اس نے ایک دن وکٹر سے گفتگو کے دوران کہا۔ ''اس سے دوستی کرو اور اسے یہ سوچنے کا موقع دو کہ تم کیا چاہتے ہو۔ انتظار کرو اور جب وہ سمجھ جائے تو پیچھے ہٹ جاؤ۔''

''مجھے شک ہے کہ شکار اسی طرح جال میں پھنسے گا۔'' وکٹر نے خیال پیش کیا۔

''ممکن ہے، ہر شکار نہ پھنسے لیکن اہم شکار ضرور پھنسے گا۔'' نکی نے جواب دیا۔ ''میں تمہیں اس کا عملی مظاہرہ کر کے دکھاتا ہوں۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ''جب تم اندر آئے تھے تو کیا تم نے اس شخص کو دیکھا تھا جس سے میں باتیں کر رہا تھا۔ اس کا نام ہنری ڈکسن ہے وہ ایک رئیس ہے اور اکتاہٹ کا شکار ہے۔ اس نے اب تک تاش کھیلنے کی خواہش ظاہر نہیں کی ہے لیکن وہ کرے گا اور جب وہ ایسا کرے گا تو میں اسے بتا دوں گا کہ میں کیا ہوں۔ پھر بھی وہ میرے ساتھ کھیلنا چاہے گا، تم دیکھنا۔''

نکی واپس بار میں ڈکسن کے پاس لوٹ گیا اور اس سے پھر سے گفتگو میں مشغول ہو گیا۔ دوسرے ڈرنک کے دوران میں ہنری ڈکسن نے تاش کھیلنے کی خواہش ظاہر کر دی۔ نکی نے ایک لمحہ سوچا اور پھر کہا۔ ''مسٹر ڈکسن، میں ایسا نہیں سمجھتا۔ مجھے آپ کی دوستی عزیز ہے اور میں اس دوستی کو برقرار رکھنا چاہتا ہوں۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ہار جاؤں گا؟'' ڈکسن نے پوچھا۔

''قطعی نہیں۔'' نکی نے شائستگی سے جواب دیا۔ ''لیکن آپ کو جیتنے کا کوئی موقع نہیں ملے گا۔ دیکھیں، بات دراصل یہ ہے کہ میں ایک پیشہ ور جواری ہوں۔''

''اگر میں تمہارے ساتھ نہ کھیلا تو مجھ پر لعنت۔'' ڈکسن فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

وکٹر ایک قریبی میز پر بیٹھا ان دونوں کے درمیان ہونے والی یہ حیران کن گفتگو سن رہا تھا۔ اس کے خیال میں نکی سے ایک بھیانک غلطی سرزد ہو گئی تھی لیکن اس کا خیال غلط تھا۔ اگلے دن جب ڈکسن اور نکی بار میں ملے تو شکار چھری تلے آنے کے لیے بے تاب تھا۔ ''میں کبھی کسی پیشہ ور جواری کے ساتھ نہیں کھیلا۔'' وہ گویا ہوا۔ ''میں یہ آزمانا چاہتا ہوں اور کون جانے؟ ہو سکتا ہے میں جیت جاؤں۔''

''کون جانے؟'' نکی نے دہرایا۔ ''لیکن میں اب بھی آپ کے ساتھ کھیلنا نہیں چاہتا۔''

اس نے نہ صرف اس دن بلکہ اس سے اگلے دن اور اس سے اگلے دن بھی ڈکسن کے ساتھ جوا کھیلنے سے انکار کر دیا لیکن سفر کی آخری رات وہ بظاہر طوعاً و کرہاً ڈکسن کے ساتھ کھیلنے بیٹھ گیا اور اس سے تیس ہزار جیت لیے۔ وکٹر نے یہ بنیادی سبق اپنی گرہ میں باندھ لیا کہ شکار میں کبھی اپنی دلچسپی ظاہر مت کرو بلکہ وہ جتنا آگے بڑھے تم اتنا ہی پیچھے ہٹو یہاں تک کہ وہ خود ہی اپنے گلے پر چھری پھروانے کے لیے تیار ہو جائے۔

جب پہلی جنگِ عظیم نے بحر اوقیانوس کے سفر کو ناممکن بنا دیا تو وہ عارضی طور پر اپنی پرانی شکار گاہ پیرس لوٹ گیا اور اپنے پرانے دھندے میں لگ گیا لیکن جنگ کے ختم ہوتے ہی وہ سیدھے امریکا پہنچ گیا۔ اس زمانے میں امریکا وکٹر جیسے لوگوں کے لیے بہترین پناہ گاہ تھا۔ نیویارک پہنچتے ہی اس نے نکی کو ڈھونڈ نکالا اور اس کے ذریعے وہ امریکی جرائم کی دنیا میں متعارف ہوا لیکن وہ ان جرائم پیشہ کے ساتھ مل کر کام کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے ان سب سے رسمی تعلقات تو رکھے لیکن وہ خود اپنی انا کا بادشاہ تھا۔ اس دوران میں نکی سے دوستی کے نتیجے میں پچیس ہزار ڈالر کے لبرٹی بونڈز اس کے ہاتھ لگ گئے۔

☆☆☆

کینساس کے ایک مقامی سپیلنا کے امریکن سیونگز بینک کا صدر تورمیٹ گرین ہر وقت اس بات پر کڑھتا رہتا تھا کہ وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب بینک نے مارٹن فارم کا سودا کیا تھا۔ وہ چند سال پہلے اس فارم کو بند کرنے پر مجبور ہو گیا تھا اور اب اس کی عمارتیں گر رہی تھیں۔ ٹیکس ادا کرتے تھے اور کوئی خریدار نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ ہی اس کا کوئی امکان تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ مارٹن فارم کوئی اچھی جگہ نہیں تھی۔ لہٰذا کوئی بھی اسے خریدنے پر رضا مند نہیں ہوتا تھا۔ تب 1924ء میں موسم بہار کی ایک صبح ایک نہایت غیر معمولی ملاقاتی گرین کے دفتر میں نمودار ہوا۔

کینساس کے لوگ کبھی بھی دھاری دار سوٹ نہیں پہنتے تھے جیسا کہ ملاقاتی پہنے ہوئے تھا۔ نہ ہی بینک کا صدر

ٹورمیٹ گرین اس مہذب زبان اور غیر ملکی لب و لہجے سے مانوس تھا جس میں وہ اجنبی مخاطب ہوا۔ گرین نے تھوڑی سی بے اطمینانی محسوس کرتے ہوئے اپنی شناخت کرائی اور پھر استفسار کیا۔

''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''میرا نام کاؤنٹ وکٹر لسٹنگ ہے۔'' نووارد نے کہا۔ ''میں ایک فارم خریدنا چاہتا ہوں۔''

''فارم؟'' گرین اچانک سیدھا ہو بیٹھا۔

''ہاں۔'' وکٹر نے اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''موسیو! آپ کے سامنے پچھلے دور کا ایک پناہ گزین ہے۔ ایسٹ ٹائرول میں ہمارے کسانوں نے بغاوت کر دی ہے اور ہم سے ہمارا سب کچھ چھین لیا ہے۔ ہمارے انگور کے باغات اور ہمارے مویشی جو نسل در نسل ہماری ملکیت چلے آ رہے تھے، ہاتھ سے نکل گئے ہیں۔ اب مجھے از سر نو زندگی شروع کرنی ہے۔''

''ہاں، بے شک۔'' گرین بولا۔

''میں یہاں مضافات کا جائزہ لیتا رہا ہوں۔'' وکٹر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور مجھے ایک ایسی جگہ مل گئی ہے جو مجھے اچھی لگی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس جگہ کو مارلٹن فارم کہتے ہیں۔ کیا آپ اس کے مالک کو جانتے ہیں؟''

''میں...... ہم ہی اس کے مالک ہیں۔'' گرین نے مریل آواز میں کہا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ ''یہ...... یہ برائے فروخت ہے...... نہایت مناسب قیمت پر۔''

وکٹر نے اپنے چہرے پر پچھتاوے کے تاثرات پیدا کیے۔ ''میں تھوڑی سی رقم کے ساتھ آسٹریا سے فرار ہونے میں کامیاب ہو سکا۔'' اس نے اپنی ایک اندرونی جیب سے ایک لفافہ برآمد کیا اور بینکر کو پیش کر دیا۔ پھر گویا ہوا۔ ''جب میں نیویارک پہنچا تو خاندان کے زیورات اس رقم میں تبدیل کر لیے۔ کیا یہ رقم کافی ہو گی؟''

گرین نے لفافہ کھولا اور پچیس ہزار کے لبرٹی بونڈز باہر آ گئے۔ گرین نے بڑی مشکل سے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور گویا ہوا۔ ''ہاں، بالکل...... میرے خیال میں، ہم وہ فارم اتنی قیمت میں فروخت کر دیں گے۔''

وکٹر نے بڑی احتیاط سے وہ لفافہ واپس اپنی جیب میں رکھ لیا اور پھر گرین اور بینک کا نائب صدر جان روز، اسے مارلٹن کی جائداد دکھانے لے گئے۔ فارم کی حالت نہایت خستہ تھی اور اسی وجہ سے گرین کا رویہ معذرت خواہانہ تھا لیکن وکٹر قطعی مایوس نظر نہیں آ رہا تھا بلکہ بڑے پُرجوش انداز میں انہیں بتا رہا تھا کہ چند ہی برسوں میں وہ جگہ کیسی لگنے لگے گی۔ جب وہ اچھی طرح اس جگہ کا معائنہ کر چکا تو اس نے ان دونوں بینکرز سے اگلے دن اپنے ہوٹل کے کمرے میں ملنے کی خواہش ظاہر کی تاکہ اس خرید وفروخت کو حتمی شکل دی جا سکے۔

''ایک اور بات بھی ہے۔'' وہ آخر میں بولا۔ ''اس فارم کو قابلِ کاشت بنانے اور اس سے کچھ کمانے میں برسوں لگیں گے اور مجھے اس کے لیے سرمائے کی ضرورت ہو گی۔ میرے پاس پچیس ہزار ڈالرز کے دوسرے لبرٹی بونڈز بھی ہیں۔ کیا وہ کیش ہو جائیں گے؟''

''اس سے آسان تو کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔'' گرین نے یقین دلایا۔

لہٰذا اگلے دن جب وہ دونوں بینکر وکٹر کے ہوٹل کے کمرے میں پہنچے تو پچیس ہزار ڈالر کیش اور مارلٹن فارم کے دستاویزات بھی ساتھ لیتے آئے۔ وکٹر نے ڈریسر کی ایک دراز سے بھورے رنگ کا ایک لفافہ نکالا اور اسے ایک طرف سے کھول کر انہیں بونڈز کی گڈیوں کا دیدار کرایا۔

''پچاس ہزار ڈالرز مالیت کے بونڈز۔'' وہ بولا۔ پھر اس نے لفافہ واپس اسی دراز میں رکھ کر دراز بند کر دی۔

اب اس نے ایک دوسری دراز سے وہسکی کی ایک بوتل نکالی۔ ''آسٹریا میں زمین کی خرید وفروخت پر ایک چھوٹا موٹا جشن منایا جاتا ہے۔'' اس نے کہا اور انہیں جام بھر بھر کے پیش کیے۔

انہیں آسٹرین طرز کے جشن منانے پر بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ کئی دور چل گئے۔ پھر وکٹر نے ان کے پچیس ہزار ڈالر کیش کے عوض بونڈز کا وہ براؤن لفافہ اور دستاویزات انہیں دے دیے۔ ایک دوسرے سے مصافحہ کیا اور وہ دونوں بینکر واپس بینک آ گئے تاکہ بونڈز کا معائنہ کر سکیں لیکن لفافے سے جو شے برآمد ہوئی اسے دیکھ کر ان دونوں کے ہوش اڑ گئے اور جسم سے ٹھنڈا پسینا پھوٹ پڑا۔ وہ واپس بھاگے بھاگے ہوٹل پہنچے لیکن وکٹر وہاں سے رفو چکر ہو چکا تھا۔ اس کا کمرا خالی پڑا تھا۔ ان کے ہاتھ میں جو براؤن لفافہ تھا اس میں پرانے اخبار کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

☆☆☆

وکٹر نے اس اعتماد اور یقین کے ساتھ کہ بیشتر لوگ اپنا نقصان برداشت کر لیتے ہیں اور سب بھول جاتے ہیں۔ اپنا سراغ چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی لیکن اس مرتبہ وہ غلط ثابت ہوا۔ اس واقعہ کے چند ہی دنوں کے بعد وہ ہتھکڑیاں پہنے ہوئے بینک کے، وکیل اور سراغ رساں رے ایلٹن کی حراست میں ٹرین کے ایک کمپارٹمنٹ میں واپس کینساس کا سفر کر رہا تھا۔ شکاگو پہنچنے تک اٹھارہ گھنٹے کی مسافت کے دوران میں وہ بیشتر وقت اس پریشان کن صورتِ حال سے بالکل بے نیاز نظر آیا۔ گاہے گاہے وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا لیکن پھر آہستہ آہستہ ایک پیٹرن ابھرتا چلا گیا۔ وہ سراغ رساں ایلٹن پر یہ حقیقت واضح کرنا چاہتا تھا کہ اس پر مقدمہ چلانا خود اس کے موکل کے حق میں برا ہو سکتا ہے۔

''میں تم سے پوچھتا ہوں۔'' وہ ایک زہر خند سے بولا۔ ''کیا مارٹن جیسی واہیات جگہ کے لیے پچیس ہزار ڈالر طلب کرنا دیانت داری تھی؟ مزہ تو تب آئے گا جب اس کیس کی تشہیر کے نتیجے میں سارے اکاؤنٹ ہولڈرز بینک سے اپنی رقم نکالنے کے لیے دوڑ پڑیں گے اور بے پناہ ہجوم ہو جائے گا۔ انہیں جیسے ہی معلوم ہوگا کہ ان کے بینک افسران کو ٹھگ لیا گیا تھا تو ان پر سے ان کا اعتماد ختم ہو جائے گا اور بینک تباہ ہو جائے گا۔ دوسری طرف اگر تم مجھے رہا کر دو تو میں ساری رقم واپس کر دوں گا۔ پھر کسی کو بھی نقصان نہیں ہوگا اور کوئی بد مزگی نہیں ہوگی۔''

یہ ساری باتیں، سراغ رساں ایلٹن کی آئیڈیالوجی کے خلاف تھیں لیکن ان باتوں میں بڑا وزن تھا۔ ان میں سادگی بھی تھی اور پرکاری بھی۔ جب وہ شکاگو پہنچے تو ایلٹن نے سیلینا کال کیا اور ان بینک کاروں سے تفصیلی بات کی۔ آخر میں وہ وکٹر کو اس شرط پر رہا کرنے پر تیار ہو گئے کہ وہ ساری رقم ادا کر دے۔ وکٹر راضی ہو گیا۔

☆☆☆

یہ مونٹریال تھا جہاں وکٹر کو اپنا اگلا بڑا شکار نظر آیا۔ وہ حسبِ معمول شہر کے سب سے اعلیٰ ہوٹل میں ٹھہرا۔ جلد ہی ایک بے جوڑ جوڑے نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لی۔ مرد نمایاں شخصیت کا حامل ایک عمر رسیدہ شخص تھا جب کہ اس کی ساتھی ایک شوخ و شنگ نوخیز حسینہ تھی۔ وکٹر نے بڑی ہوشیاری سے ہوٹل کے بیل کیپٹن سے باتوں ہی باتوں میں اس جوڑے کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں۔ بیل کیپٹن نے اسے بتایا کہ مرد کا نام لینس مرٹن تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے شہر ورمنٹ کا بینکر تھا جو اکثر مونٹریال میں اپنی بیوی کے ہمراہ چھٹیاں گزارا کرتا تھا۔

اب وکٹر نے اپنی شاطرانہ چال چلنے کے لیے پہلا قدم اٹھایا۔ اس نے مرٹن کی جیب سے پرس اڑانے کے لیے شہر کے بہترین پاکٹ مار کی خدمات حاصل کیں لیکن ساتھ ہی اسے سختی سے خبردار کیا کہ وہ پرس کو کھول کر دیکھنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اس جیب کترے ایمل کے لیے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اس نے اگلے ہی دن مرٹن کا پرس اڑا کر وکٹر کے حوالے کر دیا اور جب وکٹر نے مرٹن کا گم شدہ پرس اسے لوٹایا تو وہ اس قدر خوش ہوا کہ اس نے وکٹر کو انعام دینا چاہا لیکن وکٹر نے برا مانتے ہوئے اس کی یہ پیشکش سختی سے ٹھکرا دی۔

دونوں کے درمیان بہت تیزی سے دوستی استوار ہو گئی۔ قدرتی طور پر مرٹن کو تجسس ہوا کہ اس کا نیا دوست کس طرح پیسے کماتا تھا۔ اس کا ذریعہ آمدن کیا تھا کیوں کہ وہ بہت پیسے والا لگتا تھا۔ پہلے پہل وکٹر نے بتانے سے گریز کیا لیکن جب مرٹن نے اصرار کیا تو وہ اپنی وہی کہانی سنانے لگا کہ اس کے پاس بہت زمینیں تھیں لیکن کاشت کار باغی ہو گئے اور سب کچھ ان سے چھن گیا۔

''میں صرف پیسے کمانے کے لیے کام کرنے کو پیدا نہیں ہوا تھا۔'' وہ بولا۔ ''لیکن مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔''

''لگتا ہے تم بہت کچھ حاصل کر چکے ہو۔'' مرٹن نے کہا۔ ''تمہارا ذریعہ آمدن کیا ہے؟''

''گھوڑے۔'' وکٹر نے جواب دیا۔

''تو تم جواری ہو؟'' مرٹن نے پوچھا۔

''بہ مشکل ہی جواری ہوں، لنیس۔'' وکٹر نے بے تکلفی سے کہا۔ ''میں یقینی چیزوں پر شرطیں لگاتا ہوں۔''

''وہ کس طرح؟'' مرٹن نے تجسس سے پوچھا۔

''میرا ایک کزن ہے جو ایک ٹیلی گراف آپریٹر ہے۔'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''جیسے ہی یو ایس ایس کے نتائج مونٹریال پہنچتے ہیں یہ ایمل کی ڈیوٹی ہوتی ہے کہ وہ ان نتائج کو شرط لگانے والے مختلف پارلر کو ریلے کر دے لیکن ایمل کبھی کبھی تھوڑی تاخیر سے اپنی رپورٹ بھیجتا ہے اور اسے اتنی مہلت مل جاتی ہے کہ وہ اسی دوران میں مجھے فون پر یہ بتا دے کہ میں کس جیتنے والے گھوڑے پر شرط لگاؤں۔ یہ بہت سیدھا سادا معاملہ ہے۔'' اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آج ہی

اپنے پیسوں سے تمہارے۔ لیے ایک چھوٹی سی شرط لگاؤں گا۔ سوڈالر کی شرط اگر تم جیت گئے تو جیت کی رقم تمہاری اور ہار گئے تو میں تمہاری طرف سے ڈنر کرلوں گا۔ بولو منظور ہے؟''

''منظور ہے۔'' مرٹن بولا۔

اس سہ پہر وکٹر نے ایک ہزار ڈالر گن کر مرٹن کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ''یہ رہی جیت کی رقم۔'' اس نے کہا۔ ''اب اس کے بارے میں کوئی بات مت کرو۔''

لیکن بینکر مرٹن اس کے بابت بہت کچھ جاننا چاہتا تھا۔ اگلی صبح وہ دونوں ایمل سے ملنے والے ٹیلی گراف آفس پہنچ گئے۔ ابھی وہی جیب کترا تھا جس نے مرٹن کا پرس اڑایا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے وکٹر کے کہنے سننے پر مرٹن کو اندر آنے کی اجازت دی۔ اس سہ پہر وکٹر مرٹن کو شرط بازوں کے ایک پارلر لے گیا۔ وہاں ایک کیشیئر کی کھڑکی کے آگے متمول افراد قطار میں کھڑے تھے۔ یہ سب کے سب مونٹریال کی جرائم کی دنیا کے باسی تھے۔ جنہیں وکٹر نے بہت احتیاط سے چنا تھا اور ریہرسل کرائی تھی۔

وکٹر نے اپنی کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھا اور مرٹن کو کہنی ماری۔ ایمل کو کال کرنے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ دونوں اس کیبن کے سامنے واقع ایک فون بوتھ تک گئے اور جب فون کی گھنٹی بجی تو وکٹر نے مرٹن کو ریسیور اٹھانے کی اجازت دے دی۔ مرٹن نے ریسیور اٹھایا۔

''ہینڈ کوارٹر چوتھی ریس میں جیتے گا۔'' ایمل کی آواز سمع برگوش ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی کلک کی آواز کے ساتھ سلسلہ منقطع ہو گیا اور واقعی ہینڈ کوارٹر جیت گیا۔ شروع شروع میں مرٹن کی قسمت نے کچھ زیادہ ساتھ نہیں دیا لیکن سہ پہر میں جب ریس ختم ہوئی تو مرٹن ڈھائی ہزار ڈالر جیت چکا تھا۔ اگلے دن کی ریس میں وہ پانچ ہزار ڈالر جیتا۔ اب اس کی حرص بڑھتی جارہی تھی چنانچہ اب وکٹر نے اس کے گلے پر چھری پھیرنے کا فیصلہ کرلیا۔

اگلی صبح دونوں ایمل کو اس کا حصہ دینے کے لیے اس سے ملے لیکن ایمل کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ پیسے لے کر بھی خوش نہیں ہوا۔ بالآخر وہ بول پڑا۔ ''میں یہ جاب چھوڑ رہا ہوں۔ میری بیوی...... وہ کچھ عرصہ سے بیمار ہے اور اب ڈاکٹر نے اس کے مرض کی تشخیص کردی ہے۔ اسے ٹی بی ہے۔ مجھے فوراً اسے یہاں کی آب و ہوا سے دور کہیں اور لے جانا ہے۔''

''لیکن میاں، خدا کے لیے۔'' مرٹن پھٹ پڑا۔ ''کیا تم تھوڑا رک نہیں سکتے؟ میرا مطلب ہے جب تک یہ کھیل جاری ہے۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ میرے لیے میری بیوی سے زیادہ پیسے کی اہمیت ہے؟'' ایمل غصے سے حلق پھاڑ کر چیخا۔ ''نہیں، ہرگز نہیں، ایسا نہیں ہے۔ میں فوری جارہا ہوں۔''

وکٹر قدم اٹھا کر ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ ''بے شک۔'' وہ ایمل کو مناتے ہوئے بولا۔ ''ایلزا کی صحت سب سے اہم ہے۔'' پھر وہ بینکر کی طرف مڑا۔ ''مجھے افسوس ہے لینس...... لیکن میں اپنے کزن سے متفق ہوں اور ویسے بھی تم خاصے ڈالرز کما چکے ہو۔''

''کیا ہم ایک مرتبہ اور نہیں کھیل سکتے؟ صرف ایک مرتبہ۔'' مرٹن نے منت کی۔ ''ہم سب سے بڑی شرط لگا سکتے ہیں۔''

''سب سے بڑی شرط لگانے کے لیے ڈھیر ساری رقم کی ضرورت پڑے گی۔'' کاؤنٹ وکٹر نے کہا۔ ''داؤ پر اکٹھی رقم لگائے بغیر یہ نہیں ہوسکتا۔ میں تیس ہزار ڈالر کا انتظار کرسکتا ہوں۔ کیا تم بھی اتنی ہی رقم داؤ پر لگا سکتے ہو، لینس؟ کیوں کہ تیس ہزار ڈالر نا کافی ہیں۔''

''میں...... میں میرا خیال ہے کہ میں اتنی رقم لگا سکتا ہوں۔''

وکٹر اپنے کزن کی طرف مڑا۔ ''اس بارے میں کیا خیال ہے ایمل؟ کیا ہم مزید ایک داؤ نہ لگالیں؟''

☆☆☆

واپس ہوٹل جاتے ہوئے وکٹر بہت پرجوش نظر آرہا تھا وہ مرٹن کا دھیان بٹائے رکھنے کے لیے دلچسپ باتیں کرتا رہا۔ جب وہ ہوٹل کے قریب پہنچے تو وکٹر نے کہا۔ ''ہمیں تمہاری بیوی کو تمہارے منصوبوں سے ضرور آگاہ کرنا چاہیے۔ واقعی تمہیں جیتی ہوئی آدھی رقم اسے دینی چاہیے۔''

''آدھی؟'' مرٹن کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔ ''آخر کیوں؟''

وکٹر اس کی طرف دیکھ کر سازشی انداز میں مسکرایا اور چپ رہا۔

اگلی صبح وکٹر مارٹن کو لے کر جو اپنے ہاتھ میں ستر ہزار ڈالر بھینچے ہوئے تھا۔ واپس بکی پارلر پہنچا۔ مقررہ وقت پر فون کی گھنٹی بجی اور ایمل کی آواز سنائی دی۔ ''چھٹی ریس میں ہلڈا پر رکھ دو۔''

مرٹن کو بروقت شرط لگانے کی مہلت مل گئی۔ اسی وقت، کیشیئر نے چیخ کر کہا۔ ''ریس ختم ہو گئی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے کھڑکی بند کردی لیکن ریس کی رپورٹ مختلف تھی۔ اس مرتبہ مائی مین نامی گھوڑا اول نمبر پر رہا جب کہ ہلڈا دوسرے نمبر پر رہی۔ مرٹن کے چہرے کا رنگ راکھ جیسا ہو گیا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ وکٹر اسے تھام کر وائر روم سے باہر لے آیا۔

''آخر یہ کیسے ہوا؟'' مرٹن حیرت اور صدمے کی کیفیت کے تحت بار بار دہرا رہا تھا۔ ''آخر ہوا کیا؟''

وکٹر بھی بظاہر ویسا ہی پریشان نظر آرہا تھا۔ ''ہمیں کزن ایمل کو ڈھونڈنا پڑے گا۔'' وہ بولا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ تم نے صحیح سنا تھا؟''

ایمل ٹیلی گراف آفس سے نکل ہی رہا تھا کہ انہیں مل گیا۔ جب اسے وہ خبر سنائی گئی تو وہ مرٹن کی طرف مڑ کر غصے سے چیخ پڑا۔ ''احمق...... نامعقول...... میں نے کہا تھا، ہلڈا پر رکھ دو۔ کیا تم رکھ دو۔ کا مطلب نہیں سمجھتے؟ اس کا مطلب ہے وہ دوسرے نمبر پر رہے گی۔ تم نے مجھے تباہ کر دیا۔ میری غریب ایلزا......''

''ہم کل پھر داؤ لگالیں گے۔'' وکٹر بول پڑا۔

''ہم یہ نہیں کر سکتے۔'' ایمل غرّایا۔ ''مجھے جانا ہے۔ میرا باس مجھے دوبارہ نہیں رکھے گا۔''

وکٹر پہلے سے اپنا سامان باندھے ہوئے تھا۔ اب اسے صرف وائر روم کے ''ایکٹرز'' کو ادائیگی کرنی تھی اور شہر سے نکل جانا تھا۔ اسے یقین تھا کہ مرٹن اپنا منہ بند رکھے گا تاہم وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ آرام سے ہوٹل کی لابی میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ یہاں تک کہ مرٹن کی بیوی شاپنگ کرکے تیزی سے ہوٹل میں داخل ہوئی۔

''مبارک ہو، مائی ڈیئر۔'' وہ اس کے سامنے کورنش بجالایا۔ ''اب تم ایک امیر عورت ہو۔''

وہ شوخ، ایک پُرمسرت چیخ کے ساتھ لفٹ کی طرف بھاگی۔ وکٹر مسکرایا، اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور ہوٹل سے رخصت ہو گیا۔ مرٹن اپنی معشوقہ دلنواز کو یہ باور کرانے میں ناکام رہا کہ وہ ریس میں شرط ہار گیا ہے۔ اس کی معشوقہ اس کا تعاقب کرتی ہوئی درمونٹ پہنچی اور اس نے مرٹن کو دھمکی دی کہ اگر اس نے اسے رقم نہیں دی تو وہ ساری بات اس کی بیوی کو بتادے گی۔ مرٹن اسے اتنی رقم اکٹھی کر کے دینے سے قاصر رہا اور معشوقہ نے جب اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنایا تو مرٹن کی بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ وکٹر کا منصوبہ پورا ہو گیا۔ مرٹن اپنی الجھنوں میں پھنس کر اسے بالکل بھول گیا۔

☆☆☆

مرٹن سے فراڈ کرنے کے بعد وکٹر مونٹریال سے سیدھے پیرس پہنچ گیا اور وہاں وہ پورا ہفتہ آرام کرتا رہا۔ اس دوران میں وہ کبھی کسی کیفے میں ورماؤتھ کی چسکیاں لیتا یا فٹ پاتھوں پر چہل قدمی کرتے ہوئے اسٹالوں پر کھڑے ہو کر اخبارات کو الٹتا پلٹتا رہتا لیکن وہ تنہا نہیں ہوتا۔ اس کے ہمراہ ایک اچکا ہوا کرتا تھا جس کا نام کولنیز عرف ڈیپر ڈین تھا۔

اس دن ایک اسٹال پر کاؤنٹ وکٹر نے اچانک ایک روزنامہ تہہ کر کے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری کے سامنے رکھ دیا اور گویا ہوا۔ ''میں جانتا ہوں کہ ہمارا شکار کیا ہے لیکن میں نہیں جانتا کہ کون ہماری چھری تلے آئے گا۔ وہ جو کوئی بھی ہوگا اس کا تعلق فولاد کے سامان کی خرید و فروخت سے ہوگا۔ اس شخص نے حال ہی میں دو بڑے سودے کیے ہیں اور خوب مال کمایا ہے۔ اب وہ بڑی چیزوں کا سودا کرنا چاہتا ہے۔ یہ آئٹم پڑھو۔'' اس نے ایک چھوٹی سی خبر کی طرف اشارہ کیا۔

اس خبر کے مطابق انہیں ٹاور کی مرمت کی ضرورت تھی لیکن اس کی مرمت پر بے حد خرچ آرہا تھا۔ چنانچہ فرانسیسی حکومت اس بات کا جائزہ لے رہی تھی کہ اسے قائم رکھنے کی بجائے بیچ دینا سستا پڑے گا۔ خبر پڑھ کر ڈیپر ڈین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟'' وہ بولا۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''میرا خیال ہے کہ ہم ایسا کر سکتے ہیں۔'' کاؤنٹ وکٹر نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔ ''اخبار نے سب سے دشوار کام ہمارے لیے آسان کر دیا ہے۔ اب ہمیں صرف حکومت کا ایک سفارشی خط اور چند لیٹر ہیڈ درکار ہوں گے۔''

☆☆☆

اس کے چند ہی دنوں کے بعد لوہے کے پانچ بڑے کاروباریوں کو اس بیورو کے ڈپٹی ڈائریکٹرز کی جانب سے ذاتی خطوط موصول ہوئے جسے ایفل ٹاور پر عدالتی اختیار تھا۔ ان خطوط میں انہیں ملنے اور حکومت کا ایک ٹھیکا دینے کے سلسلے میں گفت و شنید کی دعوت دی گئی تھی۔ وقت تین بجے

مقرر کیا گیا تھا۔ دن جمعہ کا اور ملاقات کریلن ہوٹل میں ڈپٹی کے سوئٹ میں طے کی گئی تھی۔

وہ پانچوں تاجر مقررہ دن ہوٹل کے سوئٹ میں تشریف لے آئے۔ کاؤنٹ وکٹر اپنی میٹنگ کا آغاز کرتے ہوئے ان سے مخاطب ہوا۔ ''موسیو، پلیز...... میں آپ کی توجہ کا طالب ہوں۔ میں آپ کو حکومت کے ایک ایسے راز میں شریک کرنے والا ہوں جس سے صرف میں وزیراعظم اور صدر واقف ہیں۔'' س نے ڈرامائی وقفہ لیا۔ پھر گویا ہوا۔ ''حکومت ایفل ٹاور کو توڑنے والی ہے۔'' وہ ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ سوئٹ میں سناٹا چھا گیا۔

''شاید آپ کو یہ...... پتا ہو کہ یہ 1889ء میں ہونے والی پیرس ایکسپوزیشن کے موقع پر محض شہر کی عارضی دلکشی کے خیال سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد اسے شہر کا ایک مستقل حصہ بنانا ہرگز نہیں تھا۔ شروع ہی میں اس کی تعمیر نے باذوق شہریوں کی جمالیاتی حس کو مجروح کردیا تھا اور لوگ بھڑک اٹھے تھے۔ آپ اس کو اس زاویہ نظر سے دیکھیں۔''

کاؤنٹ کے معزز مہمان بڑی خوشی سے اس زاویہ نگاہ سے دیکھنے پر آمادہ تھے کیونکہ اس میں انہیں بھاری منافع نظر آرہا تھا۔ اس میٹنگ کے بعد کاؤنٹ وکٹر، اس پارٹی کو ایفل ٹاور کے معائنے کے لیے لے گیا۔ اس نے اپنی پارٹی کو شہتیروں کی تعداد، سائز اور وزن سے آگاہ کیا اور جب وہ انہیں بتا چکا تو اس نے گزارش کی کہ ڈیلر حضرات اپنا اپنا ٹینڈر سربمہر لفافہ میں اگلے بدھ تک اس کے ہوٹل بھیج دیں۔ ''اور یاد رکھیں۔'' اس نے آخر میں زور دے کر کہا۔ ''آپ حضرات حکومت کے ایک راز کے امین ہیں۔ مجھے آپ سے ہوش مندی کی توقع ہے۔''

☆☆☆

وہ اس گروپ کی سب سے مال دار پارٹی کو پہلے ہی منتخب کر چکا تھا۔ اس کا نام آندرے پواسن تھا۔ آندرے پواسن، بنیادی طور پر ایک دیہاتی تھا اور سماجی اعتبار سے احساسِ کمتری میں مبتلا تھا۔ وہ اپنی ذات کی یہ خامی دور کرنے کے لیے معاشرے میں بلند سے بلند مقام اور بڑی سے بڑی کامیابی حاصل کرنے کا سخت آرزومند تھا۔ ٹینڈر موصول ہونے میں کوئی تاخیر نہیں ہوئی۔ اگلے دن ڈیپرڈین نے آندرے پواسن کو فون پر اطلاع دی کہ اس کا ٹینڈر منظور ہوگیا۔

اگلے ہفتے تک آندرے پواسن نے رقم کا بندوبست کرلیا۔ ڈیپرڈین نے اسے وکٹر کے سوئٹ پر حتمی بات چیت کے لیے پھر کال کیا اور لوٹ کر وکٹر کو بتایا کہ شکار چھری تلے آنے سے پہلے خوف سے ممیا رہا ہے۔ ''وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ ہم میٹنگ کے لیے بیورو کے آفس کی بجائے ہوٹل کیوں استعمال کررہے ہیں؟'' وہ فون پر نروس لگ رہا تھا۔

شکار، میٹنگ کے لیے دیے گئے وقت پر ہوٹل پہنچ گیا۔ ''موسیو، پواسن۔'' وکٹر نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ ''مبارک ہو، ہمیں آپ کی کامیابی کا جام تجویز کرنا چاہیے۔''

''ابھی سودا تجویز نہیں ہوا ہے۔'' پواسن غرایا۔

''آہ، یقیناً...... پھر جام تجویز کرنے سے پہلے بزنس کی بات ہوجائے۔'' وکٹر نے کہا۔ پھر ڈیپرڈین کی طرف مڑا۔ ''تم واپس بیورو جاسکتے ہو۔ میں تین بجے اپنی میز پر ہوں گا۔''

کونیز یا ڈیپرڈین جیسے ہی ہوٹل سے رخصت ہوا وکٹر کا افسرانہ کروفر دور ہوگیا۔ ''موسیو'' وہ لجاجت سے بولا۔ ''ہمیں تھوڑی سی گفت و شنید کی ضرورت ہے۔'' اس نے ایک لحہ توقف کیا۔ پھر گویا ہوا۔ ''ایک سرکاری افسر کی زندگی آسان نہیں ہوتی۔ ہمیں عمدہ مہمان نوازی کرنی پڑتی ہے۔ بہترین لباس پہننا پڑتا ہے۔ ان سب کے باوجود ہمیں قلیل تنخواہ پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا حکومت کا ٹھیکا دینے کے لیے یہ دستور ہے کہ آفیسر انچارج کچھ وصول کرتا ہے۔''

''رشوت؟'' آندرے نے مداخلت کی۔

''موسیو، آپ بہت صاف گو ہیں۔''

''اور یہی وجہ ہے کہ ہم بیورو میں ملنے کی بجائے یہاں ملتے ہیں؟''

''آپ دانا ہیں۔'' وکٹر مسکرایا۔

آندرے نے اپنی جیب سے ایک چیک اور دوسری جیب سے ایک بٹوہ نکالا جو نوٹوں سے پھولا ہوا تھا۔ ''معاف کرنا، اب تو ہمیں کامیابی کا جام تجویز کرنا ہی ہوگا۔'' وکٹر معذرت خواہانہ مسکراہٹ کے ساتھ بار کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ نہ صرف آندرے کا چیک کیش کرا چکا تھا بلکہ آسٹریا روانہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

وہ اور کولنز، ایفل ٹاور کی فروخت اور رشوت کی رقم سے ویانا کے سب سے عالی شان ہوٹل میں ایک ماہ تک جی بھر کے عیش کرتے رہے۔ اس دوران میں وکٹر بلاناغہ پیرس

کے تمام روزناموں کا مطالعہ کرتا رہا۔ پھر وہ کولنز سے بولا۔
''آندرے اب تک پولیس کے پاس نہیں گیا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی مطلب ہوسکتا ہے۔ وہ اپنی فریب خوردگی تسلیم کرنے سے گھبرا رہا ہے اسے خوف ہے کہ اگر اس نے ایسا کیا تو پورے پیرس میں سب کے مذاق کا نشانہ بن جائے گا۔ لگتا ہے وہ یہ راز اپنے ساتھ اپنی قبر میں لے جائے گا اور چونکہ اس نے ایفل ٹاور کو اپنے قبضے میں نہیں لیا ہے چنانچہ ہم اسے دوبارہ بڑے آرام سے بیچ سکتے ہیں۔''
امریکا واپس پہنچ کر اس نے پام بیچ میں رہائش اختیار کی جو اس وقت امریکا کے امیر ترین لوگوں کی دل پسند تفریح گاہ تھی لیکن کاؤنٹ وکٹر کی آمد نے ان ارب پتی لوگوں کے درمیان ایک ہلچل مچا دی۔ وہ دنیا کی سب سے مہنگی اور چمچماتی رولس رائس کار میں پام بیچ کے سب سے عالی شان ہوٹل پہنچا جسے ایک جاپانی شوفر ڈرائیو کررہا تھا۔ ہوٹل کے رہائشی ارب پتی۔ اپنی گردنیں اچکا اچکا کر اس رئیس اعظم کی ایک جھلک دیکھنے کی کوشش کرنے لگے جس نے یک چشمی عینک پہن رکھی تھی لیکن اپنی آمد کے بعد دو دن تک صرف اپنے کمرے تک محدود رہا۔ اس دوران میں لوگوں کے تجسس میں اضافہ ہوتا رہا اور جب وہ نمودار ہوا تو ساحل پر دوسروں سے کچھ فاصلے پر ایک چھتری کے نیچے ایک کتاب لے کر نیم دراز ہوگیا۔
ایک گھنٹے کے بعد شوفر ایک ٹیلی گرام کے ساتھ بھاگا بھاگا آیا۔ کاؤنٹ نے ٹیلی گرام وصول کی اور کوئی جواب دینے سے انکار کردیا۔ اس دن اور اگلے دن وہی حرکت بار بار دہرائی جاتی رہی۔ تیسری سہ پہر تک وہ ہوٹل کے تمام باسیوں کی توجہ کا مرکز بن چکا تھا۔
ہفتے کے اواخر میں کاؤنٹ اپنی پُراسرار اور شاندار گوشہ نشینی سے باہر آیا اور اس نے لوگوں کے کانوں میں یہ بات ڈال دی کہ وہ ٹیلی گرام یورپین فائنسروں کی طرف سے بھیجے گئے تھے جو مختلف پروجیکٹ میں اس کے مالی تعاون اور مشورے کے طالب تھے لیکن چونکہ اسے مزید پیسا کمانے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی چنانچہ اس نے کسی بھی ٹیلی گرام کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس طرح اس نے اپنا پہلا ہدف حاصل کرلیا۔ ہوٹل کے باسیوں نے نہ صرف اسے خوش آمدید کہا بلکہ اس کی تلاش میں رہنے لگے۔
پھر جب ہرمین لولر نامی نو وارد کشتی رانی کا لباس پہنے چالیس، فٹ لمبی کشتی میں وہاں پہنچا تو وکٹر نے اس پر نگاہ رکھنے کا فیصلہ کرلیا اور جب اس نے اسے ہوٹل کے ویٹروں کو بڑی فیاضی سے ٹپ دیتے ہوئے منہ پھاڑ پھاڑ کر قہقہے لگاتے اور ہوٹل کے سرکردہ رہائشیوں سے میل جول بڑھانے میں ناکام ہوتے ہوئے دیکھا تو سمجھ گیا کہ اسے اس کا شکار مل گیا ہے۔ ایک ایسے شخص سے گفتگو چھیڑنا کوئی مشکل نہیں تھا جسے ہر شخص دھتکار رہا تھا۔
شروع شروع میں وکٹر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس طرح ہرمین لولر کو ٹریپ کرے لیکن گزرتے ہوئے دنوں کے ساتھ ساتھ اس نے رومانین باکس کے ذریعے ہرمین کی سادہ لوحی کو آزمانے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ پیسے بنانے کی ایک مشین تھی جس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس سے پانچ کے نوٹ کو دس کے نوٹ میں اور دس کے نوٹ کو بیس کے نوٹ میں تبدیل کیا جاسکتا تھا۔ یہ ایک بھدی، بدنما مشین تھی اور بیشتر لوگوں کو معلوم تھا کہ یہ محض ایک بھونڈا اور ناشائستہ مذاق ہے لیکن وکٹر کے ہاتھوں میں کوئی بھی شے بھدی اور بدنما نہیں ہوسکتی تھی۔ اس نے اس باکس کو اندر اور باہر سے پالش کرکے بہت خوش نما اور دیدہ زیب بنا دیا تھا جسے دیکھ کر کوئی بھی احمق دھوکا کھا سکتا تھا۔ وکٹر اس مشین کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔
ایک دن سہ پہر میں جب وہ دونوں ہرمین لولر کی خوش نما کشتی کے عقبی عرشے پر نیم دراز ایک دوسرے سے گپ شپ کررہے تھے کہ اس دوران میں ان کی باتوں کا رخ پیسے کمانے کی طرف مڑ گیا۔ ہرمین نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور گویا ہوا۔
''مجھے تم پر رشک آتا ہے۔ ایک امیر و کبیر نواب جسے گزر اوقات کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔''
''میں تمہیں بتاؤں میرے دوست کہ ایسا نہیں ہے۔'' وکٹر نے جواب دیا۔ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ایک بہت بڑے جاگیردار گھرانے کا چشم و چراغ ہوں لیکن ہمارے کاشت کاروں کی بغاوت کے نتیجے میں ہمیں اپنی زمینوں سے ہاتھ دھونے پڑ گئے۔ انہوں نے ہم سے ہمارا سب کچھ چھین لیا۔ اس کے بعد ہم پر بڑی مصیبتیں ٹوٹیں۔''
ہرمین بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور اس کے خاموش ہونے پر اسے منتظر نظروں سے تکنے لگا تھا۔ وکٹر دوبارہ گویا ہوا۔ ''دراصل میرے پاس ایک خاص مشین ہے۔''
''خاص مشین؟ وہ کیا؟'' ہرمین نے قدرے چونک

کر پوچھا۔

"ایک ایسی خاص مشین جو ایک سادہ کاغذ کے ٹکڑے کو کیمیاوی پروسیس کے ذریعے اصلی نوٹ میں تبدیل کر دیتی ہے۔ بالکل اصلی نوٹ میں۔" ہرمین اسے غیر یقینی نظروں سے گھورنے لگا۔ "تم یقیناً مذاق کر رہے ہو۔" وہ بولا۔

"قطعی نہیں، میرے دوست۔" وکٹر نے مستحکم لہجے میں جواب دیا۔ "کیا تم نے ایمل ڈیوبرے کا نام سنا ہے؟ نہیں؟ وہ ایک کیمیکل انجینئر تھا۔ ایک جینئس......!"

اس کے ساتھ ہی وہ بین الاقوامی جعلسازی اور فریب دہی کی لمبی من گھڑت داستانیں سنانے لگا جس کا لب لباب یہ تھا کہ اس مرحوم جینئس کی ایجاد کردہ پیسے بنانے کی اس مشین کا واحد ماڈل اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

"لیکن اگر تم پکڑے گئے تو؟" ہرمین پوچھ بیٹھا۔ "میرا مطلب ہے...... جعلسازی کرتے ہوئے۔"

"میں جعلسازی نہیں کر رہا میرے دوست۔" وکٹر نے جواب دیا۔ "میں بالکل اصلی کرنسی کو دوبارہ چھاپ رہا ہوں جس کی شناخت ناممکن ہے۔ سارے بینک اسے قبول کرتے ہیں۔ کیا میں آج سہ پہر میں ایک ہزار ڈالر کا نوٹ چھاپ کر تمہیں دکھاؤں؟"

"ہاں بڑے شوق سے۔" ہرمین تیار ہو گیا۔

وہ دونوں عرشے سے اٹھ کر وکٹر کے کمرے میں آئے۔ وکٹر نے ایک دیوار گیر شیلف میں سے ایک چھوٹا سا ڈبا نکالا۔ اس کے دونوں طرف تنگ شگاف بنے ہوئے تھے اور ایک طرف پیتل کے چمکتے ہوئے ناب اور ڈائل تھے۔ یہ ڈبا دیکھنے میں اس قدر دیدہ زیب اور خوش نما تھا کہ کوئی بہت ہی بیش قیمت اور غیر معمولی اثاثہ لگتا تھا۔ اب وکٹر نے ایک ہزار ڈالر کا ایک نوٹ نکالا اور ہرمین کی طرف بڑھاتے ہوئے مخاطب ہوا۔

"تم اچھی طرح اس کا معائنہ کرلو۔"

ہرمین نے اس نوٹ کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ بلاشبہ اصلی نوٹ تھا۔ وکٹر نے وہ نوٹ اس سے لے کر مشین کے ایک شگاف میں داخل کر دیا۔ پھر ہو بہو اس نوٹ کے سائز کا کٹا ہوا کاغذ کا ایک ٹکڑا مشین کے دوسرے شگاف میں داخل کیا اور بڑی سنجیدگی اور مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مشین کے ناب کے سلسلے کو موزوں کیا۔ پھر ہرمین سے مخاطب ہوا۔ "اب اس نوٹ اور سادہ کاغذ دونوں کا کیمیاوی عمل شروع ہو گیا ہے جس کے تحت اس نوٹ کی ساری چھپائی من وعن اس کاغذ پر منتقل ہو رہی ہے۔" اس نے وضاحت کی۔ "اس کیمیاوی عمل کے ہونے میں چھ گھنٹے لگتے ہیں۔"

اس کے ٹھیک چھ گھنٹے کے بعد وہ دونوں وکٹر کے ہوٹل کے کمرے میں لوٹے۔ وکٹر نے بڑی احتیاط سے سارے ناب کو دوبارہ سیٹ کیا۔ پھر Ejecter کے لیور کو گھمایا۔ فوراً ہی ہزار ہزار ڈالر کے دو نوٹ باہر آ گئے۔ وکٹر نے ہرمین کے معائنے کے لیے وہ دونوں نوٹ اس کے سامنے کر دیے۔ ہرمین کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

"تم ایسا کرو کہ ایک ایک نوٹ معائنہ کے لیے دو مختلف بینکوں میں لے جاؤ۔" وکٹر نے اس سے کہا۔ "تاکہ کسی کو ہمارے اس چھوٹے سے راز کے بابت کوئی شبہ نہ ہو۔"

ہرمین نے ویسا ہی کیا۔ وہ دونوں نوٹ لے کر ہوٹل سے نکل گیا اور جب لوٹا تو قائل ہو گیا تھا۔ وکٹر کو اس بات کی توقع تھی اور وہ جانتا تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ اس نے ہرمین کو بے وقوف بنانے کے لیے جو چال چلی تھی وہ صرف یہ تھی کہ اس نے اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہلی بار ہرمین کے قدم رکھنے سے پہلے ہی ہزار ڈالر کا ایک نوٹ اس مشین میں چھپا دیا تھا۔ وہ دونوں نوٹ بالکل اصلی تھے۔

"کاؤنٹ۔" ہرمین نے پوچھا۔ "کیا دنیا بھر میں یہی واحد مشین ہے؟"

"ہاں بالکل۔" وکٹر نے مستحکم لہجے میں جواب دیا۔

ہرمین نے زبان پھیر کر اپنے ہونٹوں کو تر کیا۔ "کیا...... کیا تم یہ مشین مجھے فروخت کرو گے؟ میں تمہیں پچیس ہزار ڈالر دوں گا۔ فی الوقت میرے پاس اتنی ہی رقم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بہت بڑی فرمائش ہے جو میں کر رہا ہوں لیکن...... لیکن تم اپنے لیے ایک دوسری مشین بنا سکتے ہو۔" اس کا لہجہ لعنت آمیز تھا۔

"ہرمین، تم میرے دوست ہو۔" وکٹر واضح طور پر ایک لمحے کو ہچکچا کر بولا۔ "اور ایک دوست کی فرمائش کو رد کرنا مجھے زیب نہیں دیتا۔ یہ مشین ہے تو نایاب اور اس اعتبار سے اس کی صحیح قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا لیکن جب تم کہتے ہو کہ سردست تمہارے پاس صرف پچیس ہزار ڈالر ہیں تو......!"

اگلے دن وکٹر ہرمین کے پچیس ہزار ڈالر سمیت ہوٹل

سے رفو چکر ہو گیا۔ چونکہ اس مشین کو آپریٹ ہونے میں چھ گھنٹے لگتے تھے چنانچہ وکٹر نے اندازہ لگایا کہ اتنی مدت میں تو وہ کہیں سے کہیں پہنچ چکا ہوگا۔

لیکن جیسا کہ ظاہر ہوا اسے فرار ہونے کے لیے اس سے بھی بہت زیادہ وقت مل گیا۔ ہرمین ایک احمق اور ضدی شخص تھا۔ وہ اتنی جلدی اس فریب کے جال سے باہر نکلنے کو تیار نہیں تھا۔ جب مشین نے کام نہیں کیا تو وہ یہی سمجھا کہ اس نے مشین کو غلط آپریٹ کیا ہے اور وہ اسے دوبارہ آپریٹ کرنے کے جتن کرنے لگا۔ اس کوشش میں اسے کئی دن نہیں بلکہ کئی ہفتے لگ گئے۔ اس دوران میں وہ اپنے کاروبار کی طرف سے بھی بالکل غافل ہو چکا تھا۔ بالآخر ایک دن اس کی بیوی نے طیش میں آ کر اس مشین کو ایک ہتھوڑے سے توڑ ڈالا ''احمق، نامعقول۔'' وہ حلق پھاڑ کر چیخی۔

☆☆☆

ہرمین سے، پچیس ہزار ڈالر اینٹھنے کے بعد وکٹر پام بیچ سے فرار ہو کر سیدھے ہالی ووڈ اور پھر وہاں سے اسٹیلا سوتی کے ہمراہ ہوانا پہنچا تھا جہاں اس نے رونالڈ ڈاج کو چونتیس ہزار ڈالر سے محروم کر دیا تھا اور پھر پیرس سے، واپس امریکا پہنچ کر پولیس سے بچنے کے لیے سیکرٹ سروس کو استعمال کیا تھا۔ پھر وہ نیویارک سے سیدھے اوکلاہاما چلا گیا لیکن یہاں اس سے چوک ہو گئی۔ وہ اوکلاہاما میں جعلی بونڈز بیچتا ہوا پکڑا گیا اور اسے جیل میں ہوا کھانی پڑی لیکن وہ جانتا تھا کہ اسے مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ جعلی بونڈز کی فریب دہی کا کوئی گواہ نہیں تھا لیکن ساتھ ہی اسے یہ خدشہ بھی لاحق تھا کہ جب اس کی گرفتاری کی خبر مشرق میں پولیس ڈیپارٹمنٹ تک پہنچے گی تو ڈاج کی طرف سے اسے بے حد مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

وہ جیل صرف ایک کوٹھری پر مشتمل تھی جس میں وہ قید تھا چنانچہ وکٹر نے جلد ہی شیرف رچرڈ سے گپ شپ شروع کر دی۔ اس نے شیرف کو غیر ممالک کے دارالخلافوں میں اونچی سوسائٹی کی ہوشربا داستانیں سنا سنا کر مسحور کر دیا۔ اس موقع پر شیرف رچرڈ بھی اپنی بڑی بڑی پارٹیوں کا ذکر کر کے وکٹر کو متاثر کرنے کی کوشش کرنے اور شیخی بگھارنے لگا۔ ان لن ترانیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ صید اور صیاد دونوں ہی میز پر ایک ساتھ بیٹھے وہسکی کی چسکیاں لینے کے ساتھ ہی ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ وہ شراب حال ہی میں ایک جگہ سے ضبط کی گئی تھی۔ جب شراب شیرف پر اثر دکھانے لگی تو وہ آہستہ آہستہ مزید کھلنے لگا۔ آخر کار اس نے وکٹر پر اپنا یہ راز افشا کر دیا کہ وہ پبلک فنڈز میں خرد برد کرتا رہا تھا۔ وہ کاؤنٹی کا خزانچی بھی تھا۔ وہ رقم خود پر خرچ کر کے راتوں کو رنگین کرتا تھا۔ اب اس کے اکاؤنٹ میں پچیس ہزار ڈالر تھے جو کہ کم تھے اور وہ بے حد پریشان تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں اس کمی کو کیسے پورا کروں گا۔'' وہ رازداری سے بولا۔

وکٹر نے اس کے گلاس میں مزید شراب انڈیلی اور اس سے ہمدردی کے اظہار میں سر ہلانے لگا۔ ''اتنی رقم تو میں نے ایک سہ پہر ایک ہی جھٹکے میں کمالی تھی۔'' وہ شانِ بے نیازی سے اپنے شانے اچکا کر بولا۔

''ایک ہی جھٹکے میں؟......تم نے......؟ وہ کیسے؟''

''میرے پاس ایک مشین ہے جو کرنسی کو دگنا کر دیتی ہے۔'' وکٹر نے رسان سے جواب دیا اور پھر اسے تفصیل سے ''رومانین باکس'' کے بابت بتانے لگا۔ ''اگر تم میرے سوٹ کیس میں سے وہ مشین نکال کر لے آؤ تو میں ابھی اس کا عملی مظاہرہ کر کے تمہیں دکھا سکتا ہوں۔'' آخر میں وہ بولا۔

اس عملی مظاہرے کے نتیجے میں اگلی صبح وکٹر کو نہ صرف قید سے رہائی مل گئی بلکہ اس کی جیب میں دس ہزار ڈالر بھی آ گئے۔ یہ رقم شیرف نے اس یقین اور اعتماد کے ساتھ کاؤنٹی کے فنڈ سے نکال کر اسے دیے کہ اس مشین سے نہ صرف یہ کہ اس کے سارے نقصانات کی تلافی ہو جائے گی بلکہ وہ بہت جلد امیر کبیر بن جائے گا۔

☆☆☆

وہ مارچ کا مہینا تھا۔ اگلے نومبر میں وکٹر، شکاگو میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں آرام کر رہا تھا کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور اگلے ہی لمحے اسے ایک ریوالر کی نال نظر آئی جو اس پر تنی ہوئی تھی۔ اس ریوالور کے عقب میں شیرف رچرڈ کا غصے سے لال بھبوکا چہرہ تھا۔ ''تمہیں تلاش کرنے میں مجھے کئی مہینے لگ گئے۔'' رچرڈ حلق پھاڑ کر چیخا۔ ''اب میں تمہیں قتل کر دوں گا۔''

''کیوں؟ ماجرا کیا ہے، شیرف؟'' وکٹر نے بڑے سکون سے پوچھا۔

''وہ مشین کام نہیں کرتی۔'' شیرف دہاڑا۔

وکٹر کے چہرے سے حیرت اور بے یقینی برسنے لگی۔

"یہ ناممکن ہے۔" وہ بولا۔

"کیا تم نے داہنی طرف والے ناب کو دو بار گھمایا تھا اور کیا اسے واپس اس کے ہندسے پر بائیں طرف لکھا تھا؟ پھر کیا اس کے دس سیکنڈ کے بعد سوئچ آن کیا تھا؟ ٹھیک دس سیکنڈ کے بعد؟ نہ نو سیکنڈ اور نہ گیارہ سیکنڈ کے بعد؟ پھر کیا تم نے کمپریسر کو گھمانے سے پہلے اشارہ دینے والے ناب کو تین مرحلوں پر سیٹ کیا تھا؟"

شیرف کا ریوالور والا ہاتھ نرم پڑ گیا۔ "میں نہیں جانتا...... میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ مشین کام نہیں کرتی۔" وہ بولا۔

وکٹر نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ہاتھ کا کام کرنے میں اتنے ماہر نہیں ہو کہ اس مشین کو آپریٹ کر سکو۔ اب میں صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ تمہاری خاطر وہاں جاؤں اور مشین کو آپریٹ کروں لیکن بدقسمتی سے میں اپنے کام میں اس قدر الجھا ہوا ہوں کہ......!"

شیرف نے پھر اس پر ریوالور تان لیا۔

"لیکن......" وکٹر جلدی سے بول پڑا۔ "میں تمہارے دس ہزار ڈالر تمہیں لوٹا دیتا ہوں۔" یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے پرس میں سے سو سو ڈالر کے کرارے نوٹ نکال کر دس ہزار ڈالر گن کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

شیرف حیرت سے گنگ ان نوٹوں کو گھورتا چلا گیا۔ پھر اس نے اپنا ریوالور اپنی جیب میں رکھ لیا۔ "تمہاری بڑی نوازش۔" وہ منمنایا۔

"بالکل نہیں۔" وکٹر نے خندہ پیشانی سے کہا اور اسے دروازے کی طرف لے چلا۔ "جب میں اس مشین کو ٹھیک کرنے آؤں گا تو تم یہ رقم مجھے لوٹا دینا۔" اس نے اپنا بازو شیرف کے شانے کے گرد حمائل کر دیا۔ "تم نے چند برے مہینے گزارے ہیں لیکن اب جب کہ یہ معاملہ صاف ہو گیا ہے۔ تو میرا خیال ہے کہ تم اس رقم میں سے چھوٹا موٹا جشن منانے کا حق رکھتے ہو، تو کیوں نہ تھوڑی سی رقم خرچ کر لو۔"

"یہ تو بہت عمدہ آئیڈیا ہے۔" شیرف خوش ہو کر بولا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اس دن کے بعد سے وکٹر ہر صبح نیو اورلینز سے شائع ہونے والا ہر روزنامہ خریدنے لگا۔ چوتھے دن اسے وہ خبر مل گئی جس کی اسے تلاش تھی۔ وہ خبر یہ تھی۔ "اوکلاہاما کے ریمین کاؤنٹی کا شیرف ایس آر رچرڈ گرفتار۔ اسے بوربن اسٹریٹ پر سو ڈالر کا ایک جعلی نوٹ چلاتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا۔"

بعدازاں اس پر مقدمہ چلا اور اسے وفاقی جیل بھیج دیا گیا۔ ظاہر ہے وکٹر نے اسے جو کرارے نوٹ دیے تھے وہ جعلی تھے۔

☆☆☆

ہمارے آپریشن کا آغاز 1934ء میں اس وقت ہوا جب مجھ سمیت ملک بھر کے تمام حصوں سے سولہ سیکرٹ ایجنٹوں کو ایک اسپیشل اسکواڈ تشکیل دینے کے لیے نیویارک طلب کیا گیا۔ ہمیں اس بات کا کوئی علم نہیں تھا کہ ہمیں کیوں طلب کیا گیا تھا لیکن ہم یہ ضرور جانتے تھے کہ معاملہ غیر معمولی اہم رہا ہوگا۔ وہاں ہمارے اکٹھا ہوتے ہی اس آپریشن کے سربراہ یعنی ہمارے باس رابرٹ گاڈبائی فوراً اپنے مطلب پر آ گئے۔

"ہمارے اسٹیٹ بینک کو ماہانہ ایک لاکھ کی شرح سے جعلی نوٹ مل رہے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

کانفرنس کی میز کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سیٹی کی مدھم آواز پھیل گئی۔ باس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "یہ ملک کی تاریخ میں ایک ریکارڈ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اگر ماہانہ ایک لاکھ ڈالر کے جعلی نوٹ گردش کر رہے ہیں تو اس سے دگنی تعداد میں چھاپے جا رہے ہوں گے۔"

انہوں نے ایک لفافہ کھول کر اندر سے سو ڈالر کا ایک نوٹ نکالا۔ "اس نوٹ کو دیکھیں۔" وہ بولے۔

ہم سب نے باری باری اس نوٹ کا معائنہ کیا اور انگشت بدنداں رہ گئے۔ کسی ماہر کے سوا کوئی بھی اسے جعلی نہیں کہہ سکتا تھا۔ ہم نے آج تک اتنا عمدہ جعلی نوٹ نہیں دیکھا تھا۔ اسے نقل یہ مطابق اصل کہا جاتا تو قطعی بے جا نہ ہوتا۔ کانفرنس روم میں مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ ہونے لگی۔ ہم لوگ باس سے سوال کرنے لگے۔ اس کا کوئی اتا پتا؟ یہ کاغذ کہاں سے آیا؟ روشنائی کہاں سے آئی؟ تانبے کی پلیٹ کہاں سے آئی؟ نقش کندہ کرنے والے کی شناخت کیسے ہو گی؟ اس کا کوئی سراغ ہے؟ وہ کہاں آپریٹ کر رہا ہے؟ ان سب سوالوں کے جواب میں گاڈبائی نے نفی میں سر ہلایا۔

"اسی کا تو ہمیں سراغ لگانا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "اور ہمیں چوبیس گھنٹے یہی کام کرتے رہنا ہے۔" اس نے اپنی انگلی سے اس جعلی نوٹ کو کھڑکھڑایا۔ "ہمیں ہر صورت میں ان پلیٹوں کا سراغ لگانا ہے۔"

☆☆☆

میرا پہلا قدم مخبروں سے رابطہ کرنا تھا لیکن مجھے ان سے کوئی معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔ اس کے بعد ہم کاغذ سپلائی کرنے والوں کے پاس گئے۔ پھر تانبے کی پلیٹیں بنانے والے اور چھاپنے کی روشنائی بنانے والے کے پاس گئے لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ پھر ایک صبح گاڈبائی نے ہم سب کو طلب کرلیا اور اعلان کیا۔ ”ہمیں نقش بنانے والے کا پتا چل گیا ہے۔“

ہم لوگ اپنی نشستوں پر یکبارگی اچھل پڑے۔ گاڈبائی نے اپنا گلا کھنکار کر صاف کیا اور دوسرا انکشاف کیا۔ ”اس کا نام ولیم راٹس ہے۔ اس نے آج سے سات سال پہلے بھی جعلی نوٹ بنائے تھے لیکن وہ کچھ زیادہ گردش میں نہیں آسکے۔ واشنگٹن کے بیورو نے اس پہلے والے نوٹ کے نمونے سے اس نوٹ کا موازنہ کیا ہے اور انہیں یقین ہے کہ ولیم واٹس ہی ہمارا مطلوبہ شخص ہے۔“

اس کے بعد گاڈبائی نے ولیم واٹس کی ایک تصویر ہمیں دیکھنے کو دی اور کہا۔ ”ہمیں اس سے زیادہ کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔“ پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔ ”واٹس، ایک گریجویٹ فارماسسٹ ہے۔ وہ 1920ء کے عشرے میں اوکلاہاما میں ایک ڈرگ اسٹور چلایا کرتا تھا۔ پھر 1925ء کے آس پاس وہ شکاگو میں نمودار ہوا اور ال کپون کے وہسکی کے جعلی لیبل تیار کرنے لگا۔ وہ ایک نہایت کم گو اور کم آمیز شخص تھا۔ زیادہ دوست نہیں بناتا تھا اور پچھلے سات سال سے آس پاس کہیں نظر بھی نہیں آرہا ہے۔ صرف ایک ہی شخص ہے جو اس کا قریبی دوست لگتا ہے اور وہ ہے..... وکٹر لسٹیگ۔“

”لیکن لسٹیگ اتنا گھامڑ نہیں ہے کہ خود کو جعلسازی میں ملوث کرے گا۔“ میں نے اعتراض کیا۔

☆☆☆

ہم بڑے خوش ہوئے کہ ہمیں وکٹر لسٹیگ کو پکڑنے کا ایک قانونی جواز مل گیا تھا لیکن دنیا بھر کے اہم شہروں کے پولیس ڈیپارٹمنٹ سے تفتیش در تفتیش کے باوجود کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوسکا۔ ہاں ہماری محنت یہ رنگ لائی کہ ہمیں اس کا ایک بہت ہلکا سا سراغ مل گیا۔ لہٰذا ہم اس سراغ کے پیچھے چل پڑے کیونکہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی سراغ نہیں تھا۔ حال ہی میں وکٹر، پٹیس برگ پولیس کی نگاہوں میں آیا تھا۔ اس بناء پر نہیں کہ اس کے خلاف کوئی الزام تھا بلکہ صرف اس بنا پر کہ وہ حنا اسمتھ نامی ایک خاتون کے ساتھ نظر آتا رہا تھا جو ایک دلالہ تھی۔ اس کی دو کال گرلز کے درمیان حسد کے جذبے نے اتنا اودھم مچایا تھا کہ مادام حنا کو فوری شہر چھوڑ کر بھاگنا پڑ گیا تھا۔

جیسے جیسے ہفتے گزرتے گئے ویسے ویسے حنا اسمتھ اور وکٹر کے سراغ کے پیچھے بھاگتے ہوئے ہم جعلسازی سے دور..... مزید دور ہوتے چلے گئے۔ لیکن پھر ایک دن نیویارک کے وائس اسکواڈ نے ہمیں یہ اطلاع دی کہ وہ لوگ مادام کے گرد گھیرا تنگ کرنے والے ہیں۔ وہ لوگ اسے پارک ایونیو کے سامنے واقع اس کے ایک اپارٹمنٹ سے گرفتار کرنا چاہتے تھے لیکن ہم نے ان سے درخواست کی کہ جب تک ہم اپنی کارروائی مکمل نہ کرلیں، وہ لوگ اسے گرفتار نہ کریں وہ لوگ مان گئے۔ ہمارے پاس حنا کی ایک خاصی اچھی تصویر تھی چنانچہ ہم اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کے باہر اکٹھا ہو کر انتظار کرنے لگے۔ ایک گھنٹا گزر گیا۔ پھر دو پھر چار آٹھ اور پھر بارہ گھنٹے گزر گئے۔ ہم اپنی جگہ کھڑے رہے۔ آخر کار مادام حنا باہر نکلی۔ ہم اسے فوراً پہچان گئے۔ ہم نے فوراً اس کو بگ کیا اور چونکہ ہم جانتے تھے کہ اس نے وکٹر کو اپنے دوستوں سے مسٹر فرینک کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا۔ لہٰذا ہم نے اس عرفیت کو اس کے دیگر ناموں میں شامل کرلیا اور حنا کی گفتگو سننے بیٹھ گئے۔

اسی طرح کئی ہفتے گزر گئے لیکن سوائے بکواس کے کوئی قابل ذکر بات سننے کو نہیں ملی۔ پھر ایک سہ پہر گاڈبائی کو ایک ایجنٹ کی کال موصول ہوئی جو حنا کی گفتگو کا ٹیپ سننے کی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ گاڈبائی نے اس کی بات سن کر ریسیور ایک دھماکے سے رکھ دیا اور میری طرف مڑا۔ ”مسٹر فرینک لین وکٹر لسٹیگ نے ابھی ابھی حنا کو کال کیا تھا۔ وہ ایک گھنٹے کے اندر اس سے ملنے اس کے اپارٹمنٹ آرہا ہے۔ تم اور سیکلر اس کے اپارٹمنٹ کے باہر نگرانی شروع کردو۔ وکٹر کے قریب جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اس کی شناخت کرلو اور مزید احکامات کے لیے ہمیں فون کرو۔“ سیکلر نے اور میں نے اپنے ہیٹ اٹھائے اور باہر کی طرف بھاگے۔

☆☆☆

ہم دو گھنٹے تک حنا اسمتھ کے اپارٹمنٹ کے باہر کھڑے رہے اور پھر یہ سوچنے لگے کہ شاید ہم ”مسٹر فرینک لین“ کو کھو بیٹھے ہیں۔ ہمارے پاس وکٹر کی جو تصویر تھی وہ چھ

سال پرانی تھی۔ اس عرصے میں وہ کافی بدل چکا ہوگا۔ میں نے ہیڈکوارٹرز سے رابطہ قائم کیا لیکن انہیں ٹیپ پر کوئی نئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ میں فون کر کے لوٹا ہی تھا کہ اچانک سیکلر نے میرا بازو پکڑلیا اور سڑک کے دوسری طرف اشارہ کیا۔ ایک خوش پوش آدمی ابھی ابھی اپارٹمنٹ بلڈنگ سے برآمد ہوا تھا۔ کیا وہ وکٹر لسٹیگ تھا؟ ہم اس کا تعاقب کرنے لگے۔ میں اس کے چلنے کے انداز پر غور کرنے لگا۔ بیشتر امریکیوں کی چال بامقصد ہوتی ہے جب کہ یورپین کا انداز چہل قدمی کرنے کا ہوتا ہے۔ وہ شخص بھی چہل قدمی کررہا تھا۔ میں اور سیکلر سڑک کے دونوں طرف سے اس کا تعاقب کررہے تھے لیکن اس سے پہلے کہ ہم اس کا قریبی جائزہ لیتے وہ ایک نکڑ سے مڑکر ایک ڈرگ اسٹور میں داخل ہوگیا۔ میں سیکلر سے جاملا۔

''وہ اپنے سائے سے بھی بدکا ہوا ہے۔'' سیکلر نے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ وہ ہم سے باخبر ہوگیا ہے لیکن ہمیں بہت احتیاط سے اسے سنبھالنا ہوگا۔''

میں خاموشی سے ڈرگ اسٹور میں داخل ہوا اور میں نے فون بوتھ سے گاوبائی کو فون کیا۔ میں اس سے رابطہ ملنے کا انتظار کررہا تھا کہ اسی دوران میں وکٹر کاؤنٹر پر سے مڑا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اس کے چہرے کی ایک جھلک نظر آئی اور میں فوراً اسے پہچان گیا۔ وہ وکٹر ہی تھا۔

''ہاں۔'' اسی وقت دوسری طرف سے گاوبائی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''مسٹر فرینک ہی وکٹر لسٹیگ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس وقت وہ میرے سامنے ہے اور میں اسے دیکھ رہا ہوں۔''

''اس کے ساتھ رہو۔'' باس نے حکم دیا۔

''ڈبھو چیف۔'' میں نے جواب دیا۔ ''سڑک پر اس سے نمٹنا بہت مشکل ہوگا۔ وہ اپنے سائے سے بھی بدکا ہوا ہے۔ اگر یہ شخص ہمیں مطلوب ہے تو ہمیں اسے ابھی گرفتار کرنا ہوگا۔''

''مجھے ہدایات کے لیے واشنگٹن کال کرنی ہوگی۔'' چیف نے جواب میں کہا۔ ''اس دوران میں اس کا پیچھا کرتے رہو اور ایک گھنٹے کے بعد دوبارہ کال کرو۔''

میں نے ریسیور رکھ دیا اور وکٹر ڈرگ اسٹور سے نکل گیا۔ میں باہر نکل کر سیکلر سے جاملا۔ اس نے اپنے سر سے جنوب کی طرف اشارہ کیا۔ اسی وقت وکٹر سڑک کے

بچوں کو دودھ پلانے والی ماؤں کا بلڈ پریشر

ماؤں کی جانب سے شیرخواروں کو دودھ پلانے کا فائدہ صرف بچوں کو ہی نہیں ہوتا بلکہ خود مائیں بھی اس سے مستفید ہوتی ہیں۔ ایک نئے طبی جائزے میں انکشاف کیا گیا ہے کہ دودھ پلانے کے کئی سال بعد بھی ماؤں کے بلڈ پریشر بڑھنے کا امکان کم ہوتا ہے۔ یونیورسٹی آف ویسٹرن سڈنی اسکول آف میڈیسن کے ریسرچرز نے دیکھا ہے کہ خواتین اپنے بچوں کو جتنے زیادہ عرصے تک اپنا دودھ پلاتی ہیں 64 سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے تک ان میں ہائی بلڈ پریشر کا امکان اتنا ہی کم ہوتا ہے تاہم 64 سال کی عمر کے بعد اس فائدے کا امکان گھٹنے لگتا ہے۔ ریسرچ نے بریسٹ فیڈنگ اور ہائی بلڈ پریشر میں تعلق کو سمجھنے کے لیے 74 ہزار 785 آسٹریلوی خواتین کے بارے میں تفتیش کی جو 45 سال یا اس سے زیادہ عمر کی تھیں۔

مرسلہ: زویا فرہاد، جہلم

کنارے کھڑی ہوئی ایک کار میں بیٹھ گیا۔ اسٹیئرنگ وہیل پر ڈرائیور موجود تھا اور انجن چل رہا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی کار تیزی سے روانہ ہوکر ٹریفک میں شامل ہوگئی۔

''جلدی۔'' سیکلر میرا بازو تھام کر چیخی۔

خوش قسمتی سے ہماری کار بھی وہیں پارک تھی میں اچھل کر اسٹیئرنگ وہیل پر بیٹھ گیا اور ہم تیزی سے وکٹر کے تعاقب میں روانہ ہوگئے لیکن ٹریفک اتنا پرہجوم تھا کہ ہم اچانک ہی اسے کھو بیٹھے۔ میں مختلف سڑکوں پر گاڑی کو گھمانے لگا کہ شاید کہیں اس کی جھلک نظر آجائے لیکن بے سود۔ اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ آخرکار ہم مایوس ہوکر واپس حنا اسمتھ کے اپارٹمنٹ پہنچ گئے۔ گاوبائی اور دیگر چار ایجنٹ حنا کے اپارٹمنٹ کے باہر کھڑے ہمارا انتظار کررہے تھے۔ ہم چیف کو تفصیل بتانے لگے اور وہ اگلے منصوبے کے بارے میں ہدایات دینے لگا۔ میں اس کی باتیں بے دلی سے سن رہا تھا اور اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس کی حماقت اور بروقت فیصلہ کرنے میں ناکام ہونے کی وجہ سے وکٹر ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور ہماری ساری محنت پر پانی پھیر گیا تھا لیکن وہ ہمارا باس تھا۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

اچانک ایک منظر میری نگاہوں کے سامنے تیر گیا۔ وہ وکٹر کی کار تھی اور اس میں وکٹر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ڈرائیور سے تیز تیز

باتیں کر رہا تھا۔

"یہی ہے وہ۔" میرے منہ سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔ "یہ لسٹیگ ہے۔"

سب لوگ مڑ کر دیکھنے لگے۔ وہ کار ہماری نگاہوں کے سامنے آدھے بلاک کے فاصلے پر سڑک کے کنارے رک گئی۔ چیف میری طرف مڑا۔ "جانسن، تم اسے اٹھا لو...... اسمتھ، تم ڈرائیور کو پکڑو۔ ربانو اور سیکلر تم انہیں کور کرو۔ بہت احتیاط کی ضرورت ہے وہ مسلح ہو سکتے ہیں۔ اب چلو، چلیں۔"

میں نے ہولسٹر میں اپنی گن کو ڈھیلا کیا اور سڑک پر تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ وکٹر اور اس کا ڈرائیور اب بھی باتوں میں مصروف تھے۔ میں کار کے قریب پہنچا۔ اچانک مڑا اور کار کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول کر میں نے وکٹر کو بازو سے پکڑ لیا۔ "سیکرٹ سروس۔" میں غرایا۔

وہ اس ناگہانی افتاد پر ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے اسے کھینچ کر کار سے اتارا اور اس کی جامہ تلاشی لی لیکن اس کے پاس کوئی گن نہیں تھی۔ اسمتھ نے ڈرائیور کو پکڑ لیا تھا اور اب ہمارے اسکواڈ نے انہیں گھیر لیا تھا۔

"آخر یہ سب کیا ہے؟" وکٹر نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر معصومیت سے پوچھا۔ پھر اس نے ہم چاروں کی طرف دیکھا جو اس کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے اور اس کی نظر پیٹر ربانو پر پڑ گئی۔ "اوہ، تم تو مجھے یاد ہو۔" وہ بولا۔

☆☆☆

ہم اسے پکڑ کر لے آئے اور اگلے چوبیس گھنٹے تک اس سے پوچھ گچھ کرتے رہے۔ وہ ہم سے اس طرح باتیں کرتا رہا گویا کوئی میزبان ڈنر پر اپنے مہمانوں کو اپنی دلچسپ اور پرلطف باتوں سے محظوظ کر رہا ہو لیکن چونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے خلاف ہمارے پاس صرف جعلسازی کا الزام تھا جس پر ہم اسے اندر کر سکتے تھے چنانچہ اس نے جعلسازی کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ اس کی زبانی ہمیں یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک نئے شکار کو شیشے میں اتار چکا تھا اور اس شام اسے اس شکار سے ملنا تھا۔

"آپ حضرات ایسا کریں کہ مجھے رہا کر دیں تاکہ میں اپنا یہ بزنس اپائنٹمنٹ رکھ سکوں۔ اس کے بعد میں یہاں لوٹ آؤں گا یہ میرا وعدہ ہے۔"

"کیا تم مذاق کر رہے ہو؟" چیف گاڈ بائی حیرت سے بولا۔ "کیا تم مجھ سے یہ توقع کر رہے ہو کہ میں تمہیں رہا کر دوں تاکہ تم ایک اور جرم کا ارتکاب کر سکو؟"

"وہ ذاتِ شریف جس سے میں ملنے جا رہا ہوں، مجھے دس ہزار ڈالر دے گا۔" وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "اگر میں اسے اس خوشی سے محروم رکھوں تو یہ بڑی زیادتی ہو گی۔"

چیف نے یہ سن کر ایک ایجنٹ کو اس شکار کے پاس بھیجا تاکہ وہ اسے بتائے کہ اسے تقریباً ٹھگ لیا گیا ہے۔ ایجنٹ چلا گیا اور جب واپس آیا تو اس نے ہمیں بتایا کہ وہ شخص سخت چراغ پا تھا۔ وکٹر پر نہیں بلکہ ہم پر۔ اس شخص کا خیال تھا کہ ہم نے اسے پیسا کمانے سے روک دیا ہے۔ وہ ہم پر سخت برہم تھا۔" اس نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ وکٹر نے اسے ہپناٹائز کر لیا ہے۔"

اب ہم نے وکٹر پر سوالوں کی ایسی بوچھاڑ کر دی کہ اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ ہم نے اسے لن ترانیوں کا کوئی موقع ہی نہیں دیا۔ مسلسل کئی گھنٹے تک تابڑ توڑ سوالوں کے بعد ایک تصویر سی ابھرتی نظر آنے لگی۔ اس نے تسلیم کیا کہ وہ شکاگو میں ولیم واٹس کو جانتا تھا۔ پھر اس نے تسلیم کیا کہ وہ مشرق میں واٹس سے وقتاً فوقتاً ملتا رہا تھا۔

"مشرق میں کہاں؟" چیف چونکا۔

"مختلف جگہوں پر۔" اس نے جواب دیا۔ "بالخصوص جرسی کے ایک بار میں۔"

"کیا تم جانتے ہو کہ وہ کہاں رہتا ہے؟" چیف نے پھر سوال کیا۔

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ واٹس اس معاملے میں بے انتہا بہانے باز ہے۔ وہ کسی کو بھی اپنے گھر کا پتا نہیں بتاتا اور مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے کہ وہ کہاں رہتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

لیکن چیف اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ وہ اس موضوع پر بار بار ہتھوڑے برسانے لگا یہاں تک کہ وکٹر نے ہتھیار ڈال دیے۔

"واٹس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ایک آرام دہ کمرے میں رہتا ہے۔" وہ بول پڑا۔ "اس نے کہا تھا کہ وہ اپنی کھڑکی سے دریائے ہڈسن اور گودی میں کھڑے بحری جہازوں کا نظارہ کر سکتا ہے اور یہ کہ اسے صبح میں سورج کی بھرپور روشنی ملتی ہے جو پلیٹوں پر کام کرنے کے لیے بہت ضروری ہے۔"

اس نے غیر شعوری طور پر اگل دیا تھا۔ ولیم واٹس،

پلیٹوں پر کام کر رہا تھا اور وکٹر یہ بات مانتا تھا لیکن اس سے آگے ہم اس سے کچھ بھی نہیں اگلوا سکے۔

اب ہم نے فیصلہ کیا کہ اس سے سودے بازی کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ اس نے جو بھی دیگر جرائم کیے تھے، وہ ہمارے دائرۂ اختیار میں نہیں آتے تھے۔ ہمارا اوّل و آخر کام ان پلیٹوں کو حاصل کرنا تھا چنانچہ ہم اسی انداز سے آگے بڑھے۔ ہم نے کوئی وعدہ کیے بغیر وکٹر سے یہ کہا کہ اگر وہ ہم سے تعاون کرے تو ہم اس کے شکر گزار ہوں گے۔ وہ ہمارا یہ اشارہ سمجھ گیا۔

''میں ان پلیٹوں پر ہاتھ ڈال سکتا ہوں۔'' بالآخر وہ بولا۔ ''لیکن مجھے یقین نہیں ہے پھر بھی میرے خیال میں، میں ایسا کر سکتا ہوں۔ مجھے بہرحال اپنے ایک دوست کی مدد درکار ہوگی۔''

وہ ''دوست'' ڈیپر ڈین نکلا۔ ہم نے ان دونوں کو تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیا اور پھر ڈین اسی سہ پہر میں لوٹ آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا اور وہ اپنے وعدے کے مطابق لوٹ بھی آیا۔ اس کے پاس ٹائم اسکوائر کے سب وے اسٹیشن کے ایک بیگیج لاکر کی چابی تھی جو اس نے ہمارے حوالے کر دی۔ ''آپ حضرات کو اس لاکر میں وہ چیز مل جائے گی جس کی آپ کو تلاش ہے۔'' اس نے کہا۔

چنانچہ دو سیکرٹ ایجنٹوں کو وہاں دوڑا دیا گیا۔ وہ لوگ ایک بیگ کے ساتھ لوٹے۔ اس بیگ میں پلیٹوں کے تین سیٹ (Set) اور پانچ ہزار ایک سو ڈالر کے جعلی نوٹ تھے۔ وکٹر مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور کورنش بجا لایا۔ پھر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھ گیا لیکن ہم نے اسے پکڑ لیا۔ اس پر سازش کرنے اور جعلی نوٹ رکھنے کا الزام عائد کر کے جج سے کہا کہ وہ اس کی زرِ ضمانت پچاس ہزار ڈالر مقرر کرے۔

''ڈبل کراس۔'' وکٹر چیخ پڑا۔

وہ مسلسل چیختا رہا لیکن ہم نے اس کی ایک نہیں سنی اور اسے وفاقی جیل بھیج کر ہی دم لیا۔ ہمیں جلد ہی پتا چل گیا کہ اس نے ہمیں ایک بار پھر بے وقوف بنانے کی کوشش کی تھی۔

☆☆☆

وکٹر کے جیل جاتے ہی واٹس کے جعلی نوٹوں کے بہاؤ کا سوتا خشک ہونے لگا۔ لہٰذا ہم سمجھ گئے کہ ہم نے واٹس کے شریکِ جرم کو پکڑنے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ ہم نے سوچا کہ وہ کچھ عرصہ جیل کا مزہ چکھ لے پھر ہم اسے دوبارہ نچوڑیں گے۔ ہمیں یقین تھا کہ وہ چار و ناچار اگلے گا لیکن اس دوران میں ایک عجیب واقعہ پیش آ گیا۔ وکٹر وفاقی جیل سے فرار ہو گیا۔

یہ جیل مین ہٹن کے قلب میں واقع تھی اور وہاں سے فرار ہونا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔ ہم گھنٹوں جیل کے ایک ایک قیدی سے پوچھ گچھ کرتے رہے تب ہماری سمجھ میں آیا کہ وہ کیسے فرار ہوا تھا۔

دراصل میں دوپہر میں ہمیشہ سارے قیدیوں کو ورزش کرانے کے لیے چھت پر لے جایا کرتا تھا۔ اس دن وکٹر بیماری کا بہانا کر کے اپنی کوٹھڑی میں رک گیا۔ اس موقع پر سارے کوریڈور سنسان تھے۔ آدھے محافظ چھت پر قیدیوں کے پاس تھے اور آدھے لنچ پر تھے۔ اس دوران میں وکٹر نے اپنے گدے کے نیچے سے بستر کی چادروں کا بنا ہوا ایک رسا نکالا۔ بستر کی چادریں ہر ہفتے لانڈری سے دھل کر آتی تھیں اور وہ ان میں ایک چادر چپکے سے اپنے پاس رکھ لیتا تھا۔ رسا نکالنے کے بعد اس نے کوٹھڑی کا قفل کھول لیا۔ یہ آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کے پاس چابی کہاں سے آئی۔ قفل کھول کر وہ سنسان کوریڈور کو عبور کر کے واش روم میں پہنچا اور ایک کٹر کے ذریعے جو نہ جانے کس طرح اس کے ہاتھ لگ گیا تھا کھڑکی کی وزنی آہنی چادر کاٹ کر باہر گر پڑا گیا۔ نیچے سڑک پر سے گزرتے ہوئے کئی لوگوں نے اسے دیکھا لیکن اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ کھڑکیاں صاف کر رہا تھا۔

☆☆☆

اس کے فرار نے ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ سیکریٹری آف ٹریژری اور سیکرٹ سروس کا سربراہ ہیری سورگن غصے سے پاگل ہو گیا۔ نیویارک کے گورنر ہربرٹ نے پولیس کو ان کی نااہلی پر سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ پولیس کو جب معلوم ہوا کہ ہم نے وکٹر سے سودے بازی کی تھی تو اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ یہ جانے بغیر کہ سودے بازی کی نوعیت کیا تھی اور ہمارے مقاصد کیا تھے۔ وہ اس کے فرار کو سودے بازی کا نتیجہ سمجھ بیٹھے۔ غرض یہ کہ ہر طرف سے ہم پر لعنت ملامت ہونے لگی۔ اس سے بھی بدتر یہ ہوا کہ ہم ان پلیٹوں تک رسائی حاصل کرنے میں سخت ناکام رہے۔ حنا اسمتھ نے کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔ ڈیپر ڈین نے ان پلیٹوں کے حصول میں کوئی قابلِ ذکر کردار ادا نہیں کیا تھا۔ اس نے محض وکٹر کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔ وہ محض ایک اچکا تھا جو وکٹر کے

اشارے پر چلتا تھا۔ لہٰذا اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ ہمیں صرف ولیم واٹس کا نام معلوم تھا لیکن ہم اس کے ٹھکانے سے صرف اتنا ہی واقف تھے جتنا وکٹر نے ہمیں بتایا تھا۔

چنانچہ ایک دن میں اسکواڈ کے ایک ممبر کے ہمراہ مین ہیٹن گیا جہاں ہم دریا کے اس پار صبح کی تیز دھوپ میں چمکتی ہوئی ہزار ہا کھڑکیوں کی طرف دیکھ سکتے تھے۔ کیا واٹس اب بھی ان ہی میں سے کسی ایک کھڑکی کے پیچھے موجود تھا یا وکٹر کے جیل سے فرار ہونے کی خبر سن کر کہیں فرار ہوگیا تھا۔ اس کا پتا چلانے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا۔ میں پورے موسم گرما میں ایک ایک دروازہ کھٹ کھٹا کر سب مکینوں سے پوچھتا رہا کہ کیا وہ کسی ایسے کرائے دار کو جانتے تھے جو کم گو اور کم آمیز ہو اور شاذ و نادر ہی باہر نکلتا ہو۔

اور جب ستمبر میں ایک ایجنٹ نے جو ایف بی آئی کے ساتھ مل کر کام کر رہا تھا۔ وکٹر کو پٹیس برگر سے دوبارہ گرفتار کرلیا۔ ہم یہ خوش خبری سن کر لمحاتی طور پر بے حد خوش ہوئے اور جوش و خروش سے یوں باتیں کرنے لگے گویا ہمارا کیس اختتام کو پہنچ گیا ہو لیکن پھر ہمیں خیال آیا کہ کل سے ہم پھر نیو جرسی میں دروازوں کی گھنٹیاں بجا رہے ہوں گے۔

☆☆☆

چند ہفتوں کے بعد ایک شام جب ہم اپنے دفتر میں ڈیوٹی کے لیے اکٹھا ہوئے تو ایجنٹ جارج بول پڑا۔ ’’ایک امکان نظر آرہا ہے۔‘‘

اس کے ہاتھ میں اس کے نوٹس تھے جن پر وہ نظریں دوڑا رہا تھا۔ ’’بڑے کمرے کا ایک مکان، یونین سٹی..... دریائے ہڈسن کا نظارہ اور صبح کی دھوپ ملتی ہے۔ ایک شخص جس کا نام مسٹر جان راماسے..... چوہے جیسا، آمدنی کا بظاہر کوئی ذریعہ نہیں۔ کوئی دوست نہیں، کوئی بیوی نہیں، کوئی بچہ نہیں۔ جب اس نے کمرا کرائے پر لیا تھا تو نبراسکا کے شہر اوماہا کا حوالہ دیا تھا۔

’’یہی وہ شہر ہے جہاں واٹس کا ڈرگ اسٹور ہوا کرتا تھا۔‘‘ میں بول پڑا۔

’’ہوسکتا ہے۔‘‘ ربانو نے کہا۔ ’’لیکن ہمیں یہ چیک کرنا پڑے گا۔‘‘

اگلی صبح ہم چھ ایجنٹ راماسے کے دروازے کے باہر کھڑے تھے۔ ’’دودھ والا۔‘‘ جارج نے پکار کر کہا۔ ’’کیا آج پیسے دے رہے ہو؟‘‘

چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا اور اگلے ہی لمحے ہم پر نگاہ پڑتے ہی واٹس کی آنکھیں جیسے دہشت سے پتھرا گئیں۔ ہم کوئی موقع دیے بغیر اسے دھکیلتے ہوئے اندر گھس گئے۔

چوہے جیسا وہ مختنی شخص پلکیں جھپکا رہا تھا۔ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کھلی کھڑکی کے پاس ہی ایک میز بچھی ہوئی تھی۔ اس میز پر تانبے کی ایک پلیٹ اور نقش کندہ کرنے کے اوزار نظر آرہے تھے۔ کمرے میں نقل بہ مطابق اصل پلیٹیں چھپا کر رکھی گئی تھیں جن کی مدد سے سو ڈالر کے جعلی نوٹ چھاپے جاتے تھے۔ ان پلیٹوں کے ساتھ ہی دیگر اوزار اور پچاس ہزار ڈالر کی جعلی کرنسی بھی برآمد ہوئی۔ ہمیں اپنا مطلوبہ شخص مل گیا تھا۔

☆☆☆

مورخہ 5 دسمبر 1935ء کو واٹس اور وکٹر لسٹیگ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے تھے۔ واٹس سرکاری گواہ بن گیا تھا۔ اس نے اپنے پارٹنرشپ کی پوری داستان بے کم و کاست بیان کردی۔ ان دونوں نے مل کر ایک ملین تین لاکھ چالیس ہزار ڈالر کے جعلی نوٹ چھاپے تھے اور مارکیٹ میں پھیلائے تھے۔ مورخہ 7 دسمبر کو وکٹر نے عدالت کے روبرو اپنے جرم کا اعتراف کرکے مقدمہ رکوا دیا اور عدالت نے اسے بیس سال قید کی سزا سنا دی لیکن اب وہ اپنے گھناؤنے ماضی کا بھی قیدی تھا۔ سزا سنائے جانے کے بعد جب ہم دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

’’کیا تم جانتے ہو کہ شیرف رچرڈکس جیل میں ہے؟‘‘

’’تمہاری مراد اس شیرف سے ہے جسے تم نے جعلی نوٹ دے کر پھنسا دیا تھا؟‘‘ میں نے پوچھا۔ ’’میرا خیال ہے کہ وہ لوئس برگ کی جیل میں ہے۔‘‘

’’کیا تم میری خاطر اتنا کرسکتے ہو کہ مجھے وہاں نہ بھیجا جائے؟‘‘ اس نے منت کی۔ ’’مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے کہ سوائے اس جگہ کے مجھے کہاں بھیجا جائے گا۔‘‘ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ ’’مجھے کہیں بھی بھیج دو مگر وہاں مت بھیجو۔‘‘ اس کی ساری خود اعتمادی ہوا ہوگئی تھی۔

اسے الکراز بھیج دیا گیا۔ 1947ء میں وہ فوت ہوگیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کی موت کی سند پر اس کا پیشہ نو آموز سیلز مین درج کیا گیا۔ ایک ایسے شخص کو سیلز مین کہنا واقعی بڑی زیادتی تھی جس نے ایفل ٹاور دو مرتبہ بیچا تھا۔

سمندر کے بھید

عائشہ جونیجو

سمندر خشکی سے بہت زیادہ بڑا ہے اس لیے اس کے اندر کی دنیا بھی زیادہ بڑی ہے۔ پتا نہیں کیسی کیسی مخلوق اس کے اندر رہتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ جل پری رہتی ہے تو کوئی کہتا ہے روشن چہرے والے مرد۔ ان کے علاوہ بھی بے شمار اجسام موجود ہیں۔

سمندر کے راز پر ایک مختصر سا جائزہ

سمندر ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ خدا کی اس عظیم الشان نعمت کے فوائد بے شمار ہیں۔ ہم نے اس مضمون میں سمندر کے ان پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ جو ہمارے لیے ایک بھید کی طرح ہیں۔

ہم سمندر کنارے جاکر اسے دیکھنے کے لیے پاگل رہتے ہیں اور وہ ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ہم اس کے ساحل پر بیٹھ کر نہ جانے کون سی دنیاؤں میں کھو جاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ڈوب جانے والوں کو سمندر اپنی طرف بلاتا ہے اور وہ اس کی آواز پر مست ہو کر اسی کی طرف بڑھتے ہی چلتے ہیں اور بالآخر ڈوب جاتے ہیں۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ سمندر تو کتنا خود غرض ہے کہ جب انسان زندہ ہو تو اسے تیرنے نہیں دیتا اور جب

مرجائے تو اسے ڈوبنے نہیں دیتا۔
چاندنی راتوں میں یہ اور بھی پُرکشش ہو جاتا ہے۔ محبت کرنے والے جوڑے ساحل پر بیٹھ کر اس کی طرف دیکھتے اور پیار بھری سرگوشیاں کرتے ہیں۔
نہ جانے کتنے راز اس سمندر کے سینے میں دفن ہیں۔ نہ جانے کتنی کہانیاں ہیں۔ کہتے ہیں کہ سمندر کے اندر کی دنیا بہت حسین ہے۔ شاید ہماری ظاہری دنیا سے بھی زیادہ۔ نہ جانے کیسی کیسی بھول بھلیاں، چٹانیں اور دیگر مخلوق اس جہان میں آباد ہیں۔

مانگیں گے نا درازئ عمر کی دعا
بے فیض زندگی سے اگر اوب جائیں گے
سورج کی ڈوبتی ہوئی کرنوں کے ساتھ ساتھ
گہرے سمندروں میں کہیں ڈوب جائیں گے

ہم بھی کبھی زیرِ سمندر جب کیمرے کی آنکھ سے اس کے حسن کو دیکھتے ہیں تو بے اختیار سبحان اللہ کہنے پر مجبور جاتے ہیں۔
اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی روایات اور پُراسرار کہانیاں بھی ہیں۔ وہ لوگ جن کی کشتیاں برسوں پہلے ڈوب گئیں لیکن آج بھی ایک خاص تاریخ کو وہ ڈوبی ہوئی کشتیاں سمندر کے سینے پر بھٹکتی ہوئی دکھائی دے جاتی ہیں۔
اس مخلوق کی کہانی جس کا اوپری حصہ عورت کا اور دھڑ مچھلی کا ہوتا ہے جسے جل پری کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ برمودا ٹرائی اینگل کے حوالے سے حیرت انگیز داستانیں ہیں۔
یہ سب کیا اس لیے ہے کہ انسان ابھی پوری طرح سمندر کو دریافت نہیں کر پایا ہے۔
سمندر سے انسان کو ہمیشہ سے دل چسپی رہی ہے۔ اس نے نہ جانے کتنی کہانیاں اور کتنی روایات سمندر سے منسوب کر رکھی ہیں۔ میتھالوجیز میں بھی سمندر سے وابستہ روایات ملتی ہیں۔
ہر عقیدے کے لوگ سمندر کے حوالے سے مختلف عقیدے رکھتے ہیں (سوائے مسلمانوں یا الہامی مذاہب کے)۔ آئیں ذرا سمندر سے وابستہ روایات اور عقیدوں کو دیکھتے ہیں۔
ہندو میتھالوجی ہو یا تبت کے رہنے والوں کی۔ سمندر ان کے نزدیک بہت وشال اور بہت بھید بھرا ہوتا ہے۔

چینیوں کے قدیم عقیدے کے مطابق دو خدا ہوا کرتے تھے۔ ایک گانگ گانگ، پانی کا خدا اور دوسرا ژورانگ (آگ کا خدا)۔
ان دونوں خداؤں کی اپنی اپنی خدائی تھی۔ جہاں ان کے احکامات چلا کرتے اور یہ دونوں اپنی اپنی مملکت کے حاکم ہوا کرتے۔ پھر کسی بات پر دونوں خداؤں کے درمیان اَن بن ہو گئی۔ جس کے نتیجے میں ایک بہت خوفناک جنگ ہوئی اور اس جنگ کے نتیجے میں پانی کے خدا کو شکست ہو گئی اور اس جنگ کے بعد پانی کا خدا بہت شرمندہ ہوا۔ اسے اپنے آپ سے ہی وحشت ہونے لگی۔ پھر اس نے پہاڑوں سے کود کر اسی سمندر میں خودکشی کر لی جس کو خود اس نے تخلیق کیا تھا۔ اس حادثے کے بعد اس کے دیوہیکل بدن کے ہزاروں لاکھوں ٹکڑے ہو گئے اور ان ٹکڑوں سے لاتعداد سمندری مخلوق وجود میں آ گئیں۔
چینیوں اور جاپانیوں کے خیال میں سمندر میں دیوہیکل اژدھے اور جل پریاں بھی ہوا کرتی ہیں۔ جاپان میں ایک ایسی سمندری مخلوق کو تسلیم کیا جاتا ہے جس کا نام Vingyo ہے جس کا ایک بڑا سا مردانہ سر ہوتا ہے۔ لیکن کمر سے نیچے وہ مچھلی کی طرح ہوتا ہے۔
ایک اور مخلوق کا بھی ذکر ملتا ہے، جس پر بچوں کے لیے بے شمار کہانیاں لکھی گئی ہیں اور فلمیں بھی بنائی گئی ہیں اس مخلوق کا نام ٹرائی ٹون ہے۔ Tri Ton ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مخلوق گھوڑے، مچھلی اور انسان کی مخلوط شکل میں ہوتی ہے۔
روم کے ایک رائٹر Pavsanias نے بھی اپنی کہانیوں میں اس مخلوق کا ذکر کیا ہے۔ اس رائٹر کا زمانہ 143AD سے 180AD تک کا ہے۔
قدیم آئرلینڈ اور برطانیہ میں بھی پانی کے ایک دیوتا کا تصور تھا جس کو انہوں نے مناہان کا نام دیا تھا۔
مچھلیوں کے شکار پر جانے سے پہلے مچھیرے اس کے حضور نذرانے پیش کیا کرتے اور اپنے شکار کی کامیابی کی دعائیں کیا کرتے۔
روس اور اس کے ملحقہ علاقوں میں بھی سمندری مخلوق کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے خیال یا عقیدے کے مطابق وہ مخلوق سینکڑوں کی تعداد میں سمندر میں اپنی کالونی بنا کر رہتی ہے۔
اس مخلوق کا نام انہوں نے Rusalka رکھا ہے۔
یہ تو تھیں سمندر کے حوالے سے قدیم کہانیاں اور روایتیں۔ اب ذرا موجودہ (ماضی قریب) کا بھی جائزہ

لے لیتے ہیں۔

جب یہ کہانیاں بہت عام ہو گئیں تو ایک مصنفہ پیٹریشیا نے اصل حقائق تک پہنچنے کے لیے مارچ 2003ء میں ایک مہم کا آغاز کیا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ سمندروں میں کوئی حیرت انگیز مخلوق ہے بھی یا صرف کہانیاں اور روایتیں ہیں۔ اس نے اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ کلاڈوکنگ نام کی ایک طاقت ور اور تیز رفتار لانچ کے ذریعے اس مہم کا آغاز کیا۔

پھر ان دونوں نے 5 مارچ 2003ء میں سمندر میں ایک ایسی مخلوق دیکھی جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ البتہ اس کی کہانیاں موجود تھیں اور ان ہی کہانیوں کی حقیقت جاننے کے لیے انہوں نے اس مہم کا آغاز کیا تھا۔

ان کے بیان کے مطابق وہ مخلوق دس بارہ میٹر طویل تھی اور سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اژدھے نما اس مخلوق کا سر انسانی تھا اور اس میں ہیرے جیسی چمک تھی۔

پیٹریشیا کا یہ بیان ہے کہ وہ اس مخلوق کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ وہ لوگ اپنی لانچ کو اس کے قریب لے گئے لیکن اس نے پانی میں غوطہ لگا دیا تھا۔

یہ صرف ایک بیان ہے۔ جب کہ اس مخلوق کی موجودگی بہت عرصے سے محسوس کی جا رہی ہے۔ بے شمار شواہد ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ یہ شواہد کب ریکارڈ پر آئے ہیں۔

1895ء۔ جی ہاں! اس مخلوق کے ریکارڈ پر آنے کا سلسلہ 1895ء سے شروع ہوا۔ جب بہت سے مچھیروں اور ایک بڑی سی کشتی پر کام کرنے والے کاریگروں نے اس مخلوق کو اپنی کشتی کے پاس دیکھا۔ انہوں نے فوراً کنارے پر آ کر حکام کو اس کی رپورٹ دی۔ ان کے بیان کے مطابق اژدھے نما وہ جسم بارہ تیرہ میٹر طویل تھا اور اس کا انسانی چہرہ اس طرح چمک رہا تھا جیسے شیشے کے پیچھے چراغ جل رہے ہوں۔

اس کے بعد بہت عرصے تک وہ مخلوق دکھائی نہیں دی یا اگر دکھائی دی بھی ہو تو کسی نے رپورٹ نہیں کی۔ اس لیے ریکارڈ پر نہیں آ سکا۔

لیکن پھر اس کا دوسرا ریکارڈ 1903ء میں سامنے آیا۔ اس بار ایک بڑے جہاز والوں نے اس مخلوق کو دیکھا تھا۔ جہاز نے جب اس کے قریب جانے کی کوشش کی تو اس مخلوق نے پانی میں غوطہ لگا دیا اور نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

1903ء کے بعد وہی مخلوق 1908ء میں جیک مان نام کے ایک ملاح کو دکھائی دی اور اس نے بھی وہی حلیہ بیان کیا جو پہلے والے بتا چکے تھے۔

اس کے بعد 1923ء میں لمر اور جیک لوری نام کے دو ملاحوں نے اسے دیکھا اور یہ دونوں اسے اچھی طرح دیکھنے میں کامیاب رہے تھے۔ ان کے بیان کے مطابق اس مخلوق کا انسانی چہرہ اتنا روشن تھا جیسے بلب جل رہے ہوں۔ ان کا بیان ہے کہ وہ اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے۔

اس کے بعد یہ پُراسرار مخلوق 1929، 1930، 1943، 1947 سے 1970ء تک دیکھی گئی۔ 1970ء میں میساچوسٹس یونیورسٹی کے ایک محقق نے کئی ہفتے اس مخلوق کی تلاش میں لگا دیے۔ اس کے بعد اس نے جو اپنی رپورٹ مرتب کی وہ شائع ہو چکی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق وہ ایک حیرت انگیز مخلوق ہے۔ بارہ تیرہ میٹر لمبی اور کسی موٹے اژدھے کی طرح موٹی۔

بظاہر اسے پانی کا اژدھا سمجھا جا سکتا تھا لیکن اس کا بالکل انسانی چہرہ اسے حیرت انگیز بنا دیتا ہے۔ دو بھنویں دو آنکھیں، ناک، ہونٹ، دو کان، سب کچھ انسانی چہرے کی طرح۔

فرق یہ ہے کہ کوئی بھی انسانی چہرہ بجلی کے بلب کی طرح روشن نہیں ہوتا لیکن وہ چہرہ روشن رہتا ہے۔ 1972ء میں فرینک سیر لیے نام کے ایک صحافی نے بتایا کہ یہ مخلوق ایک دو کی تعداد میں نہیں ہے بلکہ پانی کے نیچے ان کی پوری کالونی آباد ہے۔

آخری بار اس مخلوق کو 2003ء میں دیکھا گیا جس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

اب ان رپورٹس سے ایک بات یہ بھی سامنے آئی ہے کہ یہ مخلوق دنیا کے ہر سمندر میں موجود ہے یا کہیں بھی موجود ہو سکتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ کیا مخلوق ہے؟ اور انسان سے اس کا کیا رشتہ ہے کہ اس کا چہرہ انسانی ہو گیا ہے۔ اس بھید سے اس وقت پردہ اٹھ سکتا ہے جب وہ مخلوق ہاتھ لگے اور سائنس داں اس پر تجربے کر سکیں۔ لیکن ابھی تک وہ انسان کے ہاتھ نہیں لگ سکی ہے۔

اس کو صرف دیکھا ہی جاتا رہا ہے۔ سمندر کے بے شمار بھید ہیں۔ ایک بھید یہ بھی ہے خدا بہت عظیم ہے اور اس نے اپنی عظمت کی نشانیاں خشک و تر میں رکھی ہوئی ہیں تا کہ ہم ان کو دیکھیں اور اس بے مثال خالق کی تعریف کر سکیں۔

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط نمبر: 94

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے۔ جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیرلیا۔ میں نے کرنل زروسکی کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زروسکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زروسکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جینس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جاکر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنٹی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔

وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالتِ مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑلیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے چلے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ نائیک اور رامن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پالیا پھر راج کنور پر قابو پایا لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کہہ رہا تھا ”شہباز ہتھیار پھینک کر باہر آجاؤ۔“ میں نے بروقت راج کنور کے ہاتھ پر مارا تھا۔ وہ پستول نکال کر دور جاگرا پھر وہاں سے نکل کر راستے میں شیام کی گاڑی پر قبضہ کیا اور راج کنور کو گاڑی میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ راج کنور کو لے کر سرحد پار کرگیا۔ مگر جب اپنی سرزمین پر اترا تو خبر ملی کہ سعدیہ کو اغوا کرلیا گیا ہے اور اسے واپس انڈیا لے جایا جارہا ہے۔ میں نے واپسی کے لیے ہیلی کاپٹر لانے کو کہا۔ شملہ پہنچے پھر وہاں سے راج کنور کے محل کی ناکابندی کرنے جاپہنچے۔ میرا خیال تھا کہ جب سعدیہ کو لایا جائے گا تو راستے میں گاڑی کو روک لیں گے۔ کچھ دیر بعد ہائی وے پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکی بیتو نے سڑک پر نوکیلی کیلیں بچھادی تھیں۔ گاڑی نزدیک پہنچتے ہی دھماکا سا ہوا۔ گاڑی سے فائر ہوا جو بیتو کے شانے میں لگا۔ ہم نے گولی چلانے والے کو شوٹ کردیا۔ گاڑی کی تلاشی لی مگر وہاں سعدی کی بجائے کنور تھا۔ ہم محل کی طرف دوڑے، کہ ایک ہیلی کاپٹر اتر رہا تھا۔ اس سے سعدی اتری اور اندر چلی گئی۔ میں بیتو کو لے کر ڈاکٹر گپتا کے پاس پہنچا۔ اس نے طبی امداد دے کر ٹھہرنے کے لیے اپنی بہن سیتا کے گھر بھیج دیا۔ سیتا کا شوہر ارون اسے ہراساں کررہا تھا اسے میں نے موت کی گود میں بھیج دیا پھر آگے بڑھا تھا کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیرلیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پُراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور

پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی ''شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔'' ڈیوڈ شاہ کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگا دی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کررہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کرکے بے ہوش کردیا اور محل میں پہنچا دیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹافون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا ''کنور ہوشیار'' سادی کو لے کر چیمبر...... مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کردیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو بتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کردیا بتو مرچکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آگئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کردیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں شا نے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنا دیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کر دیتا، میں حکم ماننے پر تیار ہوگیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بن گیا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائنائیڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں، وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا۔

اب آگے پڑھیں

نیچے گرتے ہوئے میرا پہلو تنے کے ایک کسی قدر ابھرے اور بہت زیادہ کھردرے حصے سے ٹکرایا اور اس نے میرا پہلو چھیل دیا تھا۔ مزید یہ کہ پاؤں خلا میں گیا اور گرنے سے مڑا۔ اس میں بھی شدید ٹیس اٹھی تھی۔ ان دو جگہوں پر درد کی وجوہات واضح تھیں اس کے باوجود میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ فتح خان کے چلائے برسٹ نے مجھے چھوا تھا یا نہیں۔ بعض اوقات گولی کا زخم ذرا دیر سے اپنا احساس دلاتا ہے۔ میں خود کو ٹٹول رہا تھا۔ اتنے میں فتح خان کی آواز آئی۔ ''شہباز تم ٹھیک ہے؟''

''گولی چلا کر پوچھتے ہو کہ ٹھیک ہے؟'' میں نے خفگی سے کہا۔ اس دوران میں، میں نے تسلی کرلی تھی کہ مجھے گولی نہیں لگی ہے۔

''تم کو نہیں اس خانہ خراب اُلو کو گولی ماری ہے جو تم پر جھپٹ رہا تھا۔'' فتح خان نے وضاحت کی۔ ''اب تم آرام سے اپنا پستول اور شاٹ گن سامنے پھینک دو۔ جلدی مت کرنا ورنہ جلدی مر جاؤ گے۔''

مجھ پر دو طرف سے روشنی پڑ رہی تھی یعنی فتح خان کے ساتھ کم سے کم ایک آدمی اور بھی تھا۔ مجھے ان دونوں میں سے کوئی نظر نہیں آرہا تھا ایسے میں کسی قسم کا رسک لینا بالکل مناسب نہیں تھا۔ میں نے پہلے شانے سے شاٹ گن اتاری اور آگے پھینک دی۔ پھر پستول بھی نکالا اور اسی سمت اچھال دیا۔ میرا پاؤں خلا میں بری طرح پھنسا ہوا تھا اور میں نے اندر ہاتھ ڈال کر بہ مشکل کھینچ کر اپنا پاؤں خلا سے نکالا۔ مگر مزید حرکت سے گریز کیا تھا۔ میرے سامنے فتح خان جیسا وحشی تھا جس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ کب کیا کر گزرے؟ کوئی آگے آیا اور اس نے میرے پھینکے ہتھیار اٹھا لیے۔ فتح خان نے کہا۔ ''اب دونوں ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہو جاؤ۔''

میں نے حکم کی تعمیل کی۔ وہی آدمی آگے آیا اور اس نے میری تلاشی لے کر پرس، موبائل اور جیپ کی چابیاں قبضے میں لے لیں۔ میں نے کہا۔ ''فتح خان تم نے بیکار میں زحمت کی میں تمہارے ہی کام سے آیا تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے تم ہیرا لینے آیا تھا کہ لے کر میرا خدمت میں پیش کر دو؟'' فتح خان نے عیاری سے کہا۔ ''تم فتح خان کو اتنا بے وقوف سمجھتا ہے؟''

''میں نے تمہیں کبھی بے وقوف نہیں سمجھا اور جہاں تک ہیرے پیش کرنے کی بات ہے تو میں وہ تمہیں ہی دیتا مگر ایک شرط کے ساتھ۔''

''کیسا شرط؟''

''مرشد سے میری جان چھڑوا دو۔''

''تمہارا مطلب ہے مرشد کا مرڈر؟''

''یہ میں تم پر چھوڑ دیتا، تم جیسے مناسب سمجھتے یہ کام کرتے اور ہیروں کے لیے تم درجنوں جانیں پہلے ہی لے چکے ہو۔''

''جب میں نے تم کو آفر کیا تو تم نے انکار کر دیا اس وقت تم فتح خان سے انتقام کی بات کر رہا تھا۔'' اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

''فتح خان بیتو کا حساب باقی ہے اور وہ بھی بے باق ہو گا مگر ابھی میں مجبور ہوں۔''

''ہاں تم میرے ہاتھ آ گیا ہے۔'' فتح خان نے کہا۔ ''اب تم کیا کرے گا؟''

میں نے شانے اچکائے۔ ''کچھ نہیں، میں بے بس ہوں جو کرنا ہے تم نے کرنا ہے۔''

''تم نے ٹھیک جگہ ہاتھ ڈالا؟'' فتح خان نے سوال کیا۔

''نہیں اس میں صرف گھونسلا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب وہ بھی نہیں ہے میرا خیال ہے یہ اسی اُلو کا گھونسلا تھا جسے تم نے مار دیا۔ باقی تم خود دیکھ لو۔''

''جلال دیکھو۔'' فتح خان نے اپنے آدمی کو حکم دیا۔ وہ آگے آیا اور اس نے سوراخ میں ہاتھ مارا۔ اُلو خود سے گھونسلے نہیں بناتے ہیں بلکہ کسی درخت کے سوراخ میں بسیرا کرتے ہیں یا کسی اور پرندے کے بنے بنائے گھونسلے پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ سوراخ میں اُلو نے گھونسلے کو آرام دہ بنانے کے لیے خاصا کچرہ جمع کیا ہوا تھا اور اس میں انڈے دیئے تھے۔ جلال نے وہ انڈے بیدردی سے باہر پھینک دیئے ویسے بھی اب انہیں خراب ہی ہونا تھا کیونکہ مادہ اُلو مر چکی تھی۔ ایک بار روشنی گھومی تو میں نے اس کے بکھر جانے والے جسم اور پروں کی باقیات دیکھی تھیں برسٹ نے اس کے چیتھڑے اڑا دیئے تھے۔ انڈوں کے بعد جلال نے گھونسلے کا بقیہ حصہ بھی نکال دیا اور اندر اچھی طرح ہاتھ مارنے کے بعد بولا۔ ''خان ادھر کچھ نہیں ہے۔''

فتح خان پشتو میں غرایا اور یہ غراہٹ ناقابلِ اشاعت تھی۔ اس نے بیک وقت سوراخ اور ہیروں کی شان میں مدح سرائی کرتے ہوئے جو کہا تھا اسے بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ''شہباز وہ ہیرا کدھر ہے؟''

''میں تو خود تلاش میں ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اب تک کامیابی نہیں ملی ہے۔''

''تو تلاش کرو جب تک کامیاب نہیں ہو جاتے۔'' فتح خان نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''اگر تلاش نہیں کر سکے تو مر جاؤ گے۔ میں تیرے کو اسی وادی میں دفن کر جائے گا۔ جیسے مجھے ہیرا نہیں ملا اسی طرح تمہارے ساتھیوں کو تم نہیں ملے گا۔''

اس دوران میں چاند کی رہی سہی روشنی بھی ختم ہو چکی تھی مگر اب روشنی کی مجبوری بھی ختم ہو گئی تھی۔ فتح خان اور اس کے ساتھی کے پاس تیز روشنی والی ٹارچیں تھیں۔ ''مجھے تو خدشہ ہے کہ تم ہیرے مل جانے کے بعد بھی میرے ساتھ یہی سلوک کرو گے۔''

''ابھی میں تم کو کوئی ضمانت نہیں دے سکتا اس لیے کام شروع کرو۔''

''میرے پاؤں میں چوٹ آئی ہے۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ویسے ٹیس لگاتی تھی اور اب میں سکون میں تھا یعنی ٹخنے کو نقصان نہیں ہوا تھا۔ مگر میں نے فتح خان سے کہا۔ ''میں آسانی سے حرکت نہیں کر سکتا۔''

''شہباز خان تمہارا آواز بتا رہا ہے تم تکلیف میں نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ میں جلال کو بولوں بہتر ہو گا تم حرکت میں آ جائے۔''

با دلِ ناخواستہ میں حرکت میں آیا اور ہم نے ٹارچوں کی روشنی میں تنوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ روشنی فتح خان دکھا رہا تھا اور ہم تنے دیکھ رہے تھے۔ فتح خان نے کہا۔ ''مجھے یقین تھا کہ اس گورے حرامی نے تم کو ہیروں کا جگہ بتایا ہو گا اور تم جانتا ہے کہ ہیرے کہاں ہیں؟''

''برٹ شا نے صرف اشارہ دیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اس نے مرنے سے پہلے شمالی ڈھلان اور سب سے بڑے تنے کے الفاظ کہے تھے۔''

''تمہارا مطلب ہے تم ہیروں کی صحیح جگہ کے بارے میں نہیں جانتا؟''

''ظاہر ہے میں جانتا تو یوں ہر درخت کا تنا نہ چیک کر رہا ہوتا۔ اسی درخت سے ہیرے حاصل کر لیتا جہاں

برٹ شا نے چھپائے تھے۔ میری معلومات بس اسی حد تک ہیں۔''

''شہباز خان۔'' فتح خان کی آواز شک سے لبریز تھی۔ ''تم جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے۔''

''تم میرے الفاظ مت سنو میرا عمل دیکھو۔'' میں نے کہا۔ ''میں بلاوجہ تو تنے ٹٹولتا نہیں پھروں گا؟''

''ہو سکتا ہے تم کو میری موجودگی کا شک ہوا ہو اور تم مجھے دھوکا دینے کے لیے ایسا کر رہا ہو۔''

''فتح خان شک کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ بہر حال میں ایک بار پھر تمہارے قبضے میں ہوں اور تم اپنی من مانی کرنے کے لیے آزاد ہو۔''

فتح خان خاموش ہو گیا اور ہم تنے دیکھتے رہے۔ جلال خود دیکھ رہا تھا مگر میرے ساتھ فتح خان لگا ہوا تھا، جب میں کسی تنے کو چیک کرتا تو وہ بھی دیکھتا تھا۔ ظاہر ہے اسے مجھ پر اعتماد نہیں تھا۔ اس لیے میرے سر پر موجود تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں راجا عمر دراز کے پاس جا رہا ہوں۔''

''بس پتا چل گیا۔'' اس نے عیاری سے کہا۔ ''تم کیا سمجھتا ہے کہ فتح خان کی نظروں سے بچ جائے گا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ یہ اتفاق ہے۔'' میں نے جوابی عیاری کا مظاہرہ کیا۔ ورنہ مجھے یقین تھا کہ فتح خان ہمارے ٹھکانوں سے واقف ہو گیا تھا۔ کم سے کم فیض آباد والی کوٹھی سب کی نظروں میں تھی اور عین ممکن ہے کہ فتح خان بھی اس جگہ سے واقف ہو۔ ایک یہی وجہ ہو سکتی تھی۔ اس لحاظ سے ہم سب کا اس جگہ سے نکل جانا بہتر تھا میں اُمید کر سکتا تھا کہ ہمارے نئے ٹھکانے سے دشمن ناواقف ہوں گے۔ میں نے موضوع بدل دیا۔ ''فاضلی کا انجام تم جان گئے ہو گے؟''

''ہاں۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''پہلے ڈیوڈ شا نے مجھے قربانی کا بکرا بنانے کا کوشش کیا مگر میں نے انکار کیا تو اس نے فاضلی کو پکڑ لیا۔''

''فتح خان جو کام وہ فاضلی سے لے سکتا تھا وہ تم سے نہیں لے سکتا تھا۔''

''کیوں نہیں لے سکتا۔ میں فاضلی سے زیادہ مرشد کو جانتا ہے۔ اس کی ساری خوبی خامی کا مجھ کو پتا ہے۔ پر مجھے معلوم تھا کہ ڈیوڈ شا آگے کیا کرے گا؟''

''تم کو کیسے معلوم ہوا؟''

''دیکھ شہباز خاناں سیدھا سا بات ہے۔ فاضلی اور مجھ جیسا بندہ ہزار ملتا ہے۔ پر تم اور مرشد خان ہر کوئی نہیں ہوتا ہے۔ ڈیوڈ شا اس گورا کی اولاد ہے جو یہاں سو سال حکومت کر کے گیا اور اسے مرشد جیسے لوگوں کا قدر خوب ہے۔''

''مجھ میں اور مرشد میں فرق ہے۔''

''ہاں وہ بہت برا ہے اور تم بہت اچھا ہے۔'' فتح خان کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

''نہیں میری مراد کلاس سے ہے۔ مرشد الگ کلاس کا آدمی ہے یہ کلاس آزادی کے بعد بھی انگریزوں کی غلام رہی ہے لیکن میری کلاس متوسط طبقے کی ہے۔''

''ہاں پر انگریز میں یہ خوبی بھی ہے کہ وہ آدمی کی صلاحیت کی قدر کرتا ہے۔ اسے استعمال کرتا ہے۔''

میں ہنسا۔ ''تم بھی انگریزوں سے بہت متاثر لگ رہے ہو۔''

''سچ ہے۔'' وہ بولا۔ ''شہباز خان ذرا تیز کام کرو۔''

''اب تمہیں کس بات کی جلدی ہے؟''

''جلدی ہے۔'' وہ بولا۔ ''جتنا دیر ہو گا تمہاری طرف سے اتنا ہی خطرہ بڑھتا جائے گا۔''

دو گھنٹے میں ہم نے شمالی ڈھلان کے درمیان میں سارے ہی تنے دیکھ لیے تھے اور کہیں بھی کسی تنے میں سوراخ نہیں ملا تھا۔ صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی اور میں تھکن محسوس کر رہا تھا۔ میں نے فتح خان سے کہا۔ ''اب ہمت نہیں ہے کچھ دیر آرام کرنے دو۔''

''ٹھیک ہے۔'' فتح خان مان گیا مگر کیسے اس نے جلال کو حکم دیا۔ ''اس کا ہاتھ پاؤں باندھ دو۔''

جلال نے اپنے پاس سے جدید قسم کی ہلکی فولاد اور فائبر کی ہوئی ہتھکڑی اور بیڑی برآمد کیں۔ اس نے میرے ہاتھوں میں پیروں کو ان سے جکڑ دیا۔ ایسا لگ رہا تھا فتح خان میرے حوالے سے پوری تیاری کر کے آیا تھا۔ مسلسل حرکت میں رہے تھے تو خنکی کا احساس نہیں تھا مگر بیٹھے تو سردی لگنے لگی۔ اس کا علاج انہوں نے آگ جلا کر کیا۔ ویسے بھی اب انہیں کسی کے دیکھ لینے کا خطرہ نہیں تھا۔ میں ایک درخت کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور پھر سو بھی گیا۔ آگ کی حرارت سے خنکی کا احساس ختم ہو گیا تھا پھر میری آنکھ چائے کی خوشبو سے کھلی۔ جلال راکھ ہو جانے والے انگاروں پر چھوٹی سی کیتلی میں چائے بنا رہا تھا۔ فتح خان نزدیک ہی خراٹے لے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ ہوٹل والے لڑکے نے اس کے ساتھ کسی خوب صورت عورت کا ذکر کیا تھا اور وہ اس کھردرے اور بڑھے قسم کے

مرد کو لے آیا تھا۔ وہ عورت کہاں تھی؟ شاید فتح خان اسے کہیں چھوڑ آیا تھا۔

روشنی ہونے پر میں نے جلال کو ٹھیک سے دیکھا۔ اس کی عمر پچیس سے زیادہ نہیں تھی مگر جسامت اور چہرے کے نقوش ایسے تھے کہ اسے چالیس کا بھی تسلیم کیا جا سکتا تھا۔ اس نے سیاہ ملیشیا کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا اور اوپر گرم چادر تھی۔ کیونکہ اب خنکی نہیں رہی تھی اس لیے چادر تہہ ہو کر ایک شانے پر آ گئی تھی۔ اس نے بغلی ہولسٹر پہن رکھا تھا جس میں پستول تھا۔ وہ انگاروں کو کریدتے ہوئے پشتو میں کچھ گنگنا رہا تھا۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھا تو وہ چونک گیا۔ میں نے نارمل لہجے میں کہا۔ ''چائے ملے گی؟''

''کیوں نہیں ملے گی۔'' اس نے کہا اور اپنے تھیلے سے فائبر کا بنا ہوا غیر ملکی مگ نکالا۔ یہ بہت اعلیٰ درجے کا تھا اور یقیناً اسمگل ہو کر آیا تھا۔ شمالی علاقے میں پچاس فیصد اشیائے ضرورت اور سو فیصد اشیائے تعیش اسمگل ہو کر آتی ہیں۔ اس نے گرم چائے مگ میں ڈال کر مجھے دی۔ مگر ساتھ ہی وہ پوری طرح ہوشیار بھی تھا اس نے دور رہ کر مگ مجھے تھمایا اور پھر جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اسے بجا طور پر خدشہ تھا کہ کہیں میں گرم چائے اس پر پھینک کر اسے قابو کرنے کی کوشش نہ کروں؟ سچی بات ہے میرے ذہن میں خیال آیا تھا کیونکہ فتح خان سو رہا تھا اور میں ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کے باوجود کوشش کر سکتا تھا مگر جلال کی احتیاط نے میرے خیال کو خیال ہی رہنے دیا میں اسے حقیقت میں نہ بدل سکا۔ بہر حال قیدی ہونے کے باوجود گرم چائے مل گئی جس کی اس وقت شدت سے طلب ہو رہی تھی۔ میں نے اسے گھونٹ گھونٹ کر کے پیا اور بہت لطف اٹھایا۔ یہی چائے گھر میں ناشتے کی میز پر ایک بھرپور اور پُرلطف ناشتے کے بعد وہ مزہ ہرگز نہیں دیتی جو اس نے اس وقت دیا تھا۔ کچھ دیر بعد فتح خان بھی ایک انگڑائی کے ساتھ اٹھ گیا اس نے میری طرف دیکھا۔

''تم زندہ ہے شہباز خان اس کا مطلب ہے تم نے مرنے کی کوشش نہیں کی؟''

''میں نے کبھی مرنے کی کوشش نہیں کی ہمیشہ زندہ رہنے کی کوشش کی ہے۔''

''شاید اسی لیے تم زندہ ہے۔'' فتح خان بولا اور اس نے اٹھ کر اپنے لیے چائے نکالی۔ ''تم میں اور مجھ میں یہ بات ایک جیسا ہے۔ میں بھی زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔''

''لیکن تم مٹھی بھر بے جان ہیروں کی خاطر بے شمار بار مرنے کے قریب پہنچ گئے تھے۔''

''میں نے دنیا میں دو ہی چیزوں سے پیار کیا ہے۔ ایک اب دنیا میں نہیں ہے اور دوسرا یہ ہیرا ہے۔'' میں سمجھ رہا تھا وہ شینا کی بات کر رہا ہے جسے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے مار دیا تھا اور اس کی ٹولی میرے سر رکھنے کی کوشش کی تھی۔ فتح خان نے میری طرف دیکھا۔ ''ویسے تو تم بھی بہت بار موت کے منہ میں جا کر واپس آیا ہے۔''

''ہاں لیکن اپنے کسی مفاد کی خاطر نہیں، ہاں اپنے کسی پیارے کی خاطر یا دشمنوں نے مجبور کیا ہو تو ایسا ہوا ہے۔''

جلال نے چائے کے بعد اپنے تھیلے سے روغنی نان نکالے اور ایک ایک سب میں تقسیم کیا۔ ہم نے چائے کے ساتھ یہ نان کھائے اور ناشتا مکمل کیا۔ بچ جانے والی چائے انصاف سے ایک بار پھر ہم تینوں میں تقسیم ہوئی اور فتح خان نے مجھ سے کہا۔ ''برٹ شا نے تم کو بتایا کہ ہیرا ادھر ہی کہیں ہے؟''

''میں نے بتایا کہ اس نے مجھے دو اشارے دیئے تھے اور یہ بھی اس کی مجبوری تھی ان درختوں پر نمبر تو لکھے نہیں ہیں کہ وہ کہتا فلاں نمبر کے درخت میں چھپائے ہیں۔ پھر درختوں کی کوئی واضح نشانی بھی نہیں ہے اس لیے اس نے شمالی ڈھلان کے سب سے بڑے تنے والے درخت میں ہیرے چھپا دیئے۔ مرتے ہوئے اس نے مجھے یہی نشانیاں بتائیں۔ میں اسی لحاظ سے تلاش کر رہا تھا کہ تم نے غلط وقت پر انٹری دی۔''

''ہم سمجھا تم نے ہیرا تلاش کر لیا ہے۔'' فتح خان نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''جلال اسے کھول دو ہم اب ہیرا تلاش کرے گا۔''

''تمہیں یاد ہے ہم رات کون سا حصہ دیکھ چکے تھے؟''

''یاد ہے پر اب دن میں سب شروع سے دیکھے گا۔'' فتح خان نے کہا۔ ''اب ہم طریقے سے تلاش کرے گا۔ جو درخت ایک بار چیک کر لے گا اس پر نشان لگا دے گا۔''

''لیکن اس میں بہت وقت لگے گا۔''

''بے شک لگے، تمہارا کون سا فلائٹ چھوٹ رہا ہے۔'' اس نے چالاکی سے کہا۔ ''ہم بھی فارغ ہے تو کیوں نا وقت کا اچھا استعمال کیا جائے۔''

میں نے اس کی وقت کے لیے قدر شناسی کی دل ہی

دل میں داد دی۔ جلال نے میرے پاؤں اور پھر ہاتھ کھول دیئے۔ فتح خان نے بہ ظاہر بے پروائی سے لیکن درحقیقت پوری چوکسی کے ساتھ پستول نکال لیا تھا۔ وہ مجھ پر ذرا بھی اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھا۔ شمالی ڈھلان کوئی پون کلومیٹر لمبی اور اوپر سے نیچے تک کوئی نصف کلومیٹر چوڑی تھی اور اس میں بلاشبہ ہزاروں کی تعداد میں بلند و بالا درخت تھے۔ ان سب کو نئے سرے سے دیکھنے میں کئی دن کا وقت لگ سکتا تھا۔ مگر فیصلہ میرے ہاتھ میں نہیں تھا۔ فتح خان نے پوری ڈھلان کی چھان بین کا فیصلہ کیا تھا اس لیے ہم نے ایک سرے سے شروع کیا۔ جلال نیچے وادی سے ایک سفید چونے جیسا پتھر لے آیا تھا اسے کسی چیز پر رگڑا جاتا تو یہ سفید نشان چھوڑتا تھا اس سے نشان لگانے کا کام لیا جانے لگا۔ احتیاط کے طور پر فتح خان نے ایک وقت میں ایک درخت دیکھنے کی پالیسی اپنائی۔ ہم تینوں مل کر درخت دیکھتے تھے اور پھر فتح خان اس پر سفید پتھر سے نشان لگا دیتا۔

سورج چڑھنے کے ساتھ ہی خنکی غائب ہوگئی اور اس کی جگہ ہلکی سی گرمی کا احساس ہونے لگا خاص طور سے جہاں دھوپ ہوتی تھی وہاں چند سیکنڈ میں دماغ گرم ہونے لگتا تھا اس لیے ہم سائے میں رہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ موسم گرم ہونے کے ساتھ خشک بھی ہو رہا تھا اس لیے بار بار پیاس لگ رہی تھی اور دوپہر تک ہم پانی کا ذخیرہ تقریباً ختم کر چکے تھے اس لیے فتح خان نے آرام کے وقفے کا اعلان کیا اور جلال کو پانی لینے نالے کی طرف روانہ کر دیا۔ اب تک ہم کوئی دو سو درخت دیکھ چکے تھے اور یہ کل درختوں کا دس فیصد بھی نہیں بنتے تھے۔ جلال کے جانے کے بعد میں نے فتح خان سے کہا۔ ”اس عورت کو کہاں چھوڑا ہے جسے تم ساتھ لائے تھے؟“

وہ چونکا۔ ”تم کو کیسے پتا؟“

میں مسکرایا۔ ”میرے بھی ذرائع ہیں۔ اگر تم مجھ پر نظر رکھ سکتے ہو تو کیا میں تم پر نظر نہیں رکھ سکتا؟“

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا۔ ”شہباز خان تم بلف کر رہا ہے۔ تم نے فون پر عورت کا آواز سنا اور اب مجھے بے وقوف بنا رہا ہے۔“

”آواز سے یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ بولنے والی کے بال گولڈن براؤن ہیں۔ قد تقریباً پانچ فٹ چار انچ اور وزن ساٹھ کلوگرام کے آس پاس ہے مگر اضافی وزن موزوں جگہوں پر ہے۔ اس نے نیلا شلوار سوٹ اور اس پر ہلکا نیلا دوپٹا لیا ہوا تھا۔“ میں نے ہوٹل والے لڑکے سے حاصل ہونے والی معلومات روانی سے بیان کیں۔ فتح خان تشویش زدہ نظر آنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ مجھ سے پوچھنے کا فائدہ نہیں ہے میں اسے سچ نہیں بتاؤں گا۔ مگر اسے خیال ضرور ہو گا کہ میرا کوئی ساتھی اس کے پیچھے تھا اور اسی نے مجھے یہ ساری معلومات فراہم کی ہوں گی۔ میں معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا اور فتح خان کے خدشات کو تقویت دے رہا تھا کہ اسی میں میری بہتری تھی۔ اب تک فتح خان مجھ پر مکمل حاوی تھا۔ مگر اس کی تشویش سے اس کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔

”ویسے خاتون ہے کون؟“

”تم کو میرا کزن یاد ہے تمہارا ہم نام تھا اور مرشد کے چکر میں مارا گیا تھا؟“

”بالکل یاد ہے غالباً اسی کی وجہ سے شہباز خان کا لفظ تمہارے منہ پر چڑھا ہے۔“

”گل شادا اسی کا بیوہ ہے۔“

”تم نے کزن کی بیوہ کو اپنی رکھیل بنا لیا؟“ میں نے ملامت سے کہا۔

”نہیں وہ اب میرا بیوی ہے۔“ فتح خان نے اس لہجے میں کہا کہ اس رشتے کی حیثیت خود ہی واضح ہوگئی تھی۔

”تم اسے کہاں چھوڑ کر آئے ہو؟“

”فتح خان کے پاس یہاں ٹھکانوں کی کمی نہیں ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”اسے ایک جگہ چھوڑا ہے۔“

”وہ تم سے ڈرتی ہے جب میں نے تمہارے نمبر پر کال کی اور اس نے ریسیو کی تو پہلے تو فتح خان کو پہچاننے سے انکار کر دیا پھر بولی کہ تم سو رہے ہو اور اٹھایا تو مارو گے۔“

فتح خان مسکرایا۔ ”وہ سمجھدار عورت ہے ورنہ اس کے جسم پر میری چوٹ کا نشان رہتا۔ پر وہ بھلا عورت ہے جس پر اب تک میرا ہاتھ نہیں اٹھا ورنہ شہلا نے بھی مجھ سے مار کھایا تھا۔“

”تم نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“

”بالکل ٹھیک کیا وہ اسی کا مستحق تھا۔ کیا تم نہیں جانتا کہ وہ کس قسم کا عورت تھا۔“

”عورت صرف عورت ہوتی اسے قسموں میں ہم مرد بانٹتے ہیں۔“ میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”تمہارے نزدیک عورت صرف جسم کا نام ہے۔“

”تم ٹھیک سمجھا۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”فتح خان نے صرف ایک عورت کو عورت سمجھا اس کے بعد یہ میرے لیے

بس جسم رہ گیا۔"
"غالباً گل شاد کا حشر بھی بھاگ بھری والا ہوگا۔"
"نہیں میرے ساتھ رہے گا بچہ مچہ پیدا کرے گا۔ مجھے بھی تو اگلی نسل کا ضرورت ہے۔"
میرے خیال، میں تو اسے خاصی تاخیر ہوگئی تھی کیونکہ وہ پچاس سے اوپر کا تھا اور اگر اس عمر میں اس کا بچہ ہوتا تو وہ امکان تھا کہ وہ اسے جوان دیکھے بغیر ہی دنیا سے رخصت ہوجائے۔ شراب کباب سے بے اعتدال شغل نے اسے نقصان پہنچایا تھا مگر اسے اصل خطرہ اپنے لاتعداد دشمنوں سے تھا جن میں سے، ہر ایک اسے دنیا سے رخصت کرنا چاہتا ہوگا۔ اپنی نام نہاد بیوی کو بیوہ اور بچوں کو یتیم چھوڑ جاتا۔ شاید وہ اس معاملے میں تقدیر پر بھروسا کرتا تھا کہ جیسے وہ پل گیا اس طرح اس کے بچے بھی پل جائیں گے۔ فتح خان نے کچھ دیر بعد سوال کیا۔ "تم راجا کے پاس کیوں جا رہا تھا؟"
"وہ بیمار ہے، اس کی مزاج پرسی..... میرا مطلب ہے طبیعت کا معلوم کرنے جا رہا تھا۔"
"وہ ضدی آدمی ہے اس حال میں بھی تم کو ساتھ لے جانے کا بات کرے گا۔"
"ہوسکتا ہے۔"
"اگر اس نے کہا تو تم اس کے ساتھ چلا جائے گا؟"
"ہوسکتا ہے، کیونکہ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ راجا عمر دراز کے مجھ پر خاصے احسانات ہیں۔"
"وہ اچھا آدمی ہے لیکن میرا جانی دشمن ہے میں اس کے ہاتھ آیا تو وہ مجھے مروا دے گا۔"
"اس کی نظر میں تمہاری کوئی اہمیت نہیں ہے جو وہ خاص طور سے تمہیں تلاش کرائے، ہاں تم خود اس کے ہاتھ آگئے تو تمہارا بچنا مشکل ہوگا۔"
گفتگو کے دوران میں ہمیں خیال نہیں رہا۔ اچانک فتح خان چونکا۔ "یہ جلال اب تک واپس نہیں آیا؟"
"ہوسکتا ہے، اسے پانی ملنے میں دیر ہوئی ہو۔ اوپر کی طرف نالا تقریباً خشک ہوگیا ہے۔"
"پھر بھی اتنا دیر۔" فتح خان نے کہا اور اپنے لباس سے ایک سیٹی نکال کر بجائی تو کسی پرندے جیسی آواز نکلی تھی۔ کچھ دیر آواز پہاڑوں میں گونجتی رہی پھر تھم گئی۔ چند لمحے کے وقفے سے، فتح خان نے پھر سیٹی بجائی اور ساتھ ہی جلال خان کو ایک لقب سے نوازہ جس میں اس کی والدہ کو ایک ناپاک جانور سے خلط ملط کیا تھا۔ دوسری بار بھی جواب نہیں ملا تو فتح خان چوکنا نظر آنے لگا اس نے غرا کر مجھ سے کہا۔ "کھڑے ہو۔"
میں کھڑا ہوگیا۔ "اور کوئی حکم؟"
"نالے کی طرف چلو۔" فتح خان نے اشارہ کیا۔ "میں تمہارے عین پیچھے ہوگا اور گولی مارنے میں ایک سیکنڈ کا دیر نہیں کرے گا۔"
"میرا قصور؟"
"ابھی تو نہیں ہے پر اگر جلال تیرا وجہ سے غائب ہوا تو پھر خیر نہیں ہوگا۔" فتح خان نے واضح کیا۔ "اب چلو۔"
میں ڈھلان کے ساتھ ساتھ نالے کی طرف بڑھا۔ دوپہر کے بارہ بج رہے تھے اور اس بیگار میں ناشتا کب کا ہضم ہوچکا تھا۔ میں نے فتح خان سے کہا۔ "لنچ کے بارے میں کیا خیال ہے۔"
"کلاشن کا گولی ملے گا۔" اس نے رائفل کی نال گھمائی۔ "کھائے گا؟"
"اگر تم بھی کھاؤ گے تو میں بھی کھالوں گا۔" میں نے شگفتگی سے کہا مگر اندر سے میں فکر مند تھا۔ جلال کا غائب ہونا نیک شگون نہیں تھا۔ میں جانتا تھا میرے ساتھی قطعی بے خبر تھے کہ میں اس وقت کہاں ہوں مگر ہوسکتا ہے کہ کوئی اور پارٹی بھی ہو اور فتح خان سمجھے کہ میرے ساتھیوں نے کچھ کیا ہے۔ راستے میں فتح خان نے دوبارہ اور پرندے کی آواز والی سیٹی بجائی اور حسب سابق جواب نہیں آیا۔ ہم نالے کے پاس پہنچے۔ اس بار فتح خان نے عقل مندی سے کام لیا اس نے مجھے آگے رکھا مگر خود آڑ میں ہوگیا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "نالے میں دیکھو، پر بھاگنے کا مت سوچنا۔"
"میں سوچوں گا نہیں اگر موقع ملا تو عمل کروں گا۔" میں نے کہا اور نالے میں اتر گیا۔ میں بھی محتاط تھا اور آواز پیدا کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ وہاں اگر کوئی تھا تو ہماری آوازوں سے ہوشیار ہوجاتا۔ فتح خان سمجھ رہا تھا کہ وہاں میرے ساتھی ہوسکتے تھے اس لیے اس نے مجھے ڈھال اور... یرغمال کے طور پر آگے کیا تھا مگر میں جانتا تھا وہاں میرے کسی ساتھی کی موجودگی کا کوئی امکان نہیں تھا اگر وہاں کوئی تھا تو اس کے لیے میں اور فتح خان برابر ہوتے اور مجھے اس سے بھی خطرہ ہوتا۔ میرے لیے زیادہ بڑا خطرہ فتح خان تھا جو رائفل بدست میرے پیچھے موجود تھا اور کسی بھی گڑبڑ کے موقع پر وہ دوسروں کے ساتھ مجھے بھی ٹھکانے لگانے کی پوری کوشش کرتا۔ اس سے پہلے ہیروں کے جائے وقوع کے بارے میں معلومات صرف میرے پاس تھیں لیکن اب یہ

معلومات فتح خان تک پہنچ گئی تھیں اور میں اس کے لیے پہلے جیسا ناگزیر نہیں رہا تھا۔ نالا یہاں تقریباً بیس پچیس گز تک بالکل سیدھا تھا اور اس کے دونوں طرف گھاس اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔

جہاں تک نظر جاتی تھی کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نالے کے بالکل وسط میں پتلی سی لکیر کی صورت میں پانی بہہ رہا تھا۔ میں نے جھک کر ہاتھوں کے پیالے سے پانی پیا اور آگے بڑھا۔ اچانک مجھے ذرا آگے پانی میں کوئی سیاہ سی چیز دکھائی دی۔ میں نے جھک کر اسے اٹھایا۔ یہ سیاہ رنگ کا تعویذ تھا جو سیاہ ہی رنگ کی ٹوٹی ڈوری کے ساتھ تھا۔ یہ تعویذ یہاں گرا ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا جلال کے گلے میں ایسا ہی سیاہ رنگ کا تعویذ تھا۔ یہ دھات کا تھا اور ڈوری سے لگ رہا تھا کہ اسے قوت سے کھینچا گیا تھا جس کی وجہ سے یہ ٹوٹ گئی۔ میں نے مڑ کر فتح خان کو تعویذ دکھایا تو اس نے مجھے واپس آنے کا اشارہ کیا۔ میں واپس آ گیا۔ اب تک کسی طرف سے نہ تو مداخلت ہوئی تھی اور نہ ہی کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی دیے تھے۔ فتح خان نے قریب آنے پر آہستہ سے کہا۔ ”شہباز یہاں تمہارا آدمی ہے۔“

”میرا کوئی آدمی اگر یہاں ہے تو میں اس سے بے خبر ہوں۔ ویسے لگ رہا ہے جلال کسی حادثے کا شکار ہوا ہے۔“

”یہ تعویذ اسی کا ہے۔“ فتح خان نے تعویذ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ”ادھر سے چلو یہاں خطرہ ہے۔“

”فتح خان تمہارا خیال ہے کہ یہاں میرے آدمی ہیں جب کہ میرا خیال مختلف ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”تم نے ان ہیروں کی بازیابی کے لیے جتنی کوششیں کیں ان سے یہ ہوا کہ یہاں ہیروں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ لوگ جانتے چلے گئے۔ کیا ان میں سے کوئی تمہارا پیچھا کرتا نہیں آ سکتا؟“

”ہیروں کے بارے میں جتنے لوگوں نے جانا ان میں سے زیادہ تر اس دنیا میں نہیں رہے ہیں۔“

”لیکن کچھ نہ کچھ ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”فتح خان معاملہ بہت بڑی رقم کا ہے جب یہ ہیرے سالوں پہلے غائب ہوئے تو ان کی مالیت پچیس ملین ڈالرز تھی۔ یہ مالیت یقیناً اب کہیں زیادہ ہو گئی ہو گی۔ ایک اور شخص بھی ہے جو ان ہیروں کا دعوے دار ہو سکتا ہے لیکن اس نے حیرت انگیز طور پر آج تک ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔“

”ڈیوڈ شا۔“ فتح خان بولا۔ ”اسے ہیروں سے دل چسپی نہیں ہے۔“

”ایسا مت کہو تقریباً ڈھائی ارب روپے مالیت کے ہیروں میں کوئی فرشتہ ہی دل چسپی لینے سے انکار کر سکتا ہے۔ ڈیوڈ شا فرشتہ نہیں ہے۔“

”تب تم کو بھی دل چسپی ہونی چاہیے۔ تم بھی فرشتہ نہیں ہے۔“ فتح خان کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ ہم دونوں آگے پیچھے اسی ڈھلان پر اوپر کی سمت جا رہے تھے اور میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ اس طرف کیوں جا رہا تھا۔

”درست کہا۔“ میں نے تسلیم کیا۔ ”لیکن تم جانتے ہو میری جان دوسرے معاملات میں الجھی ہوئی ہے اور میں فی الحال کسی نئے چکر میں نہیں پھنس سکتا۔“

”تب تم یہاں کیوں آیا؟“

”میں بتا چکا ہوں میں ان ہیروں کی مدد سے تم پر دباؤ ڈالنا چاہتا تھا۔ ذاتی طور پر مجھے ان ہیروں سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔“

دس منٹ میں ہم خاصی بلندی پر آ گئے تھے۔ یہاں پہنچ کر فتح خان نے مجھے زمین پر الٹے منہ لیٹنے کا حکم دیا اور اپنے لباس سے ایک چھوٹی مگر طاقتور دوربین نکال لی۔ اب میں سمجھا کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا۔ اس جگہ سے وادی اور اس سے نکلنے والے نالے کا منظر بہتر طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ دوربین سے نیچے دیکھنے کے دوران میں وہ مجھ پر ٹھیک سے نظر نہیں رکھ سکتا تھا اس لیے اس نے مجھے نیچے لیٹنے اور دونوں ہاتھ گردن پر رکھنے کا حکم دیا۔ میں نیچے لیٹ گیا اور دونوں ہاتھ گردن پر رکھ لیے۔ فتح خان دوربین سے نیچے کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے فتح خان سے کہا۔ ”ممکن ہے ایسی کوئی چیز آنے والوں کے پاس بھی ہو اور وہ تمہیں دیکھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔“

”چپ رہو۔“ اس نے غرا کر کہا۔

”جب دشمن چھپا ہو اور سامنے آنے سے گریز کر رہا ہو تو سمجھ لو وہ تمہارے اعصاب آزما رہا ہے اور اس صورت میں کسی قسم کی عجلت یا بے صبری نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔“

”میں سمجھتا ہے۔“ وہ جھنجلا گیا۔ ”تم چپ نہیں رہ سکتا۔“

”ٹھیک ہے میں چپ ہوں۔ بلکہ اجازت ہو تو ذرا سو جاؤں رات بھی بس برائے نام نیند آئی تھی۔“

”میرا طرف سے ہمیشہ کی نیند سو جاؤ۔“ فتح خان نے بھنا کر کہا۔

''وہ میرے دشمن سوئیں۔'' میں نے کہا اور سچ مچ آنکھیں بند کرلیں مگر اس پوز میں سونا بہت مشکل تھا۔ ذرا سی دیر میں میری گردن دکھنے لگی تھی کیونکہ سارا زور اس پر آرہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ تک فتح خان وادی کا معائنہ کرتا رہا۔ پھر اس نے مجھے اٹھنے کا حکم دیا۔

''شہباز خان۔'' اس نے مجھ پر نظر جما کر کہا۔ ''اگر یہ تمہارا آدمی ثابت ہوا تو میں تم کو فوراً شوٹ کردے گا۔''

''وہ کیوں؟'' میں نے کہا۔ ''اگر میرے آدمی میرے لیے کوشش کررہے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے مگر میں ایک بار پھر یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میرے آدمی نہیں ہیں۔''

''تب ہلال کہاں ہے؟''

''مجھے کیا معلوم؟''

''تم کو معلوم ہے اس کا تعویذ بھی تم نے ڈھونڈا ہے۔''

''فتح خان اب تم پٹھان بن رہے ہو۔'' میں نے ملائمت سے کہا۔ ''مجھے تم جیسے ذہین آدمی سے ایسی بات کی توقع نہیں تھی۔''

اس کا موڈ خراب ہوگیا۔ ''یہ اس وقت کون خانہ خراب آگیا، ٹانگ اڑانے۔''

فتح خان ایک بار پھر دوربین سے دیکھنے لگا اور چند منٹ بعد وہ چونکا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں نے دیکھ لیا۔''

''کیا اور کہاں دیکھ لیا؟''

''ادھر چٹانوں میں کوئی ہے۔'' اس نے وادی کی وسطی کھنڈر نما چٹانوں کی طرف اشارہ کیا۔

''ممکن ہے کوئی جانور ہو۔''

''اس وقت وہاں جتنی گرمی ہوتا ہے کوئی جانور ادھر کا رخ نہیں کرسکتا۔ کیا تم کو پتا نہیں ہے۔''

وہ درست کہہ رہا تھا اچھے موسم میں بھی یہ چٹانیں دوپہر میں گرم ہوجاتی تھیں اور آج تو ویسے ہی خاصی گرمی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''کیا مجھے دوربین دو گے؟''

اس نے دوربین میری طرف بڑھا دی۔ میں نے آنکھوں سے لگائی۔ دوربین سچ مچ خاصی طاقتور تھی کیونکہ تقریباً پون کلومیٹر دور چٹانیں جیسے آنکھوں کے سامنے آگئی تھیں۔ تقریباً دائرے میں اور کوئی تین سو میٹرز قطر میں پھیلی یہ چٹانیں کسی زلزلے کا شکار ہوکر ایسا روپ اختیار کرگئی تھیں اور دور سے دیکھنے پر کسی قدیم شہر کے کھنڈرات کا منظر پیش کرتی تھیں۔ یہاں لمبوترے بولڈرز پر مشتمل چٹانوں کی

اونچائی دس سے پچاس فٹ تک تھی۔ یہ درمیان سے اونچی تھیں اور کناروں سے کم اونچی تھیں۔ مسلسل بارشوں اور موسموں کا شکار ہوکر یہ اب زیادہ تیزی سے شکست و ریخ کا شکار ہورہی تھیں اور شاید کچھ عرصے بعد ان کا وجود ہی مٹ جاتا۔ میں نے فتح خان سے پوچھا۔ ''تم نے کس طرف حرکت دیکھی تھی؟''

''دائیں طرف جو نوکیلی چٹان نظر آرہا ہے اس کے پاس۔''

میں نے دوربین اس طرف مرکوز کی اور تلاش کرنے لگا۔ اس طرف سورج کی روشنی زیادہ تھی اور وہاں معمولی سی چیز بھی نمایاں ہورہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ دشمن ہی تھا تو اس نے نہایت احمقانہ حرکت کی تھی۔ اس وقت یہاں رہنا جہنم میں رہنے کے مترادف تھا اور پھر یہاں بے پناہ روشنی کی وجہ سے نظروں میں آنے کا بہت زیادہ امکان تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ اتفاق ہے، دھوکا ہے یا پھر دشمن کی کوئی چال ہے۔ اچانک فتح خان نے مجھ سے دوربین واپس لے لی اور بولا۔ ''ادھر چلو۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن یہ عقل مندی نہیں ہوگی۔''

''اس وقت عقل کا بات مت کرو۔'' اس نے غرا کر کہا۔ ''اگر ادھر کوئی موجود ہے تو وہ کل کا سورج دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہے گا۔''

مجبوراً میں حرکت میں آیا اور ہم ڈھلان پر ایک دائرے میں گھومتے ہوئے نیچے اترنے لگے۔ پہلے اس جگہ پہنچے جہاں جلال والا تھیلا موجود تھا۔ نیچے آتے ہوئے فتح خان اور میں نے سیر ہوکر پانی پی لیا تھا۔ ہمارے پاس پانی رکھنے والی واحد چیز پلاسٹک ربر کی بوتل جلال لے گیا تھا اور وہ اسی کے ساتھ غائب تھی۔ جب ہم مغربی سمت پہنچے تو یہاں سے یہ چٹانیں زیادہ دور نہیں تھیں۔ ان کی تپش یہاں تک آرہی تھی۔ ان چٹانوں میں گرمی کا عالم سوچا جاسکتا تھا۔ مجھے کئی بار ان چٹانوں کی گرمی کا تجربہ ہوچکا تھا اور میرے خیال میں یہ نخلستان میں ایک چھوٹا سا صحرا تھا۔ یعنی اس نے محاورہ الٹا کردیا تھا۔ فتح خان نے مجھے بے بس کرنے کے لیے ایک درخت کی شاخ سے ہتھکڑی لگا کر مجھے کہا۔ ''اسے اپنا ہاتھ میں پہن لو۔''

انکار کا فائدہ نہیں تھا اس لیے میں نے خاموشی سے پہن لیا۔ یہ شاخ کوئی بہت مضبوط نہیں تھی میں اسے توڑ سکتا تھا مگر اس میں کچھ وقت لگتا اور فتح خان یہی وقت چاہتا

تھا۔اس نے پھر دوربین سنبھال لی۔ یہ جگہ چٹانوں سے کوئی دوسو فٹ اوپر تھی۔ فتح خان ایک چٹان پر اوندھے منہ لیٹ کر دوربین آنکھوں سے لگائے ہوئے تھا اور اسے آہستہ حرکت دے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ چٹانوں کے درمیان کسی کو تلاش کررہا ہو۔ اب دو بج رہے تھے اور پیٹ میں باقاعدہ چوہے دوڑنے لگے تھے۔ میں اپنے ساتھ جو زاد راہ لایا تھا وہ بھی ان لوگوں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ میرا اسلحہ ان کے پاس نہیں تھا اس کا مطلب تھا وہ انہوں نے کہیں چھپا دیا تھا۔ ورنہ شاٹ گن چھپانا مشکل کام تھا۔ پستول شاید فتح خان یا جلال کے پاس ہوتا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''فتح خان فرض کرو جلال کسی کے ہتھے چڑھ گیا ہے تو کیا اس نے ہمارے بارے میں زبان بند رکھی ہوگی۔''

''جلال پکا آدمی ہے وہ کبھی زبان نہیں کھولے گا۔''

''فرض کرو جن لوگوں نے جلال کو قابو کیا وہ ہمارے بارے میں پہلے ہی جانتے ہوں گے۔''

''تب وہ ہمارے پیچھے کیوں نہیں آیا؟''

''ممکن ہے وہ صرف نگرانی کررہے ہوں کہ کب ہم ہیرے حاصل کرتے ہیں اور جلال کسی غلطی سے ان کے سامنے آگیا ہو۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ جلال کو کسی غلطی کی وجہ سے پکڑا ہے۔''

''ہاں، ان کا ارادہ ہوتا تو جلال کے بعد ہمیں قابو کرنا کون سا مشکل کام تھا وہ کہیں بھی آرام سے ہمیں ہینڈز اپ کرالیتے۔ تم خود بتاؤ کیا دو تین چھپے مسلح افراد کا مقابلہ کرسکتے ہو۔''

''نہیں۔'' اس نے اقرار کیا۔ مگر اس نے اپنے انداز میں تبدیلی نہیں کی اور بدستور چٹانوں کی طرف دیکھتا رہا۔

''اگر کوئی اس طرف موجود ہے تو یقین کرلو یہ ٹریپ ہے۔''

''چپ کرو میں بھی عقل رکھتا ہے۔'' وہ جھنجلا گیا۔ ''سارا عقل تمہارے پاس نہیں ہے۔''

''یہ تو ہے مگر میں اس کا استعمال ذرا فراغ دلی سے کرتا ہوں۔ تم جانتے ہو استعمال کرنے سے عقل کم نہیں ہوتی ہے۔''

اس گفتگو کے دوران میں، میں شاخ کی مضبوطی بھی آزمارہا تھا کہ اگر میں اسے توڑنا چاہوں تو یہ کام کتنی دیر میں ہوجائے گا مگر یہ مضبوط سبز شاخ تھی اسے توڑنا آسان نہیں تھا کم سے کم فتح خان پر قابو پانے کے لیے توڑنا ممکن نہیں تھا۔

اسے چوکنا ہونے کے لیے کافی وقت ملتا۔ البتہ کسی ہنگامی صورت حال میں، میں اسے چند سیکنڈ میں توڑ سکتا تھا۔ فتح خان نے اس کا خیال رکھا تھا کہ میں سامنے نہ ہوں اس لیے اس نے مجھے درخت کے تنے کی آڑ میں باندھا تھا۔ میں نے شاخ کو اس کی جڑ تک ٹٹولا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''فتح خان میرا مشورہ مانو تو یہاں سے نکلنے کی کرو۔ اس کا خطرہ بہت زیادہ ہے کہ دشمن تمہاری موجودگی سے واقف ہے اور وہ تمہیں شکار کرنے کے لیے ہانک رہا ہے۔ ایک بار تم اور میں اس کے ہاتھ آگئے تو شاید ہیرے تمہارے ہاتھ نہ آئیں۔''

''وہ کیسے؟''

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''دیکھو میں اور تم ایک دوسرے کو جانتے ہیں اگر ہم نے ایک دوسرے کو مارنا ہوتا تو ایسے کتنے ہی مواقع آئے تھے جب ہم ایک دوسرے کو مار سکتے تھے مگر مصلحت نے ہمارے ہاتھ روک لیے۔ ہر کوئی ایسا نہیں سوچتا ہے۔ اگر اس نے عجلت دکھائی تو شاید ہم دونوں ہی مارے جائیں۔''

فتح خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں ہیرے لیے بغیر نہیں جائے گا۔''

''فتح خان تم بچکانہ ضد کررہے ہو اور اتنے بڑے خطرے کو نظر انداز کررہے ہو۔ تم جلد فیصلہ کرلو میرے حساب سے اب زیادہ وقت نہیں رہا ہے سورج ڈوبتے ہی یہ لوگ حرکت میں آجائیں گے اور ہم ان کے قابو میں ہوں گے۔''

فتح خان نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور مشکوک لہجے میں بولا۔ ''تم کیسے جانتا ہے۔''

''میرا اندازہ ہے اور تم جانتے ہو میرا اندازہ اکثر درست نکلتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے پیچھے کون ہے مگر میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ جو کوئی بھی ہے اصل میں ہیروں کے چکر میں ہے۔ اس کی تم سے کوئی براہِ راست دشمنی ہے بھی تو وہ ہیروں کی خاطر تمہیں چھوٹ دے رہا ہے۔ ہاں جب تم اس کے قابو میں آگئے اور اسے ہیرے ملے یا نہ ملے دونوں صورتوں میں تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہوگا۔''

''تمہارے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوگا۔''

''ہاں میں گیہوں کے ساتھ گھن کی طرح پسوں گا۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''حالانکہ گھن اصل میں تم ہو جو مجھے لگ گئے ہو۔''

فتح خان نے دوربین گلے میں لٹکالی اور ذرا پیچھے ہو کر

چٹان پر لیٹ گیا۔ اس نے مجھے کھولنے کی کوشش نہیں کی اور تھیلے سے ایک روٹی نکال کر ایسے ہی کھانے لگا۔ میں نے کہا۔ ”بے شک تم مجھے باندھ کر رکھو مگر بھوکا رکھنا کمینگی ہے۔“

”ہم کمینہ آدمی ہے۔“ فتح خان نے دانت نکالے مگر تھیلے سے ایک روٹی نکال کر مجھے بھی تھما دی۔

”مجھے کھولو میں ایسے نہیں کھا سکتا۔“

”مت کھاؤ پر ابھی میں نہیں کھول سکتا۔“ اس نے انکار کیا۔ مجبوراً مجھے تنے سے ٹک کر ہی واحد ہاتھ سے روٹی کھانے پڑی تھی میں نے اسے گول کر کے رول کی شکل دے دی۔ اس طرح کھانے میں آسانی ہو رہی تھی۔ روٹی ختم کر کے میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ جو اپنے گناہ گار بندے کو ہر حال میں رزق دیتا ہے۔ اگرچہ ایک روٹی نے بھوک ختم نہیں کی تھی مگر پیٹ میں ہونے والی چوہا ریس ختم ہو گئی تھی۔ فتح خان بھی روٹی ختم کر کے سستا رہا تھا۔ بہ ظاہر اس نے میری بات کا زیادہ اثر قبول نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اس کے رویے میں کوئی عجلت اور پریشانی نہیں تھی۔ وہ مزے سے لمبی تان کر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”تم تقدیر پر ایمان رکھتے ہو؟“

اس نے طنزیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے ادھر سکون سے ایسے ہی لیٹا ہے۔“

”تب مجھے کس بات کی سزا ہے؟“ میں نے بھنا کر پوچھا۔

”یہ احتیاط ہے۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”تم کھلا دشمن ہے اور سامنے ہے تم کو آزاد نہیں چھوڑ سکتا ہے، جو دشمن سامنے نہیں اور آزاد ہے اسے اوپر والے پر چھوڑا ہوا ہے۔“

”وہی تمہیں جہنم رسید کرے گا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے کھولو ورنہ میں چلاؤں گا۔ میں اس طرح کھڑے کھڑے تھک گیا ہوں۔“

حالانکہ میں خاص نہیں تھکا تھا۔ مگر فتح خان پر ظاہر کر رہا تھا کہ میں چل چل کر کھڑے رہ کر تھک گیا ہوں۔ فتح خان کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر اس نے ہتھکڑی کھول کر مجھے آزاد کر دیا۔ ہتھکڑی تھیلے میں ڈال کر وہ دوبارہ اسی انداز میں لیٹ گیا تھا۔ مگر اس کا ہاتھ رائفل پر تھا۔ میں وہیں تنے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ یہ کم سے کم سات فٹ قطر کا تنا تھا اور درخت کی اونچائی شاید سو فٹ ہو گی یا اس سے بھی زیادہ ہو گی نیچے سے اس کی اونچائی کا درست اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ سورج اب مغرب کی طرف ڈھل رہا تھا اور تین بجے چکے تھے مگر تپش اور دھوپ کی تیزی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ البتہ درختوں کے نیچے گرمی کا احساس کم ہو گیا تھا۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ شمالی علاقے میں اونچے پہاڑوں اور وادیوں میں گرمی نہیں پڑتی ہے۔ حالانکہ یہاں بھی گرمی پڑتی ہے اور اچھی خاصی پڑتی ہے جہاں جہاں چٹانیں وہاں تو گرمی صحرا کی مانند ہو جاتی ہے اور ایسا بھی ہوا کہ چٹانوں میں جانے والا کوئی ٹریکر یا سیاح ڈی ہائیڈریشن سے ہلاک ہو گیا۔ اس وادی کی کھنڈر نما چٹانیں اس کا جیتا جاگتا ثبوت تھیں کہ تقریباً چھ سات ہزار فٹ کی بلندی پر بھی اذیت ناک گرمی ہو سکتی ہے۔

میری نظر چٹانوں پر مرکوز تھیں۔ اگرچہ یہاں سے چٹانوں کے سارے حصے نظر نہیں آ رہے تھے مگر اس کا وسطی حصہ اور ہماری طرف والا حصہ واضح دکھائی دے رہا تھا اور اب تک مجھے اس حصے میں کوئی حرکت نظر نہیں آئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ فتح خان کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی یا اسے یہاں تک گائیڈ کیا گیا تھا مگر اس وقت وہاں کسی کا موجود ہونا بہت مشکل تھا۔ مجھے یاد ہے ہم جان بچانے کے لیے وہاں رہے تھے اور یہ وقت بڑی مشکل سے گزارا تھا۔ پانچ چھ کے بعد یہ چٹانیں اتنی ٹھنڈی ہوتی تھیں کہ ان میں رہا جا سکے۔ اچانک مجھے لگا کہ کوئی سیاہ سی چیز چٹانوں کے درمیان تیزی سے حرکت کر رہی ہو۔ مگر یہ جھلک ایک لمحے کے لیے تھی جو دو چٹانوں کے درمیان نظر آئی تھی اور شاید سیکنڈ کے تیسرے حصے کے لیے تھی۔ مگر میری نظروں نے صاف دیکھا تھا۔ مگر یہ واضح نہیں تھا کہ گزرنے والی چیز کوئی انسان تھا یا کوئی جانور، وہ بہت نیچے سے گزرا تھا تقریباً کتے جتنی بلندی تھی۔ اگر کوئی انسان جھک کر بھاگتا تو وہ بھی اسی طرح دکھائی دیتا۔ میں غور کر رہا تھا کہ فتح خان نے دیکھ لیا اس نے پوچھا۔ ”کیا نظر آیا ہے؟“

”جو تمہیں دکھائی دیا تھا۔“ میں نے کہا اور چٹان کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس جگہ وہ جو درمیان میں چھوٹا سا گیپ نظر آ رہا ہے۔ اس سے کوئی سیاہ چیز گزری ہے۔“

فتح خان نے اس طرف دیکھا اور بولا۔ ”تم سچ کہہ رہا ہے کیا؟ یا مجھ کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”غالباً تم خود یہاں آئے ہو اور پہلے ہی بنے ہوئے ہو اس لیے مجھے کوشش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ میں واپس تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ فتح خان مسکرایا۔

''تم برا مان گیا؟''

''میں اس وقت صحیح سے برا مانوں گا جب تمہاری وجہ سے مجھے کوئی نقصان ہو گا۔ تم مجھ پر اعتبار نہیں کرو گے اس لیے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔''

''اتنا ناراض مت ہو۔'' اس نے گویا مجھے پچکار کر کہا۔ ''ابھی میں سوچ رہا ہے۔''

''میرا خیال ہے دشمن عمل کر رہا ہے اور تم ابھی تک سوچ ہی رہے ہو۔''

''تم فکر مت کرو فتح خان ترنوالہ نہیں ہے۔''

چار بجے کے بعد سورج تیزی سے جھکنے لگا تھا اور اب اس طرف ڈھلان پر اندھیرا آ رہا تھا۔ کیونکہ سورج مغرب کی طرف آ رہا تھا اس لیے چٹانوں کا مغربی حصہ زیادہ روشن اور واضح ہو رہا تھا۔ شاید اسی لیے مجھے وہ سیاہ جھلک دکھائی دی ورنہ دوپہر کی تیز روشنی میں جہاں جہاں سائے بن رہے تھے وہ سیاہ تھے اور ان کے ہوتے ہوئے کسی الگ سی چیز کو تلاش کرنا بہت دشوار کام تھا۔ فتح خان نے مجھ سے کہا۔ ''میں مذاق کر رہا تھا مجھے یقین ہے تم نے بھی کچھ دیکھا ہو گا۔''

''تمہاری مہربانی۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ہم دونوں بیٹھے ہوئے تھے اور بہ ظاہر فارغ البال لگ رہے تھے۔ فتح خان نے وقت گزاری کے لیے پوچھا۔

''برٹ شا کالڑکی ایمن تم سے ملتا ہے؟''

''نہیں لیکن اس سے ایک دوبار رابطہ ہوا۔''

''اچھا لڑکی ہے تم پر مرتا ہے۔''

''خیال ہے تمہارا، گورے کبھی اتنے جذباتی نہیں ہوتے کہ محبت کے چکر میں مریں یا ماردیں، یہ تو صرف ہم لوگ ہی اتنے جذباتی ہیں۔''

''تم ٹھیک کہتا ہے پر وہ لڑکی تم سے محبت کرتا ہے۔''

''تم اسے زیادہ سے زیادہ پسند کہہ سکتے ہو۔'' میں نے تردید کی۔ ''اس کی وجہ بھی تم جانتے ہو جب میں نے اسے تمہارے اور کرم خان کے چنگل سے نکالا تھا۔''

''کرم خان۔'' فتح خان نے سرد آہ بھری۔ ''وہ میرا بچپن کا دوست، اور چچا کا بیٹا تھا۔ ان ہیروں کے لیے وہ میرا دشمن بن گیا میں نے اپنے ہاتھ سے اس کا گلا کاٹا تھا۔''

''اگر کرم خان زندہ ہوتا تو میں سوچتا کہ یہ وہی ہے۔''

''کرم کا ایک ہی بھائی ہے۔ بیرم خان لیکن وہ ادھر نہیں ہوتا۔ بیس سال سے ادھر انگلینڈ میں ہے۔''

''کیا اسے نہیں معلوم کہ اس کے بھائی کو کس نے قتل کیا ہے؟''

''ہو سکتا ہے معلوم ہو پر وہ اس قسم کا آدمی نہیں ہے کہ انتقام کے لیے خود کو خطرے میں ڈالے۔''

''کسی کے بارے میں اتنے یقین سے مت کہا کرو خاص طور سے جب الفاظ کے مقابلے میں تمہاری جان داؤ پر لگی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''فرض کرلو کہ اس وقت ان چٹانوں میں کوئی ہے تو تم اس کے خلاف کیا کرلو گے؟''

''ابھی تم دیکھے گا۔'' فتح خان نے کہا۔ ''چلو اٹھو۔''

''کہاں جانا ہے؟''

''پانی پی کر آئے گا۔'' وہ بولا۔

مجھے بھی پیاس لگ رہی تھی اور ہم ڈھلان سے گھومتے ہوئے نالے کی طرف روانہ ہوئے۔ ''تمہارے پاس پانی رکھنے کے لیے کوئی اور چیز نہیں ہے کیا؟''

''ہوتی تو یوں خوار ہوتا۔''

آدھے گھنٹے بعد ہم نالے میں تھے اور ہم نے دل بھر کر پانی پیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اب صبح تک پانی نہیں ملے گا۔ ویسے رات میں پیاس کا اتنا مسئلہ بھی نہیں ہوتا۔ جب تک ہم واپس آئے سورج تقریباً پہاڑ کے کنارے پر جا ٹکا تھا اور کچھ دیر بعد وادی سائے میں آ جاتی۔ فتح خان نے واپسی کے بعد مجھے حکم دیا۔ ''ہاتھ آگے کرو۔''

میں نے حکم کی تعمیل کی اور اس نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی اور پھر جھک کر پیروں میں بھی بیڑی پہنا دی۔ سب سے آخر میں اس نے تھیلے سے ایک کسی قدر پتلی لیکن بڑی زنجیر نکالی اور اسے ایک چھوٹے تنے والے درخت کے گرد گھما کر اور میرے پیروں سے گزار کر ایک تالے سے لاک کر دیا۔ گویا میں پوری طرح بے بس ہو گیا تھا۔ مگر میں کسی حد تک اس کا مقصد سمجھ رہا تھا۔ ''فتح خان اگر تم کسی ایڈونچر پر جا رہے ہو تو مجھے اس طرح باندھ کر کیوں جا رہے ہو؟''

''تاکہ تم واپسی میں اسی جگہ ملے۔''

''اور اگر واپسی نہ ہو سکی تو؟'' میں نے پوچھا۔

''تب کوئی دوسرا آئے گا اور تمہارا قسمت اس کے ساتھ ہو گا۔ ویسے ابھی تم نے پوچھا تھا تقدیر کے بارے میں تو تم خود بھی ایمان رکھتا ہو گا۔''

''ہاں لیکن ہوں تو کمزور انسان نا۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ فتح خان نے کھانے پینے اور دوسرے سامان والا تھیلا وہیں چھوڑ دیا تھا البتہ اسے میری دسترس سے دور کر دیا

تھا۔ ہاں اس نے روٹیوں والا شاپر نکال کر میرے پاس رکھ دیا۔ "یہ کھانے کے واسطے ہیں پر احتیاط کرنا اگر کوئی نہ آیا تو تم زیادہ دان زندہ رہ سکے گا۔"

اس کی بات کا مفہوم سمجھ میں آیا تو میرے جسم میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اگر کوئی نہ آیا تو میں بھوکا پیاسا مروں گا۔ روٹی ہوگی تو دیر تک زندہ رہوں گا۔ "فتح خان میں بلاوجہ مارا جاؤں گا۔"

"بلاوجہ تو نہیں اگر تم پہلے ہم کو ہیرے تلاش کر دیتا تو اس مصیبت میں نہ پھنستا۔" اس نے اپنی منطق کے مطابق بات کی اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ لگ رہا تھا کہ وہ میری بات نہیں سنے گا اور اپنی من مانی کرے گا۔ میں زندگی میں بہت پچھتایا لیکن اس وقت دل سے پچھتایا کہ مجھے اس وادی میں آنے کی کیا ضرورت تھی اگر فتح خان راستے میں آیا تھا تو میں کسی اور راستے سے راجا عمر دراز کے پاس چلا جاتا۔

یقیناً میری مت ماری گئی تھی جو میں نے ایک احمقانہ خیال کے سہارے وادی کا رخ کیا۔ جیسے ہی جنگل کا یہ حصہ اتنے سائے میں آیا کہ سایا چٹانوں تک چلا گیا۔ فتح خان حرکت میں آیا اس نے بہت تیزی سے درمیان کا فاصلہ طے کیا اور بھاگتا ہوا چٹانوں میں گھس گیا۔ عمر اور اپنی بھاری جسامت سے قطع نظر اس کی رفتار قابلِ دید تھی اور اسے دو سو میٹرز کا فاصلہ طے کرنے میں پون منٹ بھی نہیں لگا تھا۔ وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا اور جب وہ کھلی جگہ سے گزر رہا تھا تب نہ تو کسی نے اسے روکا اور نہ ہی اس پر گولی چلائی تھی۔

سائے بہت تیزی سے بڑھ رہے تھے اور چند منٹ بعد ہی چٹانیں پوری طرح سائے میں آچکی تھیں اور اب صرف وادی کی مشرقی ڈھلان پر دھوپ تھی وہ بھی تیزی سے سمٹ رہی تھی۔ میں جہاں بندھا ہوا تھا وہ جگہ تو تقریباً تاریکی میں آچکی تھی اور اگر کوئی آجاتا تو اسے شاید ہی میں نظر آتا۔ فتح خان اپنے طور پر دشمن کے شکار پر روانہ ہوا تھا مگر اس کا پورا امکان تھا کہ دشمن اسے ہی شکار کر لے۔ وہ ایک مفروضے کے ساتھ گیا تھا کہ دشمن اس سے بے خبر ہے لیکن اگر اس کے برعکس ہوتا تو فتح خان کی بہ حفاظت واپسی مشکل دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے زنجیر کا جائزہ لیا۔ یہ ہلکی لیکن خالص اسٹیل کی بنی ہوئی تھی اور مضبوطی میں کئی گنا موٹی زنجیر سے کم نہیں تھی اسی طرح تالا بھی مضبوط تھا۔ میں کیا کوئی پہلوان بھی اس زنجیر کو نہیں توڑ سکتا تھا۔ بیڑی بھی اسی طرح بہت مضبوط قسم کی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ کیا فتح خان جانتا تھا کہ میں یہاں آؤں گا جو وہ اتنی تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ لیکن وہ کیسے جان سکتا تھا جب کہ خود میرا ارادہ بھی اس طرف آنے کا نہیں تھا بلکہ یہ خیال تو مجھے لینڈ سلائیڈنگ کے بعد آیا تھا۔

اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ دراصل فتح خان یہی سمجھ رہا تھا کہ میں ہیروں کے چکر میں وادی کی طرف جارہا ہوں اور وہ اسی لحاظ سے تیاری کرکے آیا تھا مگر جب میں ہائی وے سے وادی جانے والے راستے کی طرف نہیں مڑا تو فتح خان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ پھر میرے پیچھے آیا اور غلطی سے آگے نکل گیا کیونکہ میں رات بشام میں رک گیا تھا۔ فتح خان اس سے بے خبر تھا۔ اب پتا نہیں وہ لینڈ سلائیڈنگ کھلنے پر واپس میرے پیچھے آیا تھا یا پھر اس نے کسی اور کو چھوڑا ہوگا جو اس راستے پر نگرانی کر رہا ہوگا اور اسی نے فتح خان کو اطلاع دی ہوگی کہ پنچھی دانے پر آگیا ہے اور وہ دوڑا ہوا میرے پیچھے آیا۔ اس دوران میں اس نے گل شاد کو کہیں چھوڑ دیا ہوگا۔ یہاں اس نے مجھے گھیر لیا اور اب میں بے بسی کی حالت میں بندھا ہوا تھا۔ مگر مجھے کچھ کرنا تھا۔ کچھ کرنے کے لیے سب سے پہلے مجھے خیال آیا کہ تالا کھولنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

میں نے پتلون کے ساتھ جیکٹ اور جوتے پہنے ہوئے تھے اور ان میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس کی مدد سے میں تالا کھول سکتا تھا۔ میں نے تمام چیزوں کا جائزہ لیا تو میری توجہ پتلون کی بیلٹ کی طرف گئی۔ اس کا بکل بند کرنے والا ہک نوکیلا تھا۔ میں نے ذرا سی کوشش کرکے بیلٹ اتار لی اور پھر اس کا تنکے جیسا دھاتی ہک تھام کر پہلے پاؤں کی بیڑی کھولنے کی کوشش کا آغاز کیا۔ اتنی دیر میں اندھیرا ہو چکا تھا اور مجھے سب ٹٹول کر کرنا پڑ رہا تھا۔ ایک بار تالے کے سوراخ سے ہک پھسل جاتا تو بڑی مشکل سے تلاش کرنے پر ملتا تھا اور پھر اس سے بھی زیادہ مشکل سے میں اسے سوراخ میں داخل کرتا تھا۔ مگر میں لگا رہا۔ مسلسل ایک پوزیشن میں بیٹھ کر ایک ہی جیسا کام کرنے سے جسم دکھنے لگا تھا۔ جب دکھن زیادہ ہوجاتی تو میں کچھ دیر آرام کر لیتا تھا۔ ابتدائی جوش وخراش کے بعد جب مسلسل ناکامی نصیب ہوئی تو خالی ذہن کے عالم میں مشینی انداز میں لگ گیا۔

میری نظر چٹانوں کی طرف تھی۔ ان کا سفید رنگ تاریکی میں نمایاں ہو رہا تھا۔ فتح خان کو گئے ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت ہوگیا تھا اور اب تک اس کی یا اس کے مبینہ دشمنوں کی طرف سے کوئی ردِعمل دیکھنے میں نہیں آیا

تھا۔ نہ ہی فتح خان کے جانے کے بعد کوئی حرکت دکھائی دی تھی۔ پھر اچانک ایک فائر کیا اور مجھے چٹانوں کے درمیان ہلکی سی روشنی کی جھلک دکھائی دی۔ یہ فائر کے شعلے کی چمک تھی اور اسی لمحے بیڑی کے تالے سے کلک کی آواز آئی اور تالا کھل گیا۔ میں اس معزز فن یعنی تالے، وغیرہ کھولنے میں قطعی اناڑی ہوں۔ البتہ ماہرین فن کو اکثر دیکھا کہ وہ محض ایک تار کی مدد سے پیچیدہ تالے وغیرہ بھی کھول لیتے ہیں۔ یہ قطعی اتفاق تھا کہ میں نے تالا کھول لیا اور مجھے اس کی بے انتہا خوشی ہوئی تھی۔ میں نے ہلکی سی قلقاری ماری اور جلدی سے زنجیر پیروں سے نکالی۔ ایک تالا کھلا تھا یعنی ایک پاؤں کھلا تھا دوسری میں بدستور بیڑی تھی۔ وقت نہیں تھا کہ میں اسے بھی کھوتا اس لیے مجھے اس کے ساتھ ہی حرکت کرنی تھی۔

میں نے جلدی سے بیلٹ واپس پتلون میں پہنی اور کھل جانے والی بیڑی اس کی ساتھی بیڑی کے ساتھ موڑ کر پتلون کے پائنچے میں اڑس لی۔ ہاتھ بدستور بندھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں کھولنے میں وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ کیونکہ پہلی کامیابی بھی اتفاق سے ملی تھی اور اتفاق ہر بار نہیں ہوتا ہے دوسرے میں جلد از جلد اس جگہ سے دور جانا چاہتا تھا۔ میں نے تھیلا چیک کیا یہ دیکھ کر میری پہلے سے کھلی باچھیں مزید کھل گئیں کہ تھیلے میں میرا پستول تھا۔ اس کے ساتھ دو عدد اضافی میگزین بھی اسی میں تھے۔ مگر مجھے مزید کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے میں اپنی ہتھکڑیاں کھول سکتا۔ البتہ ایک عدد ایمرجنسی لائٹ کم ٹارچ نکل آئی۔ میں نے اس کے شیشے پر ہتھیلی رکھ کر اسے چیک کیا اور یہ کام کر رہی تھی۔ میں نے اسے بھی رکھ لیا۔ جیکٹ کی جیبوں سے آسانی ہو رہی تھی ایک جیب میں پستول اور دوسری میں اس کے اضافی میگزین آگئے تھے۔ ٹارچ میں نے جیکٹ کے اندر سینے سے لگالی۔ کچھ روٹیاں بھی نکال کر جیکٹ میں ڈال لیں۔ بھوک تھی مگر فی الحال اور بھی غم تھے زمانے میں روٹی کے سوا۔

میں ڈھلان سے اتر کر جنگل کے کنارے تک آیا۔ پہلے فائر کے بعد نہ تو مزید کوئی فائر ہوا تھا اور نہ ہی کوئی اور آواز یا حرکت سنائی یا دکھائی دی تھی۔ چٹانیں اوپر سے نمایاں لیکن اندر سے تاریک تھیں۔ ان میں اب کوئی حرکت کر بھی رہا تھا تو وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں آزاد ہو گیا تھا اور مسلح بھی تھا۔ مگر یہاں فتح خان سمیت نامعلوم تعداد میں ایسے افراد تھے جن پر دوستی کا گمان بھی مشکل تھا۔ ایسے میں سب سے آسان تدبیر یہ تھی کہ میں نو دو گیارہ ہو جاتا۔ مگر مسلسل مشکل حالات سے گزر کر میرے اندر ایک پنگے کی عادت سی آگئی تھی۔ وہ مجھے مجبور کر رہی تھی کہ میں ذرا اس کھیل کا مشاہدہ کروں جو ان چٹانوں کے درمیان کھیلا جا رہا تھا۔ پہلے فائر کے بعد خاموشی تھی شاید دونوں طرف سے محتاط رویہ اپنایا جا رہا تھا۔ میں دوسرے فریق کا رویہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ اگر وہ فتح خان سے واقف تھا تو اسے اب تک اس پر قابو پالینا چاہیے تھا اور اگر وہ اس سے بے خبر تھا تو اسے ان چٹانوں کا رخ کرنا نہیں چاہیے تھا۔ دن میں یہ غیر محفوظ اور بے پناہ گرم ہو جاتی ہیں۔

اچانک مجھے چٹانوں کے درمیان کچھ حرکت محسوس ہوئی۔ وہاں سے دو افراد نکلے تھے۔ لیکن نہیں ان میں ایک تیسرا فرد بھی تھا۔ وہ ان کے پیچھے تھا۔ میں نے آنکھوں پر زور دیا کہ کیا فتح خان نے دو افراد کو قابو کیا ہوا ہے۔ مگر نہیں پیچھے موجود شخص فتح خان سے زیادہ طویل قامت تھا۔ جو دو آگے تھے ان میں سے ایک لڑکھڑا رہا تھا اور دوسرا اسے سنبھالے ہوئے تھا اور وہ تینوں میری طرف ہی آرہے تھے۔ میں احتیاط سے پیچھے ہٹا اور درختوں کے درمیان میں جانے لگا۔ فتح خان نے ان پر قابو پایا تھا یا خود ان کے ہتھے چڑھ گیا تھا دونوں صورتوں میں اس پارٹی کو اس طرف آنا تھا جہاں فتح خان مجھے قید کر کے گیا تھا۔ میں نے دو ایسے درختوں کے درمیان جگہ سنبھالی جن کے تنے نہ صرف آس پاس تھے بلکہ ڈھلان والی طرف ایک بڑی چٹان تھی۔ مورچے کے لحاظ سے یہ جگہ بہت موزوں تھی۔ میں پستول نکال کر اس مورچے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔

وہ تینوں کچھ دیر بعد درختوں میں داخل ہوئے یہاں تاریکی زیادہ تھی اس لیے بس ان کے ہیولے محسوس کیے جا سکتے تھے۔ وہ اسی طرف بڑھے جہاں میں موجود ہوتا اگر زنجیر کا تالا نہ کھلتا۔ اس جگہ کے نزدیک پہنچ کر انہوں نے آپس میں کچھ تبادلہ خیال کیا۔ ان کی دھیمی آوازیں مجھ تک آئیں اور پھر ان میں سے ایک کو دھکا دے کر نیچے گرا دیا گیا اور جب اس نے بلند آواز میں کراہ کر گرانے والے کو گالی دی تو میں نے شناخت کر لیا وہ فتح خان تھا اور اب پتا چلا کہ وہ ان کا قیدی ہی نہیں زخمی بھی تھا۔ البتہ گالی کے بعد اس نے جو نام لیا اس نے مجھے چونکا دیا۔ اس نے جلال کو گالی دی تھی۔ جواب میں جلال نے اسے ٹھوکر ماری۔ ''چپ کرو خنزیر کا بچہ، میں تمہارا نوکر ہے جو ایسے بات کرتا ہے۔''

''تو غدار ہے۔''

''وہ کدھر ہے۔'' طویل قامت نے مداخلت کی۔'' یہ دیکھو زنجیر کھلی ہے اور وہ غائب ہے۔''

''میں نہیں جانتا میں اسے باندھ کر گیا تھا۔'' فتح خان بولا۔ اتنی دیر میں، مجھے کسی قدر نظر آنے لگا تھا اور میں نے دیکھا کہ فتح خان، نے اپنا دایاں شانہ تھام رکھا تھا۔ پتا نہیں اسے گولی لگی تھی یا کوئی اور زخم آیا تھا۔ طویل قامت فتح خان کی طرف آیا۔ وہ صاف لہجے میں اردو بول رہا تھا مگر لہجہ کہیں کہیں چغلی کھا رہا تھا کہ وہ پشتو بولنے والا ہی تھا۔ اس نے جھک کر فتح خان سے کہا۔

''فتح تم جانتے ہو اس دنیا میں مجھ سے، زیادہ تمہارے خون کا پیاسا کوئی نہیں ہوگا۔''

''خیال ہے تمہارا۔'' فتح خان نے اس حالت میں بھی استہزائیہ لہجے میں کہا۔'' لگتا ہے انگلینڈ جا کر بھی تم نے ابھی دنیا نہیں دیکھا۔''

میں چونکا کیونکہ انگلینڈ کا حوالہ اس نے کرم خان کے بھائی بیرم خان کے بارے میں بات کرتے ہوئے دیا تھا۔ طویل قامت کہہ رہا تھا۔'' فتح تم بہت فضول باتیں کرتے ہو۔ کام کی بات کرو۔''

''کام کا کیا بات کرے بیرم خان۔'' فتح خان بولا۔'' کام کا بندہ تو بھاگ گیا۔''

''یہی میں پوچھ رہا ہوں کہ وہ کہاں ہے؟''

''تم انگلینڈ پلٹ کر بھی جاہلوں کا سا بات کر رہا ہے۔ اگر قیدی آزاد ہو جائے تو وہ کہاں جاتا ہے۔ وہ بھاگ گیا ہوگا۔ اب تک تو نالے میں پہنچ گیا ہوگا۔''

''تم نے کہا تھا اس کے پیروں میں بھی کف ڈالی ہے۔''

''تم پھر احمقانہ بات کر رہا ہے یہ زنجیر دیکھ رہا ہے یہ بند ہے تو اس نے بیڑی ہی کھولا ہوگا نا، اس کا مطلب ہے اب وہ بھاگ نکلا ہے۔''

بیرم خان خاموش ہوگیا۔ میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کچھ دیر پہلے ہی بیرم خان کے بارے میں فتح خان نے فرمایا تھا کہ وہ اس چکر میں نہیں پڑے گا مگر حالات بتا رہے تھے کہ وہ اسی چکر میں تھا اور کچھ زیادہ ہی تھا کیونکہ جلال جسے فتح خان اپنے اعتماد کا آدمی قرار دے چکا تھا وہ اب بیرم خان کے ساتھ نظر آرہا تھا۔ گویا وہ شروع سے بیرم خان کا آدمی تھا۔ نہ جانے فتح خان نے اس پر کیسے اعتبار کر لیا۔ کچھ دیر بعد بیرم خان بولا۔'' مجھے ہر قیمت پر وہ ہیرے چاہییں۔''

''تو لے لو، ابھی تک تو نہیں ملا ہے، اس کتے نے تم کو سب بتا دیا ہوگا۔'' فتح خان نے جلال کی طرف اشارہ کیا تو وہ غرانے لگا تھا۔

''ہوسکتا ہے جب جلال تمہارے پاس سے نکلا ہو تو تم کو ہیرے مل گئے ہوں۔''

فتح خان نے اس بار قہقہہ مارا۔'' اگر مجھے ہیرے مل گئے ہوتے تو میں تمہارے پیچھے آتا۔ اس جیسے دس کتوں پر لعنت بھیج کر ادھر سے جاچکا ہوتا۔''

جلال بے قابو ہو کر فتح خان کی طرف جھپٹا اور اس نے بے دریغ اس کے زخمی شانے پر ٹھوکریں رسید کیں۔ فتح خان کو خاصی تکلیف ہوئی ہوگی مگر وہ جلال کو چڑانے کے لیے ہنستا رہا اور جب وہ ہانپتے ہوئے پیچھے ہٹا تو فتح خان نے حقارت سے کہا۔'' تیرا کیا خیال ہے تو فتح خان سے معافی کی اُمید رکھتا ہے۔''

بیرم خان نے مدبرانہ انداز میں ہاتھ بلند کیا۔'' بس، جاہلوں کی طرح لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''جاہل تم ہے۔'' فتح خان نے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔'' جو بندہ پڑھ لکھ کر بھی ایسا کرے وہ زیادہ بڑا جاہل ہوتا ہے۔ ہم تو ان پڑھ آدمی ہے۔ ایسا کرتا ہے تو ٹھیک کرتا ہے۔''

''تم جانتے ہو انتقام ہمارے خون میں ہے۔'' بیرم خان دھیمے لہجے میں بولا۔'' ہم دنیا کی ہر چیز چھوڑ سکتے ہیں لیکن بدلہ نہیں چھوڑ سکتے۔''

''تب تم کو اب خیال آرہا ہے۔''

''نہیں یہ خیال کبھی میرے دل سے نہیں نکلا مگر میں موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ میں یہاں کے حالات اور تمہارے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا اس لیے معلومات حاصل کرنے اور تمہارے ارد گرد بندے تلاش کرنے میں کچھ وقت لگا تھا۔''

''مگر تم کو بس یہی ملا ہوگا۔'' فتح خان نے پھر حقارت سے جلال کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں تمہارے آس پاس سارے ہی لوگ لالچی نکلے، ان کو نوٹ کی جھلک دکھائی تو سب بکنے کو تیار ہو گئے تھے۔ مگر میں نے اسے چنا کیونکہ یہ تمہارے سب سے قریب تھا۔ ویسے کیا تم کوئی نیکی کا کام کر رہے ہو جو اپنے آدمیوں سے وفاداری کی توقع رکھتے ہو۔ تم بھی تو پیسے کے لیے سب کرتے ہو۔''

''سب پیسے کے لیے کرتا ہے۔'' فتح خان نے اپنا دفاع کیا۔'' تم نے بولا تھا کام کا بات کر لو، وہ کر لیا اب

تمہارا کیا ارادہ ہے۔ بدلہ لینا ہے تو اور جاؤ، وقت کیوں ضائع کرتا ہے۔''

''کیا تمہیں مرنے کی جلدی ہے؟'' جلال بولا۔''خان کی رحم دلی سے فائدہ اٹھاؤ۔''

جواب میں فتح خان نے قہقہے کے ساتھ جو فرمایا اسے لکھنے سے میرا قلم معذور ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اتنا بے جگر ہو رہا تھا اسے قطعی پروا نہیں تھی کہ اس کے سامنے اس کی جان کا دشمن تھا اور وہ ایک لمحے میں اسے دنیا سے رخصت کر سکتا تھا۔ مگر فتح خان کو جیسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس نے جلال کو خان کی رحم دلی کے حوالے سے ایک ناقابلِ بیان مشورہ دیا تھا۔ بیرم خان مشتعل نہیں ہوا اور جلال پہلے ہی اپنا غصہ اتار چکا تھا اس لیے فتح خان مزید چوٹوں سے محفوظ رہا۔ بیرم خان نے کہا۔''فتح خان تم نے ٹھیک کہا تھا کہ پڑھ لکھ کر بھی آدمی جاہلوں کی سی حرکت کرے تو یہ زیادہ جہالت ہوتی ہے اس لیے میں تمہیں اپنے ہاتھ سے نہیں ماروں گا۔''

''مجھے معلوم ہے تعلیم نے تم کو بزدل بنا دیا ہے، شاید خون دیکھ کر تم کو الٹی آتا ہوگا۔ تم اس سے بولے گا۔ اسی لیے خریدا ہے اسے۔''

''نہیں، میں تمہیں یہاں اسی زنجیر سے باندھ جاؤں گا اور تم بھوک پیاس سے مرو گے۔''

فتح خان ایک لمحے کو چپ ہوا پھر بولا۔''یہ کیسا انتقام ہے دشمن کو تو اپنے ہاتھ سے مار کر چین آتا ہے۔''

''یہی انتقام ہے۔'' بیرم خان عیاری سے بولا۔''یہ کیا کہ ایک گولی ماری اور آدمی ختم، مزہ تو اس وقت ہے جب دشمن سسک سسک کر زیادہ دیر میں جان دے۔''

''تم باندھ کر چلا جائے گا؟''

''نہیں میں یہیں رکوں گا اور اس دوران میں جلال کے ساتھ مل کر ہیرے تلاش کروں گا۔ یہاں کتنے درخت ہیں شاید دو ہزار ہوں۔ اگر ہم روز سو درخت بھی دیکھیں تو بیس دن میں یہ سارا جنگل چھان سکتے ہیں چلو مہینا لگ جائے گا۔ کم سے کم پچاس ملین ڈالرز کے ہیروں کے لیے ایک مہینا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس دوران میں تم کو مرتے ہوئے دیکھتا رہوں گا۔''

''تم زیادہ سے زیادہ تین دن اس شو کو دیکھ سکتا ہے۔'' فتح خان نے خوفزدہ ہوئے بغیر کہا۔''اس کے بعد کیا کرے گا؟''

مگر بیرم خان جیسے سب طے کر کے آیا تھا اس نے کہا۔''تم فکر مت کرو میں تم کو پانی دیتا رہوں گا صرف کھانے کو کچھ نہیں ملے گا تب تم کو مرنے میں بہت وقت لگے گا۔ کم سے کم تین ہفتے لگے گا تمہیں مرنے میں۔''

فتح خان کو تو نہیں پتا لیکن میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی تھی۔ بیرم خان کا منصوبہ نہایت خوفناک تھا اور اگر اس پر عمل کیا جاتا تو فتح خان کو مرنے میں سچ مچ اتنا وقت لگ جاتا اور یہ موت بہت خوفناک ہوتی۔ بیرم خان کے اشارے پر جلال نے فتح خان کو زنجیر سے یوں باندھا کہ پہلے اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈالی اور پھر اس کے دوسرے کڑے میں زنجیر ڈال کر اسے دوبارہ تالے سے بند کر دیا۔ اب فتح خان اسی طرح درخت کا قیدی بن گیا تھا جیسے اس نے مجھے بنایا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ میرے دونوں ہاتھ پاؤں ہتھکڑی اور بیڑی سے بند تھے جب کہ فتح خان کے صرف ایک ہاتھ میں ہتھکڑی تھی اور اس کے پاؤں بیڑی سے آزاد تھے مگر وہ بھی میری طرح درخت کا قیدی بن گیا تھا۔ ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں وقت نے پلٹا کھایا۔ جو آزاد تھا وہ قیدی بن گیا اور جسے قیدی بنایا تھا وہ آزاد ہو گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کیا مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے؟ میری بلا سے فتح خان کے ساتھ کچھ بھی ہوتا رہے۔ مگر میں دیکھنا چاہتا تھا کہ آگے کیا ہوتا ہے؟

فتح خان میرا دشمن تھا اور اس نے بہت سے مواقعوں پر مجھے زچ کیا تھا۔ اس نے منشی دل جی جیسے خبیث دشمن کا ساتھ دیا اور اس کا نتیجہ بالآخر بیتو کی موت کی صورت میں نکلا مگر فتح خان اس میں براہ راست ملوث نہیں تھا۔ بلکہ اس نے مجھے چھوڑ دیا تھا حالانکہ وہ مسلح تھا اور چاہتا تو مجھے آسانی سے شوٹ کر سکتا تھا مگر اس نے صرف فرار کو ترجیح دی۔ اس کا یہ بوجھ مجھ پر باقی تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ بوجھ اتار دوں۔ بیرم خان نے فتح خان کو بے بس کرنے کے بعد اپنے سامان سے ایک کمبل نکال کر بچھایا تھا اور اب اس پر محوِ آرام تھا۔ بہ ظاہر اس نے فتح خان کے لیے سزا تجویز کی تھی لیکن اس کے پس پشت اصل میں اس کا مقصد ہیروں کا حصول تھا شاید اس کے ذہن میں تھا کہ ہیرے فتح خان کے پاس تھے اور جب وہ بھوک پیاس سے نڈھال ہو جائے گا تب وہ اس سے ہیروں کا پوچھے گا۔ ساتھ ہی وہ خود بھی ہیروں کی تلاش جاری رکھتا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اسے ہیرے مل گئے تو وہ فتح خان کو قتل کرنے میں ایک منٹ کی دیر نہیں کرے گا۔

مجھے پیاس لگ رہی تھی لیکن فی الحال یہاں سے ہلنا مناسب نہیں تھا۔ بیرم خان اور جلال دونوں چوکنا تھے اور اگر میرے پاؤں کی بیڑی کھنک جاتی تو وہ میری موجودگی

سے واقف ہو جاتے۔ اس لیے مجھے انتظار کرنا تھا اور وقت گزاری کے لیے میں خشک نان چبانے لگا۔ میری سرگزشت پڑھنے والے اکثر قارئین شکوہ کرتے ہیں کہ میں لذیذ کھانوں کا ذکر کچھ زیادہ ہی کرتا ہوں۔ مگر کسی اللہ کے بندے یا بندی کو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ جب میں دشمن کی قید میں فاقے کرتا ہوں یا اس طرح خشک نان چباتا ہوں تو مجھ سے اظہارِ ہمدردی ہی کر لے۔ دو نان حلق سے اتار کر پیٹ کو تو افاقہ ہو گیا تھا مگر حلق میں جیسے کانٹے پڑنے لگے۔ خشک نان رہی سہی نمی بھی چوس گئے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ رات کے نو بج چکے تھے۔ جلال نے ایک عدد لالٹین نما ایمرجنسی لائٹ جلا کر ایک ایسی جگہ رکھ دی تھی جہاں سے اس کی روشنی ان کے پڑاؤ کو منور کر رہی تھی۔ پھر انہوں نے الاؤ جلایا اور کھانا گرم کرنے کی تیاری کرنے لگے۔ بیرم خان کے پاس ٹن بند کھانے تھے اور وہ مچھلی کا ایک ٹن کھول کر اسے ہلکا گرم کر کے کھا رہا تھا۔ جلال وہی روٹی اور چائے سے گزارا کر رہا تھا۔ فتح خان بندھا ہوا اپنی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے شانے کے زخم کے بارے میں نہ تو اس نے بات کی تھی اور نہ ہی ان لوگوں نے کوئی بات کی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ زخم گولی کا نہیں ہے ورنہ وہ اسے اتنا ہلکا نہ لیتے اور گولی کا زخم ویسے ہی جلد خراب ہونے لگتا ہے۔ اتنی دیر میں فتح خان کی حالت غیر ہو جاتی مگر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ٹھیک ہے۔ وہ درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور کبھی کبھی دھیمی آواز میں کچھ گنگناتا بھی تھا۔

پیاس کی شدت میں اضافہ ہوا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ کھانے کے بعد ایسا ہی ہوتا ہے۔ کچھ دیر میں یہ شدت دوبارہ کم ہو جائے گی۔ میں نے دوپہر میں اچھی طرح پانی پیا تھا اور اس بات کو سات گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا اس لیے مجھے ڈی ہائیڈریشن کا مسئلہ نہیں تھا۔ یہ صرف ایک نفسیاتی پہلو تھا میرے پاس چونکہ پانی نہیں تھا اس لیے مجھے پیاس کا خیال آ رہا تھا۔ کسی قدر حقیقی پیاس بھی تھی۔ کچھ دیر بعد پیچ پیاس کی شدت کم ہونے لگی۔ بیرم خان کھاتے ہی لیٹ چکا تھا۔ جب کہ جلال الاؤ کے پاس بیٹھا ہوا فتح خان کی نگرانی کر رہا تھا۔ فتح خان نے اس سے کہا۔ ''میرا آدمی جانتا ہے تم میرے ساتھ تھا جب میں واپس نہیں جاؤں گا تو وہ تم کو تلاش کرے گا۔''

''کوئی تلاش نہیں کرے گا۔'' جلال نے اطمینان سے کہا۔ ''آج کل کوئی کسی کا نہیں کرتا ہے۔''

''تم سب کو اپنے جیسا دوغلا سمجھتا ہے۔'' فتح خان حقارت سے بولا۔ ''میرا آدمی میرے اشارے پر اپنا جان قربان کر سکتا ہے۔''

''آج صبح تک تم بھی میرے بارے میں ایسا ہی سوچتے ہو گے۔'' جلال ہنسا۔ ''کیا میں نے جان قربان کی، نہیں کی نا...... فتح خان آج کل کوئی کسی کے لیے جان قربان نہیں کرتا۔ بڑا خراب دور ہے۔ لوگ بھائی کے مرنے کے بعد اس کی بیوی پر قبضہ کر لیتے ہیں۔''

جلال کا اشارہ یقیناً گل شاد کی طرف تھا۔ فتح خان اس کا طنز سمجھا یا نہیں لیکن وہ خاموش ہو گیا تھا۔ بیرم خان کچھ دیر بعد خراٹے لینے لگا۔ جلال بھی جمائیاں لے رہا تھا مگر وہ لیٹا نہیں۔ مجھے بھی اونگھ آ رہی تھی مگر میں سونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ ذرا سی بے احتیاطی میرا راز فاش کر دیتی۔ میں ان لوگوں سے بیس گز سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس لیے میں نیند کے جھونکوں سے ہوشیار رہا۔ میں نے اپنی پشت کھردری چٹان سے لگائی تھی اور یہ بے آرامی مجھے جگائے رکھنے میں معاون ثابت ہو رہی تھی۔ کچھ دیر میں چاند طلوع ہو گیا۔ مگر یہ زوال پذیر چاند تھا اور روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی خاص طور سے درختوں تلے اس کا اثر نہ ہونے کے برابر تھا البتہ سفید چٹانیں روشن ہو رہی تھیں۔ میں کبھی کبھی ان چٹانوں پر بھی نظر دوڑا لیتا تھا۔

ایک بار میں نے اس طرف دیکھا تو مجھے لگا وہاں کوئی چیز ہے جو حرکت کر رہی ہے۔ میں نے واضح نہیں دیکھا تھا۔ مگر مجھے احساس ہوا تھا اس بار میں نے نظر جما کر دیکھا۔ چند لمحے بعد دو سائے حرکت کرتے دکھائی دیے۔ وہ چٹانوں کے درمیان تھے اور جھک کر چل رہے تھے۔ ان کا رخ ہماری طرف نہیں تھا۔ بلکہ وہ شمالی ڈھلان کی طرف جا رہے تھے۔ میں چوکنا ہو گیا۔ یہ کوئی نئی مصیبت تھی یا فتح خان کے آدمی تھے جو اب آئے تھے۔ اگر وہ بیرم خان کے آدمی ہوتے تو انہیں اس طرح چھپ کر حرکت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے ایک جگہ جہاں جھاڑیاں زیادہ تھیں وہاں سے میدان عبور کیا اور شمالی ڈھلان پر پہنچ گئے۔ میں چوکنا ہو گیا۔ یہ جگہ لالٹین کی روشنی کی وجہ سے نمایاں تھی اور یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ان دو افراد نے اس روشنی کو نہ دیکھا ہو۔

میری نظر اب شمالی ڈھلان کی طرف تھی مگر درختوں تلے بالکل اندھیرا تھا اور اگر کوئی یہاں حرکت کرتا تو بھی اس کا نظر آنا محال تھا صرف آواز سے کسی آنے والے کا سراغ لگ سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے میں جنوب کی طرف تھا اس لیے

یہ امکان نہیں تھا کہ وہ میرے پیچھے سے آتے۔ اس کے باوجود میں آس پاس سے چوکنا تھا۔ مگر آنے والے بہت ہی محتاط تھے۔ وہ اس وقت نظر آئے جب وہ لالٹین کی روشنی کی حد میں آگئے تھے۔ ان کے سائے درختوں کے درمیان حرکت کر رہے تھے۔ پھر وہ ایک جگہ رکے اور الگ الگ ہو کر دائیں بائیں چلے گئے۔ ایک میری طرف آیا تھا مگر وہ مجھ سے کچھ دور ایک درخت کی آڑ میں رک گیا اور دوسرا اس سے مخالف سمت میں کسی قدر نیچے تھا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ ان لوگوں کو گھیر رہے تھے۔ ان کے پاس خود کار رائفلیں تھیں۔ جلال اب اونگھ رہا تھا اسے لیے اسے قطعی خبر نہیں ہوئی۔

مجھے آنے والے خطرناک لگ رہے تھے۔ عین ممکن تھا وہ میرے پاس آجاتے اور مجھے دیکھ لیتے۔ اس لیے میں نے جلال کو خبردار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے ایک عدد پتھر تلاش کیا اور اسے پڑاؤ کی طرف اچھال دیا۔ پتھر الاؤ کے پاس گرا اور جلال نے بھڑک کر اپنی رائفل اٹھائی تھی۔ اس دوران میں، میں نے دوسرا پتھر ڈھلان کے اوپری حصے کی طرف پھینکا جس طرف وہ دونوں موجود تھے اور آواز آتے ہی جلال نے اس طرف ہلکا برسٹ مارا۔ بیرم خان بھی ہڑبڑا کر اٹھا تھا اور اس دوران میں جلال نے پھرتی سے لائٹ بجھادی۔ فوراً ہی اوپر سے برسٹ چلا اور تاریکی میں پتا نہیں چلا کہ کون نشانہ بنا اور کون بچ گیا۔ ایک کے بعد دوسرا برسٹ چلا اور شعلوں سے اندازہ ہوا کہ اوپر والے دونوں افراد محفوظ تھے اور اپنی اپنی کمین گاہوں سے فائرنگ کر رہے تھے۔ پھر نیچے سے جوابی فائرنگ شروع ہوگئی۔ اس کا مطلب تھا کہ بیرم خان اور جلال بھی بچ گئے تھے۔

میں سوچ رہا تھا کہ اوپر والوں میں سے کوئی مورچہ بنانے کے لیے اس طرف نہ آئے۔ کیونکہ یہ جگہ بڑی موزوں تھی اور یہاں سے پڑاؤ کو زیادہ آسانی سے نشانہ بنایا جاسکتا تھا۔ پھر ایسا ہی ہوا جو آدمی میری پناہ گاہ کے نزدیک تھا وہ اس طرف آیا۔ میرے پاس بالکل موقع نہیں تھا اور اگر میں اسے ذرا موقع دیتا تو وہ مجھے شوٹ کر دیتا اس لیے میں نے پہلے یہ کام کیا۔ جیسے ہی وہ تنوں کے درمیان نمودار ہوا میں نے اس کے سینے میں گولی اتاردی۔ وہ ڈکرا کر پیچھے گیا مگر خوش قسمتی سے اس وقت فائرنگ کا بے پناہ شور جاری تھا اس لیے کسی نے ایک پسٹل فائر کی آواز نہیں سنی۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا تو میں نے اس کی ٹانگیں پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا اور پھر ٹٹول کر اس کی رائفل اپنے قبضے میں لے لی۔ مزید تلاشی پر اس کے پاس سے ایک عدد اضافی میگزین نکلا تھا۔ اس کے حلق سے آتی ہلکی سی خرخراتی آوازیں بتا رہی تھیں کہ وہ دم توڑ رہا ہے۔ گولی دل سے ذرا لگی تھی اور جان لیوا ثابت ہوئی تھی۔

اس کے پاس دوسری چیز پانی کی ایک بوتل نکلی تھی اور مجھے پانی کی ضرورت تھی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کر کے اس میں سے ایک گھونٹ لیا اور رائفل سنبھال کر لڑائی کی طرف متوجہ ہوا۔ پڑاؤ میں الاؤ آخری دموں پر تھا۔ کیونکہ آگ بجھ گئی تھی اور اب انگارے بھی بجھ رہے تھے۔ ان کی ہلکی روشنی فائرنگ کے شعلوں کے سامنے بجھی سی گئی تھی۔ مارے جانے والے کا دوسرا ساتھی اوپر سے بے دریغ گولیاں برسا رہا تھا اور پھر اس کی فائرنگ کام آئی۔ جلال جو بے احتیاطی سے کھلے میں آیا تھا وہ نشانہ بنا اور الٹ کر انگاروں پر آگرا اور پھر وہیں لوٹ پوٹ ہونے لگا تھا۔ دوسرے برسٹ نے اسے وہیں ٹھنڈا کر دیا مگر اس کی لاش انگاروں پر روسٹ ہونے لگی اور چند لمحے بعد فضا میں گوشت جلنے کی بو پھیلنے لگی۔ بیرم خان ایک درخت کی آڑ میں تھا۔ اس نے جلال کے مرنے کے بعد اوپری سمت چند فائر کیے اس کے پاس زیادہ بڑا ہتھیار نہیں تھا اور اوپر والے کو اس لحاظ سے برتری حاصل تھی۔

اوپر والا اب بالادست تھا۔ کیونکہ نیچے صرف ایک رہ گیا تھا اور وہ بھی پستول سے مسلح تھا۔ اس لیے وہ نیچے آنے لگا۔ وہ تیزی سے ایک درخت کی آڑ میں آیا۔ پھر دوڑ کر ذرا نیچے موجود دوسرے درخت کی آڑ میں آنے والا تھا کہ ٹھوکر کھا کر گرا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ سنبھل نہ سکا اور لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ بیرم خان نیچے آتے ہوئے اس پر مسلسل گولیاں برسا رہا تھا اور بالآخر وہ نیچے آگرا اور اس کے ساتھ ہی بیرم خان کا پستول خالی ہوگیا۔ مجھے کلک کی آواز آئی۔ شاید بیرم خان میگزین بدل رہا تھا کہ دوسرے آدمی نے اپنی رہی سہی ہمت جمع کر کے اس پر برسٹ مارا اور وہ فوراً ہی مارا گیا کیونکہ وہ الٹ کر گرا تھا اور پھر ساکت ہوگیا۔ میں دم بہ خود سے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے رائفل حاصل کر لی تھی مگر اسے استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

دو پتھر استعمال کر کے میں نے اپنے چار ممکنہ دشمنوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ دشمن نے آپس میں ایک دوسرے کا کام تمام کر دیا تھا۔ اب ہر طرف خاموشی تھی۔ مگر میں نے حرکت نہیں کی۔ زنجیر چھنکی تو اندازہ ہوا کہ فتح خان زندہ ہے۔ یہ اس کی قسمت تھی ورنہ وہ اس میدانِ

جنگ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بے تحاشہ فائرنگ ہوئی تھی اور کوئی بھی گولی اس کا رخ کر سکتی تھی۔ مگر وہ محفوظ رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''لگتا ہے خدائی خوار سب مر گیا۔ اب مجھے کون آزاد کرے گا۔''

میں آزاد کر سکتا تھا مگر فی الحال میرا یہاں سے ہلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بہ ظاہر سب مر گئے تھے لیکن کیا کہا جا سکتا تھا کہ کوئی زندہ ہو اور مرتے مرتے بھی کسی ایک کو ساتھ لے جانے کی کوشش کرے۔ جلال کے انگاروں پر گرنے سے رہی سہی روشنی بھی ختم ہو گئی تھی میرے پاس ٹارچ تھی مگر اسے استعمال کرنے کا مطلب اپنی موجودگی کا راز خود فاش کرنا تھا۔ دوسرے مجھے ایک خدشہ اور تھا کہ اگر ان دو کے پیچھے کچھ افراد اور ہوئے تو وہ جلد یا بدیر یہاں تشریف لے آتے۔۔۔ بے شک میں اب زیادہ مسلح تھا مگر بندھے ہاتھوں سے میں اپنا دفاع اور حملہ بہت اچھے انداز میں نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے مجھے محتاط رہنا تھا اور فی الحال اپنی موجودگی ظاہر کرنا مناسب نہیں تھا۔ مجھے کوئی عجلت بھی نہیں تھی۔ میں کھا پی چکا تھا اور اس جگہ آرام سے تھا۔ اپنے کشتے کی لاش میں نے آرام سے دھکیل کر تنوں سے باہر کر دی تھی۔

اب مجھے صبح کی روشنی کا انتظار تھا۔ فتح خان اپنی جگہ بے بسی سے بندھا ہوا تھا اور وہ بھی آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ شروع میں اس نے زیرِ لب کچھ کہا تھا مگر اب خاموش تھا۔ غالباً اسے بھی صبح کی روشنی کا انتظار تھا۔ میں کچھ دیر تو جاگتا رہا مگر پھر سکون اور خطرہ نہ ہونے کے احساس نے مجھ پر غلبہ پا لیا اور میں سو گیا۔ درمیان میں ایک بار آنکھ کھلی اور حالات کو جوں کا توں پا کر میں دوبارہ سو گیا۔ دوسری بار آنکھ کھلی تو مشرقی افق سرخ ہو رہا تھا۔ سورج طلوع ہونے والا تھا۔ میں نے انگڑائیاں لے کر اپنا جسم کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر ابھی تک تاریکی تھی مگر ہیولے نظر آ رہے تھے۔ اچانک فتح خان کی آواز آئی۔ ''شہباز خان صبح ہو گئی ہے اب باہر آ جاؤ۔''

میں دنگ رہ گیا تھا کہ اسے یہاں میری موجودگی کا پتا کیسے چلا؟ مگر میں نے جواب نہیں دیا خاموش رہا تو اس نے کچھ دیر بعد پھر کہا۔ ''شہباز میں جانتا ہے تم یہاں ہے سوتے میں تم نے کچھ آواز نکالا تھا اس لیے اب ڈراما چھوڑ دو اور سامنے آ جاؤ۔''

''میں سامنے آؤں گا لیکن جب تم مجھے نظر آؤ گے۔'' میں نے اب بات کرنے میں حرج نہیں سمجھا۔ فتح خان یا ان دونوں کے ساتھ اور کوئی ہوتا تو وہ اب تک یہاں آ چکا ہوتا۔

''میں سامنے ہے۔''

''صبر فتح خان، ذرا روشنی ہو جانے دو۔'' میں نے کہا۔ ''اتنی جلدی کی ضرورت کیا ہے۔ آخر میں کل رات سے یہاں بیٹھا ہوں اور سکون سے ہوں۔ ویسے جب تک روشنی نہیں ہو جاتی ہم آپس میں کچھ تبادلۂ خیال نہ کر لیں۔''

''کیسا تبادلۂ خیال؟''

''پہلی بات تو یہ کہ یہ دونوں کون ہیں جو مارے گئے ہیں۔''

''بیرم خان میرا چچا کا لڑکا اور جلال۔''

''میں ان دونوں کی بات کر رہا ہوں۔'' اس بار میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''جو خاموشی سے یہاں آئے تھے۔''

''میں ان کے بارے میں نہیں جانتا۔'' فتح خان نے صاف انکار کر دیا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے فتح خان، یا تو یہ بیرم خان کے ساتھی تھے یا پھر تمہارے ساتھی ہوں گے۔''

''میں نے کہا نا میرا ساتھی نہیں ہے۔'' فتح خان اپنے انکار پر قائم رہا۔

''اگر یہ بیرم خان کے ساتھی ہوتے تو اس پر حملہ نہ کرتے۔''

''ہو سکتا ہے کوئی تیسرا پارٹی بھی۔'' وہ عیاری سے بولا۔

''فتح خان بات حلق سے اتر نہیں رہی ہے۔ بہر حال جو بھی حقیقت ہو گی جلد سامنے آ جائے گی۔''

مشرق اب زیادہ روشن ہو گیا تھا اور رفتہ رفتہ یہ روشنی نیچے کی طرف آ رہی تھی کیونکہ ہم مغربی ڈھلان پر تھے اس لیے پہلے یہ روشن ہوتی۔ روشنی بتدریج بہتر ہو رہی تھی اور میں نے اٹھ کر پہلے اپنا جسم کھولا۔ رات بھر ایک محدود جگہ بیٹھے رہنے سے بند سا گیا تھا۔ پھر ٹھنڈ کا اثر بھی تھا۔ پانچ چھ منٹ کی محدود ایکسر سائز نے مجھے چاک و چوبند کر دیا تھا۔ اب روشنی اتنی تھی کہ آس پاس سب صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو فتح خان درخت کی اوٹ میں تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''فتح خان سامنے آؤ۔''

''میں سامنے نہیں آئے گا۔'' اس نے انکار کیا۔

''اس صورت میں تم یہیں بندھے رہو گے اور میں روانہ ہو جاؤں گا۔'' میں نے اسے دھمکی دی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔

''کیا ضمانت ہے کہ تم ہم پر گولی نہیں چلائے گا۔''

''کوئی ضمانت نہیں۔''

"اچھا میں سامنے آتا ہے۔" فتح خان نے کہا اور زنجیر چھنکاتا ہوا سامنے آگیا۔ وہ خالی ہاتھ تھا اور زنجیر اس کے ہاتھ میں بندھی ہتھکڑی کے دوسرے حلقے سے گزر رہی تھی۔ میں نے پستول تھام لیا کیونکہ کلاشنکوف بندھے ہاتھوں سے استعمال کرنا ذرا مشکل کام تھا۔ فتح خان مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ "مجھے یقین تھا کہ تم آس پاس ہی ہوگا۔"

"تمہیں توقع ہوگی کہ میں تمہیں بچاؤں گا۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

"مجھے توقع نہیں ہے لیکن تم کو جانتا ہے، تم رک گیا کہ دیکھے معاملہ کیا ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مجھے اسی تجسس نے روک لیا تھا ورنہ اس حالت میں فرار بھی مشکل نہیں تھا۔ میں نے پستول اسی کی طرف رکھا اور پوچھا۔ "ہتھکڑیوں اور بیڑی کی چابی کہاں ہے؟"

"اس کے پاس ہوگی۔" فتح خان نے مردہ بیرم خان کی طرف اشارہ کیا۔ "اس نے میری تلاشی لے کر سب لے لیا تھا۔"

"تم اس کے ہاتھ کیسے آئے؟"

"اس نے دھوکا کیا۔ لیزر لائٹ سے ایسا دھوکا دیا کہ میں آدمی سمجھا اور اس پر فائر کر دیا۔ پیچھے سے اس داؤس نے رائفل کا بٹ مارا جو شانے پر لگا۔ گوشت پھٹ گیا اور ابھی تک یہ ہاتھ ٹھیک سے کام نہیں کر رہا۔" اس نے اپنے زخمی شانے کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے جلال کا بتایا تھا کہ اس نے اس پر رائفل کا بٹ آزمایا تھا۔ جلال کی لاش اور اس کے نیچے انگارے ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ بیرم خان کے سینے پر پورا برسٹ لگا تھا اور وہ شاید فوراً ہی مر گیا تھا مگر اوپر سے آنے والے نے خاصی مشکل سے جان دی تھی کیونکہ دو گولیاں اس کے پیٹ اور ران پر لگی تھیں اور وہ خون بہنے سے مرا تھا۔ اسی وجہ سے اسے اتنا موقع ملا کہ وہ بیرم خان کو مار سکے۔ بیرم خان حلیے اور چہرے مہرے سے پڑھا لکھا شخص لگ رہا تھا۔ وہ یقیناً انگلینڈ میں اچھی زندگی گزار رہا ہوگا مگر لالچ اور انتقام کی خواہش نے اسے مروا دیا تھا اور اب اس کی لاش یہاں بے گور وکفن پڑی تھی اور اگر اس کے اہلِ خانہ تھے تو ان کو کچھ علم نہیں تھا۔ میں فتح خان سے مطمئن نہیں تھا اس لیے میں نے سب سے پہلے ہتھیاروں کا جائزہ لیا کہ ان میں سے کوئی اس کے ہاتھ تو نہیں لگا ہے پھر حفظِ ماتقدم اس کی تلاشی لی۔ مگر اس کے پاس کچھ نہیں تھا اس کے بعد

جست کی کمی کی علامات

وہ انسان جن کے زخم ٹھیک ہونے میں زیادہ وقت لگتا ہو ان میں جست کی کمی ہوتی ہے۔ اس کمی کو پہچاننا نہایت آسان ہے۔ ناخنوں پر سفید دھبے ہی جست کی کمی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح شدید یا متعدی بیماری کے بعد مریض میں ذائقے کی پہچان ختم ہونے کی وجہ بھی جست کی کمی ہے۔ ایسے مریض کی بھوک میں کمی بھی واقع ہو جاتی ہے جس سے وزن کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ جست کی کمی کو پورا کرنے کا سب سے بہترین طریقہ خوراک ہے۔ سب سے زیادہ جست اوسٹر اور میٹ (گوشت) میں ہوتا ہے جبکہ جست کی مناسب مقدار خشک پھلوں، مٹر، لوبیہ اور دالوں وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔

مرسلہ: زوبیا فرہاد، جہلم

میں بیرم خان کے پاس آیا اور اس کے خون آلود لباس سے ہاتھ بچاتے ہوئے بہ مشکل اس کی جیبوں کا معائنہ کیا اور بالآخر چابی برآمد کر لی یہ ایک ہی چابی تھی جس سے تمام تالے کھلتے تھے۔ میں نے ہاتھوں اور پیروں کو آزاد کرا کے بے انتہا سکون محسوس کیا۔ اس کے بعد میں نے سب سے پہلے اپنا سامان تلاش کیا۔ مجھے پرس، موبائل اور جیپ کی چابیاں جلال کے پاس سے ملیں۔ مگر افسوس موبائل کی اسکرین اس کے نیچے دب کر ٹوٹ گئی تھی یہ بیکار ہو گیا تھا۔ میں نے سم نکال کر اسے وہیں پھینک دیا اور باقی چیزیں اپنے پاس رکھ لیں۔ فتح خان نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"میرے کو پانی دو۔"

میں نے بوتل اسے تھما دی اس کے بعد میں نے مارے جانے والے افراد کا اسلحہ جمع کیا۔ اس میں چار عدد خودکار رائفلیں اور تین عدد پستول تھے۔ ان سب کو اپنی پناہ گاہ میں لے کر ڈال دیا۔ میرے لیے ایک رائفل اور ایک پستول کافی تھا۔ پھر میں نے چاروں لاشیں بھی اسی جگہ ڈال دیں۔ ان کو ایسے ہی چھوڑنا مناسب نہیں تھا کیونکہ گرمی تھی اور آسمان پر چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ میں نے آس پاس سے پتھر جمع کر کے ان کو ڈھانپ دیا۔ اس کام میں خاصا وقت لگا مگر مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب لاشیں مردار خور پرندوں اور

جانوروں کی دسترس سے دور تھیں۔ میں واپس آیا تو فتح خان پوری بوتل خالی کر چکا تھا۔ بہر حال وہاں اور پانی بھی تھا۔ میں نے چائے کا پانی چڑھایا اور بیرم خان مرحوم کے خوراک کے ذخائر کا جائزہ لیا۔ اس میں بہترین ٹونا فش، فرائی آلو، مٹر، حلال گوشت اور اناناس کے پیک ٹن، کولڈ ڈرنک اور کافی چائے دونوں کا مکمل سامان تھا۔ میں کافی دیکھ کر خوش ہو گیا اور فوراً چائے بنانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ کافی تیار کر کے میں نے ایک مگ فتح خان کو دیا اور دوسرا خود سنبھال لیا۔ اس نے منہ بنا کر گھونٹ لیا اور بولا۔

''اب تم کیا کرے گا؟''

''سوچا نہیں ہے ممکن ہے تمہیں اسی طرح چھوڑ جاؤں یا پھر ایک گولی مار کر تمہارا قصہ پاک کر دوں۔''

اس نے اپنی منگولوں جیسی آنکھیں سکیڑ کر پوچھا۔ ''تم اپنی دھمکی پر عمل کرے گا۔''

''میں دھمکی نہیں دیتا ہاں جو کرنا ہوتا ہے وہ کر گزرتا ہوں۔ فتح خان میں نے تم کو بہت چھوٹ دی۔ بار بار کہا کہ میرے راستے میں مت آؤ مگر تم نہیں مانے۔ ایک احمقانہ خیال کے تحت تم میرے پیچھے لگے رہے۔ ٹھیک ہے ہیرے اس وادی میں ہیں لیکن انہیں صرف میں ہی تلاش کر سکتا ہوں۔ تمہارے اس خناس نے مجھے بہت مشکلات سے دوچار کیا۔ صرف مجھے نہیں میرے ساتھیوں کو بھی اور وہ اس بات پر برافروختہ رہے ہیں کہ میں تمہیں چھوٹ کیوں دیتا رہا ہوں۔''

''چھوٹ تو میں بھی دیتا رہا ہوں۔''

''ہاں لیکن اپنے مفاد کے تحت۔'' میں نے کہا۔ ''میرا تم سے کوئی مفاد نہیں تھا۔ تم نے مجھ پر ذاتی حملے کیے۔ میری حویلی میں گھس کر سویرا کو اغوا کیا۔''

''تم نے بھی شینا کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔'' وہ بولا۔ ''میں نے حساب برابر......''

''بکواس مت کرو۔'' میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ''سویرا اور شینا کا موازنہ مت کرو اس کا کردار تم خود بھی جانتے ہو اور اسی لیے تم نے اسے قتل کیا۔ پھر تم مسلسل میرے ساتھیوں کے پیچھے پڑے رہے۔ کبھی تم مرشد اور کبھی ڈیوڈ شاہ کے گماشتے بن کر میرے خلاف میدان میں رہے۔ حد یہ کہ تم نے منشی دل جی جیسے گھٹیا شخص سے بھی اتحاد کر لیا۔ تمہاری وجہ سے ہمارا منصوبہ ناکام ہوا۔ سو سے زائد افراد مارے گئے، اور سب سے قیمتی فرد بیتو تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے میں ہمیشہ اسی طرح یہ سب بھول جاؤں گا۔ شاید میں بھول بھی جاتا لیکن فتح خان اب میں اپنے ساتھیوں پر مزید کوئی افتاد برداشت نہیں کر سکتا۔''

فتح خان خاموشی سے سن رہا تھا۔ میں جذباتی ہو گیا تھا۔ جب میں خاموش ہوا تو شاید میرا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور میرا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''تو تم نے فیصلہ کر لیا ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''فتح خان اب میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ قصہ اب یہیں ختم ہو جانا چاہیے۔''

''کیا کرے گا مجھے بھوکا پیاسا مرنے کے لیے یہیں چھوڑ جائے گا؟'' اس کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا۔

''میں کسی انسان کے ساتھ اتنا انسانیت سوز سلوک نہیں کر سکتا۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں اس کے مقابلے میں ایک گولی استعمال کرنے کو ترجیح دوں گا۔''

''تب دیر کس بات کا ہے گولی استعمال کرو اور جاؤ۔'' فتح خان نے کہا۔ میں اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے ناشتے کی تیاری کرنے لگا۔ میں نے چائے بنائی اور نان کے ساتھ فتح خان کو دی اور خود بھی کھائی۔ اس دوران میں دھوپ یہاں تک آ چکی تھی اور آس پاس خوب روشنی ہو چکی تھی۔ ناشتے کے بعد میں کھڑا ہوا تو فتح خان کا چہرہ ستا گیا تھا اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''شہباز کیا تم سچ مچ مجھے قتل کر دے گا؟''

''کیا تمہیں شک ہے؟'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اپنی آخری خواہش بیان کرو۔''

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا اور پھر ہنسا۔ ''تم کیا سرکار ہے جو سزائے موت دینے سے پہلے آخری خواہش پوچھ رہا ہے؟''

''میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں اپنی آخری خواہش بیان کرو۔ میرے بس میں ہوا تو میں ضرور پوری کروں گا۔''

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ ''اگر ایسا ہے تو شہباز خان مجھے ہیرا لا دو۔ یہ میرا آخری خواہش ہے۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''فتح خان اب بھی وقت ہے سوچ لو اور کوئی اور خواہش کر دو۔''

''نہیں میرا یہی خواہش ہے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''تمہاری مرضی۔''

میں شمالی ڈھلان کی طرف بڑھا تھا کہ فتح خان نے عقب سے پوچھا۔ ''شہباز تم ہیرا لانے جا رہا ہے؟''

''ہاں ... تمہاری ... آخری ... خواہش ... پوری کرنے۔'' میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ شمالی ڈھلان ابھی

تک سائے میں تھی مگر درختوں تلے روشنی ہو گئی تھی۔ مجھے اس درخت تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آئی جس کے تنے کے سوراخ میں اُلو نے گھونسلا بنایا ہوا تھا اور اسی اُلو کی باقیات وہاں زمین پر بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے جڑ کے خلا میں ہاتھ ڈالا اور کسی قدر دقت سے وہ سیاہ دھاتی بکس نکال لیا جس میں وہ نایاب ہیرے تھے جو روس کی ملکہ کیتھرین کے خزانے میں شامل تھے۔ انہیں ملکہ کے آنسو کہا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ تھے نایاب اور قیمتی ہیرے تھے۔ یہ ہیرے ایک روسی جنرل کے ہاتھ لگے اس نے افغانستان میں کمانڈ کی تھی۔ ان ہیروں کا سوئٹزرلینڈ کے کسی دولت مند سے سودا کیا اور برٹ شا نے ان ہیروں کو پہنچانے کی ذمے داری لی تھی۔ مگر برٹ شا کی شامت کہ اس نے فتح خان جیسے شخص کی خدمات حاصل کیں اور نہ صرف ہیروں بلکہ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو لیے تھے۔

میں اس سیاہ بکس کو دیکھ رہا تھا جو سالوں سے تنے کے سوراخ میں پڑا ہوا تھا۔ جب میں نے اس میں ہاتھ ڈالا تب بھی وہاں موجود تھا مگر جب فتح خان نے مجھے للکارا تو میں نے سیاہ بکس کی بجائے انڈا نکالا اور جب اسے رکھنے لگا تو صفائی سے سیاہ بکس نکال لیا۔ میرا پاؤں جڑ کے خلا میں گیا تو میں نے گرتے ہوئے پاؤں کھینچنے کے بہانے سیاہ بکس اس خلا میں ڈال دیا یہی وجہ تھی کہ وہ جلال کو تنے کے سوراخ میں نہیں ملا تھا۔ میں اسے لے کر واپس روانہ ہوا۔ اصولاً یہ ہیرے ایمن کو ملنے چاہیے تھے اگرچہ اس کی ملکیت بھی نہیں تھے۔ اس کے باپ کو کسی کو پہنچانے تھے۔ مگر مجھے برٹ شا کی ساکھ اور اس سوئس دولت مند کی کوئی پروا نہیں تھی جو ان ہیروں کی قیمت ادا کر چکا تھا۔ میں واپس آیا تو فتح خان کی حالت دیدنی تھی سیاہ بکس دیکھ کر وہ اچھل پڑا۔ ''یہ تمہارے پاس تھا تم دھوکا دے رہا تھا؟''

''فتح خان مجھے اس دولت یا اس سے کہیں زیادہ دولت کے لیے بھی کسی کو دھوکا دینے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ اس سے ہزاروں لاکھوں گنا زیادہ قیمتی میری جان ہے۔'' میں نے سیاہ بکس اس کی طرف اچھال دیا۔ اس نے کیچ کیا اور مایوسی سے بولا۔

''فائدہ، جب میں مرجاؤں گا۔''

''فتح خان موت کی صورت الگ ہوتی ہے اور وہ صرف میری نہیں کسی بھی صورت میں آسکتی ہے۔ اسے اپنے وقت پر آنا ہوتا ہے اور انسان اس وقت سے ناواقف ہوتا ہے۔''

''تم نے کہاں چھپایا تھا؟''

میں نے اسے بتایا کہ سیاہ بکس کہاں تھا اور میں نے اس کے ساتھ کیا ہاتھ کی صفائی دکھائی تھی۔

''اب تم کیا کرے گا مجھے مارے گا اور ہیرا لے جائے گا؟'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

''ظاہر ہے جب تم مرجاؤ گے تو یہ تمہارے لیے بیکار ہو جائیں گے۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''تب میں انہیں لے جاؤں گا۔''

''شہباز خان یہ تو چالاکی ہوا۔''

''نہیں فتح خان چالاکی تم نے کی۔ میں نے تم سے آخری خواہش کا اسی لیے پوچھا تھا کہ میں اسے پورا نہ کر سکوں تو تم بچ جاؤ مگر تم نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے ہیرے مانگ لیے جو تمہارے خیال میں، میں نہیں لاسکتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے تمہیں موقع دیا اور تم نے اصرار کر کے وہ بھی گنوا دیا۔ تو چالاکی میں نے کی یا تم نے؟''

''ٹھیک کہا تم نے چالاکی میں نے کی اور اب سزا بھی مجھے ملے گی۔'' فتح خان نے سنجیدگی سے کہا۔ ''شہباز مجھے مرنے کا کوئی افسوس نہیں ہے کیونکہ میں ایک بہادر دشمن کے ہاتھ سے مارا جاؤں گا۔''

میں نے پستول نکالا اور فتح خان کے پاس چلا آیا اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اپنا سر جھکا لیا تھا میں نے پستول کا رخ اس کے سر کی طرف کیا تو نہ جانے کیوں میرے ہاتھ میں لرزش آ گئی تھی۔ اس سے پہلے جب میں نے کسی پر گولی چلائی تو میرا ہاتھ نہیں لرزا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میں جو قتل کر رہا ہوں وہ اپنی زندگی کے لیے کر رہا ہوں اور مجھے اپنے دفاع کا حق بھی ہے۔ مگر اس بار میں خود کو آمادہ نہیں کر پا رہا تھا۔ فتح خان نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ میں نے دل کڑا کر کے لگاتار تین گولیاں چلائیں اور پلٹ کر چل پڑا۔ میں مزید نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بس آخری منظر یہ تھا کہ فتح خان گر گیا ہے۔ میرا سر گرم ہو رہا تھا اور قدم خود بہ خود تیز اٹھ رہے تھے۔ میں نے ہیروں والا بکس نہیں اٹھایا تھا۔ مجھے ان ہیروں سے نفرت محسوس ہو رہی تھی جو نہ جانے کتنے انسانوں کی موت کی وجہ بنے تھے۔ نالے تک آیا تو اس میں پانی نایاب تھا۔ پانی کی تلاش میں مجھے کچھ آگے جانا پڑا تھا۔ ایک جگہ کچھ پانی جمع تھا۔ میں نے جھک کر اس سے منہ پر چھینٹے مارے اور سر پر ڈالا تاکہ میرے سر کی گرمی کچھ کم ہو۔

کچھ دیر میں اس یخ پانی سے خود کو سرد کرتا رہا اور پھر کھڑا ہوا۔ پانی نے میری گرمی دور کر دی تھی اور اب میں مڑ

سکون تھا۔ میں بوتل ساتھ نہیں لایا تھا کیونکہ آگے مجھے پانی ملتا رہتا۔ ذرا آگے جا کر نالا گھومنا شروع ہوا تو اس میں دائیں بائیں سے آنے والے کچھ نالوں کا پانی شامل ہونے لگا تھا اور اب اس نے ندی کی صورت اختیار کرلی تھی۔ میری کوشش تھی کہ جلد از جلد پل تک پہنچ جاؤں اور پھر اس جگہ سے روانہ ہو جاؤں کیونکہ مجھے اس سے وحشت ہو رہی تھی۔ ندی میں پانی کم ہونے سے مجھے سفر کرنا آسان لگ رہا تھا۔ آگے پانی زیادہ ملتا تو مجھے کناروں پر سفر کرنا پڑتا اور اس سے رفتار ذرا کم ہو جاتی۔ ایک گھنٹے بعد میں نصف راستہ طے کر چکا تھا۔ اس سے آگے پل تک پہنچنے میں مجھے مزید ڈیڑھ گھنٹا لگا تھا اور تب تک آسمان بادلوں سے بھر گیا تھا۔ یہ گزشتہ دو دن سے پڑنے والی تیز دھوپ اور گرمی کا لازمی نتیجہ تھا۔ اس سے پہلے کہ بارش شروع ہوتی میں پل کے چوکیدار کی کوٹھری تک پہنچ گیا تھا۔ جیپ اپنی جگہ موجود تھی۔ میں نے کوٹھری کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے دروازہ دھکیلا تو وہ کھل گیا اور فوراً ہی اندر سے ایک کراہت آمیز بُو آئی۔ یہ سڑتے ہوئے خون اور گوشت کی بُو تھی۔ اندر مکھیاں بھن بھنا رہی تھیں۔ میں نے دل کڑا کر کے اندر جھانکا تو چوکیدار اپنے خون میں غلطاں فرش پر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ اسے مرے ہوئے کم سے کم تیس پینتیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ اب نہیں معلوم کہ یہ فتح خان کا کام تھا یا بیرم خان کا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر پیچھے ہٹا تھا کہ کسی نے عقب سے میرے سر پر وار کیا اور بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے سنا۔ ''قاتل کا بچہ کیسے ہاتھ آیا؟''

☆......☆

لگ ایسا رہا تھا کہ پیچھے بیرم خان یا فتح خان کا کوئی آدمی رہ گیا تھا اور اسی نے میرے سر پر وار کر کے مجھے ہوش و حواس سے بیگانہ کیا تھا۔ مگر جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو تھانے میں پایا۔ آنکھیں کھولنے سے پہلے مجھے اس کا پتا چل گیا تھا کیونکہ تھانے میں دن دہاڑے ایک چور سے اعتراف کرانے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ اس نے خان کی گھوڑی چرائی ہے۔ اعتراف جرم کرانے والے اس سے گھوڑی برآمد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مبینہ ملزم کے ساتھ زور و شور سے تفتیش جاری تھی۔ زور پولیس والوں کا تھا اور شور مبینہ ملزم کا۔ ہر لتر پر جس کی آواز الگ سے سماعت تک آ رہی تھی وہ دل خراش چیخ کے ساتھ دہائی دیتا اور مصرع طرح کے طور پر دھراتا۔ ''اف ام مر گئی...... بالکل مر گئی۔''
یہاں کی مقامی زبان پشتو تھی مگر تھانیدار پنجاب سے آیا ہوا تھا اس لیے ملزم اردو استعمال کرنے پر مجبور تھا۔ وہ خالص سلطان راہی اسٹائل میں بڑکیں مار رہا تھا۔ مگر گالیاں وہ پولیس ڈکشنری سے ہی دے رہا تھا۔ اس شور سے مجھے لگ رہا تھا جیسے میرا سر یک دم بہت نازک ہو گیا ہو اور شور کسی ٹھوس شے کی طرح اس سے ٹکرا رہا ہو۔ مارنے والے نے رحم دلی کو بالائے طاق رکھ کر وار کیا تھا اور غالباً اسے میرے پاس موجود خطرناک اسلحے سے خدشہ تھا کہ وار ہلکا رہ گیا تو میں جوابی کارروائی میں اسے یقینی طور پر فوت کر دوں گا اس لیے اس نے میرا سر پھاڑ ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو حوالات کا کمرا ایک لمحے کو گھوما تھا اور پھر اپنی جگہ قائم ہو گیا۔ سر سے بہنے والا خون میری گدی تک آیا تھا اور یہ اچھی بات تھی ورنہ وار کی قوت اتنی تھی کہ اگر میرا سر نہ پھٹتا تو اندرونی جریان خون کا مسئلہ ہو سکتا تھا۔ میں بہ مشکل اٹھ کر بیٹھا اور پھر کونے میں رکھے پانی کے گھڑے سے پانی نکال کر پیا تو طبیعت میں بہت افاقہ ہوا تھا۔ اسلحے سمیت میرا پرس اور تمام چیزیں غائب تھیں صرف کپڑے اور جوتے ان لوگوں نے پتا نہیں کیسے چھوڑ دیئے تھے۔

میں پانی پی کر ایک طرف دیوار سے ٹک کر بیٹھ گیا کیونکہ اس دیہاتی تھانے کے حوالات میں فرش پر دری بھی نہیں تھی۔ سوال یہ تھا کہ مجھے یہاں لایا کون تھا؟ آیا کہ یہ کارنامہ خیر پولیس والوں نے خود انجام دیا تھا یا چوکیدار کے لواحقین نے مجھے قاتل سمجھ کر بے ہوش کر کے پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ بہر حال یہ طے تھا کہ میں ملزم کی حیثیت سے یہاں آیا تھا اور میرے کسی بھی عمل کا ردعمل بہت شدید ہو سکتا تھا۔ اس لیے مجھے جو کرنا تھا آگے کا سوچ سمجھ کر کرنا تھا۔ میں نے خود سے شور کرنے اور آبیل مجھے مار کہنے سے گریز کیا۔ کچھ دیر بعد ایک کانسٹیبل نے اندر جھانکا اس کی قمیص آدھی پتلون سے باہر تھی اور اس نے بیلٹ بھی نہیں باندھی ہوئی تھی۔ وہ سوتے سے اٹھ کر آیا تھا اور مجھے بیدار دیکھ کر اس نے پہلے بلند آواز سے جماہی لی اور اس سے بھی بلند آواز سے بولا۔ ''بندے کو ہوش آ گیا ہے۔''

''میں کہاں ہوں؟'' میں نے سوال کیا تو اس نے استہزائیہ انداز میں جواب دیا۔

''تجھے باہر شور سنائی نہیں دے رہا اور یہ وردی دکھائی نہیں دے رہی ہے کیا؟''

''میرا مطلب ہے کہ میں کون سے تھانے میں ہوں؟''

''تجھے جلد پتا چل جائے گا۔'' اس نے کہا اور اپنی قمیص پتلون میں کرتا چلا گیا۔ غالباً تھانے میں ملزم کم تھے اور ان کو تختۂ مشق بنانے کے لیے کم لوگ ملتے تھے اس لیے میری باری جلد آگئی۔ دو سپاہی آئے ایک نے لاک اپ کا دروازہ کھولا اور مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ جیسے ہی میں باہر آیا دوسرے نے مجھے بازو سے پکڑلیا۔

''آرام سے میں بھاگ نہیں رہا اور نہ ہی بھاگنے والوں میں سے ہوں۔'' میں نے ذرا دبنگ لہجے میں کہا۔ مگر اس میں بدمعاشی کا تاثر شامل کرنے سے گریز کیا۔

''کون اے تم جو اس طرا بات کرتا اے۔'' مجھے پکڑنے والے سپاہی نے کسی قدر مرعوب ہوکر کہا۔

''مجھے ایس ایچ او کے پاس لے چلو۔''

''اس کے پاس ہی لے جارہے ہیں۔'' دوسرا معنی خیز انداز میں بولا۔ ایس ایچ او خالص پولیس والا تھا۔ اس کی توند کا حجم بتارہا تھا کہ اس کی پرورش کیسے کی گئی تھی۔ وہ ایسی سفید رنگت رکھتا تھا جس میں اعمال کی سیاہی شامل ہوگئی تھی۔ کسی قدر بڑھی شیو اور سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ خطرناک تھانیدار لگ رہا تھا۔ جب تک مبینہ ملزم کے ساتھ تفتیش جاری تھی اس نے لنچ میں سالم مرغا تناول فرمالیا تھا اور اس وقت ماچس کی تیلی سے خلال میں مصروف تھا۔ تھوڑی چور غالباً عارضی رخصت پر تھا اور اس دوران میں مجھے طلب کرلیا تھا۔ میں نے ایس ایچ او سے پوچھا۔

''مجھے کس الزام میں پکڑا ہے۔''

''الزام بھی بتادیں گے۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''پہلے اپنا تعارف تو کراؤ۔''

''میرا نام شہباز ملک ہے اور میں یہاں سیاحت کے لیے آیا ہوں۔''

''اس پل کے آس پاس کون سی جگہ ہے سیاحت والی؟'' اس کے لہجے کی معنی خیزی بڑھ گئی۔

''میں ندی کے ساتھ ساتھ ٹریک پر گیا تھا۔ اپنی جیپ پل کے چوکیدار کی رکھوالی میں چھوڑ گیا تھا۔ واپس آیا تو کوٹھری میں اس کی لاش پڑی تھی اور پھر کسی نے مجھے سر پر وار کرکے بے ہوش کردیا۔''

''اپنے شریف شاہ نے کام کیا تھا۔'' ایس ایچ او نے مجھے لانے والے سپاہی کی طرف اشارہ کیا۔ ''بڑا ظالم ہاتھ مارتا ہے۔''

''اگر تمہارا خیال ہے کہ میں نے چوکیدار کو قتل کیا ہے تو تم غلطی پر ہو یہ کام کسی اور کا ہے اور اپنی جیپ لینے آیا تھا۔''

''صرف چوکیدار کا قتل نہیں ہوا ہے۔ اس کی نئی بیوی بھی غائب ہے۔ اسے کہاں لے گئے تم اور اس کے ساتھ کیا کیا؟'' کہتے ہوئے ایس ایچ او کے اندر کی خباثت لہجے میں آگئی۔ ''وہ کہاں ہے مرگئی ہے یا کہیں پڑی ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں چوکیدار کی بیوی کے بارے میں نہیں جانتا۔ دو دن پہلے میں یہاں آیا تھا اور جیپ اس کے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔''

''ملک صاحب ایسے کام نہیں چلے گا۔'' ایس ایچ او نے چالاکی سے کہا۔ ''تمہارے پاس کوئی شناختی دستاویز بھی نہیں ہے۔ اسلام آباد نمبر کی جیپ لے کر گھوم رہے ہو۔''

''میرے شناختی کاغذات جیب سے ندی میں گر گئے۔''

''جیپ بھی کسی شاہین ایاز کے نام پر ہے۔''

''ایاز میرا دوست ہے اور شاہین اس کی بیوی ہے جیپ اسی کے نام پر ہے۔''

ایس ایچ او اب تک مجھ سے محتاط انداز میں بات کر رہا تھا غالباً اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ میں چلتا پھرتا آدمی نہیں ہوں۔ یہ چھوٹا دیہاتی علاقہ تھا اور یہاں وہ کسی اثر و رسوخ والے بندے کے ساتھ زیادتی کرجاتا تو اسے آگے جواب دینا مشکل ہوجاتا۔ اس نے میز کے نیچے سے رائفل اور پستول اٹھا کر سامنے رکھ دیئے۔ ''تمہارے پاس سے یہ اسلحہ نکلا ہے۔ اس کا لائسنس کہاں ہے؟''

''بدقسمتی سے لائسنس بھی کاغذات کے ساتھ ندی میں ہی گر گیا۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے یہاں ہر دوسرا بندہ ایسے ہی اسلحہ لے کر گھومتا ہے ان سے پوچھا بھی۔''

''ادھر والوں کو اجازت ہے۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''ملک صاحب مجھے مطمئن کرو ورنہ میں تین سو دو اور اغوا کی ایف آئی آر کاٹنے پر مجبور ہوجاؤں گا۔''

یہ تو اس کے انداز سے واضح تھا کہ وہ کس قسم کا اطمینان چاہتا تھا۔ اسے چوکیدار یا اس کی گم شدہ بیوی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ اپنی خوش قسمتی سمجھ رہا تھا کہ اس کیس میں پھنسانے کے لیے اسے ایک ایسا مرغا ہاتھ آگیا جس سے وہ خاصا مال کھینچ سکتا تھا۔ اس جگہ مال کمانے کے مواقع نہ ہونے کے برابر تھے۔ کیونکہ یہاں جن کے پاس پیسا تھا وہ اس جیسے تھانیدار کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہوں گے اور باقی غریب غربا کے پاس کیا تھا زیادہ سے زیادہ اسے یہاں مرغ مسلم مل جاتا ہوگا۔ یقیناً اسے اپنی کسی غلطی کی وجہ سے

یہاں پھینکا گیا تھا۔ ایسا کیس تو مہینوں میں جا کر ایک بار ہاتھ آتا تھا۔ میرے پاس سے تقریباً ساٹھ ہزار کی رقم برآمد ہوئی تھی اس لیے وہ سوچنے میں حق بہ جانب تھا کہ جو صرف جیب میں اتنی رقم لے کر گھوم رہا ہو وہ اونچی پارٹی ہو گا۔ میں راجا صاحب کا حوالہ دے سکتا تھا مگر مجھے اچھا نہیں لگا کہ اس قسم کے معاملات میں انہیں ملوث کروں اور بلاوجہ کا احسان سر لوں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کرتے ہوئے سر ہلایا اور بولا۔ ”میں اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

ایس ایچ او نے اسلحہ واپس میز کے نیچے رکھ دیا۔ اور سپاہی اس کے انداز سے سمجھ گیا تھا اس لیے خاموشی سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس کا ایس ایچ او نے برا منایا تھا مگر منہ سے کچھ کہا نہیں۔ میں نے کہا۔ ”میرے پاس سے جو رقم نکلی تھی۔“

”اسے بھول جاؤ۔“ اس نے صاف کہا۔ ”آگے بات کرو۔“

”دیکھو۔ میں نہیں چاہتا کہ یہاں رہنے والے اپنے واقف کار کو زحمت دوں۔ ورنہ تمہیں رقم بھی واپس کرنی پڑے گی اور میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کا تاوان بھی دینا پڑے گا۔“

”بادشاہو سلمان چودھری آج تک کسی کی دھمکی میں نہیں آیا۔“ اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔ ”ادھر پشاور میں بھی دو پھنے خان تھے۔ دونوں کو مقابلے میں لڑھکا دیا۔ اسی لیے آج یہاں بیٹھا ہوں۔“

”میں پھنے خان نہیں ہوں۔ شریف آدمی ہوں اور کسی جرم میں ملوث نہیں ہوں۔“ میں نے بدستور نرم لہجے میں کہا۔ ”تم خود سوچو کہ میں نے قتل کیا ہوتا تو میں اسے آوازیں دیتا ہوا کوٹھری تک آتا۔ اپنے آدمی سے پوچھ لو جس نے مجھے بے ہوش کیا میں چوکیدار کو آواز دے رہا تھا کہ اپنی جیپ لے جاؤں۔ کوٹھری کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا جواب نہیں ملا تو ذرا سا کھولا تھا وہیں سے میں نے چوکیدار کی لاش دیکھی تھی۔ میں تو اندر تک نہیں گیا تھا۔“

”ٹھیک ہے ملک صاحب آپ ادھر گئے کیوں تھے وہ جگہ تو اجاڑ جنگل ہے۔“

”میں سیاح ہوں اور میری ایک ٹورسٹ کمپنی ہے۔ میں یہاں کسی اچھے ٹریک کی تلاش میں گیا تھا۔“

سلمان چودھری نے دانتوں میں خلال بند کیا۔ ”اس اسلحے کی کیا وضاحت کرو گے۔ صرف مقامی لوگ ایسے اسلحے رکھتے ہیں باہر سے آنے والوں کو اجازت نہیں ہے۔“

درحقیقت مجھے کلاشنکوف نے پھنسوا دیا تھا اگر پستول ہوتا تو اس کی وضاحت آسانی سے ہو جاتی۔ کلاشنکوف ممنوعہ اسلحے میں آتی ہے اور اس کا لائسنس عام دستیاب نہیں ہے صرف وی آئی پی حضرات کو ملتا ہے۔ میں اعتراف کر چکا تھا کہ میرے پاس لائسنس تھا جو ندی میں گر گیا ہے۔ یہ حماقت تھی اگر میں کہہ دیتا کہ کلاشنکوف میں چوکیدار سے کرائے پر لے کر گیا تھا تا کہ اپنا دفاع کر سکوں تو یہ شاید معقول بات ہوتی۔ مگر سر کی چوٹ نے شاید میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر اثر ڈالا تھا۔ میں نے کہا۔ ”چودھری صاحب آپ جانتے ہیں کہ کاروباری لوگوں کی دشمنیاں بھی ہوتی ہیں اور بندے کو اپنی حفاظت کے لیے ایسی چیزیں رکھنی پڑتی ہیں۔ لیکن یہ صرف یہیں کی حد تک ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں گے لیکن بہرحال ایک لاش تو ہے اور آپ اسی کے پاس سے پکڑے گئے ہو۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ”اتنی آسانی سے چھٹکارا تو نہیں ملے گا۔“

”آپ جو چاہتے ہیں کھل کر کہیں۔“ میں نے کہا۔

”دس لاکھ روپے۔“ وہ ذرا جھک کر دھیمے لہجے میں بولا۔

”یہ بہت زیادہ ہیں۔ میں کاروباری ہوں کوئی جدی پشتی دولت مند نہیں ہوں۔“

”دس لاکھ سے ایک روپیا بھی کم نہیں ملک صاحب۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”ہاں یا نہ میں جواب دو۔“

دس لاکھ مسئلہ نہیں تھے مگر میں اس کے منہ میں دس لاکھ ڈال دیتا تو وہ آگے پھر کوئی مسئلہ کھڑا کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے بھی اسی جیسا رویہ اپنایا۔ ”ٹھیک ہے دس لاکھ...... مگر اس کے بعد ایسا ہونا چاہیے جیسے میں یہاں کبھی آیا ہی نہیں تھا میرا نام نہ آئے اور نہ کہیں کوئی ذکر ہو۔“

”منظور ہے۔“

”رقم میرا وکیل لے کر آئے گا اور آگے وہی تم سے بات کرے گا۔“

”منظور ہے۔“ اس نے پھر جواب دیا۔

”مجھے کوئی موبائل دو، کاغذات بچانے کے چکر میں موبائل بھی پانی میں گر گیا اور ٹوٹ بھی گیا تھا اسے پھینک دیا تھا مگر سم میرے پرس میں ہے وہ بھی دو۔“

اس نے میرا پرس برآمد کیا اور اس میں موجود سم ایک کھٹارا سے موبائل کے ساتھ میرے حوالے کر دی۔ میں نے

سم موبائل میں لگائی اور ندیم کا نمبر ملایا۔ اس نے پہلی بیل پر اٹھالیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔ ''تو زندہ ہے۔''

''حسبِ معمول اور اللہ کے فضل سے۔''

''مارکو پولو کے گھوڑے، ابن بطوطہ کے خچر سنا ہے تو آتے ہی دولتیاں جھاڑتا ہوا شمالی علاقے کی طرف بھاگ نکلا۔ اب کہاں ہے؟''

''تھانے میں۔'' میں نے کہا تو ندیم نے اتنا بلند بانگ قہقہہ مارا کہ تھانیدار نے بھی سنا۔

''مجھے معلوم تھا تیرا یہی انجام ہونا ہے، ایک دن، جتھے دی کھوتی اوتھے آن کھلوتی۔''

''بکواس مت کر، یہاں ایک چودھری صاحب کرتا دھرتا ہے اور تین سو دو کے کیس میں مجھے شامل کرنا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی کچھ مغویہ کا معاملہ بھی ہے، مگر یہ زیرِ دفعہ دس لاکھ کے تحت بات ختم کرنے کو تیار ہیں۔''

ندیم سنجیدہ ہوگیا اس نے کہا۔ ''میری بات کرا۔''

میں نے موبائل سلمان چودھری کی طرف بڑھا دیا۔ پہلے تو ان دونوں میں گرما گرمی ہوئی کیونکہ دونوں نے اپنی اپنی اوقات جتانے کی کوشش کی پھر ذرا اعتدال میں آئے اور بالآخر نرمی سے بات کرنے لگے۔ جب بات قہقہوں اور گپ شپ تک آئی تو میں نے اشارے سے سلمان چودھری کو یاد دلایا کہ موبائل میں بیلنس بھی ہوتا ہے جو خرچ ہو جاتا ہے۔ بادل ناخواستہ اس نے موبائل میرے حوالے کیا اور ندیم نے کہا۔ ''میں نے سیٹنگ کر لی ہے تیرے کسی گھوڑے کو دوڑاتا ہوں۔ بارہ گھنٹے مزید یہاں رہ اور مزے کر۔''

''وہ تو کر رہا ہوں سر پھٹا ہوا ہے اور خون تک صاف نہیں ہوا ہے۔''

''سب ہو جائے گا، تو بے فکر ہو جا، بندہ واقف کار نکل آیا ہے۔ بڑی حرامی چیز ہے میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ بہرحال اب تیرے ساتھ کچھ نہیں ہوگا۔''

میں نے سم نکال کر موبائل اسے واپس کرنا چاہا تو اس نے کہا۔ ''رکھیں جی ہو سکتا ہے آنے والا ساتھی آپ سے رابطہ کرے۔''

ایک گھنٹے بعد میں مرہم پٹی کے بعد بیٹھا ہوا مرغ مسلم کے مزے اڑا رہا تھا۔ یہ دیسی مرغ تھا مگر کسی ماہر فن نے تلا تھا۔ اس کے ساتھ شمالی علاقے میں ملنے والی گاڑھے دہی جیسی لسی تھی۔ یہ میرا لنچ بھی تھا اور ڈنر بھی جو میں نے شام کے وقت کیا۔ خوش قسمتی سے میرا لباس صاف تھا اس لیے دوسرے کپڑوں کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ مجھے ایک چارپائی دی گئی تھی اور کھانے کے بعد میں دو عدد پیناڈول لے کر اس پر محو استراحت ہوگیا۔ اس دوران میں عبداللہ سے بات ہوئی تھی اور وہی رقم لے کر آرہا تھا۔ میں نے احتیاطاً صرف کام کی بات کی اور وادی کے ایڈونچر کا ذکر کرنے سے گریز کیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ صبح تک پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد میں سوگیا۔ رات کسی قدر سردی لگی مگر گزارا ہوگیا تھا۔ کھانے پینے کے ساتھ مجھے باقی سہولتیں بھی مہیا کی گئی تھیں مگر ہر جگہ ایک سپاہی میرے ساتھ لگا رہا۔ جیپ تھانے کے احاطے میں موجود تھی۔ خلافِ توقع رات سکون سے گزری کیونکہ یہاں تفتیش دن میں ہو جاتی تھی۔

صبح فجر کی اذان پر آنکھ کھلی تو میں نے اٹھ کر سوتے سپاہی کو ہلایا اور اس سے وضو کرانے کو کہا۔ وہ مجھے تھانے کے باتھ روم تک لایا۔ وضو کر کے میں نے نماز پڑھی اور دوبارہ سوگیا۔ دل مطمئن تھا کہ آج اللہ نے نماز کی توفیق دی۔ پھر میری آنکھ سپاہی کے ہلانے سے کھلی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''اٹھ جائیں جی تھانیدار جی بلاتی ہے۔''

تھانیدار جی کو مرغ سے خاص دل چسپی تھی کیونکہ ناشتے میں بھی مرغ پراٹھے تھے۔ اس نے مجھے ناشتے پر مدعو کیا تھا۔ مرغ پراٹھے، پھر لسی اور آخر میں شیرہ جیسی دودھ پتی کی چائے نے مزہ دیا۔ ندیم سے بات کرنے اور معاملہ طے پانے کے بعد سلمان چودھری کا رویہ بالکل بدل گیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا ٹورزم کا بزنس کہاں تک پھیلا ہوا ہے اور میں اسے مزید کہاں تک پھیلانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس نے کہا۔ ''ادھر سوات تک تو سارا بزنس تباہ ہوگیا تھا۔ اب کچھ رونق لگی ہے ورنہ دہشت گردی کے ڈر سے لوگوں نے آنا چھوڑ دیا تھا۔''

میں نے چوکیدار کے بارے میں کریدا تو اس نے مبہم انداز میں بتایا کہ اس کی لاش مقامی اسپتال پہنچا دی گئی تھی اور پوسٹ مارٹم کے بعد اسے لواحقین کے حوالے کر دیا جاتا۔ البتہ اس کی بیوی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اب مجھے ایک خدشہ ستانے لگا تھا کہ کہیں اگر پولیس والے ندی کے ساتھ ساتھ ہوتے وادی تک چلے گئے تو انہیں وہاں مزید کئی عدد لاشیں ہاتھ آجاتیں اس کے بعد میری گلوخلاصی پھر کھٹائی میں پڑ جاتی۔ اسے قاتل کی فکر نہیں تھی کیونکہ اس علاقے میں قاتل جلد یا بدیر پکڑا ہی جاتا ہے۔ چوکیدار کی لازمی کسی سے دشمنی تھی۔ اب یہ خاندانی تھی یا بیوی کی وجہ سے تھی کیونکہ اس کے قتل کے بعد وہ بھی غائب تھی۔ پیسا اس میں ملوث نظر

نہیں آتا تھا۔ اس لیے سلمان چودھری بھی کیس پر توجہ دینے کی بجائے جلد از جلد مجھ سے معاملہ کر لینا چاہتا تھا۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا۔ کیونکہ اس کا امکان تھا کہ جلد وادی کی لاشیں مل جائیں گی اور پھر سلمان چودھری کا دھیان میری طرف جائے گا مگر اس کے پاس صرف ایک نام ہوگا۔ ندیم کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ وہ اس کا رخ کرتا تو ندیم خود اس کے گلے پڑ جاتا۔ البتہ میں راجا عمر دراز کا نام لے لیتا تو اس کے پاس یک سرا ہوتا۔

عبداللہ نو بجے آیا۔ وہ مسلسل ڈرائیو کرتا رہا تھا اور تھکا ہوا تھا۔ مجھ سے گلے مل کر اس نے سلمان چودھری سے کہا۔ ''مجھے ندیم صاحب نے بھیجا ہے میں ان کا نائب اکرم چشتی ہوں۔''

عبداللہ نے روانی سے جھوٹ بولا اور میرے ایک دشمن کا نام لیا جو اتفاق سے ایس ایچ او کا چہیتا بھائی تھا۔ سلمان چودھری نے حریص نظروں سے اس کے ہاتھ میں موجود بیگ دیکھا۔ ''بسم اللہ جی۔''

''مجھے، میرا سامان دیا جائے۔'' میں نے مطالبہ کیا۔ اس نے بلا حیل و حجت ہتھیار، ایمونیشن، پرس اور جیپ کی چابیاں سامنے رکھ دیں۔ میں نے پستول لے کر بیلٹ سے لگایا اور کلاشنکوف سامنے کر لی مگر دونوں بغیر گولیوں کے تھیں اس لیے سلمان چودھری مطمئن تھا۔ مزید اطمینان کے لیے باہر ایک مسلح سپاہی موجود تھا۔ عبداللہ نے بیگ اس کے سامنے رکھا۔

''اپنی تسلی کر لیں ایس ایچ او صاحب۔''

اس نے بیگ کھول کر دیکھا اور پھر اندر موجود ہزار کی گڈیوں کا جائزہ لیا۔ مطمئن ہو کر اس نے بیگ بند کر دیا۔ ''ٹھیک ہے ملک صاحب ڈیل ہوگئی۔''

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ سر پھٹا، رات تھانے میں گزارنا پڑی اور دس لاکھ روپے بھی دیے مگر میری پولیس سے جان چھوٹ گئی تھی۔ سلمان چودھری نے گرم جوشی سے رخصت کیا اور ساتھ ہی پیشکش بھی کی کہ اب میں جب یہاں سے گزروں تو اس کا مہمان ہوں گا اور اس کے تھانے کی حدود میں مجھے کوئی مسئلہ ہوا تو وہ ذمے دار ہوگا۔ باہر آتے ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ اب یہاں سے گزروں گا بھی نہیں۔ عبداللہ جس گاڑی میں آیا تھا یہاں آتے ہوئے اس نے اس کی نمبر پلیٹس بدل لی تھیں اور واپسی کے سفر میں دوبارہ بدل لیتا۔ میں نے اسے مختصراً حالات بتائے اور یہ بھی کہ فتح خان سے چھٹکارا مل گیا ہے۔ وہ خوش ہوا تھا کہ یہ

قصہ بھی ختم ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ تفصیلات میں جاتا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''سب جلد از جلد اس علاقے سے نکل جاؤ اور ندیم سے کہنا کہ سلمان چودھری کی کال کے لیے تیار رہے اسے ٹوپی کرانی ہے۔''

''میں بتا دوں گا۔'' عبداللہ نے کہا اور مجھ سے گلے مل کر رخصت ہوگیا۔ جیپ ٹھیک ٹھاک حالت میں تھی۔ اس میں میرا سامان بھی جوں کا توں تھا۔ پرس والی رقم بھی گئی تھی اس لیے میں نے عبداللہ سے کوئی تیس ہزار روپے لیے تھے۔ اگرچہ خاص ضرورت نہیں تھی مگر کہیں کام بھی پڑ سکتا تھا۔ اس کے بعد میں ہر ممکن تیزی سے راجا عمر دراز کے محل کی طرف روانہ ہوگیا۔ عبداللہ پہلے ہی مخالف سمت جا چکا تھا۔ دن کی تیز روشنی میں مجھے تیز رفتار ڈرائیونگ کرنے میں مدد ملی تھی اور دو گھنٹے بعد میں اس کچی سڑک تک پہنچ گیا تھا جو راجا عمر دراز کی وادی تک جاتی تھی۔ درّے کو کراس کر کے میں نے وادی میں قدم رکھا جہاں میں برسوں پہلے آیا تھا۔ یہاں کے ایک مخلص رہائشی نے مجھے اپنا مہمان بنایا تھا اور شینا اس کے معذور بوڑھے باپ کی تیسری بیوی تھی۔ اسی وادی سے میری مشکلوں کا آغاز ہوا تھا۔ اگرچہ مرشد اور نادر کا اس وادی سے کوئی تعلق نہیں تھا جو میری اور میرے ساتھیوں کی پُرسکون زندگی میں عذاب بن کر آئے تھے۔ مگر بہت سے معاملات کا تعلق تو یہیں سے تھا۔

وادی میں داخل ہونے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہاں اب پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتری آئی تھی۔ اتفاق سے میرا جب بھی آنا ہوا تو بائی ائر ہوا یا پھر رات کے وقت آیا گیا تھا اس لیے وادی کی حالت دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ آبادی تو اتنی ہی تھی اور لوگوں کا طرز زندگی بھی تقریباً وہی تھا یعنی گھٹے ہوئے ہوا بند گھروں میں رہنا، البتہ کھیتوں و باغات کی سرسبزی و شادابی میں اضافہ ہوا تھا۔ اب کھیت اور باغات پہاڑوں پر زیادہ اوپر تک چلے گئے تھے۔ پانی کی نالیوں میں اضافہ ہوا تھا اور مجھے کئی مقامات پر اسکول کی نئی عمارات نظر آئیں۔ جب میں راجا عمر دراز کے محل کی طرف جانے والی پختہ سڑک پر پہنچا تو اسے شاندار حالت میں پایا۔ یہ پتھروں اور سیمنٹ سے بنائی ہوئی بہت مضبوط سڑک تھی اور یقیناً مقامی کاوش سے تیار ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کئی سڑکیں تھیں۔

محل سے ذرا نیچے ایک عمارت پر اسپتال اور ڈسپنسری کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہ خاصی بڑی ہوگئی تھی اور اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے خوشنما بنگلے بھی بنے ہوئے تھے جو یقیناً

یہاں کام کرنے والے ڈاکٹروں کے لیے تھے۔ یہ سب راجا عمر دراز نے کرایا تھا۔ محل کے گیٹ پر حسبِ معمول دو مقامی افراد گارڈ کی وردی میں مستعد موجود تھے۔ ان میں سے ایک اندر رہا اور دوسرا باہر آیا۔ میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا اور اس نے بھی شاید پہلی بار مجھے دیکھا تھا اس لیے ادب سے بولا۔ ''جی صیب آپ کا نام کیا ہے کس سے ملنا ہے؟''

''میرا نام شہباز ملک ہے اور مجھے راجا عمر دراز صاحب سے ملنا ہے۔''

اس نے اندر والے گارڈ کو بتایا اور خود مستعد ہو کر گیٹ کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اس کے پاس ایک چھوٹی لیکن جدید ماڈل کی ایس ایم جی تھی۔ چند منٹ بعد گیٹ کھلا اور گارڈ نے مجھ سے کہا۔ ''صاحب آپ وہ سفید عمارت تک جاؤ۔''

محل کی عمارت سرخ کھپریل والی تھی مگر اب دائیں طرف باغ کے ساتھ ایک چھوٹی سفید عمارت بھی بن گئی تھی۔ پتھروں اور سفید ہی رنگ کے کھپریل سے بنی چھت کی اس دومنزلہ عمارت کا رقبہ چھ سات مرلے سے زیادہ نہیں تھا اور بہ ظاہر یہ گیسٹ ہاؤس جیسی لگ رہی تھی۔ میں نے جیپ اس کے سامنے روکی تو اندر سے ایک خادم برآمد ہوا جس نے راجا کے محل کے خادموں والی مخصوص یونیفارم پہن رکھی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور جب میں نیچے اترا تو اس نے پوچھا۔ ''جناب سامان ہے؟''

''ہاں پیچھے موجود ہے۔''

اس نے عقبی دروازہ کھول کر میرا بیگ نکال لیا۔ اسلحہ دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور پھر اس نے بدستور ادب سے کہا۔ ''جناب یہاں کسی باہر سے آنے والے کو اسلحہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔''

میں پہلے ہی اس استقبال پر کھٹکا ہوا تھا اور اس کی یہ بات سن کر میرے اندر غصہ سرسرانے لگا۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں پہلی بار نہیں آیا ہوں اور میں نے ہمیشہ اپنا اسلحہ اپنے پاس رکھا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب لیکن اب اصول بدل گیا ہے۔ آپ کو یہ اسلحہ یہاں جمع کرانا ہوگا آپ کو واپسی میں مل جائے گا۔''

''اسلحہ جمع کرانے کی بجائے میں واپس جانے کو ترجیح دوں گا۔'' میں نے کہا۔ میرا غصہ بڑھنے لگا تھا۔ ''میرا بیگ واپس رکھ دو۔''

''جناب آپ غصہ نہ کریں۔'' اس نے عاجزی سے کہا۔ ''اچھا ایسا کریں آپ بیگ صاحب سے بات کر لیں۔''

''اگر بیگ صاحب کو مجھ سے بات کرنی ہوتی تو وہ خود یہاں موجود ہوتے۔'' میں نے کہا اور اس سے لے کر اپنا بیگ واپس جیپ کے عقبی حصے میں ڈال کر دروازہ بند کر دیا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ راجا عمر دراز کے محل میں میرا استقبال یوں ہوگا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی کئی بار میرے ساتھ یہاں برا سلوک ہوا تھا مگر وہ حالات اور واقعات کی مناسبت سے تھا۔ مگر اس طرح میرا استقبال کبھی نہیں ہوا تھا کہ صرف ایک خادم مجھے ریسیو کرے اور مجھے ایک الگ تھلگ عمارت میں لے جایا جائے۔ جب میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ رہا تھا تو میں نے خادم کو ایک چھوٹے واکی ٹاکی نما آلے پر کسی سے بات کرتے پایا۔ میں نے جیپ موڑی اور گیٹ کی طرف روانہ ہوگیا مگر جب وہاں پہنچا تو گیٹ بند تھا اور میرے ہارن دینے پر بھی نہیں کھلا۔ یہ آٹومیٹک مشین سے کھلنے اور بند ہونے والا گیٹ تھا۔ پہلے یہ مینول ہوا کرتا تھا مگر اب اسے آٹومیٹک کر دیا گیا تھا۔ دوبارہ ہارن دینے پر چھوٹی سی چوکی سے گارڈ باہر آیا اور اس نے مؤدب لہجے میں کہا۔

''جناب بیگ صاحب خود یہاں آ رہے ہیں۔ ان کی درخواست ہے کہ آپ ایک منٹ ان کا انتظار کر لیں۔''

''ٹھیک ہے لیکن ایک منٹ بعد یہ گیٹ کھل جانا چاہیے۔''

اس وقت میرا سر گرم ہو رہا تھا اور شاید چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ایک منٹ تو نہیں مگر دو منٹ بعد بیگ اپنا عبایا نما رنگین گاؤن لہراتا ہوا وہاں آن موجود ہوا اور اس نے مجھ سے آہستہ سے کہا۔ ''شہباز صاحب پلیز میرے ساتھ آیئے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آپ نے جو بات کرنی ہے یہیں کر لیں۔''

''ان ملازموں کے سامنے۔''

''اب تک سب ملازموں کے سامنے ہی ہوا ہے۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''تو اب کیا مانع ہے بات کرنے میں ہے۔''

غالباً بیگ ملازموں کے سامنے معافی تلافی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس کی سبکی کا معاملہ تھا۔ مگر میرے ساتھ جو ہوا تھا اس کے بعد میں اسے اتنی آسانی سے معاف نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ ایک طرف لے جا کر مجھے منا لے گا مگر میں

چاہتا تھا کہ وہ یہ کام سب کے سامنے کرے۔ بیگ کے چہرے پر مسکینیت تھی۔ اس نے پھر التجا آمیز نظروں سے دیکھا مگر میں سامنے دیکھنے لگا۔ بادل ناخواستہ اس نے کہا۔ ''شہباز صاحب آپ کو میری وجہ سے جو زحمت ہوئی ہے اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ واپس چلیں۔''

''ٹھیک ہے لیکن میں اس شرط پر واپس جاؤں گا کہ جلد از جلد راجا صاحب سے میری ملاقات کرادی جائے میں صرف ان کی خیریت پوچھنے آیا ہوں۔''

''آپ اندر تو آئیے۔'' اس نے کہا اور میرے ساتھ والی سیٹ پر آگیا۔ میں نے جیپ پھر واپس موڑی اور شکوہ کیا۔

''بیگ صاحب یہاں میرے ساتھ ہمیشہ غلط سلوک ہوتا ہے جب کہ راجا صاحب سے میرا اخلوص عیاں ہے۔''

''میں جانتا ہوں اور اس کے لیے بھی معذرت خواہ ہوں۔'' بیگ نے حسبِ معمول محتاط انداز میں کہا۔ ''بعض اوقات طریقہ کار کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے مگر مقصود آپ کی تضحیک نہیں ہوتی ہے۔''

''اس بار مجھے اس عمارت تک لے جایا گیا ہے۔''

''یہ مہمانوں کے لیے بنی ہے۔'' اس نے صفائی پیش کی۔ ''محل میں جو گیسٹ ہاؤس ہے وہاں راجا صاحب کے کچھ رشتے دار مقیم ہیں اس لیے آپ کو یہاں بھیجا گیا اور کیونکہ آپ کی آمد غیر متوقع تھی اس لیے میں خود استقبال کے لیے نہ آسکا۔''

''مجھ سے اسلحہ طلب کیا گیا جب کہ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔''

''شہباز صاحب آپ جانتے ہیں کچھ عرصے سے راجا صاحب کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں اور ایک موقع پر یہاں آنے والے مہمان کا پستول غائب کر کے اس سے راجا صاحب کی جان لینے کی کوشش کی جاچکی ہے۔ اس کے بعد سے یہاں سوائے گارڈز کے کسی کو اسلحہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ حد یہ کہ میں بھی نہیں رکھ سکتا کیونکہ ہم گارڈز کی طرح ہمہ وقت اسلحہ اپنے پاس نہیں رکھتے ہیں اور اس کے چوری ہونے کا امکان ہوتا ہے۔''

ظاہر ہے یہ محل کا پروٹوکول تھا اور مجھے بھی اس کی پابندی کرنی تھی اس لیے اسلحہ بھی جمع کرانا تھا۔ میں نے جیپ اسی عمارت کے سامنے روکی وہی خادم منتظر تھا اس نے پیچھے سے بیگ اور میرا دوسرا سامان اٹھایا۔ میں نے پستول اپنے پاس رکھا اور کلاشنکوف بیگ کے حوالے کر دی۔ میں نے کہا۔ ''پستول چوبیس گھنٹے میرے پاس ہوتا ہے اور اس کے چوری یا گم ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔''

بیگ بادل ناخواستہ اس کے لیے آمادہ ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''لیکن پستول سامنے نہ ہو۔''

یوں معاملات سیٹ ہو گئے۔ ہم اندر آئے اور خادم نے ایک پُرتعیش قسم کے کمرے میں میرا بیگ رکھا اور مجھ سے چائے پانی کا پوچھا۔ بارہ بج رہے تھے ابھی لنچ میں وقت تھا۔ بیگ مجھ سے کچھ رسمی گفتگو کر کے رخصت ہو گیا مگر اس نے راجا عمر دراز سے میری ملاقات کے بارے میں بھاپ نہیں نکالی تھی اس معاملے میں اس کا رویہ حسبِ سابق تھا۔ میں نے خادم سے قہوہ لانے کو کہا اور خود بستر پر دراز ہو گیا۔ چند دن کی تھکن تھی جو اب تک جسم میں موجود تھی۔ چند منٹ بعد قہوہ آگیا اور ساتھ ہی خادم نے دریافت کیا۔ ''جناب آپ لنچ کب پسند کریں گے؟''

خادم کے پوچھنے سے ظاہر تھا کہ لنچ مجھے اکیلے کرنا تھا ورنہ مجھے وقت بتایا جاتا۔ ''ایک بجے اور یہیں کمرے میں۔''

اس نے سر ہلایا اور رخصت ہو گیا۔ قہوہ محل کا خاص مشروب تھا اور اسے پی کر طبیعت تازہ دم ہو جاتی تھی۔ میں نے بیگ سے دوسرے کپڑے نکال کر استری کروائے اور غسل کر کے جسم سے میل اتارا۔ تازہ دم ہوا تھا کہ لنچ ٹھیک ایک بجے آگیا اور بہت پُرتکلف قسم کا تھا۔ میں نے اس سے بھرپور انصاف کیا۔ اس کے بعد فطری طور پر خمار طاری ہونے لگا۔ سونے سے پہلے میں نے عبداللہ کو کال کر کے اپنے خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع دینا چاہی تو پتا چلا کہ موبائل پر سگنل نہیں ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ یہاں موبائل سروس نہیں ہے۔ محل میں تمام تر رابطہ لینڈ لائن فون، انٹرنیٹ اور سیلائیٹ فون سے تھا۔ حالانکہ اس وادی کی اچھی خاصی آبادی تھی اور یہاں موبائل کی سروس ہونی چاہیے تھی کیونکہ یہاں بے شمار لوگ ملازمت کے لیے باہر گئے ہوئے تھے اور ان کا رابطہ موبائل سے ہی آسانی سے ہو سکتا تھا۔

میں اٹھ کر کال کرنے کا ارادہ کر کے سو گیا۔ میں تقریباً دو بجے سویا تھا۔ میں چھ سات بجے تک آرام سے جاگ جاتا۔ مجھے دن میں اس سے زیادہ سونے کی عادت نہیں تھی مگر جب میری آنکھ کھلی تو رات کے نو بج رہے تھے۔ میں حیران ہوا تھا کیونکہ مجھے دن میں اتنی طویل نیند کی عادت نہیں تھی اور نہ ہی تھکن اتنی زیادہ تھی کہ میں بے خبر سوتا

رہتا۔ بہر حال ذہن اور جسم ہلکا ہو رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور بیل بجا کر خادم کو طلب کیا۔ اس بار دن والے خادم کی بجائے دوسرا خادم تھا۔ میں نے اس سے بیگ کے بارے میں پوچھا کہ براہِ راست راجا عمر دراز کے بارے میں پوچھنا پروٹوکول کے خلاف تھا۔ مگر اسے بیگ کے بارے میں علم نہیں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''تب بیگ صاحب کے بارے میں کیسے علم ہو؟''

''آپ انٹر کام سے ایک نمبر دبا کر پوچھ سکتے ہیں۔''
اس نے میری رہنمائی کی اور میں نے انٹر کام اٹھا کر ایک دبایا۔ دوسری طرف سے کسی سریلی آواز والی لڑکی نے پوچھا۔

''سر میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔''
''مجھے بیگ سے ملنا ہے۔''
''سوری سر ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ سونے چلے گئے ہیں۔''
میں جھنجلا گیا۔ ''تب میں راجا صاحب سے ملنا چاہوں گا۔''
''سر راجا صاحب سے ڈاکٹر نے ملاقات پر مکمل پابندی عائد کی ہوئی ہے۔'' آپریٹر نے جواب دیا۔ ''اس کے باوجود کوئی ان سے براہِ راست نہیں مل سکتا۔''
یہ سب میں پہلے سے جانتا تھا مگر اس وقت میں جھنجلا رہا تھا اور پچھتا رہا تھا کہ مجھے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی اس سے اچھا تھا کہ میں حویلی چلا جاتا۔ بعض اوقات مروت بھی آدمی کو ذلیل کرا دیتی ہے۔ شاید میں یہ سوچ کر آیا تھا کہ راجا عمر دراز مجھ سے ملنے کے لیے بے تاب ہوگا اور میں اس کے محل کے گیٹ میں بھی داخل نہیں ہوں گا اور وہ ملاقات کے لیے مجھے طلب کر لے گا۔ مگر راجا تو دور کی بات تھا بیگ بھی دستیاب نہیں تھا۔ میں سوچتا رہا اور ٹہلتا رہا۔ دس بجے جب خادم نے ڈنر کی یاد دلائی تو میں نے اس سے کچھ ہلکا پھلکا لانے کو کہا۔ میرا باقاعدہ کھانے کا موڈ نہیں رہا تھا۔ اس نے سینڈوچز کا پوچھا۔ میں نے اس سے کلب سینڈوچز لانے کو کہا۔ کچھ دیر بعد وہ کلب سینڈوچز اور کافی لے آیا۔ سینڈوچز سے ڈنر بھگتا کر میں نے کافی پی اور پھر ٹہلنے لگا۔ میں نے سوچ لیا کہ اگر کل صبح ناشتے کے بعد بیگ نے راجا صاحب سے ملاقات کے حوالے سے مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا تو میں واپس روانہ ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد میری ساری توجہ مرشد سے معاملات نمٹانے پر مرکوز رہے گی اور میں مزید کسی چکر میں نہیں پڑوں گا۔ اگر یہاں میرے لیے مشکلات کم نہیں ہوں گی تو میں دبئی شفٹ ہو جاؤں گا اور شادی کر کے سویرا کو بھی وہیں لے جاؤں گا۔ یہ فیصلہ کر کے میں پُرسکون ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اب میں راجا عمر دراز کا شکر گزار تھا کہ اس نے خود مجھے اس فیصلے پر پہنچنے میں مدد دی کہ اب میں اس کی کوئی احمقانہ بات تسلیم نہیں کروں گا۔

میں لیٹا اور سو گیا۔ ساری رات سوتے گزری اور صبح میری آنکھ دس بجے کے قریب کھلی تھی۔ مجھے تعجب ہوا کیونکہ میں اتنا سونے کا عادی نہیں تھا بہت تھکنے اور دیر تک جاگنے کے بعد بھی میں سات آٹھ گھنٹے کی نیند لے کر اٹھ جاتا تھا اس سے زیادہ دیر لیٹنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ رات کو ہلکا کھانے کی وجہ سے اس وقت میرے پیٹ میں بھوک کا جن انگڑائیاں لے رہا تھا اور اسے جلد کھانے کو کچھ چاہیے تھا۔ میرے ساتھ کچھ گڑبڑ تھی۔ شاید میں نے فتح خان کے ساتھ جو کیا تھا اس نے مجھے ذہنی طور پر ڈسٹرب کر دیا تھا۔ میں نے خادم کو بلانے کی بجائے انٹر کام پر ایک کا بٹن دبایا تو اسی سریلی آواز والی لڑکی نے جواب دیا۔ ''سر میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟''
میری جگہ کوئی ٹھرکی ہوتا تو اس کے اس انداز سے پوچھنے پر اپنی کئی ناتمام حسرتوں کو پورا کرنے کی فرمائش کر سکتا تھا۔ مگر میں نے صرف بیگ کی فرمائش کی۔ ''میں بیگ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔''
''سوری سر وہ اب تک اپنی رہائش گاہ سے نہیں نکلے ہیں۔''

میں نے دل میں سوچا کہ وہ اب ساری عمر وہیں رہے اور انٹر کام رکھ دیا۔ خادم کو بلا کر اسے بھرپور ناشتا لانے کو کہا۔ میرا کل کا اتارا ہوا لباس دھل کر اور استری ہو کر سیلوفین میں پیک آ گیا تھا۔ میں نے اسے بیگ میں رکھا اور واش روم میں آیا۔ جب تک میں غسل سے فارغ ہوا ناشتا آ گیا تھا۔ میں نے اس سے انصاف کیا اور پھر خادم کو بلا کر اس سے کہا۔ ''مجھے روانہ ہونا ہے۔ میں نے یہاں آنے کے بعد جو رائفل جمع کرائی تھی اسے گیٹ پر بھجوا دو میں وہاں سے لے لوں گا۔''
''یہ کام بیگ صاحب کر سکتے ہیں۔'' اس نے ادب سے جواب دیا یہ کل دن والا خادم تھا۔ ''وہی اسلحہ لینے اور دینے کے مجاز ہیں۔''
راجا عمر دراز کے اس مجازی سیکریٹری نے صحیح معنوں میں میرا ناک میں دم کرنا شروع کر دیا تھا۔ میری رائفل اس

کے پاس تھی اور وہ خود غائب تھا اپنے حجرۂ خاص سے نکلنے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے پھر نمبر دو کو کال کی اور اس سے کہا۔ ''بیگ صاحب کی غیر موجودگی میں معاملات کون دیکھتا ہے؟''

''کوئی نہیں سر۔''

''اگر خدانا خواستہ بیگ صاحب دنیا سے اچانک پردہ فرما جائیں تو کیا تب بھی کوئی ان کی جگہ نہیں لے گا؟''

وہ بے ساختہ ہنسی اور بے ساختہ ہی رک گئی۔ غالباً اسے اپنی حرکت کا احساس ہوا تھا۔ ''سوری سر...... میں اس بارے میں کسی پروسیجر سے لاعلم ہوں۔''

''کیا میں انٹر کام پر راجا عمر دراز سے بات کرسکتا ہوں؟''

''سوری سر۔'' اس نے پھر کہا۔ ''یہ بھی ممکن نہیں ہے۔''

''یہ بھی ممکن نہیں ہے تو پھر کیا ممکن ہے وہی بتا دو۔'' میں بھنا گیا تھا۔ ''یہ راجا صاحب کا محل ہے یا پاکستان جس کا کوئی پرسانِ حال ہی نہیں ہے۔''

''سر آپ جو کہہ رہے ہیں وہ میرے بس میں نہیں ہے۔ پلیز آپ کچھ دیر ویٹ کرلیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر ریسیور رکھ دیا اور اپنے لیے کیتلی سے تازہ چائے نکالنے لگا۔ سیکریٹری بیگ عمر میں راجا سے بڑا تھا اور وہ تھا بھی نحیف ونزار سا، اس لیے طبیعت خرابی انہونی نہیں تھی۔ مگر اس کا حال بھی ہمارے سیاست دانوں اور سرکاری بابوؤں جیسا ہے کہ جب تک دم میں دم ہے اختیارات نہیں چھوڑنا اور کسی کو جانشین بنانے کی کوشش بھی نہیں کرنی ہے۔ راجا عمر دراز کی طبیعت خرابی کی اطلاع جہاں ایک طرف تشویش ناک تھی وہیں مجھے یہ اطمینان بھی ہوا کہ فی الحال اس کی طرف سے کسی ایڈونچر کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وقت گزاری کے لیے میں باہر نکل آیا۔ گزشتہ چوبیس گھنٹے میں یہاں شاید بارش ہوئی تھی کیونکہ پودے بہت صاف ستھرے ہو رہے تھے۔ ویسے تو یہاں مٹی شاذ ہی نظر آتی ہے مگر بارش کے بعد پودوں کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ الگ سے ہی محسوس کی جاسکتی ہے اور یہاں بھی ایسا ہی لگ رہا تھا۔

دو گھنٹے مزید گزر گئے اور میرے صبر کا پیمانہ ایک بار پھر لبریز ہونے لگا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میں ایک ایسی رائفل کے چکر میں بیٹھا ہوا ہوں جو اصل میں میری نہیں تھی اور میں اس پر با آسانی لعنت بھیج کر یہاں سے جاسکتا تھا تو مجھے اب انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ راجا عمر دراز سے ملاقات نہ کرنے کا فیصلہ میں پہلے ہی کرچکا تھا۔ میں نے اندر آکر اپنا بیگ اٹھایا تھا کہ خادم آگیا۔ اس نے کہا۔ ''جناب بیگ صاحب آپ سے ملاقات کے منتظر ہیں۔''

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ جب میں جانے والا تھا تو وہ آگیا۔ بہرحال اب میں انکار تو نہیں کرسکتا تھا اس لیے اس کے ساتھ روانہ ہوا اور محل کے اس حصے میں آیا جو دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ بیگ وہاں اپنے دفتر میں میرا منتظر تھا اور وہ چہرے سے سچ مچ بیمار لگ رہا تھا۔ میں نے مزاج پرسی کی جسے اس نے ٹالنے والے انداز میں لیا اور بولا۔ ''معذرت شہباز صاحب، میں طبیعت خرابی کی وجہ سے کل جلد سونے چلا گیا تھا اور آج دیر سے آیا۔''

''اچھا ہوا آپ سے ملاقات ہوگئی کیونکہ میں جانے والا ہوں۔''

''اوہ۔'' اس نے کسی قدر مصنوعی سے انداز میں کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ راجا صاحب سے آپ کی ملاقات نہیں ہوسکی ویسے اگر آپ کل تک رک جائیں تو شاید ان کی حالت اتنی بہتر ہوجائے کہ وہ آپ سے ملاقات کرسکیں۔''

''بیگ صاحب، کیا آپ کھل کر مجھے راجا صاحب کی حالت بتاسکتے ہیں؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''بدقسمتی سے کینسر اپنی جڑیں پھیلا رہا ہے اور افاقہ عارضی ثابت ہوا۔ ڈاکٹروں کے مطابق ان کے پاس وقت کم ہے اور شاید اب دو مہینے بھی نہیں ہیں۔''

''اوہ۔'' مجھے افسوس ہونے لگا۔ ''لیکن اسلام آباد میں تو مجھے کچھ اور بتایا گیا تھا۔''

''وہ مجبوری تھی کیونکہ راجا صاحب خود رابطے میں تھے اور ان کے سامنے کوئی بھی ایسی بات نہیں کرتا جس سے ناامیدی جھلکے۔ ہم ہر جگہ یہی کہہ رہے تھے کہ راجا صاحب صحت یاب ہو رہے ہیں۔ مگر اس وقت میں آپ کے سامنے غلط بیانی نہیں کرسکتا۔ اس وقت محل میں نہ صرف راجا صاحب کی تمام اولادیں بلکہ دور قریب کے تمام ہی رشتے دار موجود ہیں۔ جہاں تک آپ کا تعلق ہے تو آپ کی آمد سے صرف میں واقف ہوں کیونکہ باقی نہ تو آپ سے واقف ہیں اور نہ ہی وہ آپ کی حیثیت جانتے ہیں۔ اس لیے کسی سے ملاقات مناسب نہیں ہوگی۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''میں اس اعتماد کے لیے شکر گزار ہوں۔ لیکن کیا راجا صاحب بھی میری آمد سے بے خبر ہیں۔''

''نہیں کل رات جانے سے پہلے میں نے انہیں آپ

کی آمد کے بارے میں بتا دیا ہے۔ ڈاکٹرز نے صرف ایک گھنٹا ملاقات کی اجازت دی ہے۔ وہ بھی آدھے آدھے گھنٹے کے دو وادوار میں اور ہر دور میں کم سے کم چھ گھنٹے کا فرق لازمی قرار دیا ہے اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کی طبیعت کس حد تک نازک ہے۔''

''اب میں سمجھ رہا ہوں۔''

''تو کیا میں سمجھوں کہ آپ کل تک رکنے پر آمادہ ہیں؟'' بیگ نے پُراُمید لہجے میں پوچھا۔ مکمل وضاحت کے بعد اور پھر بیگ کے لہجے پر میرا دل پسیج گیا تھا اور میں نے اس سے کہا۔

''ٹھیک ہے میں کل تک دیکھ لیتا ہوں۔''

''میں ذاتی طور پر آپ کا شکر گزار ہوں گا۔ بدقسمتی سے یہاں صرف میں اور راجا صاحب آپ کی اہمیت جانتے ہیں۔''

''میری کوئی اہمیت نہیں ہے یہ اوپر والے کی مہربانی کے بعد آپ لوگوں کا حسن ظن ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہاں موبائل سگنل کام نہیں کر رہے ہیں کیا میں لینڈ لائن سے اسلام آباد کال کر سکتا ہوں۔''

''بدقسمتی سے کل رات بارش کے دوران میں بجلی گرنے سے محل کے کمیونیکیشن ٹاور کو نقصان ہوا ہے اور فی الحال لینڈ لائن سمیت باہر سے تمام رابطے منقطع ہیں۔''

''لینڈ لائن بھی؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہاں کیونکہ بجلی گرنے سے وائرنگ جل گئی ہے اور اب پوری وائر پیچھے تک تبدیل ہوگی تب لائن ٹھیک ہو گی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آج شکایت کرادی ہے کل تک عملہ آجائے گا۔''

''اور سیٹلائٹ فون؟''

''محل کے دو سیٹلائٹ فون دو دن سے مسلسل استعمال ہونے کی وجہ سے فی الحال ری چارج نہ ہونے کے باعث بند پڑے ہیں۔ مواصلاتی رابطہ نہیں ہے کہ ان کو ری چارج کرکے یہ کال کی جا سکے۔'' بیگ نے اس کا بھی معقول جواب دیا۔ ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ یہ جوابات کہیں مجھے اسلام آباد رابطے سے روکنے کے لیے تو نہیں ہیں۔ مگر پھر میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ بیگ کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیونکہ کام کی بات ہو گئی تھی اس لیے میں اس کے پاس سے اٹھ گیا اور واپس مہمان خانے آ گیا۔ میرا ارادہ پھر بدل گیا تھا۔ یہ سارا دن بھی آرام کرتے گزرا تھا اور دوپہر کا کھانا کھا کر میں ایک بار پھر لمبی تان کر سو گیا تھا۔ جب جاگا تو شام کے سات بج رہے تھے۔ جسم سست اور ذہن جیسے اونگھ میں تھا۔ کسی قدر سرد پانی سے غسل کے بعد میں چاق و چوبند ہوا مگر ایک بار پھر مجھے اپنی کیفیت پر تعجب ہوا تھا۔ میں نے نارمل حالات میں بھی خود کو نیند کا اتنا رسیا اور سست نہیں پایا تھا۔ ذہن کو چوکنا کرنے کے لیے میں نے چائے کی جگہ سیاہ کافی طلب کی اور اس سے میری حالت سچ مچ بہتر ہوئی تھی۔

میں باہر آیا تو موسم سرد ہو رہا تھا اور لان میں لائٹس روشن تھیں۔ محل میں جدید ترین لائٹس تھیں جن کے گرد لوہے کے تاروں کی باریک جالی تھی اور اندر خاص روشنی والے بلب روشن تھے۔ اڑنے والے کیڑے مکوڑے اس روشنی پر کھنچے آتے تھے اور لوہے کی باریک جالی سے ٹکرا کر کرنٹ سے مر جاتے تھے۔ جب وہ ٹکراتے تو ہلکی سی چرچراہٹ کی آواز آتی اور جلتے لیمپ کی روشنی ذرا مدھم ہو جاتی تھی۔ کھلی جگہ پر ایسے کیڑوں کی کوئی کمی نہیں تھی اس لیے کسی نہ کسی طرف سے چرچرانے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ باہر کے ملکوں میں دق کرنے والے کیڑوں اور خاص طور سے مچھروں سے نجات کے لیے اس قسم کے لیمپ عام ہیں مگر ہمارے ہاں اب تک باہر کی لائٹس میں ان کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے۔ حالانکہ یہ مچھروں اور ان سے پیدا ہونے والی بیماریوں سے سدباب کا ایک آسان اور ماحول دوست طریقہ ہے۔ جب کہ اسپرے اور سلگنے والے تمام مچھر مار ماحول کو آلودہ کرتے ہیں اور جو لوگ ان کے قریب ہوتے ہیں ان کی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔

چہل قدمی کرکے میں واپس آیا تو ڈنر کا وقت ہو گیا تھا اور خادم نے اس بار بھی اکیلے ڈنر کی نوید سنائی۔ مگر بیگ مجھے بتا چکا تھا کہ محل میں موجود افراد میرے بارے میں بے خبر تھے۔ ڈنر کے بعد میں نے کافی کی بجائے چائے کا انتخاب کیا اور اس کے کچھ دیر بعد مجھے پھر جمائیاں آنے لگیں۔ میں فکرمند ہوا تھا مگر زیادہ نہیں ہو سکا کیونکہ آنکھیں بند ہوئیں اور میں سو گیا۔ اس بار میری آنکھ کھلی تو میں کچھ دیر بے حس اور سن کر دینے والی کیفیت میں رہا تھا۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی جیسے سلب ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ میرے سوچنے کی صلاحیت بحال ہوئی تو میں نے آس پاس دیکھا۔ میں اسی کمرے میں تھا۔ گھڑی میں صبح کے دس بج رہے تھے۔ لیکن نہیں یہ صبح کے نہیں رات کے دس بجے تھے۔ کیونکہ کھڑکی کے باہر اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ کیا میں چوبیس

گھنٹے سوتا رہا تھا؟ میرے ساتھ آخر ہو کیا رہا تھا؟

میں نے اٹھ کر انٹرکام اٹھایا تو اس سے ٹون نہیں آرہی تھی۔ وہ مر چکا تھا پھر میں نے دروازہ کھولنا چاہا تو انکشاف ہوا کہ دروازہ بھی باہر سے بند تھا اور میں اسے اندر سے نہیں کھول سکتا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا اور چلّا کر آواز دی۔ مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ دروازے سے مایوس ہو کر میں کھڑکی کی طرف آیا مگر اس سے باہر جانا بھی ممکن نہیں تھا کیونکہ شیشوں کے باہر مضبوط فولادی گرل تھی۔ اٹیچ باتھ تھا اور اس سے بھی باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کل سے میرے اندر جو ایک وسوسہ سا ڈیرے ڈال رہا تھا وہ اچانک پوری طرح حقیقت بن کر سامنے آگیا تھا۔ بیگ کا رویہ اور پھر ہر کھانے کے بعد نیند آنا اور میرا خوب سونا۔ یہ سب نارمل نہیں تھا۔ اگرچہ ایسا بھی نہیں تھا کہ مجھے شبہ ہوتا کہ کھانے میں کچھ شامل کر کے دیا گیا ہے۔ یہ سب بہت ہوشیاری اور پلاننگ سے کیا گیا تھا۔ یہاں موبائل میں سگنل نہیں تھے اور مجھے لینڈ لائن استعمال کرنے نہیں دی گئی۔ حالات بتا رہے تھے کہ بیگ نے اس بارے میں جھوٹ بولا تھا۔ مگر کیوں کہا گیا تھا میں سمجھنے سے بالکل قاصر تھا۔ یہ تو دشمنی والا رویہ تھا اور میں اس جگہ رہنے والوں سے گمان میں بھی دشمنی کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے دوبارہ دروازہ بجانے کی کوشش نہیں کی۔ میرا پستول جو میں بیڈ کے ساتھ سائیڈ دراز میں رکھ کر لیٹا تھا وہ غائب تھا۔ بلکہ نہیں اس کمرے میں اب کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے میں ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتا۔ حد یہ کہ پھل کاٹنے والی چھری جو کل تک پھل والی ٹوکری کے ساتھ رکھی تھی اب وہ بھی غائب تھی۔ خود کو پُرسکون کرنے کے لیے میں نے سرد پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ دانت صاف کیے اور دوسری ضروریات سے فارغ ہوا۔ رفتہ رفتہ میرا دماغ سکون میں آنے لگا۔ میں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ میں یہاں قید ہوں اور کیوں قید ہوں؟ جلد یا بدیر اس کی وجہ سامنے آجائے گی۔ میرے جذباتی ہو کر شور شرابا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور نہ ہی میں ٹارزن یا ہرکولیس ہوں جو دروازہ توڑ کر یہاں سے نکل سکوں۔ اول تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں دروازہ توڑنے کے بعد بھی یہاں سے نکل سکوں۔ محل کی سیکیورٹی کا مجھے اچھی طرح علم تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ میں چوبیس گھنٹے سے زیادہ سوتا رہا اور لازمی بات ہے کہ اس دوران میں بے ہوشی کا دورانیہ کسی طریقے سے بڑھایا گیا ہوگا کیونکہ نارمل حالت میں انسان کسی بھی دوا سے آٹھ گھنٹے سے زیادہ بے ہوش نہیں رہ سکتا اس دوران میں جسم دوا کا توڑ کر ہی لیتا ہے۔ اس لیے دوبارہ دوا دینا لازمی ہوگی۔ میں نے اپنا ہاتھوں کا جائزہ لیا مگر کوئی نشان نہیں تھا شاید مجھے گیس انجکشن سے دوا دی گئی تھی۔ یہ انجکشن کی جدید ترین قسم ہے اس میں سوئی نہیں ہوتی ہے بلکہ سرنج کا منہ سکے کی طرح چپٹا اور گول ہوتا ہے اسے جلد پر رکھ کر بٹن دبانے سے انجکشن کے پیچھے موجود نائٹروجن گیس زبردست پریشر ڈالتی ہے اور اس پریشر سے دوا مساموں سے گزر کر براہ راست جسم اور خون میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس کا کوئی نشان نہیں پڑتا اور نس تلاش کرنے کی زحمت بھی نہیں کرنا پڑتی ہے صرف وہ خاص انجکشن جو نس میں ہی دیئے جاتے ہیں وہ اس طریقے سے نہیں دیئے جا سکتے۔ نیند کی دوا کا انجکشن مسلز میں بھی دیا جا سکتا ہے جہاں سے یہ بتدریج خون میں شامل ہو جاتا ہے۔

دروازہ کھلا تو میں چونکا۔ سامنے سر سے پاؤں تک خاص لباس میں چھپے دو افراد کھڑے تھے اور انہوں نے ہاتھوں میں ٹیزر گن تھام رکھی تھی۔ یہ مغرب میں خاص پولیس اور ایجنسیوں کے افراد استعمال کرتے ہیں جب کسی مجرم کو زندہ پکڑنا ہو۔ وہ دونوں اپنے انداز سے بہت تربیت یافتہ لگ رہے تھے اور بیگ ان کے پیچھے تھا۔ میں کھڑا ہوا تو وہ دونوں چوکنا ہو گئے اور ان کی گنوں کا رخ میرے سینے کی طرف ہو گیا۔ میں نے بیگ کی طرف دیکھا۔ ”کیا میں اس رویے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔“

”مجبوری۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”شہباز صاحب مجھے افسوس ہے مگر بعض حالات کی وجہ سے آپ سے ایسا رویہ اختیار کرنا پڑا۔“

”حالات سے کیا مراد ہے، کیا آپ کا مرشد یا ڈیوڈ شا سے کوئی سمجھوتا ہو گیا ہے؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”میں نے کہا ناں کہ مجبوری ہے اور آپ کو یہاں سے جانا ہوگا۔“

”میں خود یہاں سے جا رہا تھا تب مجھے کیوں روکا گیا؟“

”اس کی بھی وجہ ہے جو فی الحال بتائی نہیں جا سکتی مگر اب محل کے آدمی آپ کو اس علاقے سے باہر تک چھوڑ کر آئیں گے۔“

”شاید آپ یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ اب میں دوبارہ یہاں کا رخ نہ کروں؟“ میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔

''میں ایسی کوئی بات نہیں کہہ رہا۔'' بیگ نے کہا اوران دونوں کو اشارہ کرتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ ٹیزر گنوں والے آگے آئے اور ایک نے ہتھکڑی نکالی۔

''سر یہ پہن لیں۔''

میں نے دونوں ہاتھ آگے کیے اور جیسے ہی اس نے ان میں ہتھکڑی ڈالنا چاہی میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کھینچے اور اسے گھماتے ہوئے گردن سے جکڑ لیا۔ اسی لمحے دوسرے نے فائر کیا اور تار آکر جکڑے آدمی کے سینے سے چپکا۔ اسی لمحے میں نے اسے چھوڑ دیا اس لیے مجھے معمولی سا جھٹکا لگا مگر وہ کرنٹ کا شکار ہو گیا اور نیچے گر کر لرزنے لگا۔ دوسرے نے بدحواس ہو کر جلدی سے پستول سے تار نکالا اور مجھ پر پھر فائر کرنے جا رہا تھا کہ میں نے تپائی اس پر کھینچ ماری۔ دوسرا فائر کہیں اور گیا۔ عام ٹیزر گن ایک ہی فائر کر سکتی ہے یا اسے جسم سے لگا کر بٹن دبانا پڑتا ہے مگر یہ رائفل قسم کی ٹیزر گن تھی جو کئی فائر کر سکتی تھی۔ تیسرے فائر سے پہلے میں نے بیٹھتے ہوئے لات گھمائی اور وہ دھڑام سے نیچے گرا۔ اس حالت میں بھی اس نے گن نہیں چھوڑی اور پھر فائر کرنے کی کوشش کی تھی کہ میں نے اگلی لات رائفل پر ماری اور وہ اس کے ہاتھ سے نکل کر دیوار سے ٹکرائی۔

میں نے پہلے شکار کی رائفل اٹھائی اور اس کا رخ دوسرے کی طرف کیا تھا کہ کوئی چیز میرے سینے سے آکر لگی اور مجھے شدید قسم کا جھٹکا لگا تھا۔ میں نیچے گر کر بالکل اپنے شکار کے انداز میں لرزنے لگا۔ یہ کام بیگ نے کیا تھا اس کے پاس بھی گن تھی۔ جب میں اس کے گرگوں سے نمٹنے میں مصروف تھا تو اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ کام کیا جو ان دونوں سے نہیں ہو سکا تھا۔ شدید برقی صدمے نے میرے اعصاب شل کر دیے تھے۔ دوسرے نے اٹھ کر جلدی سے میرے دونوں ہاتھ ہتھکڑیوں میں جکڑے۔ مزید گارڈز آ گئے تھے اور مجھے دونوں طرف سے پکڑ کر اٹھایا گیا اور چلاتے ہوئے لے جا کر کسی گاڑی کے عقبی حصے میں بٹھا دیا۔ اس وقت میں روبوٹ بنا ہوا تھا اور میری لگام دوسروں کے ہاتھ میں تھی۔ مجھ میں مزاحمت کی سکت نہیں تھی۔ پھر گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور روانہ ہو گئی۔ رات کا وقت تھا اور سناٹے میں، میں نے ایک دوسری گاڑی کے انجن کی آواز بھی سنی۔ یہ میری جیپ تھی۔ وہ بھی ساتھ جا رہی تھی۔

چند منٹ بعد برقی صدمے کے آثار کم ہونے لگے اور رفتہ رفتہ میں سنبھل گیا مگر میں ظاہر یہی کر رہا تھا کہ ابھی تک شاک کی کیفیت میں ہوں۔ ایک گھنٹے بعد گاڑی رکی اور مجھے اس سے اتارا گیا تھا۔ حالات نے پلٹا کھایا تھا اس بار وہ لوگ مخالف کے روپ میں سامنے آئے تھے جنہیں میں نے ہمیشہ دوست اور مشفق پایا تھا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بحال تھی اور کچھ زیادہ ہی کام کر رہی تھی۔ اس لیے اس سفر کے دوران میں ایک ممکنہ مفروضے پر پہنچ گیا تھا کہ شاید راجا عمر دراز کی ضد نے بیگ اور خاندان کے باقی افراد کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیں اور راجا عمر دراز کو مجبور کرنے کے ساتھ انہوں نے یہ کام بھی کیا میرے ساتھ دشمنوں والا سلوک کر کے وہ راستہ ہی بند کر دیا جس سے گزر کر راجا اپنی خواہش پوری کر سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں نہ نو من تیل ہوگا اور نہ رادھا ناچے گی۔ مجھے جیپ میں بٹھا کر میری ہتھکڑیاں کھول دی گئی تھیں۔ میرا پستول، رائفل اور دوسری چیزیں جیپ میں پہلے ہی پہنچا دی گئی تھیں۔ مجھے جیپ میں بٹھا کر وہاں پہنچانے والے نے معذرت کی۔

''معاف کرنا صاحب ہم حکم کے ملازم ہیں کوئی گستاخی ہوئی ہو تو معاف کر دینا۔''

میں نے جواب نہیں دیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ حکم کا غلام تھا۔ اس کی ڈور بیگ اور راجا عمر دراز کے ہاتھ میں تھی۔ مجھے لانے والے تین افراد تھے اور انہوں نے مجھے راجا عمر دراز کے علاقے سے تقریباً باہر نکال دیا تھا۔ یہاں سے مجھے خود آگے جانا تھا۔ جیپ میں ڈیزل فل تھا اور میں آرام سے واپس اسلام آباد پہنچ سکتا تھا۔ وہ واپس اپنی گاڑی میں بیٹھے اور گھوم کر واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ عقب میں میرے بیگ کے ساتھ کھانے پینے کا ایک بنڈل اور اس کے ساتھ ایک لفافہ بھی تھا۔ میں نے اندر کی لائٹ آن کر کے لفافہ کھولا۔ اس میں ایک چھوٹا سا رقعہ تھا۔

''شہباز صاحب، اس سلوک کے لیے معذرت کا لفظ یقیناً چھوٹا ہے لیکن میں نے بتایا کہ میری مجبوری ہے اور میں زندگی میں کبھی اتنا مجبور نہیں ہوا۔ شاید وقت حقیقت آپ کے سامنے لے آئے۔ مخلص، بیگ۔''

میں نے رقعہ مٹھی میں جکڑ لیا اور پھر جیپ سے کھانے پینے والا بنڈل نکال کر باہر سڑک پر رکھ دیا۔ میں اسے کھائی میں اچھال دینا چاہتا تھا مگر میرے دل میں رزق کا احترام ہے اس لیے میں چاہنے کے باوجود ایسا نہ کر سکا۔ میں نے یہاں رکھ دیا تھا کہ کسی غریب کا بھلا ہو جائے گا مگر میرے

لیے اب راجا ئمر دراز کا کھانا پینا ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے جیپ آگے بڑھانے سے پہلے موبائل نکال کر چیک کرنا چاہا تو پتا چلا موبائل جیب میں نہیں ہے۔ میں نے اسے شاید سائیڈ دراز پر رکھ دیا تھا اور اسے اٹھایا نہیں تھا۔ ان لوگوں کو بھی خیال نہیں رہا جب کہ میری ہر چیز واپس رکھ دی تھی۔ حد یہ کہ اسلحہ بھی تھا۔ صرف موبائل رہ گیا تھا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھائی۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ مگر طویل نیند کے بعد اب مجھے آرام کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی البتہ بھوک لگ رہی تھی کیونکہ چوبیس گھنٹے سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد جیپ ایک جھرنے کے پاس سے گزری تو میں نے پانی پیا۔ مگر صرف پیاس بجھانے کی حد تک۔

میں نے سوچا اور اس سڑک سے نہ گزرنے کا فیصلہ کیا جس پر وہ پولیس اسٹیشن تھا جہاں میں رات گزار چکا تھا اور عین ممکن تھا کہ وادی میں لاشیں ملنے کے بعد میری تلاش پھر سے شروع ہو چکی ہو۔ اس لیے اس علاقے سے دور رہنا ہی مناسب تھا۔ مگر سیدھی اور صاف سڑک یہی تھی اس کے علاوہ باقی سڑکیں بہت خراب اور بس گزارے لائق تھیں۔ بعض مقامات پر تو سڑک ہی غائب ہوتی تھی اور کچے راستے پر سفر کرنا پڑتا تھا۔ میں نے متبادل سڑک پر مڑنے کے بعد خراب حصہ آتے ہی پڑاؤ ڈال دیا کیونکہ اب سفر کرنا بہت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے جیپ محفوظ جگہ روک کر بیگ سے جیکٹ نکال کر پہن لی۔ سردی کا یہی علاج تھا اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ پھر سیٹ جہاں تک ہو سکی پیچھے کی اور نیم دراز ہو کر آرام کرنے لگا۔ نیند نہیں آرہی تھی مگر اونگھ آنے لگی۔

اچانک مجھے لگا کہ کوئی عورت ہنسی ہو۔ میں چونک کر بیدار ہوا۔ مگر اب ہنسی رک گئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ آواز سچ مچ آئی تھی یا پھر میرا واہمہ تھا۔ بعض اوقات ان ویرانوں میں ہوائیں ایسی چلتی ہیں کہ ان پر ایسی ہی انسانی آوازوں کا گماں ہوتا ہے۔ مگر چند لمحے بعد ہنسی کی آواز پھر آئی اور یہ بالکل واضح تھی۔ کوئی عورت بڑے دل سے ہنس رہی تھی۔ اس کی ہنسی میں خوشی اور جذبات کی کیفیت بالکل نمایاں تھی۔ میں چوکنا ہو گیا اور پستول نکالتے ہوئے آس پاس کا جائزہ لیا مگر ہلکی چاندنی میں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس ہنسی نے ایک پرانی یاد تازہ کر دی جب میں حویلی سے فرار ہو رہا تھا اور راستے میں نہر کے ساتھ گزر رہا تھا تب ایسی ہی ہنسی نے مجھ پر خوف طاری کر دیا تھا۔ ذہن میں چڑیلوں کے قصے تازہ ہو گئے تھے مگر قصہ مختصر یہ نکلا کہ کوئی جوڑا گھر والوں سے چھپ کر نہر کے ساتھ جھاڑیوں میں منہ کالا کر رہا تھا۔ کیا اس بار بھی وہی چکر تھا۔

میں آہستہ سے نیچے اتر آیا۔ آواز ڈھلان کی طرف سے آئی تھی مگر یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا پہاڑوں میں آواز اس طرح گونجتی ہے کہ سمت کا تعین ذرا دشوار ہو جاتا ہے میں ایک درخت تک آیا اور اس سے ٹک کر آواز کے پھر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر اس بار آواز نہیں آئی بلکہ وہ خود آئی اور اس طرح آئی کہ میں دم بہ خود رہ گیا۔ وہ سامنے سڑک سے نمودار ہوئی اور ہلکی چاندنی میں اس کا چاندنی جیسا بدن یوں دمک رہا تھا کہ وہ مجسم چاندنی کی بنی ہوئی لگ رہی تھی۔ یہ تشبیہ یوں دینا پڑی کہ اس کے بدن ایک سفید باریک کپڑے کا ایسا لباس تھا جس کے آر پار آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ اس لباس میں اس کا ایک ایک انگ یوں نمایاں تھا کہ دیکھنے کے لیے ذرا بھی زحمت کرنا نہیں پڑ رہی تھی۔ اس کے سنہری بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ عجیب سے انداز میں چلتی ہوئی جیپ کی طرف آرہی تھی اس کی چال کو بیک وقت رقص اور کیٹ واک سمجھا جا سکتا تھا۔ وہ چلتی ہوئی جیپ تک آئی اور اس کے بونٹ پر سر جھکاتے ہوئے پھر اسی انداز میں ہنسی۔ تب مجھے لگا وہ نشے میں تھی۔ پھر اس نے سر تھما کر بہت دعوت انگیز انداز میں میری طرف دیکھا اور بوجھل لہجے میں بولی۔

''ادھر کیا کرتا ہے میرے پاس آ...... نا۔''

کوئی زاہد خشک بھی اس کی اس آفر کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ میں تو ویسے سے کوئی دعویٰ ہی نہیں کر سکتا۔ اب تک میں اگر اس قسم کی ترغیبات سے بچتا آیا تھا تو یہ صرف اللہ کا کرم اور توفیق تھی کہ اس نے مجھے گناہ سے محفوظ رکھا۔ سچی بات ہے اس کی بات اور لہجے پر میرا جسم سنسنا گیا تھا اور رگوں میں خون کی روانی تیز ہو گئی تھی۔ صرف جسم ہی نہیں اس کا چہرہ بھی حسین ترین تھا۔ اوپر سے اس کی ادائیں اور آوازیں۔ لیکن میں جن حالات سے گزر رہا تھا اس وقت میں اپنے سائے پر بھی بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ میں پستول آگے رکھ کر اس کی طرف بڑھا۔ اس نے پستول کی طرف ایک لمحے کو نہیں دیکھا تھا، براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ میں نے پاس جا کر دھیمی آواز میں پوچھا۔

''کون ہو تم؟''

''تجھے کیا نظر آتی ہوں؟'' اس نے اٹھلا کر پوچھا تو اس کے گداز بدن میں لہریں سی پیدا ہوئی تھیں۔ میں نے بہ مشکل نظر کو بھٹکنے سے روکا اور پستول اس کی گردن سے لگا کر دبایا تو اس نے گردن اوپر کر لی۔ یہ ایک اور مصیبت تھی۔ وہ

ان عورتوں میں سے تھی جن کی ہر حرکت دوسروں کے لیے مصیبت بن جاتی ہے۔ مجھے ایک بار پھر نظروں کو روکنا پڑا تھا اور میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''فضول باتیں مت کر، تو اس حلیے میں اور اس وقت یہاں کیا کر رہی ہے۔''

''تو بتا کیا کر سکتی ہوں؟'' اس نے ایک بار پھر خود کو نمایاں کیا تھا۔

''تیرے ساتھ اور کون ہے؟''

''بس میں ہوں۔'' اس نے پھر ایک ادا سے کہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس قسم کی عورت کا اکیلے وجود کم سے کم اس علاقے میں ممکن نہیں تھا۔ ہمارے، ہاں کوئی عورت چاہے وہ کتنی ہی آزاد خیال کیوں نہ ہو۔ اس حلیے میں باہر نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتی ہے۔ شہلا رضوی سچ مچ بہت آزاد خیال تھی اور اس کا لباس واہیاتی حدوں کو چھوتا تھا مگر باہر نکلتے ہوئے وہ بھی خود کو ڈھک لیتی تھی۔ یہ عورت یہاں اکیلی نہیں تھی بلکہ کسی دوسرے کی موجودگی بھی لازمی تھی۔ یہ کسی چکر میں تھی۔ میں سوچ میں تھا اور ساتھ ہی چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک میں نے اسے خاصی زور کا تھپڑ مارا اور وہ الٹ کر سڑک پر جا گری تھی۔ اسی لمحے چاروں طرف سے آہٹیں سنائی دیں اور چند سیکنڈ سے بھی پہلے مجھے تین عدد حلیے سے خطرناک نظر آنے والے مسلح افراد نے گھیر لیا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں خودکار رائفلیں تھیں۔ ایک گھنی داڑھی والے نے گرج کر کہا۔

''تیری جرأت کیسے ہوئی اسے ہاتھ لگانے کی؟''

''کیوں کیا یہ تمہاری بیوی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ وہ میرے سامنے تھا اور باقی دو دائیں بائیں سے آئے تھے۔ عورت کو یقیناً چکر آ گیا تھا۔ وہ سنبھل کر اٹھ رہی تھی اور پھر اس نے داڑھی والے سے کہا۔

''شیر خان اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے اس کے ہاتھ توڑ دے۔'' عورت کہتے ہوئے میرے اور شیر خان کے درمیان میں آئی تھی اور میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر شیر خان پر گولی چلا دی۔ گولی عورت کے پاس سے گزر کر اس کے بازو پر لگی تھی۔ فائر کے ساتھ ہی میں جھکا اور گھوم کر جیپ کے پیچھے آ گیا۔ مجھے ڈھلان کی طرف سے آنے والے سے خطرہ تھا میں اس کی زد میں تھا مگر اس نے کسی قدر تاخیر سے فائر کیا اور گولی جیپ پر آ کر لگی تھی۔ آڑ میں آتے ہی میں نے جوابی فائر کیا تو وہ عجلت میں بھاگ کر ڈھلان سے اتر گیا۔ وہ اتنی تیزی سے گیا تھا کہ مجھے لگا وہ نیچے ہی لڑھک گیا ہوگا۔ اوپر کی طرف سے آنے والا جیپ کے دوسری طرف تھا اور وہ میری طرف بے سود فائر کر رہا تھا کیونکہ میں مکمل طور پر آڑ میں تھا۔ شیر خان اور عورت بھی بھاگ رہے تھے۔ اس وقت عورت رقص نما چال بھول گئی تھی اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا چاہتی تھی مگر اس کا میکسی نما لباس رکاوٹ بن رہا تھا۔ اس نے بلا تکلف اسے کھینچ کر رانوں تک کیا اور تیز دوڑنے لگی۔ میں نے ڈرانے کے لیے ان کی طرف دو فائر اور کیے اور پھر پیچھے کی طرف سے جیپ میں گھسا۔ سر نیچے رکھتے ہوئے میں نے چابی لگا کر انجن اسٹارٹ کیا۔ ڈیزل انجن کی وجہ سے انجن جلدی اسٹارٹ نہیں ہوا۔ یہ گرم ہونے پر ہی اسٹارٹ ہوتا۔ میں نے چابی دبا کر رکھی اور بالآخر انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ میں نے پیچھے کا گیئر لگایا اور جیپ پیچھے لے جانے لگا۔ سامنے سے برسٹ آیا اور کچھ گولیاں بونٹ سے پھسل کر گزر گئیں۔ ونڈ اسکرین بچ گئی تھی مگر دوسرے برسٹ نے اگلے دونوں وہیل برسٹ کر دیے اور جیپ آگے کی طرف بیٹھ گئی۔ میرے منہ سے ناگفتنی نکل گئی تھی۔

ایک تو میری قسمت ایسی تھی کہ جب پرانے دشمن ذرا سانس لینے کا موقع دیتے تو کوئی نہ کوئی نیا دشمن آ جاتا جو بلا وجہ گلے پڑ جاتا۔ یہ لوگ بھی کچھ ایسے ہی لگ رہے تھے۔ عورت کے انداز سے لگ رہا تھا کہ یہ لٹیروں کا کوئی گروہ تھا۔ عورت اپنے حسن کا جادو چلا کر مسافروں کو روک لیتی ہو گی اور پھر یہ لوگ آ کر اسے اس کی حسن پرستی کی سزا دیتے ہوں گے۔ بہت سے شریف مار کھا جاتے ہوں گے۔ میں تو پہلے ہی رکا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں یہ مجھے غیر ملکی لگے تھے۔ خاص طور سے عورت کے نقوش اور بالوں کا رنگ ہمارے ہاں نظر نہیں آتا ہے وہ شاید یورپ یا روس سے تعلق رکھتی تھی۔ جیپ بیکار ہو گئی تھی۔ میں نے اپنا بیگ لیا۔ اس میں سے کلاشنکوف نکالی اور پیچھے سے نیچے اترا اور اوپری ڈھلان پر چڑھ گیا۔ اسی جگہ میں ان لوگوں سے محفوظ رہ سکتا تھا جو خود کار ہتھیاروں سے مسلح تھے۔

جیپ ناکارہ کرنے کے بعد ان لوگوں کی طرف سے فائرنگ رک گئی تھی۔ مگر وہ بھاگے نہیں تھے بلکہ یہیں کہیں موجود تھے۔ چاند مغربی افق کی طرف جھک رہا تھا اور گزشتہ تین دن میں مزید چھوٹا ہو گیا تھا اس کی روشنی بس تاروں سے کچھ ہی بہتر تھی۔ اس لیے ڈھلان پر تو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا البتہ سڑک نمایاں تھی۔ میں دبے قدموں اس طرف بڑھنے لگا جہاں ان کی موجودگی کا امکان تھا۔ اگرچہ یہ آنچل

مجھے مار کہنے والی بات تھی مجھے مخالف سمت کا رخ کرنا چاہیے تھا۔ مگر میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ لوگ موجود تھے اور میرے خلاف مزید کیا ارادہ رکھتے تھے؟ میں دبے قدموں چل رہا تھا اور تقریباً پچاس گز کے بعد مجھے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ وہ شیر خان ہی ہوسکتا تھا جس کے بازو میں گولی لگی تھی۔ پھر میں نے عورت کی آواز سنی۔ ''مجھے پٹی باندھنے دو خون بہہ رہا ہے۔''

''چھوڑو۔'' شیر خان غرایا۔ ''میں اس کو چھوڑوں گا نہیں۔''

''مجھے یہ شخص خطرناک لگ رہا ہے۔'' عورت کی پھر آواز آئی۔ ''یہ نہ تو مجھ سے متاثر ہوا اور نہ ہی تم لوگوں سے ڈرا۔''

''چپ کر۔'' شیر خان نے اسے پھٹکارا۔ اب میں نے عورت کی آواز سنی تو مجھے لگا کہ وہ سچ مچ غیر ملکی ہے۔ ''اسے پکڑنا ہے ورنہ پارٹی کو کیا جواب دے گا؟''

میں چونکا تھا۔ یہاں کوئی پارٹی نکل آئی تھی۔ میرا اندازہ غلط تھا۔ وہ لٹیرے نہیں تھے بلکہ کسی کے لیے انہوں نے مجھے روکا تھا۔ البتہ طریقہ نہایت احمقانہ تھا۔ شاید میری فرمائش کرنے والوں نے انہیں میرے بارے میں بریف نہیں کیا تھا ورنہ شاید وہ اس عورت کو یوں استعمال نہ کرتے۔ اس کی بجائے وہ مجھے سوتے میں خاموشی سے ہینڈز اپ کرا لیتے تو میں ان کے قابو میں آجاتا۔ مجھے پہلے بیگ کا خیال آیا مگر اسے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے عملاً بہت بے آبرو کرکے راجا کے کوچہ محل سے رخصت کیا تھا۔ یہ کوئی اور پارٹی تھی۔ فتح خان کے آدمی خود ان سے کم نہیں تھے یعنی انہیں کسی کو ہائر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر کون رہ جاتا تھا۔ مرشد سے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی تیزی سے حرکت میں آئے گا۔ مگر کیا کہا جا سکتا تھا ہوسکتا ہے کہ مرشد نے سچ مچ اس ٹولے کو ہائر کرلیا ہو کیونکہ اس کے اپنے بدمعاش دنیا سے جا چکے تھے اور اسے افراد کی کمی کا سامنا تھا۔

میری نظر تاریکی سے مانوس ہوئی تو میں نے شیر خان اور عورت کو دیکھا۔ وہ اس کے بازو کی مرہم پٹی کر رہی تھی اور اس کے لیے اس نے اپنے لباس سے ایک پٹی الگ کرلی تھی۔ فی الحال اس کے اوپری جسم پر ایک ہلکی جیکٹ نظر آرہی تھی۔ ستر پوشی سے زیادہ سردی سے بچاؤ کے لیے جیکٹ پہنی تھی۔ ورنہ نچلا حصہ بدستور عریاں تھا۔ ان کے دونوں ساتھی غائب تھے اور وہ غالباً سڑک پر میرے لیے گھات لگائے بیٹھے تھے۔ جب میں نے شیر خان پر فائر کیا اور بھاگا تو ڈھلان سے آنے والے نے مجھ پر جو فائر کیا وہ خاصی دور سے گزر گیا تھا۔ اس وقت میں سمجھا کہ نشانہ خطا گیا ہے مگر اب سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ مجھے مارنے یا لوٹنے نہیں بلکہ پکڑنے آئے تھے اور اسی لیے بچا کر صرف ڈرانے کے لیے فائر کیا تھا۔ بازو پر پٹی بندھوا کر شیر خان کھڑا ہوگیا اس نے عورت سے کہا۔ ''زینی تو یہیں رک، ہم اسے گھیرتے ہیں۔''

زینی وہیں رک گئی اور شیر خان ڈھلان سے اتر گیا۔ زینی ایک درخت سے ٹیک لگا کر سمٹ کر بیٹھ گئی تھی اسے یقیناً سردی لگ رہی تھی۔ یہ جگہ بلند تھی یا پھر گزشتہ روز ہونے والی بارش کا اثر تھا سردی اچھی خاصی ہوگئی تھی۔ شیر خان کے جانے کے بعد میں دبے قدموں زینی کی طرف بڑھا اور عقب سے آتے ہوئے میں نے اوپر سے اس کے سر پر کلاشنکوف کی نال لگائی اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ''آواز نہ نکلے۔''

وہ ساکت ہوگئی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تم بیکار کوشش کررہے ہو ہم صرف چار نہیں ہیں اور بھی آدمی ہیں۔''

''تب تم لوگوں سے زیادہ احمق کوئی نہیں ہے۔ مجھے آرام سے گھیر کر پکڑ لیتے تمہیں کیٹ واک کرانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''پتا نہیں یہ شیر خان کا پلان تھا؟'' وہ بولی ہم سرگوشی میں بات کررہے تھے اور اس نے آواز بلند کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس بار میں نے اس کا لہجہ سمجھ لیا اور پوچھا۔

''تم رشین ہو؟''

''جارجین۔'' اس نے جواب دیا۔

''او کے شیر خان اور اس کے ساتھی کس کے لیے کام کررہے ہیں۔''

''ہم اپنے لیے کام کرتے ہیں۔''

''میرا مطلب ہے کہ میرے لیے کس نے تمہیں ہائر کیا ہے؟''

''یہ بات شیر خان جانتا ہے۔''

''تم لوگ مجرم ہو؟''

''تم جو چاہے سمجھو۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ ویسے وہ خوفزدہ نہیں تھی۔ اچانک میرے سر سے کوئی چیز آکر لگی اور پھر شیر خان کی آواز آئی۔

''باقی میں بتاؤں گا۔''

جاری ہے

(نامعہ تحریم کراچی کا جواب)

زویا........ کراچی
اشکوں کی ضمانت بھی جہاں کام نہ آئے
اس بزم میں باتوں کا یقین کون کرے گا

راجا ابریز خان........ ملتان
اٹھ کر تو آگئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

نزہت احمد........ گجرات
اب تو ہی بتا کیسے میں دیکھوں تری جانب
اس بزم کا ہر شخص مجھے دیکھ رہا ہے

عزیز ملک........ حاصل پور
اک شب کو جگمگائے ہماری بھی جھونپڑی
مانگیں گے ہم بھی چاندنی اس ماہتاب سے

نگہت جبیں........ ساہیوال
اچھی گزر رہی ہے دلِ خود کفیل سے
لنگر سے روٹی لیتے ہیں پانی سبیل سے

(عدنان حسین خان کراچی کا جواب)

اسحاق بٹ........ میرپور آزاد کشمیر
وصل کی چھاؤں ہو یا ہجر کی دھوپ
ہر تغیر کا ہے رستا مجھ میں

کاوش علی........ نگر گلگت
وہ منت خاک ہوا نے جسے بکھیر دیا
سمیٹنے گی تگ و دو ہے آدمی کیا ہے

نوشین اختر........ لاہور
وہ اتفاق سے بھی دوبارہ نہ مل سکے
رستہ کسی نے روک دیا ممکنات کا

واصف علی........ جھنگ
وہ زلفیں جیسے لہراتی ہوئی راتیں
وہ گیسو جیسے بدلی گھر کے آئے

رضوان حمزہ........ لاہور
وہ رہا حسنہ رگِ جاں کے قریب
جس کو اپنے سے جدا سمجھے تھے ہم

محمد ندیم اختر........ گلگت
فتنہ و شر ہیں اسی دامن میں زیرِ تربیت
جس کو اب تک سایۂ امن و اماں سمجھا ہے تو

(راجا ابریز خان ملتان کا جواب)

طالب حسین طلحہ........ ملتان
رضا کا خاتمہ بالخیر ہو جانا مبارک ہو
چراغاں آپ کے گھر میں رہے گا مہرباں کب تک

نیاز حسین........ سرائے سدھو
روئے تو اپنی یاد کی کھیتی ہری ہوئی
بارش ہوئی تو نخلِ تمنا نکھر گئے

ایس مصطفیٰ........ پشاور
روح بھی ذات کی اسیر دل بھی اسیر ذات کا
اپنی ہی قید میں ہوں میں صدیوں سے اس سزا کے ساتھ

(رضوان حمزہ لاہور کا جواب)

فہیم انصاری........ کراچی
گدگداتی ہے کبھی جو اس کے دامن کی ہوا
سبز جنگل کی طرح شاہد لہک جاتے ہیں خواب

(ماہ رخ لطیف آباد کا جواب)

منظر علی خان........ لاہور
اب اس میں رہنا مرے لیے محال مرشد
مجھے بدن کے کنویں سے باہر نکال مرشد

سعید احمد چاند........ کراچی
بدن میں پڑ گیا اب نظام میکدہ ساقی
ہزاروں رند ہیں دو ایک پیمانے سے کیا ہوگا

(فہیم انصاری کراچی کا جواب)

علی رضا........ کورنگی کراچی
میں بھی اس بحر کی موج سرگشتہ ہوں
ہے اسی کی عطا میرا نام و نشاں

امجد اکرام........ بہاولپور
مہمان بن کے ہم بھی کہاں آگئے رضا
ہر میزبان بے سروساماں ہے اور ہم

احمد علی صدیقی........ملتان

مجھ کو بھی ماہر بہ رنگ حافظ رنگیں خیال
آپ رکھنا یاد، گلشتِ مصلّٰی چاہیے

فروغ محسن........ گجرات

مظلوم نہ گھبرائیں کہ برحق ہے قیامت
دنیا ہے یہ انصاف یہاں ہو نہیں سکتا

(عبدالغفور خان ساغری اٹک کا جواب)

ابرار احمد........ کراچی

یوں نہ چلتی ہوا جو نفرت کی
کوئی بھی دربدر نہیں ہوتا

انیس الحق........لاہور

یہ سمجھ لیا کوئی مشکل نہ تھا میرے لیے
درد کی پہچان کا رشتہ ہے کیا میرے لیے

نازش انصاری........ کراچی

یاد محبوب اک عبادت ہے
ذکر بھی بندگی میں شامل ہے

(منشی محمد عزیز مے لندن کا جواب)

محمد عمران جونانی........ کراچی

انجان نگاہوں کی یہ مانوس سی خوشبو
کچھ یاد سا پڑتا ہے کہ پہلے بھی ملے تھے

(شاہد جہانگیر شاہد پشاور کا جواب)

کائنات فاطمہ........لاہور

لوگ آج نئی زندگی کی خواہش میں
نکل رہے ہیں دھواں بن کے کارخانوں سے

ندیم اختر........ حیدر آباد

یہ زنگ جو ہر دانش کو چاٹ جائے گا
مری لغت میں کچھ الفاظ معتبر ہیں ابھی

برجیس احمد........ جہلم

یہ سدا کا اک تعلق یہ ابد ابد کا رشتہ
نہ تو غم نے ہم کو چھوڑا نہ تو ہم نے غم کو چھوڑا

عزیز ملک........ حاصل پور

یوں بلاوجہ دھڑکتا نہیں دل
آپ نے پیار سے دیکھا ہو گا

فیاض حسین........ لاہور

یہ ساری زندگی تو کٹی قید میں مگر
مرنے کے بعد بھی درِ زنداں کھلا نہیں

(کاشف ظہیر مظفر گڑھ کا جواب)

محمد کامل........ سکھر

ناخدا کا کرم نہ ہو جن پر
وہ کناروں پہ ڈوب جاتے ہیں

عرفان مروت........ خان پور

نہ کرنا دولت و حشمت پر ناز جیتے جی
مریں تو جانے کفن بھی کسے کہاں سے ملے

(مرزا ہادی بیگ حیدر آباد کا جواب)

نوازش علی سید........ لاہور

نگہ مہر کے ہوتے ہی وہ وحشت نہ رہی
قابلِ دید مرا حال پریشاں نہ رہا

رام چند ملکانی........ سکرنڈ

نہیں سنتا کسی کی بات ہی جب وہ سلیقے سے
سحر اس سنگ دل سے ہم کو تاب التجا کیا ہو

آفتاب حیدر........ کوٹری

نمود صبح کا پیغام لا رہے ہیں چراغ
اندھیری رات کے دامن پر چھا رہے ہیں چراغ

(قاضی مشرف معروف حمیدی کا جواب)

مہوش سلطان........ سکھر

میری پلکوں پر وہ سو ننھے ستاروں کی قطار
ان کے آنے کی قیامت ہے خوشی آج کی رات

فرخندہ قاضی........ لاہور

مجھ پر بھی کرم ہو جائے ترا اُمید لگا کر آیا ہوں
میں نے یہ سنا ہے در پر ترے تقدیر بنائی جاتی ہے

نگار اکبر........ گجرات

مصلحت کہتی ہے چپ ہو جا نہ اپنا غم سنا
دل بضد رہتا ہے جو کچھ آنکھ سے دیکھا سنا

(نزہت احمد کا جواب)

عمران جونانی........ کراچی

اک بار ہی جینے کی سزا کیوں نہیں دیتے
گر حرف غلط ہوں تو مٹا کیوں نہیں دیتے

آصفہ بتول........ واہ کینٹ

اگر آسکو تو آؤ انہی پتھروں پہ چل کے
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

بیت بازی کا اصول ہے، جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے

کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 26 فروری 2015ء تک علمی آزمائش 111 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم! محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کررہا ہوں اسے شائع اشاعت کرلیں (شعر الگ کاغذ پر ہے)

71

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش۔ 111

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک علمی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 28 فروری 2015ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

ایک مشہور شاعرہ جو اپنے بارے میں لکھتی ہے۔ ''24 نومبر 1956ء میں اس عالم رنگ و بو میں پہلی سانس لی، ابھی گڑیاں کھیلنے، پہل دوج اور کوڑا جمال شاہی کے لطف سے دل بھرا بھی نہ تھا کہ کاغذی زنجیر پیروں میں ڈال دی گئی۔ پہلے اسلامیہ کیمرج اسکول میں تعلیم حاصل کی اور پھر رائزنگ سن اسکول سے اکتساب نور کیا۔ اس کے بعد رضویہ گرلز اسکول کا دامن پکڑا جو میٹرک کے بعد ہی چھوٹا، پھر سرسید کالج نے اپنے دامن میں پناہ دی۔ جامعہ کراچی سے انگریزی میں ایم اے کیا اور بحیثیت لیکچرار سرسید گرلز کالج سے وابستہ رہی، ابتدا میں بینا تخلص رکھا۔''

علمی آزمائش 109 کا جواب

روبندر ناتھ ٹیگور نے کلکتہ کے ایک زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ بچپن سے ہی اسے ڈراما اسٹیج کرنے کا شوق تھا۔ خود ہی لکھتا پھر اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ مل کر گھر ہی کے ایک بڑے دالان میں اسے پیش کرتا، کچھ اور بڑا ہوا تو اسے شاعری کا شوق ہوا۔ اس صنف سخن میں اس نے اتنی مہارت حاصل کی کہ اس کے مجموعہ کلام پر نوبل انعام دیا گیا۔

☆☆☆

انعام یافتگان

1۔ علی ترمذی۔ ملتان **2**۔ زویا حبیب۔ فیصل آباد **3**۔ عباس خاص خیلی۔ حیدرآباد

4۔ نواز بٹ۔ کوئٹہ **5**۔ زاہد علی سید۔ پشاور

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے سنبل جبیں، محمد یامین، اکبر علی رئیسانی، نعمان اشرف، علی زبیر سید، مختار بٹ، رسول بخش پلیجو، زاہد

حیات، کاوش ارشد، علی نظیر، ارباز حسین، نکہت گل، صدف فاطمہ، نیاز احسن ملکانی، ہارون صدیقی، عنبرین احمد، انعام حیات، اکبر حسین، اشرف اللہ خان، کلیم صدیقی، خاقان احمد، نذر حسین، اسرار احمد، عنایت گجر، فرحت عباس نقوی، سبطین سید، غلام حسن، باسط فاروقی، یاسین خان، مولانا بخش بٹ، نبیل اختر، عنایت مسیح، الیاس محمد، طفیل احمد، صباحت مرزا، قیام الدین انصاری، تنویر حسین، محمد احمد، منظر حسن، وردہ بتول، ہارون محمد، انیس احمد، سعید الدین مربت، محمد فتح یاب خان اچکزئی، فہیم بٹ، محمد فیضان، خواجہ خیر محمد، نواز سلیم کھوکھر، فرحین بشیر، مہوش علی خان، فیروز رحمانی، انیسہ خاتون، فرحت فاطمہ، نصیب فاروقی۔ خیر پور سے عباس ماٹھی، عنایت علی ماتلی، احمد علی زیدی، ارشاد حسین، نورین اصغر، نیابت علی زیدی، فاطمہ بخش علی، ناہید ماچھی، نسیم خان، یاور علی مرزا۔ گجرات سے انیس احمد، ذیشان علی سید، فرقان احمد، رفیق بٹ۔ شادی پور سے ارباز کمال۔ خانیوال سے نیاز کھوسو، ارشد علی۔ ڈی آئی خان سے محمد شاد خان، باور حسین، زاہد علی، سلیم کھوکھر۔ ڈی جی خان سے ایاز سومرو، محمد شادا خان، یونس احمد، ظاہر خان۔ جھنگ سے عطاء المصطفیٰ، نورین ملک، التماس عباس۔ تلہ گنگ سے فصیح الدین خان۔ شجاع آباد سے خالد یاسر، پرویز احمد، غلام پنجتن زیدی۔ چنیوٹ سے خورشید رضوی، فتح یاب خان۔ سرگودھا سے رشید تبسم محمد یامین، بشیر احمد، الیاس طارق بٹ، ایاز احمد۔ حاصل پور سے فرمان الیاس قادری۔ لڈن سے غلام حسن۔ بھکر سے محمد عارف قریشی۔ میر پور خاص سے زاہد حامد، نوشین فاطمہ زیدی، مجاہد علی ایس بنسی۔ اسلام آباد سے نیلوفر شاہین، فرمان حسین، علی عباس، یاسر حسن خان، آصف حسن۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، ظفر اسماعیل، نعیم احمد، سرفراز خان، یامین محمد، بلقیس فاطمہ، نذر محمد، غلام الثقلین، قیام الحسن، اشرف ممتاز، انصار الدین انصاری، ابرار احمد، غلام حسن عثمانی، وصی احمد خان، ہارون محمد، سید تقی عباس تقی، نوید حسن خان، کاظم جعفری۔ احمد جان، محمد افضل، خوشی طینت، اسلم ملک، نور علی شاہ، ملک خورشید، ثناء اللہ بخاری، شادر علی، میاں احتشام، زاہد سلیم عرف گلو بٹ، احسان خان، شاہدہ بتول۔ بھکر سے طوبیٰ اسلم۔ اسلام آباد سے خالد آفریدی، زیب النساء، فرحت رحمن، انور یوسف، راشد خان، فرحان احمد، بازخان آفریدی، کلیم الحسن، فریحہ مرتضیٰ، سید زاہد حسین زیدی الواسطی شہزادا کبر، نعمان عباس، میثم عابدی، جعفر سعید انصاری، ثمینہ گل عباس، ذیشان مصطفیٰ۔ واہ کینٹ سے محمد فیض، عباس عباسی، ذیشان مرزا۔ لاہور سے کائنات مرزا، منظر علی خان، فہد علی خان، ظفر الحسنین، عباس علی سید، سرفراز بٹ، فرحین نیاز، قائم فریدی، فصیح احمد، کائنات بھٹ، نیاز چوہان، مصباح الرضا، نوید احسن، اصغر علی اصغر، متین لاہوری، نعیم عباس، نواز کبیر، سلمان احمد، موتی، پہلوان گیلانی، اشرف علی، تاثیر احسن، رحیم بخش، فہیم احمد، نجم الدین خان، گل فرخندہ سید۔ ساہیوال سے محمد افضل حکیم الدین، کاظم علی، ارباز خان، غلام رضا، زویا بتول۔ لڈن وہاڑی سے منشی عزیز مے۔ شیخوپورہ سے مبارک علی۔ پشاور سے عزیز اللہ خان، گل فراز خان، عباس طوری، نذر علی سید، الیاس گل، انعام علی، یاسین محمد، قیام بخش، نوشین ملک، ارشد مہدی، سرفراز خان۔ جہلم سے نعیم علی، اسرار خان، مظہر حسین، بھیکو، شاہد خان آفریدی، نعمان خان۔ بہاولپور سے منشی نوروز علی، کاظم علی، انیس اقبال، ثناء کوثر، چودھری رحیم داد، نور الٰہی فضل اللہ، نواز کھوکھر، اللہ بخش زرگر، فیضان مصطفی، اسماعیل علی۔ مظفر گڑھ سے عباس سولنگی، مسرت علی، یاسین نقشبندی، حبیب علی مصطفی، عتیق احمد، صابر حسن، برجیس مرزا، انور علی سید، تنویر الحسن۔ جامشورو سے فیاض سومرو، برجیس کلہوڑو، عباس پھولپوتو، منصور احمد (کرگزی)۔ حیدر آباد سے ناعمہ تحریم، جاوید عطاری، کوکب خان، فیض عثمانی، عرفان عباسی۔ ملتان سے محمد یحییٰ معین، فرحین گل، ابرار احمد خان، شیر گل۔ کوہاٹ سے فدا حسین طوری، نصیر عباسی، ریاض کوہانی۔ باڑی چم ہوتی مردان سے م انور۔ راجن پور سے ملک محمد ظفر اللہ۔ سیالکوٹ سے بابو باسط، کائنات مرزا۔ سرگودھا سے ملک نوشین، اصغر سید، بانو صدیق۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے اصغر حسین سید۔ ڈیرہ غازی خان سے اشفاق علی، کاجل، فرحت، نیاز، اکبر حسین۔

بیرون ملک سے نیابت مرزا، اسرار خان (شارجہ)۔ زید علی (عمان)۔ احمد سہیل (قطیف، سعودیہ)۔ انصار ملک (العین)۔ ذاکر حسین (مانچسٹر یو کے)۔ محمد جنید انصاری الہندی (دبئی)۔ عباس علی، ایاز سومرو (بیڈفورڈ)۔ خالد ارشد آرائیں (اومان، مسقط)۔ نیاز کھوکھر (جرمنی)۔ ناصرہ احمد (166E,New york)

سفاک محسن

جناب معراج رسول
السلام علیکم
میں ایک پڑھا لکھا ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ کراچی میں ٹیکسی چلانا کتنا رسکی ہے۔ یہ آپ بھی جانتے ہوں گے۔ میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ گزرا ہے جسے میں بیان کردینا ضروری سمجھتا ہوں۔ واقعہ کتنا عجیب اور دہلا دینے والا ہے یہ آپ کو پڑھ کر ہی اندازہ ہو جائے گا۔

تنویر حسن
(کراچی)

مسلسل بے روزگاری سے تنگ آکر جب میں نے ٹیکسی چلانے کا فیصلہ کیا تو اس وقت میرے، وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اس شعبے میں مجھے اتنے انوکھے اور عجیب و غریب تجربات ہوں گے جن کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ٹیکسی میں موت سے لے کر پیدائش تک سب دیکھا۔ ایک بہت نوجوان آدمی جو میری فرنٹ سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھا ہوا گپ شپ کررہا تھا اچانک ہی ساکت ہوا اور جب میں نے ٹیکسی روک کر اسے چیک کیا تو دنیا سے گزر چکا تھا۔ اسی طرح ایک دردِ زہ میں مبتلا خاتون نے ٹریفک جام کی وجہ سے میری ٹیکسی میں بچے کو جنم دیا۔ خوش قسمتی سے اس کی ماں اور ایک دوسری خاتون ساتھ تھیں اور اللہ نے خیریت کی کہ اسپتال پہنچنے پر زچہ بچہ دونوں سلامت رہے تھے۔ اس دن سیٹ کور سے میں نے ٹیکسی کے پچھلے حصے کا پردہ کیا تھا۔ یہ دونوں واقعات صرف یہ بتانے کے لیے ہیں کہ میں نے کیا کچھ نہیں دیکھا۔ البتہ زیرِ نظر واقعہ ایسا ہے جس نے براہ راست مجھے متاثر کیا اور اگر اللہ کا کرم شاملِ حال نہ ہوتا تو شاید آج میں زندہ نہ ہوتا۔

میں انٹر پاس ہوں۔ والد صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ انہوں نے سول انجینئرنگ کی تھی۔ میرے دونوں بڑے بھائی بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ایک نے کیمسٹری میں باہر سے پی ایچ ڈی کی ہے اور ایک یونیورسٹی میں پڑھا رہے ہیں۔ دوسرے والد کی طرح سول انجینئر ہیں اور ایک سرکاری ادارے میں اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ میری واحد بڑی بہن بھی گریجویشن ہیں اور انہیں بھی آگے پڑھنے کا ارمان تھا مگر امی کو ان کی شادی کی جلدی تھی اس لیے وہ مزید تعلیم حاصل نہیں کرسکیں۔ گھر میں واحد میں ایک بچہ تھا جسے شروع سے تعلیم سے کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی۔ اسکول کی حد تک بس پاس ہوجاتا تھا اور یہ بھی اللہ کا کرم ہے کسی مضمون میں فیل نہیں ہوا۔ البتہ مجھے کم نمبروں کی وجہ سے ایک عام سے کالج میں داخلہ ملا۔ وہاں کا ماحول اچھا نہیں تھا۔ سیاست تھی اور اکثر کلاسز بند رہتی تھیں۔ اس لیے میرا رہا سہا دل بھی نہ رہا اور میں نے بہت مشکل سے انٹر کرکے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت والد صاحب نے کہا۔

''بیٹا اگر پڑھو گے نہیں تو روزگار کی بجائے ٹیکسی رکشا

چلانا پڑے گا۔"

ان کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔

اگرچہ مجھے بڑے بھائی کے توسط سے ایک پرائیویٹ کمپنی میں ریکارڈ کیپر کی جاب مل گئی مگر یہ جاب اس وقت تک ہی مناسب رہی جب تک کہ شادی نہیں ہوئی اور بچے دنیا میں نہیں آگئے۔ اس کے بعد یہ جاب ناکافی ہوگئی کیونکہ اس میں تنخواہ اتنی کم تھی کہ اب گزارا نہیں ہوتا تھا۔ آسیہ میری کزن ہے اور اسی وجہ سے میری شادی بھی ہوگئی ورنہ ہمارے خاندان میں تو کوئی بھی انٹر نہیں ہے۔ والد صاحب ایک اچھا گھر چھوڑ گئے جس میں اوپر تلے تین پورشن ہیں۔ میرا پورشن سب سے اوپر ہے۔ دونوں بھائی سپورٹ کرتے تھے اور بل وغیرہ وہی ادا کردیتے مگر وہ میرے بیوی بچے تو نہیں پال سکتے تھے اور خود مجھے بھی یہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ پریشانی کے عالم میں میں نے کمپنی والوں سے تنخواہ بڑھانے کی بات کی اور ایک جھگڑے کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے ملازمت سے جواب دے دیا گیا۔

جب تک جاب تھی اس کی قدر نہیں تھی۔ جب جاب نہیں رہی اور اس کی تلاش میں دھکے کھانے پڑے تب جا کر مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے کفرانِ نعمت کیا تھا۔ بے شک تنخواہ کم تھی مگر گزارا تو ہو رہا تھا۔ بجائے اس کے کہ میں اور آسیہ اپنے اخراجات پر قابو پاتے میں نے مزید کے چکر میں جاب ہی گنوادی۔ میرا خیال تھا کہ مجھے دوسری جاب آسانی سے مل جائے گی مگر اس کے بعد بے روزگاری کا ایک طویل دور شروع ہوا جو اب مجھے کسی بھیانک خواب کی طرح لگتا ہے۔ دفتر بہ دفتر جاب کے لیے مارا مارا پھرتا رہا۔ بھائیوں نے کوشش کی مگر نہ جانے کیا بات تھی جہاں جاتا انکار ہو جاتا یا کوئی ایسا مسئلہ سامنے آجاتا کہ ملازمت ملنے سے رہ جاتی۔ ایک بار تو اپائنٹ منٹ لیٹر بھی مل گیا تھا کہ اچانک کمپنی کے مالک بھائیوں میں جھگڑا ہو گیا اور کمپنی ہی بند ہوگئی۔

تنگ آکر میں نے محنت مزدوری کا سوچا مگر یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ بچپن سے ناز و نعم میں پرورش پائی، کبھی کوئی سختی نہیں دیکھی۔ اس لیے جب جوانی میں مشکل ہوئی تو عادت نہیں تھی اس لیے سخت کام نہیں کر سکا۔ تب آسیہ نے ٹیکسی کا مشورہ دیا۔ میں نے پہلے تو انکار کر دیا۔ "تمہارا دماغ خراب میں، میں اصغر علی کی اولاد ٹیکسی چلاؤں گا۔"

"تو ٹیکسی چلانا کون سی بری بات ہے۔ آپ محنت کا کام کرنا چاہ رہے ہیں تو یہ بھی تو محنت ہی ہے۔"

جب میں نے غور کیا تو آسیہ کی بات درست پائی۔ ٹیکسی چلانا بھی تو محنت کا کام تھا۔ پھر اس میں محنت تھی مگر مشقت نہیں تھی۔ مجھے ڈرائیونگ آتی تھی اور میرے پاس لائسنس بھی تھا۔ میں نے بھائیوں سے مشورہ کیا اور میرا خیال تھا کہ وہ مخالفت کریں گے کہ ان کا بھائی ٹیکسی چلائے تو یہ ان کی بے عزتی کے مترادف ہوگا۔ مگر انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ ان کا کہنا تھا کہ کام سارے اچھے ہوتے ہیں اس میں آدمی اپنی محنت اور قابلیت سے جگہ بناتا ہے۔ اس میں آگے بڑھنے کا امکان بھی تھا۔ میں تیار ہو گیا۔ رقم کا مسئلہ آیا تو وہ بھی آسیہ نے حل کر دیا۔ اس کے پاس

خاصا گولڈ تھا۔ اس نے اپنا ایک بڑا اسیٹ دے دیا۔ اتفاق سے اس وقت سونے کی قیمت اپنے عروج پر تھی اور شاید پینسٹھ ہزار روپے تولہ بک رہا تھا۔ چار تولے کے سیٹ کے دو لاکھ ستائیس ہزار روپے مل گئے۔ کیونکہ یہ سیٹ آسیہ کے بھائی نے دبئی سے لیا تھا اس لیے اس کا گولڈ بہت اچھا تھا اور اسی وجہ سے اس کی قیمت بہت اچھی ملی۔

رقم کا مسئلہ حل ہوا اور میں نے مناسب گاڑی کی تلاش شروع کی۔ میں یلو کیب لینا چاہتا تھا۔ مگر مارکیٹ میں موجود تمام یلو کیب پرانی ہو چکی تھیں کیونکہ وہ گزشتہ بائیس سال سے مسلسل ٹیکسی کے طور پر استعمال ہو رہی تھیں۔ پھر ایک دوست کے توسط سے ایک یلو کیب لی جو ایک صاحب نے اپنے استعمال کے لیے رکھی تھی اور وہ بھی کم استعمال ہوئی تھی۔ گاڑی اچھی حالت میں تھی۔ بڑی گاڑی تھی اس لیے مناسب قیمت میں مل گئی۔ کچھ رقم اوپر سے خرچ کی اور گاڑی بہترین حالت میں آ گئی۔ یوں میں نے ٹیکسی ڈرائیور کے طور پر کام شروع کیا۔ ان دنوں سی این جی کا بحران شروع ہوا تھا اور ہفتے میں دو دن سی این جی اسٹیشن بند رہنے لگے تھے۔ میں نے اس کا یہ حل نکالا کہ ایک سلنڈر اضافی لے لیا اور اسے بھروا کر رکھ لیتا تھا جب ضرورت ہوتی تو اسے فٹ کر لیتا۔ مگر اس کی نوبت کم آتی تھی۔

شروع میں کام اتنا نہیں تھا۔ میری رہائش ایک پوش علاقے میں ہے اور یہاں اکثر گھروں میں ایک سے زیادہ گاڑیاں ہیں۔ اس لیے ٹیکسی کی ضرورت اتنی زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے میں نزدیک ہی ایک ایسے علاقے میں اسٹاپ پر کھڑا ہونے لگا جہاں لوگ تو کھاتے پیتے رہتے تھے مگر فلیٹ یا کسی دوسری مجبوری کی وجہ سے گاڑی نہیں رکھ سکتے تھے۔ یہاں ٹیکسی کا کام خوب چلتا تھا۔ کم تعلیم کے باوجود میری شخصیت میں کوئی کمی نہیں تھی۔ اللہ نے اچھی شکل و صورت دی ہے۔ میرے گھرانے کا علمی پس منظر اور شائستگی مجھ میں بھی آئی ہے۔ میں خود بھی صاف ستھرا رہتا تھا اور گاڑی بھی صاف ستھری رکھتا تھا۔ پھر کسٹمر سے اس طرح پیش آتا کہ جو ایک بار بیٹھتا وہ لازمی میرا نمبر لے لیتا تھا۔ اس کے بعد جب اسے ضرورت ہوتی کال کر کے گھر بلوا لیتا۔ یوں مجھے جلد ہی پکی سواریاں میسر آ گئیں۔

ایک دولت مند فیملی نے مجھے اسکول سے بچے لانے لے جانے کے لیے رکھ لیا۔ اس خاندان کے کمانے والے مرد ملک سے باہر تھے اور گھر میں صرف خواتین، بچے اور ایک معمر صاحب تھے۔ جب میں بچے چھوڑنے اور لینے جاتا تو وہی میرے ساتھ ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے میں یہ ذمے داری لینے پر آمادہ ہوا کیونکہ خدا نا خواستہ کوئی واردات ہو جاتی تو کون میری بات کا یقین کرتا کہ میں اس میں ملوث نہیں ہوں۔ معمر صاحب کی وجہ سے میری ذمے داری صرف ڈرائیور کی حد تک تھی۔ اس لگی بندھی ڈیوٹی سے مجھے اتنا مل جاتا تھا کہ ٹیکسی کی گیس اور مرمت کا خرچ اسی سے نکل آتا تھا اور باقی کمائی خالص ہو جاتی۔ شروع میں بچوں کو لاتا لے جاتا تھا۔ پھر گھر کی خواتین کو بھی لانے لے جانے لگا۔ میری وجہ سے انہوں نے اپنے ڈرائیور کو نوکری سے نکال دیا۔ مجھے اس کا افسوس ہوا مگر اس میں میرا قصور نہیں تھا۔ میں ایک طرح سے ان کا بغیر تنخواہ کا ڈرائیور ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ بھی فائدے میں تھے کہ جتنا استعمال کرتے اتنا ہی معاوضہ دیتے تھے اور گاڑی کا خرچ بھی بچتا تھا۔ جلد میں تقریباً اسی خاندان کے لیے انگیج ہو کر رہ گیا اور دن میں دو تین بار لازمی جانا ہوتا تھا۔ صرف گرمیوں کی چھٹی میں میری طلبی کم ہوتی تھی۔ ان دنوں میں دوسری سواریاں دیکھتا۔

میں نے محنت کی اور ایمان داری سے کام کیا تو اللہ نے جلد اس کا صلہ دیا اور میں اپنی سابق آمدنی سے دوگنا سے بھی زیادہ کمانے لگا تھا۔ عید اور شادیوں کے سیزن میں آمدنی مزید بڑھ جاتی تھی۔ پھر میں گھر میں زیادہ وقت دے سکتا تھا۔ آسیہ، بچوں کو کہیں لانا لے جانا ہوتا تو اپنی گاڑی موجود تھی ورنہ پہلے بھائیوں سے لینی پڑتی تھی۔ سب سے بڑھ کر اب مجھے بھائیوں سے مدد نہیں لینی پڑتی تھی۔ میری خود دار طبیعت کو پہلے بھی یہ بات کھلتی تھی۔ اس لیے اب میں مطمئن تھا۔ صرف اچھے طریقے سے گزارا نہیں ہو رہا تھا بلکہ میں کچھ نہ کچھ بچت بھی کرتا رہتا تھا۔ یہ نہ سمجھیں کہ ٹیکسی کے کام میں بہت پیسا ہے۔ کسی زمانے میں ایسا تھا مگر جب سے ایندھن اور دوسری چیزوں کی قیمت بڑھی ہے۔ یہ بھی بس گزارے لائق کام رہ گیا ہے۔ مجھے اس وجہ سے زیادہ آمدنی ہوتی تھی کہ میرا اچھی پارٹیز سے رابطہ ہو گیا تھا اور میں ان کے لیے کام کرتا تھا۔

میں عام طور سے صبح سات بجے نکلتا تھا۔ پہلے بچوں کو اسکول چھوڑتا اور اس کے بعد اسی فیملی کے ساتھ کچھ کام اور نمٹاتا۔ پھر بچوں کو اسکول سے لا کر واپس گھر آتا۔ کھانا وغیرہ کھا کر کچھ دیر آرام کرتا۔ ورنہ کال آنے پر چلا جاتا تھا۔ اس کے بعد میں شام سات آٹھ بجے تک باہر رہتا اور پھر گھر آ جاتا

اس کے بعد صرف جاننے والوں کی کال پر جاتا اور رات دس بجے کے بعد اپنا موبائل بند کر دیتا۔ صرف ایک اور نمبر تھا جو اسی فیملی کو دیا ہوا تھا کہ کوئی ہنگامی ضرورت ہو تو مجھے کال کر لیں۔ مگر اس کی نوبت شاذ ہی آتی تھی۔ فیملی جانتی تھی کہ میں رات دس بجے کے بعد نہیں نکلتا ہوں اس لیے وہ بلا ضرورت کال نہیں کرتی تھی۔ ملازمت چھوٹنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب میں سکون سے زندگی گزار رہا تھا اور خوش تھا۔

ان دنوں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اور یہ دو سال پرانی بات ہے۔ شدید گرمی کی وجہ سے دن میں نکلنا مشکل ہوتا تھا۔ دن بھر لو چلتی اور رات بھی خاصی دیر میں جا کر ٹھنڈی ہوتی تھی۔ لوگ بارش کی دعائیں مانگ رہے تھے مگر شہر کراچی میں ابر باراں مشکل سے ہی برستا ہے۔ اس دن موسم بہت گرم تھا اور اتفاق سے میں سارا دن مصروف رہا تھا۔ اس لیے جب شام میں گھر آیا اور نہا دھو کر ذرا سکون میں آیا تو میں نے پھر گھر میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ بچے خوش ہو گئے کہ میں ان کے ساتھ تھا۔ میری چھوٹی بیٹی عالیہ مجھ سے بہت اٹیچ ہے وہ فوراً اپنے اسکول کی چیزیں لے آئی اور مجھے دکھانے لگی۔ آٹھ بجے رات کا کھانا کھا کر میں ٹی وی دیکھنے لگا۔ اچانک موبائل نے بیل دی تو میں نے دیکھا۔ اسی فیملی کا نمبر آ رہا تھا۔ ان کے کئی نمبر تھے جو میرے پاس محفوظ تھے۔ میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے کسی مرد نے کہا۔

''تنویر حسن۔''

''بات کر رہا ہوں جناب؟'' میں نے محتاط انداز میں کہا۔ ''آپ کون ہیں۔''

''پہچانا نہیں۔'' آدمی نے بے تکلفی سے کہا۔ ''میں ابھی آیا ہوں۔''

''صباحت صاحب۔'' میں نے کہا۔ صباحت اس فیملی میں بڑے بیٹے تھے۔

''ٹھیک پہچانا۔'' آدمی بولا۔ ''سوری یار اس وقت کال کی ہے لیکن ایمرجنسی ہے۔ تم نے ...... اسپتال دیکھا ہے۔'' اس نے ایک نجی اسپتال کا نام لیا۔

''جی صباحت صاحب، باجی کو وہاں لے جاتا رہا ہوں۔''

''بس یہاں آجاؤ۔ امی کو ساتھ لایا ہوں مگر گاڑی میں مسئلہ ہو گیا ہے۔ ان کو دوسرے اسپتال لے جانا ہے۔ ممکن ہے تمہیں آج رات میرے ساتھ رہنا پڑے۔''

کوئی اور ہوتا تو میں انکار کر دیتا مگر اس فیملی کو انکار

جنت

باغ۔ نیک انسانوں کا مرنے کے بعد دائمی گھر۔ جنت ہر اس باغ کو بھی کہتے ہیں جس کی زمین درختوں کی وجہ سے نظر نہ آئے۔ بعض کے نزدیک ان گنجان درختوں کو بھی جنت کہا جاتا ہے جو زمین کو چھپائے ہوئے ہوں اور بہشت کو جنت یا تو دنیاوی باغات سے تشبیہ دے کر کہا گیا ہے۔ یا اس لیے کہ بہشت کی نعمتیں ہم سے مخفی رکھی گئی ہیں جیسا کہ قرآن مجید کے اس ارشاد سے ظاہر ہے۔ ''کوئی متنفس نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا رکھی ہے۔'' (17:32) جنت کی جمع جنات ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جنات کہنے کی وجہ یہ ہے کہ بہشت سات ہیں۔ ((1 جنت الفردوس۔ ((2 جنت عدن۔ ((3 جنت النعیم۔ ((4 دارالخلد۔ ((5 جنت الماویٰ۔ ((6 دارالسلام۔ ((7 علیین۔ بعض اہلِ تحقیق نے بہشت کے آٹھ درجات قائم کیے ہیں۔ جو یہ ہیں۔ ((1 عدن۔ ((2 جنت الماویٰ۔ ((3 فردوس۔ ((4 نعیم۔ ((5دارالقرار۔ ((6دارالخلد۔ ((7 دارالسلام۔ ((8 دارالجلال۔ محققین نے یہ بھی لکھا ہے کہ سات درجے تو انسانوں کی قیام گاہ کے لیے ہیں لیکن آٹھواں دیدار حق تعالیٰ کے لیے لیکن دیدار حق کے لیے کون سا درجہ ہے اس بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک یہ مقام علیین ہے۔ علامہ زمحشری صاحب کشاف نے جنت کے نام اس ترتیب سے بیان کیے ہیں۔ ''دارالخلد، دارالقام، دارالسلام، جنت عدن، دارالقرار، جنت نعیم، جنت الماویٰ، جنت فردوس۔'' علامہ موصوف نے سورۃ الزاریات کی تفسیر میں لکھا ہے کہ عدن کو زمرد سبز سے بنایا گیا ہے۔ اس میں سخی و عادل و نمازی و زاہد اور آئمہ مساجد رہیں گے۔ جنت الماویٰ کو نور سے تیار کیا گیا ہے اور یہ مقام ہے شہید حقیقی، خیرات کرنے والوں، غصہ کھانے والوں اور تقصیروں کے معاف کرنے والوں کا۔ فردوس کو جلال کبرائی کے نور سے بنایا ہے۔ اس میں انبیاء علیہم السلام رہیں گے۔ اس کے درمیان ایک غرفہ نور رضا کا بنایا ہے۔ اسے مقام محمود کہتے ہیں۔ آنحضورؐ اس میں تشریف رکھیں گے۔ نعیم کو زبرجد سبز سے بنایا ہے۔ اس میں شہید اور مؤذن رہیں گے۔ دالقرار کو مروارید روشن سے بنایا ہے۔ اس میں عام مومنین رہیں گے۔ دارالسلام کو یاقوت سرخ سے بنایا ہے۔ اس میں فقیر، صابر رہیں گے۔

مرسلہ: نعیم عطاری۔ کراچی

مشکل تھا اس لیے میں تھکن کے باوجود جانے کو تیار ہو گیا۔ آسیہ نے دبے لفظوں میں کہا بھی کہ میں نہ جاؤں۔ کوئی لازمی تو نہیں تھا کہ میں ہی جاتا ان کے اور بھی جاننے والے تھے ان کو بلا لیتے۔ مگر مجھے اچھا نہیں لگا کہ وہ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں تو میں انکار کر دوں۔ میں روانہ ہوا اور آدھے گھنٹے بعد مذکورہ اسپتال کے سامنے تھا۔ یہ ایک مرکزی شاہراہ پر واقع ہے اور سروس روڈ پر پارکنگ مشکل سے ملتی ہے۔ میں نے ایک جگہ ٹیکسی روک کر صباحت صاحب کو کال کی۔ انہوں نے ریسیو کی تو میں نے کہا۔

''میں آگیا ہوں۔''

''کہاں پر ہو؟''

میں نے جگہ بتائی جہاں میں نے گاڑی پارک کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ وہ آرہے ہیں۔ مگر اس کے بعد میرے ساتھ جو ہوا اس کا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میں نے گرمی کی وجہ سے آگے کے دونوں شیشے نیچے کر رکھے تھے۔ اچانک ایک شخص سائیڈ پر آیا اور اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تم میرے پستول کی زد پر ہو۔ پیچھے کا دروازہ ان لاک کر دو۔ غلط حرکت مت کرنا ورنہ مر جاؤ گے اور اس سے پہلے کہ کوئی ہمیں دیکھے ہم یہاں سے جا چکے ہوں گے۔''

مجھے اس سے پہلے کبھی ایسی صورتِ حال سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ کبھی موبائل چھیننے کی واردات بھی نہیں ہوئی تھی اور اب ایسا لگ رہا تھا کہ وہ گاڑی سمیت مجھے لے جانے آئے تھے۔ ورنہ مجھ سے چابی مانگ کر نیچے اتار دیتے۔ سچی بات ہے پستول کا سن کر میرے ہوش اڑ گئے تھے۔ پہلے ہی پسینا آرہا تھا اور اس لیے مزید پسینے کے بارے میں کہہ نہیں سکتا۔ البتہ جسم کانپنے لگا تھا۔ آج کل ہمارے ہاں انسانی جان سب سے سستی ہو گئی ہے کیونکہ قاتلوں کو کوئی پکڑنے والا اور سزا دلوانے والا نہیں ہے۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے پچھلے دروازے کا لاک کھولا اور بولا۔ ''دیکھو تمہیں گاڑی چاہیے، تو لے جاؤ۔''

''ہمیں گاڑی تمہارے ساتھ چاہیے۔'' میرے سر پر موجود شخص نے کہا۔ ایک تو وہاں نیم تاریکی تھی جس میں صورت نظر نہیں آرہی تھی دوسرے میں اس کی طرف دیکھنے کی جرات بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ پچھلی دروازہ کھلا اور دو افراد اندر آگئے۔ اس کے بعد میرے سر پر موجود آدمی گھوم کر آیا اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تب میں نے اس کے ہاتھ میں پستول دیکھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ میں نے بلف سمجھتے ہوئے مزاحمت کی کوشش نہیں کی۔ اس نے حکم دیا۔ ''اب یہاں سے چلو۔ گلشن کی طرف جانا ہے۔''

میں نے ٹیکسی نکالی اور اس اُمید پر آس پاس دیکھا کہ شاید صباحت صاحب نظر آجائیں اور وہ سمجھ جائیں کہ میں کس مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ اگرچہ وہ دیکھ لیتے اور اگر سمجھ جاتے تب بھی زیادہ سے زیادہ پولیس کو کال کر سکتے تھے۔ ہماری پولیس کی کارکردگی سب کے سامنے ہے کہ ٹارگٹ کلرز ان کے سامنے اپنا کام کر کے نکل جاتے ہیں اور یہ دیکھتی رہ جاتی ہے۔ مگر جب انسان ڈوبنے لگتا ہے تو تنکے کا سہارا بھی تلاش کرتا ہے۔ اگرچہ میں جس مشکل میں پڑ گیا تھا اس سے مجھے اللہ ہی نکال سکتا تھا۔ میں نے شاہراہ پر آتے ہوئے کہا۔ ''جناب، میں ایک ٹیکسی ڈرائیور ہوں میرا کسی جھگڑے یا چکر سے تعلق نہیں ہے۔''

''فکر مت کرو۔'' اس نے کہا۔ ''تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ بس جو ہم کہیں وہ کرتے رہو تو کچھ دیر بعد تم کو چھوڑ دیں گے اور معاوضہ بھی دیں گے۔''

مجھے اس کی بات پر قطعی اعتبار نہیں آیا۔ اول تو وہ کسی چکر میں مجھے ساتھ لے جا رہے تھے اور اگر چھوڑتے تو امکان تھا کہ معاوضہ ایک گولی کی صورت میں ملتا تا کہ کوئی عینی گواہ باقی نہ رہے۔ میں نے پھر فریاد کی۔ ''میرے چھوٹے بچے ہیں اور میں ہی اپنے گھر کا واحد کفیل ہوں۔''

وہ ہنسا۔ ''مرتے کیوں ہو، جوان آدمی ہو حوصلہ کرو۔ بندے کو یقین رکھنا چاہیے کہ جب تک اوپر والے کی طرف سے طے کیا ہوا وقت نہیں آتا کوئی مرتا نہیں ہے اور جب وقت آجائے تو بچتا نہیں ہے۔''

میں چپ ہو گیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا مگر انسان کی فطرت ہے وہ ڈرتا ضرور ہے۔ عقب میں بیٹھے دونوں افراد آپس میں بات کر رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ ''تم نے اچھی گاڑی اٹھائی، عین موقع پر جواب دے گئی۔''

''تو اسے بھی میں نے ہی بلوایا نا۔'' دوسرے نے جواب دیا۔ ''میرے ذہن کی داد دو کہ بر وقت خیال سوجھا۔''

میں چونکا۔ ''مجھے کال تم نے کی تھی؟''

''ہاں یہ موبائل چند دن پہلے لیا ہے اس کی میموری میں تمہارا نام شامل تھا۔'' پیچھے سے جواب آیا۔ ''نام ہے ٹیکسی تنویر حسن۔ بس تم اس وجہ سے بلائے گئے ہو۔''

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس فیلی کا اپنا

کوئی موبائل گم ہو گیا اور وہ ان کے پاس پہنچ گیا انہوں نے مجھے دھوکے سے کال کر کے بلوا لیا تھا۔ میرا ابتدائی خوف کم ہو گیا تھا اور میں کسی قدر پُرسکون تھا۔ ''دیکھو تم میری ٹیکسی میں کوئی واردات کرو گے اور بھاگ جاؤ گے۔ پولیس مجھے پکڑے گی۔''

''نہیں پکڑے گی۔'' میرے برابر والے نے کہا۔ وہ نوجوان اور خوش شکل آدمی تھا۔ ''مجبوری تھی ورنہ ہم خود کسی شریف آدمی کو تکلیف نہیں دیتے ہیں۔''

گلشن پہنچ کر اس نے ایک جگہ ٹیکسی رکوائی۔ یہ کچی آبادی تھی جو چاروں طرف سے پوش آبادی میں گھری ہوئی تھی اور بہت بدنام تھی۔ یہاں منشیات کا کاروبار ہوتا تھا اور اکثر مفرور ملزم یہیں روپوش ہوتے تھے۔ آئے دن یہاں پولیس چھاپے مارتی تھی مگر پکڑے جانے والے چند دن میں چھوٹ کر واپس آجاتے اور اپنے دھندے پھر سے شروع کر دیتے تھے۔ ان میں سے دو ٹیکسی سے اتر گئے اور ایک پیچھے بیٹھا رہا۔ برابر والے نے اترنے سے پہلے کہا۔ ''کوئی حماقت مت کرنا مجھے تمہارے بیوی بچوں کا خیال آرہا ہے مگر تم بھی ان کا خیال رکھنا۔ میرا آدمی یہاں موجود ہے۔''

وہ دونوں کچی گلیوں میں غائب ہو گئے اور میں دوسرے آدمی کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھا اپنی عافیت کی دعائیں مانگتا رہا۔ لہجے سے وہ تینوں پڑھے لکھے لگ رہے تھے مگر ساتھ ہی ان کے لہجے میں ہلکی سی جھلک تھی جس سے لگتا تھا کہ اردو ان کی مادری زبان نہیں ہے۔ ٹیکسی انہوں نے ایسی جگہ رکوائی تھی جہاں تاریکی تھی اور دور سے دیکھنے سے یہ پتا چلانا مشکل تھا کہ ٹیکسی میں کوئی ہے یا خالی ہے۔ رات کے ساڑھے نو بجے تھے مگر رہائشی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں سناٹا اور ویرانی تھی۔ اِکا دُکا گاڑیاں گزر رہی تھیں اور پیدل جانے کی ہمت صرف اسی کچی آبادی کے لوگوں کی ہوتی تھی کیونکہ یہاں لوٹ مار کی وارداتیں بھی بہت ہوتی تھیں۔ اس لیے لوگ یہاں سے پیدل گزرنے سے گریز کرتے تھے۔ گاڑی والے بھی بس وہی گزرتے تھے جن کی مجبوری ہوتی تھی۔ ان دونوں کو گئے ہوئے دس منٹ ہونے کو آئے تھے اور اب تک ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ اچانک ذرا دور سے فائرنگ کی آواز آئی۔ یہ سنگل فائر تھے۔ پیچھے موجود آدمی نے مضطرب لہجے میں کہا۔

''انجن اسٹارٹ کرو مگر روشنیاں بند رکھنا۔''

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور ایک بار پھر اپنی عافیت کی دعا مانگنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ فائرنگ کی آوازوں کا ان تینوں سے کوئی تعلق تھا تب ہی پیچھے بیٹھے آدمی نے مجھے انجن اسٹارٹ کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس نے چند لمحے بعد کہا۔ ''گاڑی سیدھی نکالنا اور مین روڈ پر سیدھے پر موڑ لینا۔''

مشکل سے ایک منٹ بعد اس طرف سے دو سائے نمودار ہوئے جس طرف وہ دونوں گئے تھے۔ وہ بھاگ رہے تھے مگر ان میں سے ایک لڑکھڑا رہا تھا۔ عقب میں موجود آدمی یک دم چوکنا ہو گیا اور اس نے سیٹ کی پناہ میں خود کو چھپا لیا تھا۔ میں ایک بار پھر کانپ اٹھا تھا۔ پتا نہیں آنے والے کون تھے اور وہ کیا کرتے۔ مگر نزدیک آنے پر وہ وہی دونوں ثابت ہوئے جو ٹیکسی سے گئے تھے۔ فرنٹ سیٹ والا اپنی جگہ آگیا اور دوسرا اندر گھستے ہوئے بولا۔ ''جلدی نکلو وہ آنے والے ہیں۔''

میں نے ایکسی لیٹر دبایا اور عجلت میں ٹیکسی بھگائی۔ ابھی ہم کچھ دور گئے ہوں گے کہ عقب سے چند افراد نکلے اور انہوں نے ٹیکسی کی طرف فائرنگ کی۔ سب نے سر نیچے کر لیے اور ٹیکسی لہرائی تھی مگر میں نے اسے قابو کر لیا اگلے لمحے ہم مین روڈ کی طرف مڑ گئے تھے اور یہاں ٹیکسی کو لائن میں لانے کے دوران کئی گاڑیوں سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی تھی۔ جب ٹیکسی اور میرے ہاتھ پاؤں قابو میں آئے تب میں نے محسوس کیا کہ فرنٹ سیٹ والا زخمی تھا اور وہی کراہ رہا تھا۔ پیچھے رہ جانے والے نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''کام ہو گیا مگر مجھے بھی گولی لگی ہے۔'' فرنٹ سیٹ والے نے جواب دیا۔

''وہ کتے کے بچے بھی مسلح تھے۔'' فرنٹ سیٹ والے کا ساتھی بولا۔ ''پر سب کو ٹپکا دیا۔''

''لائٹ جلاؤ۔'' فرنٹ سیٹ والے نے کہا تو میں نے اندر کی لائٹ آن کر دی۔ اس نے اپنی شرٹ کے نچلے بٹن کھول کر اسے اوپر کیا تو اس کے پیٹ اور سینے کے درمیان والی جگہ دائیں طرف گولی کا نشان نظر آیا۔ زخم سے رہ رہ کر خون ابل رہا تھا۔ اس نے رومال نکال کر اس پر رکھا اور بولا۔ ''کسی میڈیکل اسٹور کے پاس رکنا۔''

ذرا آگے ایک میڈیکل اسٹور تھا۔ میں نے سروس روڈ پر لیتے ہوئے اس سے ذرا دور ٹیکسی روک لی۔ ان میں سے ایک اتر کر گیا اور میڈیکل اسٹور سے دوائیں اور مرہم پٹی کا

سامان لے آیا۔ اس نے آتے ہی فرنٹ سیٹ والے کو طاقتور پین کلر کو اڈ ڈرنک کے ساتھ دی۔ مگر اسے باقاعدہ علاج کی ضرورت تھی میں نے کہا۔ ''تمہیں اسپتال جانا ہوگا۔''

''اپنا منہ بند رکھو۔'' وہ غرایا۔ ''گاڑی چلاؤ۔''

میں نے ٹیکسی آگے بڑھادی۔ وہ دوا کھا کر اپنے زخم پر خون جاذب کرنے والی پٹی رکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اوپر سے ٹیپ کر کے اسے بند کر دیا۔ چند منٹ بعد میں نے کہا۔ ''تم نے کہا تھا کہ کام ہو جانے کے بعد مجھے جانے دو گے؟''

''اپنا منہ بند کر۔'' اس بار پیچھے والے نے خون خوار لہجے میں کہا۔ ''ابھی بندے ٹپکا کر آرہے ہیں ایسا نہ ہو تجھے بھی ٹپکا دیں۔''

''خدا کے لیے۔'' میں کانپ گیا۔

''ڈرو مت۔'' اس بار فرنٹ سیٹ والا نرمی سے بولا۔ ''یہ مسئلہ ہو گیا ہے ورنہ تمہیں جانے دیتے۔ اب تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''کہاں؟''

''اسی راستے پر چلتے رہو آگے سے چورنگی سے دائیں طرف موڑ لینا۔''

میں فکر مند ہو گیا۔ اس چورنگی سے دائیں طرف چند کلومیٹرز کے بعد شہر کا بیرونی حصہ آجاتا اور وہاں کی آبادیوں کی اچھی شہرت نہیں تھی۔ جرائم پیشہ اور پیشہ ور قاتل وہیں آبادیوں میں رہتے تھے کیونکہ ان جگہوں پر ان کی حکومت تھی۔ پولیس والے وہاں جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ مجھے ایک بار پھر اپنی عافیت شدید خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔ وہ مجھے ساتھ لے کر گئے تھے اور انہوں نے کچھ لوگوں کو قتل کیا تھا۔ میں عینی گواہ تو نہیں تھا مگر اس کے خلاف گواہی دے سکتا تھا اس لیے وہ مجھے چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مجھے اب واپس آنا نصیب نہیں ہوگا۔ مگر میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا اس کے حکم کی تعمیل کی۔ یہاں تک خاصی ٹریفک تھی مگر دوسری سڑک پر مڑتے ہی ٹریفک یک دم کم ہو گیا اور جیسے جیسے ہم آگے جارہے تھے اس میں مزید کمی آرہی تھی۔ میں نے ہمت کر کے پوچھا۔ ''تمہیں کہاں جانا ہے؟''

''اسی سڑک پر ذرا آگے ایک جگہ ہے۔'' فرنٹ سیٹ والے نے جواب دیا۔ پین کلر لینے کے بعد اس کی تکلیف میں کمی آئی تھی اور وہ اب سکون میں تھا۔ مگر میں اس کی ہمت کی داد دے رہا تھا۔ جسم میں گولی کی موجودگی برداشت کرنا یقیناً آسان کام نہیں ہوتا ہے۔ وہ حوصلہ مند نوجوان تھا۔ شکل صورت سے اچھا لگ رہا تھا۔ مگر آج کل جرائم کے معاملے میں شکل وصورت پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ میں نے خود گن پوائنٹ پر ایسے لڑکوں کو سر راہ لوگوں سے موبائل اور رقم چھینتے دیکھا ہے جو صورت سے نہایت شریف اور اچھے گھرانوں کے لگتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر لگتا ہے کہ انہوں نے کبھی مکھی بھی نہیں ماری ہوگی مگر وہ بندے مار دیتے ہیں۔ چند کلومیٹرز بعد سڑک سنسان ہو گئی اور اب سوائے میری ٹیکسی کے کوئی اور گاڑی نہیں تھی۔ اس سڑک پر لوگ دن میں بھی جاتے ہوئے ڈرتے تھے اور صرف وہی جاتے تھے جن کو یہاں کام ہوتا تھا۔ اس سڑک پر آگے ماربل اور پتھر کرش کرنے والی فیکٹریاں تھیں جو شہر میں تعمیراتی کاموں کے لیے ماربل اور کرش مہیا کرتی ہیں۔ مزید چند کلومیٹرز سفر کے بعد وہ فیکٹریاں بھی آ گئیں اور انہوں نے ابھی تک ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا تھا کہ انہیں کہاں جانا تھا؟

میری پریشانی اور خوف بڑھ رہا تھا۔ جب فیکٹریاں بھی ختم ہو گئیں تو میں نے ہمت کر کے پھر پوچھا۔ ''اب کہاں جانا ہے؟''

''آگے سے جو سڑک جھیل کی طرف جاتی ہے اس طرف مڑ جانا۔'' پیچھے موجود آدمی نے کہا۔

''لیکن اس طرف تو ویرانہ ہے۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''اسی طرف ہمیں جانا ہے۔'' فرنٹ سیٹ والا بولا۔ ''بس زیادہ دور نہیں ہے مشکل سے ایک کلومیٹر دور ہو گا۔''

مجھے لگا کہ وہ مجھے دلاسہ دے کر میری قتل گاہ تک لے جا رہا ہے اس ویرانے میں مجھے مار کر خاموشی سے دفن کر دینا کون سا مشکل کام تھا کسی کو پتا بھی نہیں چلتا کہ میں کہاں چلا گیا۔ اس وقت مجھے آسیہ اور بچے بہت یاد آئے اور میں نے اللہ سے دعا کی کہ اگر میری زندگی ہے۔ تو میرے بیوی بچوں کی خاطر مجھے بچانا۔''

میں بیوی بچوں کو یاد کر رہا تھا کہ اچانک میرے موبائل کی بیل بجی اور وہ تینوں چونکے۔ میں نے موبائل نکال کر دیکھا تھا کہ فرنٹ سیٹ والے نے چھین کر اسے آف کر دیا۔ اس پر آسیہ کی کال آرہی تھی۔ اس نے موبائل آف کر کے ڈیش بورڈ کے خانے میں ڈال دیا اور میں بے بسی

سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ یقیناً آسیہ فکر سے کال کر رہی تھی کہ میں کہاں تھا؟ جلد وہ سڑک بھی آگئی جس پر مجھے مڑنا تھا۔ یہ کبھی پکی سڑک رہی تھی مگر اب بارشوں کی وجہ سے اس کا حشر ہو گیا تھا اور جگہ جگہ جمپ اور کھڈے تھے۔ ٹیکسی اس پر مڑتے ہی اچھلنے لگی تھی۔ اچانک ہی روشنی میں سڑک کے ساتھ ایک جوڑا دکھائی دیا۔ وہ یوں کھڑے تھے جیسے کسی گاڑی کے منتظر ہوں۔ ٹیکسی دیکھ کر انہوں نے ہاتھ لہرایا۔ مگر میں روک نہیں سکتا تھا۔ فرنٹ سیٹ والے نے انہیں اس وقت دیکھا جب ٹیکسی ان کے پاس سے گزرنے لگی تھی۔ اس نے بے ساختہ گالی دی۔ ''...... یہ یہاں موجود ہیں۔''

عقبی نشست والے نہیں دیکھ سکے تھے۔ ایک نے پوچھا۔ ''کون کس کی بات کر رہے ہو؟''

''وہی جوڑا...... کاش کہ یہ مسئلہ نہ ہوتا تو آج انہیں نہیں چھوڑتا۔''

''دفع کرو۔'' پیچھے والے نے کہا۔ ''ہمیں کیا؟''

''نہیں ایسے لوگوں کو بالکل نہیں چھوڑنا چاہیے۔'' وہ غرّایا۔ نہ جانے کیوں اسے اس جوڑے سے اتنی پرخاش تھی اور وہ انہیں مارنے کی بات کر رہا تھا۔ مجھے ان دونوں سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ زخمی تھا ورنہ ان بے چاروں کی شامت آجاتی۔ گاڑی گزر گئی تو میں نے عقبی آئینے میں دیکھا وہ مین روڈ کی طرف جا رہے تھے۔ ویسے مجھے تعجب ہوا تھا کہ یہ جوڑا اس ویرانے میں کیا کر رہا تھا؟ مگر مجھے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ میری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز تھی ذرا سی غلطی سے گاڑی کو نقصان ہو سکتا تھا اور میں واپسی کے قابل بھی نہ رہتا اگر یہ مجھے واپس جانے کی اجازت بھی دے دیتے۔

سڑک سے تقریباً ایک کلومیٹر اندر آنے کے بعد فرنٹ سیٹ والے نے رکنے کو کہا۔ مجھے سڑے ہوئے پانی کی بدبو آرہی تھی گویا ہم جھیل کے آس پاس کہیں تھے۔ یہاں نیم تاریکی میں چند مکانوں کے ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔ وہاں لائٹ نہیں تھی یا اگر کسی طرح سے بجلی لی ہوئی تھی تب بھی لائٹ غائب تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا کہ ان کا ٹھکانا آ گیا تھا۔ اب مجھے جانے کی اجازت مل جانی چاہیے تھی۔ مگر فرنٹ سیٹ والا کسی قدر دقت سے نیچے اترا اور اس نے مجھ سے کہا۔ ''نہیں''

''کیوں؟'' میں چلّا اٹھا تھا۔ ''تم نے کہا تھا کہ تم مجھے جانے کی اجازت دو گے۔''

''اس وقت تمہارے لیے جانا ٹھیک نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''دوسرے تم نے ہمارا ٹھکانا دیکھ لیا ہے۔''

''تت...... تم مجھے قتل کر دو گے۔'' میں نے ہکلا کر کہا۔

''نہیں...... یہ ہمارا عارضی ٹھکانا ہے اور صبح سے پہلے ہم یہاں سے چلے جائیں گے تب تمہیں بھی جانے کی اجازت ہو گی۔''

''یار کیوں اتنی وضاحت کر رہا ہے۔'' عقبی نشست والا بولا۔ ''نہیں مان رہا تو اسے گولی مار۔''

''نہیں۔'' میں جلدی سے چابی نکال کر نیچے اتر آیا۔ ''مان تو رہا ہوں۔''

وہ تینوں مجھے گھیرے میں لے کر ایک مکان کی طرف بڑھے۔ چار دیواری میں بڑا سا لوہے کا زنگ آلود گیٹ لگا ہوا تھا۔ انہوں نے اس کا چھوٹا دروازہ کھولا اور ہم اندر آئے۔ یہاں ایک بڑی سی کھلی جیپ موجود تھی اور کونے میں دو کمرے بنے ہوئے تھے ان کے ساتھ ایک لیٹرین یا غسل خانہ تھا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لائے اور ایمرجنسی لائٹ جلائی... فرنٹ سیٹ والے نے کہا۔ ''ابھی تم کچھ دیر یہاں رہو گے۔ میں پھر کہہ رہا ہوں کوئی حماقت مت کرنا ہم تمہیں مارنا نہیں چاہتے ورنہ کب کا مار چکے ہوتے۔ ذرا صبر کرو پھر تم آزاد ہو گے۔''

وہ دروازہ باہر سے بند کر کے چلے گئے۔ حبس اور گرمی سے زیادہ خوف اور گھبراہٹ سے میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ میرا دل چاہا کہ چلّانا شروع کر دوں اور ان سے کہوں کہ اگر مجھے مارنا ہے تو ابھی مار دیں یوں اذیت نہ دیں۔ نہ جانے کیسے میں نے خود پر قابو پایا۔ اب تک انہوں نے مجھ سے جو وعدے کیے تھے ان میں سے ایک بھی پورا نہیں کیا اور وہ مجھے یہاں تک لے آئے تھے۔ مجھے یہاں قید کر دیا تھا اور شاید یہیں مار کر مجھے دفن کر دیتے۔ اس کمرے کا فرش کچا تھا۔ دیواریں اینٹوں سے بنی تھیں اور اوپر سیمنٹ کی شیٹ تھی۔ دروازہ لوہے کا تھا اور اسے کھولنا کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ کمرے میں صرف لوہے کی چارپائی تھی۔ ایمرجنسی لائٹ کیل کی مدد سے دیوار پر ٹنگی تھی۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ابھی ان لوگوں کو گئے ہوئے کچھ دیر گزری تھی کہ کسی کی گھٹی گھٹی چیخ سنائی دی اور پھر وہ کراہنے لگا۔ شاید فرنٹ سیٹ والے کے جسم سے گولی نکالی جا رہی تھی۔ اس کی کراہیں دس پندرہ منٹ تک سنائی دیتی رہیں پھر خاموشی چھا گئی۔

کمرے میں حبس اور گرمی کی وجہ سے مجھے پیاس لگنے لگی تھی اور دروازہ بجا کر ان سے پانی مانگتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ مگر کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک شاپر اندر رکھ دیا۔ دروازہ بند ہونے پر میں نے اسے اٹھا کر دیکھا تو اس میں پانی کی ایک بوتل اور دو عدد سیب تھے۔ میں نے پانی پیا اور سیب کھانے کا خیال بھی ذہن کے کسی گوشے میں نہیں تھا۔ پانی پی کر میں خود کو کسی قدر بہتر محسوس کرنے لگا اور مجھے خیال آیا کہ اس سے پہلے میری قسمت کا فیصلہ ہو جائے مجھے آزاد ہونے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ پہلی بار میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس میں ایک طرف لوہے کی گرل اور پٹ والی کھڑکی لگی تھی۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا اتنی دیر سے گرمی اور حبس برداشت کر رہا تھا اور کھڑکی کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ کھڑکی مسلسل بند رہنے کی وجہ سے کسی قدر جام تھی مگر زور لگانے پر کھل گئی۔

اس کے کھلتے ہی باہر سے جاں فزا اور تازہ ہوا کا جھونکا آیا اور مجھے لگا جیسے میں قبر سے باہر آ گیا ہوں۔ باہر اس وقت تیز ہوا چل رہی تھی اور ایسی آواز آ رہی تھی جیسے کہیں مٹی گر رہی ہو۔ یہ کھلا علاقہ تھا اور یہاں ہوا تیز ہی چلتی ہے۔ کھڑکی کھولتے ہوئے ذرا آواز ہوئی تھی میں ڈرا کہ کہیں کوئی متوجہ نہ ہو مگر کسی نے توجہ نہ دی۔ چند گہرے سانس لے کر میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ دیواریں بغیر پلاسٹر کی لیکن مضبوط تھیں اور ان میں کہیں رخنہ تک نہیں تھا۔ اسی طرح واحد دروازہ لوہے کا اور یہ بھی ایسا تھا کہ اسے توڑنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ میں مایوس ہوا تھا کہ اس قید خانے سے باہر جانے کی کوئی راہ نہیں تھی۔ دروازے کے نیچے تین انچ کا خلا تھا اور اس سے صرف کوئی بلی باہر جا سکتی تھی۔ کسی انسان کا نکلنا ممکن نہیں تھا۔ میں چارپائی پر آ بیٹھا اور انتظار کرنے لگا کہ قدرت میرے لیے کیا سامنے لاتی ہے۔

باہر سناٹا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ سو گئے تھے تو یہ میرے لیے موقع تھا کہ یہاں سے فرار ہو جاؤں۔ مگر کیسے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کمرے سے نکل جاتا تو اس کے بعد یہاں سے فرار ہونا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کیونکہ اس گھر کی چار دیواری زیادہ اونچی نہیں تھی اور باہر میری ٹیکسی تھی جس کی چابی بھی میرے پاس تھی۔ سوچتے ہوئے ایک بار میری نگاہ دروازے کے نیچے کے خلا تک گئی اور اسے دیکھ کر میں آگے آیا۔ انگلیوں سے چوکھٹ کا حصہ کھرچا تو پتا چلا کہ یہ کچی زمین کا حصہ ہے۔ یعنی دروازے کے نیچے زمین کچی تھی۔ اگر مجھے کوئی مٹی کھودنے والی چیز مل جاتی تو میں یہاں سے آزاد ہو سکتا تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور چابی نکالی اس کی کی چین کے ساتھ کئی اوزاروں والا پیک تھا میں نے اس میں سے چاقو باہر نکالا اور مٹی کھودنے لگا۔

شروع میں ذرا مشکل ہوئی کیونکہ مٹی سخت تھی اور اس پر گرنے والا پلاسٹر اور سیمنٹ بھی جم گیا تھا مگر ایک بار اوپر کی پرت اکھڑی تو نیچے سے نرم مٹی نکل آئی۔ مجھے دو فٹ چوڑا اور ایک گہرا اور دو فٹ لمبا سوراخ کرنے میں تقریباً آدھا گھنٹا لگ گیا۔ میں بہت احتیاط سے کام کر رہا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ کوئی باہر سے مجھے دیکھ نہ لے۔ اگر کوئی کمرے کے دروازے کی طرف دیکھ لیتا تو میں اسے مٹی کھودتا ہوا صاف نظر آ جاتا۔ میں نکلنے والی مٹی اندر کھینچ رہا تھا۔ پھر ہر چند سیکنڈ بعد رک کر باہر کی سن گن لیتا تھا۔ جب باہر سناٹا محسوس ہوتا تو دوبارہ کام شروع کر دیتا۔ اس وجہ سے یہ چھوٹا سا حصہ کھودنے میں اتنی دیر لگ گئی۔ جب میں نے محسوس کیا کہ میں اب کسی قدر دقت کے ساتھ اس سے نکل جاؤں گا تو پہلے میں نے سر نکال کر باہر دیکھا۔ صحن خالی تھا یعنی وہ تینوں دوسرے کمرے میں تھے۔ میرے لیے موقع تھا کہ میں باہر جا سکوں۔

میں نے پشت کے بل لیٹ کر باہر کی طرف سرکنا شروع کر دیا۔ پہلے سر باہر نکالا اور صحن میں جھانک کر دیکھا۔ پھر جسم کو نیچے کی طرف دباتے ہوئے سینہ نکالنے لگا۔ لوہے کے دروازے کا نچلا حصہ زنگ آلود اور کھردرا تھا۔ جسم پر لگ رہا تھا اور خراشیں ڈال رہا تھا۔ ابھی میں نے کچھ ہی سینہ باہر نکالا تھا کہ اچانک برابر والے کمرے سے کوئی نکلا اور میری طرف دیکھے بغیر لیٹرین کی طرف چلا گیا۔ وہ اتنا اچانک آیا کہ میں دنگ رہ گیا کوئی آہٹ بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے جاتے ہی میں نے عجلت میں باہر نکلنا شروع کیا کیونکہ جاتے ہوئے اس کا رخ دوسری طرف تھا اور وہ عجلت میں بھی تھا اس لیے مجھ پر نظر نہیں گئی مگر واپس آتے ہوئے اس کی نظر لازمی اس طرف ہوتی اور وہ مجھے دیکھ لیتا۔ اس کی واپسی سے پہلے مجھے نکل جانا تھا۔ لوہے کی رگڑ نے سینے کو جگہ جگہ سے چھیل دیا مگر موت کے مقابلے میں یہ تکلیف کچھ نہیں تھی۔ سینہ ہی مشکل تھا۔ جیسے ہی یہ نکلا کام آسان ہو گیا۔ پیٹ نکال کر میں نے کسی قدر دقت سے ٹانگیں بھی نکال لیں اور اٹھ کر جلدی سے کمرے کی آڑ میں آ گیا۔

اب میں لیٹرین جانے والے کا منتظر تھا۔ وہ اندر چلا

جاتا تو پھر میں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا۔ وہ چند منٹ بعد نمودار ہوا اور کمرے کی طرف آیا۔ میرا سانس رک گیا کہ ابھی وہ کمرا کھول کر دیکھے گا اور مجھے غائب پائے گا تو فوراً ہی میری تلاش شروع ہو جائے گی اور میں بھاگنے سے پہلے پکڑا جاؤں گا۔ ایک لمحے کو مجھے پچھتاوا ہوا کہ اس کا انتظار کرنے کی بجائے میں نے فوراً ہی بھاگنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ میں سانس روکے کھڑا تھا کہ ابھی وہ کنڈی کھولے گا مگر اس نے کنڈی نہیں کھولی صرف اسے ہلا کر چیک کیا کہ وہ لگی ہے اور واپس اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سکون کا طویل ترین سانس لیا تھا۔ اب مجھے یہاں سے نکلنا تھا اور ان حالات میں یہ کام آسان نہیں تھا ذرا سی آہٹ سے ان کو پتا چل جاتا کہ میں آزاد ہو گیا ہوں اور مجھے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ وہ مجھے فوراً گولی مار دیں گے۔

میں ان کے لیے خطرہ تھا وہ تو اس بے چارے جوڑے کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جو کسی وجہ سے ان کے لیے ناپسندیدہ تھا۔ میں دبے قدموں گیٹ تک آیا مگر جب یہ گیٹ کھلا تھا اور اندر آ کر انہوں نے کنڈی لگائی تب ہی میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی زنگ آلود کنڈی کتنا شور کر رہی تھی۔ اسے کھولنا تو اپنا پول خود کھولنے کے برابر تھا۔ بڑا گیٹ تالے سے بند تھا۔ اندر سے یہ سپاٹ چادر والا تھا اور اس کا اوپری حصہ اتنا بلند تھا کہ وہاں تک میرا ہاتھ نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے نیچے اینٹوں کی چوکھٹ تھی اس لیے کھدائی کر کے باہر جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اب مجھے دیوار پھلانگنی تھی۔ دیوار کوئی آٹھ فٹ اونچی تھی۔ میں نے ایک جگہ جہاں کچھ مٹی جمع تھی اچھل کر اس کے منڈیر پر ہاتھ جمائے اور خود کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی مگر مجھے اس کی کوئی پریکٹس نہیں تھی اور نہ ہی میرے بازوؤں میں اتنا زور تھا۔ مجھے دیوار پر چڑھنے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ اس کے بغیر یہ کام ممکن نہیں تھا۔ ایک مشکل ختم ہوتی نہیں تھی کہ دوسری سامنے آ جاتی تھی۔ میں آزاد ہو کر بھی اس چار دیواری میں قید تھا۔

میں نے کوئی ایسی چیز تلاش کرنا شروع کی جسے دیوار کے ساتھ رکھ کر میں اوپر چڑھ سکوں۔ مگر احاطے میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ حد یہ کہ اینٹ پتھر تک نہیں تھے۔ میں اپنے کمرے کا دروازہ کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کی زنگ آلود کنڈی بھی اتنا ہی شور مچاتی اور ان لوگوں کو پتا چل جاتا۔ ورنہ میں اندر سے چارپائی اٹھا لاتا اور اسے دیوار سے لگا کر با آسانی اوپر چڑھ جاتا۔ صحن میں موجود جیپ کی

متوقع عمر کا نیا پیمانہ

اس جہانِ فانی سے کوچ کرنے والے تین لاکھ افراد کا میڈیکل ڈیٹا اور ان سے متعلق اعداد و شمار کا تجزیہ کرنے کے بعد "کاس بزنس اسکول لندن" کے محققین نے ایک سادہ سا فارمولا وضع کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر آپ اندازہ لگانا چاہتے ہیں کہ آپ کتنی عمر پائیں گے تو اس وقت اپنی کمر ناپ لیجیے۔ برطانیہ میں اس وقت اوسط عمر 81 سال سمجھی جاتی ہے۔ پاکستان اور اس جیسے دیگر ممالک میں اوسط عمر 70 سے بھی کم ہے۔ بہر حال، برطانوی حساب سے اگر 30 سال کے ایک شخص کا قد پانچ فٹ دس انچ ہے تو اس کی کمر 35 انچ ہونی چاہیے۔ تب وہ اوسط طبعی عمر تک پہنچنے کی امید رکھ سکتا ہے۔ اگر اس کی کمر 42 انچ ہے تو اسے اپنی متوقع اوسط عمر میں سے دو سال کم کر لینے چاہئیں لیکن اگر کمر 56 انچ تک پہنچ چکی ہو تو پھر اسے متوقع اوسط عمر میں سے 20 سال کم کر لینے چاہئیں۔ اس حساب کتاب کی بنیاد پر اس نظریے پر رکھی گئی ہے کہ آپ کے جسم کے درمیانی حصے پر موجود چربی، فاضل کولیسٹرول کی موجودگی اور بہت سی بیماریوں کے امکانات کی نشاندہی کرتی ہے۔

مرسلہ: نادیہ عمر۔ لاہور

طرف آیا۔ یہ پرانی طرز کی بڑے ٹائروں والی کھلی جیپ تھی۔ میں نے اس کا جائزہ لیا تو اس کی عقبی سیٹیں مجھے نکلنے والی لگیں۔ انہیں ہلایا جلایا تو میرا اندازہ درست نکلا۔ یہ نٹ بولٹ کی مدد سے جیپ کے فرش پر فکس تھیں۔ اوزار مجھے جیپ کے ٹول بکس سے مل گئے۔ موزوں کی تلاش کر کے میں نے ایک سیٹ کے بولٹ کھولنے شروع کیے۔ تاریکی اور گھبراہٹ میں یہ کام آسان نہیں تھا۔ ہر لمحہ ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی کوئی آ جائے گا اور میں پکڑا جاؤں گا۔

بہ مشکل میں نے ایک سیٹ کے بولٹ کھولے اور اسے نکالنے لگا تو کچھ آوازیں ہوئی تھیں۔ میں خوف سے ساکت رہ گیا۔ جب ان آوازوں پر کوئی ردِعمل نہیں ہوا تو میں پھر حرکت میں آیا اور بہت آہستہ سے سیٹ نکالی اور دیوار تک آیا۔ سیٹ کے ساتھ رکھ کر میں اوپر چڑھا اور دیوار پر بازو جما کر خود کو اوپر اٹھانے لگا۔ آدمی کو جس کام کی پریکٹس نہ ہو اور

اسے پہلی بار کرتا ہوتو جتنی مشکل اسے پیش آسکتی ہے مجھے اس سے زیادہ ہی مشکل پیش آئی تھی۔ ہاتھ، پیروں پر خراشیں ڈلوا کر میں کسی طرح اس پتلی سی دیوار کے اوپر چڑھا کیونکہ اوپر مشکل سے تین انچ والی اینٹیں لگی تھیں۔ اوپر جانے کے لیے زیادہ زور لگایا تو یک دم اوپر گیا اور باہر گرتے گرتے بچا۔ بڑی مشکل سے خود کو بچایا اور ایک پاؤں دوسری طرف لٹکایا پھر ہاتھوں سے دیوار پکڑتے ہوئے دوسرا پاؤں لٹکایا اور ممکن حد تک نیچے ہوکر ہاتھ چھوڑ دیے۔

میں ایک فٹ کی بلندی سے گرا مگر عین نیچے کوئی پتھر تھا سیدھا پاؤں اس پر گیا اور ایسی ٹیس اٹھی کہ میں نے بہت مشکل سے اپنی چیخ روکی تھی۔ ایک لمحے کو لگا کہ ٹخنہ ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے نیچے بیٹھ کر پاؤں ٹٹولا تو ویسے ٹھیک لگا۔ مگر تکلیف زیادہ تھی۔ کچھ دیر بیٹھا رہا پھر ہمت کر کے اٹھا۔ میں مکان سے نکل آیا تھا مگر اس ویرانے سے نکلنا باقی تھا۔ کھڑا ہونے پر مجھے اندازہ ہوا کہ چوٹ شدید ہے مگر ہڈی محفوظ ہے ورنہ میں کھڑا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے باوجود پاؤں رکھنا محال ہورہا تھا اور ہر قدم پر مجھے جیسے قیامت سے گزرنا پڑتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح میں ٹیکسی تک پہنچ گیا۔ اندر گھس کا چابی نکالنا چاہی تو پتا چلا کہ جیب میں چابی نہیں ہے۔ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ میں نے دیوانہ وار تمام جیبیں ٹٹول لیں۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا میں نے پتلون کی سامنے والی پاکٹ میں چابی ڈالی تھی مگر وہ اس میں نہیں تھی۔ شاید دیوار پر چڑھتے یا اترتے ہوئے گرگئی۔

مایوسی اور بے بسی سے مجھے رونا آگیا تھا۔ پاؤں کی تکلیف کے ساتھ واپس دیوار تک جانا محال لگ رہا تھا اور میں اس تاریکی میں چابی کہاں سے تلاش کرتا۔ مگر چابی لازمی تھی اس کے بغیر میں یہاں سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اگر پاؤں میں چوٹ نہ لگی ہوتی تو میں چابی اور ٹیکسی کی پروا کیے بغیر یہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا۔ مگر اس حالت میں چند قدم چلنا بھی مشکل تھا۔ میں کسی نہ کسی طرح اتر کر واپس دیوار تک پہنچا۔ اپنی کراہیں ضبط کرنے کے لیے مجھے منہ پر ہاتھ رکھنا پڑا تھا اور دیوار کے پاس پہنچ کر میں گرہی گیا۔ اب مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جارہا تھا۔ بہ مشکل اٹھ کر بیٹھا اور بیٹھے بیٹھے ہی زمین پہ ہاتھ مار کر چابی تلاش کرنے لگا۔ میں اندازے سے واپس آیا تھا کہ میں کہاں سے اترا تھا اور چابی اسی جگہ گری ہوگی۔ مجھے اس پتھر کی تلاش تھی جس پر میرا پاؤں آیا تھا۔ بالآخر پتھر مل گیا اور میں اس کے آس پاس چابی تلاش کرنے لگا۔ زمین پر ہاتھ مارتے ہوئے میں دل ہی دل میں چابی ملنے کی دعا کررہا تھا اور پھر دعا پوری ہوئی میرے ہاتھ میں چابی آئی اور اسی لمحے اندر سے چلانے کی آواز آئی۔

''وہ نکل گیا ہے۔''

''تلاش کرو اسے۔'' فرنٹ سیٹ والے کی مضطرب آواز آئی۔ ''کہیں وہ ان لوگوں کے ہاتھ نہ لگ جائے۔''

''ہماری طرف سے جہنم میں جائے۔'' دوسرے نے غصے سے کہا۔ ''اب یہاں سے نکلنا ہوگا۔ سامان سمیٹو اس سے پہلے کہ پولیس یہاں آئے۔''

میں ان کی آوازیں سن کر سن رہ گیا تھا۔ وہ باہر نکلتے اور میں ان کی نظروں میں آجاتا۔ ٹیکسی تک جانے کا وقت نہیں تھا کیونکہ وہ گیٹ کھول رہے تھے اور جلد باہر آجاتے۔ میں نزدیک نظر آنے والی ایک جھاڑی کی طرف سرکنے لگا۔ یہ زیادہ بڑی نہیں تھی مگر میں اس کی اوٹ میں لیٹ جاتا تو کوئی نزدیک آئے بغیر مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں بروقت جھاڑی کی اوٹ میں ہوا کیونکہ وہ لوگ ایمرجنسی لائٹس لے کر باہر نکل آئے تھے۔ ان کی روشنی میں مجھے آس پاس تلاش کررہے تھے۔ اگر میں جھاڑی سے باہر ہوتا تو ان کی نظروں میں آجاتا۔ انہوں نے ہر طرف دیکھا اور جب میں نظر نہیں آیا تو ایک نے کہا۔ ''شاید وہ جھیل اور مزار کی طرف بھاگا ہے۔ اس کی گاڑی یہیں کھڑی ہے۔ جیپ نکالو اسے تلاش کرنا ہے۔''

انہوں نے ٹیکسی بھی دیکھی۔ پھر اندر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی میں جھاڑی سے نکلا اور لنگڑاتا ہوا ٹیکسی تک پہنچ گیا اور اس کے نیچے گھس گیا۔ یہی ایک جگہ تھی جہاں میں محفوظ تھا۔ چند منٹ بعد اندر سے جیپ نکلی اور ایک نے گیٹ بند کیا اور جیپ میں سوار ہوگیا وہ گھوم کر جھیل کی طرف چلی گئی۔ میں ٹیکسی کے نیچے سے نکلا اور ڈرائیونگ سیٹ پر آیا۔ انجن اسٹارٹ کیا مگر روشنیاں بند رکھی تھیں۔ ٹیکسی واپس موڑ کر سڑک کی طرف چل پڑا۔ تاریکی میں راستہ نظر نہیں آرہا تھا اس لیے میں دھیمی رفتار سے ڈرائیو کررہا تھا۔ جیسے ہی عقب میں جیپ کی روشنیاں غائب ہوئیں میں نے ٹیکسی کی ہیڈ لائٹس آن کیں اور ہر ممکن تیزی سے سڑک کی طرف روانہ ہوا۔ ناہموار سڑک پر ٹیکسی اچھل رہی تھی مگر میں پہلی بار اس کی پروا کیے بغیر ڈرائیو کررہا تھا۔ اس وقت میری جان پر بنی ہوئی تھی اور اگر وہ پیچھے سے آجاتے تو میری سی این جی والی ٹیکسی اس ڈیزل جیپ کا مقابلہ نہیں

کر سکتی تھی۔

چند منٹ بعد میں سڑک پر پہنچ گیا اور پھر میں نے پیچھے دیکھا تو دور تک تاریکی تھی۔ مجھے اطمینان ہوا کہ وہ واپس نہیں آئے تھے اور شاید آتے بھی نہیں۔ انہیں میرے فرار کے بعد پولیس کا خوف تھا اور وہ اب یہاں نہیں رک سکتے تھے۔ خطرہ مجھے یہ تھا کہ وہ میرے پیچھے نہ آجائیں۔ میں عقب میں دیکھ رہا تھا اس لیے مجھے پتا نہیں چلا کہ وہ جوڑا کب میری ٹیکسی تک آگیا۔ میں نے جب سامنے دیکھا تو ان کی موجودگی محسوس کر کے ایک بار پھر میری گھگی بندھ گئی تھی۔ یہ سوچ کر کہ وہ تینوں کسی اور طرف سے یہاں سڑک پر آگئے تھے اب میرے منتظر تھے۔ انہیں معلوم ہوگا کہ میں اسی سڑک سے نکلوں گا۔ مگر جلد مجھے محسوس ہوا کہ ان میں ایک عورت تھی۔ انہوں نے بھی میرا خوف محسوس کر لیا تھا۔ مرد بولا۔

''ڈرو مت، ہم بے ضرر لوگ ہیں۔''

میں نے ٹیکسی کی اندرونی لائٹ آن کی تو پہلی بار ان کو پاس سے دیکھا۔ یہ وہی جوڑا تھا جس کے بارے میں زخمی نے کہا تھا کہ اگر وہ زخمی نہ ہوتا تو آج وہ ان دونوں کو قتل کر دیتا۔ مرد تقریباً چالیس سال کا اور عام جسامت اور صورت والا بے ضرر نظر آنے والا آدمی تھا۔ البتہ عورت بہت خوب صورت تھی۔ گوری چٹی اور کسی قدر لمبی وصحت مند تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا پھولدار اور خاصا چست لباس پہن رکھا تھا۔ اس میں اس کے نشیب و فراز اور کمر کے نیچے کا حصہ بہت نمایاں تھا۔ قمیض کا گریبان بھی خاصا کشادہ تھا اور اس سے اس کی دودھیا رنگت جھلک رہی تھی۔ اس نے چھوٹا سا دوپٹا بے پروائی سے لے رکھا تھا۔ اس کے شانے پر ایک ہینڈ بیگ لٹکا ہوا تھا اور مرد خالی تھا۔ مرد کھنکارا تو مجھے احساس ہوا کہ میں بد تہذیبی سے عورت کو گھور رہا تھا۔ میں نے کھسیا کر جلدی سے کہا۔

''تم لوگ اس خطرناک جگہ کیا کر رہے ہو؟''

''ہم یہاں کسی سے ملنے آئے تھے۔'' عورت نے ایک ادا سے کہا۔ اس نے جسم کو یوں حرکت دی کہ میں بے اختیار نظریں چرانے پر مجبور ہو گیا۔ ایک لمحے کو میرے ذہن سے پیچھے رہ جانے والا خطرہ بھی نکل گیا تھا۔ مرد نے بتایا۔

''واپس جا رہے ہیں مگر کوئی سواری نہیں مل رہی۔ تمہاری ٹیکسی دکھائی دی تھی۔ سوچا کہ تم واپس آؤ گے مگر تم نے بھی اتنی دیر کر دی۔''

''تو تم لوگ اتنی دیر سے یہیں موجود تھے؟'' میں نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''ہاں ادھر بہت خطرناک لوگ ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ میری عورت بھی ہے۔ اس لیے ہم جھاڑیوں میں چھپ گئے کہ رات یہیں گزار کر صبح جائیں گے۔''

''تم نے ٹھیک کیا، مجھے جو لوگ لے گئے تھے وہ بھی بہت خطرناک اور قاتل ہیں۔ انہوں نے مجھے زبردستی ساتھ لے کر واردات کی اور پتا نہیں کسی کو مارا یا زخمی کیا۔ ان میں سے بھی ایک زخمی ہوا اور اس نے تم دونوں کو دیکھ کر کہا کہ وہ اگر زخمی نہ ہوتا تو تمہیں آج رات نہ چھوڑتا۔ تمہاری اس سے کیا دشمنی ہے؟''

عورت کھڑکی کی طرف جھکی۔ ''یہ لوگ مجرم ہیں ایک بار ہم نے ان کے خلاف پولیس میں رپورٹ کرائی تھی تب سے یہ ہمارے دشمن ہو گئے ہیں۔''

میں نے صرف سنا کہ اس نے کیا کہا ہے کیونکہ میری نظر تو اس نظارے میں الجھ کر رہ گئی تھی جو وہ دکھا رہی تھی۔ پھر میں چونکا وہ کہہ رہی تھی۔ ''تم بتاتے کیوں نہیں ہو ہمیں شہر تک لے جاؤ گے؟''

میں ایک بار پھر چونک کر کھسیایا اور بولا۔ ''ہاں آجاؤ۔ جلدی کرو اس سے پہلے کہ وہ آجائیں ان کے پاس طاقتور جیپ ہے میری ٹیکسی رفتار میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔''

عورت نے دروازہ کھولا اور یوں بل کھا کر اندر آئی کہ میرا ذہن ایک بار پھر بھٹکا۔ حالانکہ میں لاحول پڑھ رہا تھا مگر وہ ان عورتوں میں سے تھی جو مرد کے ہوش اڑا دیتی ہیں اور میرے حواس تو پہلے ہی گم تھے۔ نزدیک آتے ہی اس کے پاس سے بہت انوکھی اور تیز خوشبو آئی تھی۔ وہ جان بوجھ کر دروازے کی طرف ہونے کی بجائے میری طرف ہو کر بیٹھی تھی۔ مرد پچھلی نشست پر آگیا۔ میں نے اندر کی لائٹ بند کی اور ٹیکسی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ ''اس خطرناک علاقے میں تمہارا کون رشتے دار رہتا ہے۔''

''رشتے دار نہیں ہے۔'' عورت بولی۔ ''ایک واقف کار ہے اس نے ادھار لیا تھا اور ہم واپس لینے آئے تھے۔ وہ گھر پر نہیں تھا انتظار میں دیر ہوگئی اور پھر نکلتے ہوئے یہ وقت ہو گیا تھا جب تم نے جاتے ہوئے ہمیں دیکھا تھا۔''

میں نے عورت کی طرف دیکھا۔ ''تمہارے شوہر کو آنا چاہیے تھا۔ یہ جگہ تم جیسی عورت کے لیے بالکل ٹھیک نہیں

ہے۔''

''میرے لیے کیوں ٹھیک نہیں ہے۔'' اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا اور گیئر پر جمے میرے ہاتھ پر اپنا نرم و گداز ہاتھ رکھ دیا۔ ساتھ ہی وہ خاص انداز سے میری طرف جھکی تھی۔

''تم خوب صورت عورت ہو اور یہاں بہت خطرناک لوگ رہتے ہیں۔'' میں روانی میں کہہ گیا اور پھر مجھے احساس ہوا کہ اس کا شوہر پیچھے موجود ہے۔ ''معاف کرنا میرا مطلب یہ نہیں ہے۔''

''مطلب کو چھوڑو۔'' وہ بے تکلفی سے بولی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے مگر میں مراد کے ساتھ رہتی ہوں، ہم ہر جگہ ساتھ جاتے ہیں۔''

''تم لوگوں کی رہائش کہاں ہے؟''

''تم ہمیں...... چورنگی پر اتار دینا۔'' عورت بولی پھر اس نے ناز بھرے انداز میں چیخ ماری۔ ''ہائے اللہ میری انگوٹھی گر گئی ہے۔ گاڑی روکو۔''

''کیوں کیا باہر گری ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں اندر ہے مگر چلتی گاڑی میں کیسے تلاش کروں روک کر لائٹ آن کرو۔'' وہ بولی۔ ''سونے کی ہے اس پر زمرد لگا ہوا ہے۔''

ہم اس جگہ سے خاصا آگے نکل آئے تھے اور اب فیکٹریوں کا علاقہ شروع ہونے والا تھا۔ میں نے بریک لگائی اور ٹیکسی رک گئی۔ میں نے ہاتھ اوپر کر کے اندر کی لائٹ آن کی اور جیسے ہی ہاتھ نیچے کیا عقب سے کوئی چیز آ کر میری گردن سے لپٹ گئی۔ میں نے تڑپ کر اسے گردن سے الگ کرنا چاہا تھا مگر اتنی سی دیر میں وہ اتنی کس گئی کہ میری انگلیاں رسی میں نہیں جا رہی تھیں۔ عورت نے پھرتی سے اندر کی لائٹ آف کی اور میرے ہاتھ پکڑ لیے۔ اس میں بھی بڑی جان تھی میں ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا اور ناکام رہا تھا۔ اب سمجھ میں آیا کہ عورت میرے برابر میں کیوں آئی اور مرد عقب میں کیوں بیٹھا اور زخمی ہونے والا ان میاں بیوی یا جوڑے کے بارے میں کن خدشات کا اظہار کر رہا تھا مگر اب دیر ہو گئی تھی۔ میری گردن میں آنے والی رسی ہر گزرتے لمحے تنگ ہوتی جا رہی تھی اور میں اسے کناروں سے تھام کر مزید تنگ ہونے سے روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

دم گھٹنے لگا تو میں پاؤں مارنے لگا۔ خود کو پیچھے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر سیٹ اور عقب میں موجود مرد میری ساری کوششیں ناکام بنا رہے تھے۔ اس نے جتنی مہارت سے کام کیا تھا صاف لگ رہا تھا کہ اس کے لیے اور عورت کے لیے یہ سب نیا نہیں تھا۔ مجھے قابو کرنے کی کوشش میں عورت مجھ پر تقریباً سوار ہو گئی تھی مگر مجھے اس وقت اس کے وجود کی کشش کا خیال تک نہیں تھا۔ میری جان پر بنی ہوئی تھی اور میں ڈوبتے آدمی کی طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اب سانس رکنے سے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ میں اسے دم گھوٹنے سے تو نہیں روک پایا تھا مگر میں نے رسی کو اتنا تنگ ہونے سے ضرور بچا لیا تھا کہ میرا نرخرہ پھٹنے نہ پائے ورنہ میں جلد مر جاتا۔ اس کے باوجود موت اب زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ اندھیرا گہرا ہوتا چلا گیا اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔

مجھے لگا جیسے میں مر گیا ہوں۔ تاریکی بہت گہری تھی مگر اچانک ہی جیسے میں تاریکی سے نکل آیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ گلے میں شدید درد تھا مگر سانس لی جا رہی تھی۔ زندگی بخش ہوا میرے جسم میں جا کر مجھے پھر سے زندہ کر رہی تھی۔ رفتہ رفتہ میرے حواس بھی بحال ہونے لگے اور پھر میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو آواز آئی۔ ''لیٹے رہو ابھی تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اسی طرح سانس لیتے رہو۔''

میں سن ہو گیا کیونکہ آواز اسی زخمی کی تھی جس کی قید سے میں آزاد ہوا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو خود کو سڑک پر دراز پایا۔ وہ میرے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ کچھ فاصلے پر سڑک کے ساتھ کچے میں دونوں میاں بیوی سروں پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے اور زخمی کے دونوں ساتھی ان کے سروں پر سوار تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھیار نظر آ رہے تھے۔ ٹیکسی کی روشنیاں آن تھیں اور اسی وجہ سے یہ سب صاف دکھائی دے رہا تھا ورنہ رات تو اور بھی گہری ہو گئی تھی۔ میرا گلا صحرا کی طرح خشک ہو رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کنویں سے نکل کر کھائی میں گرا ہوں یا کھائی کے بعد کنویں میں بھی گر گیا ہوں۔ میں ان لوگوں کی قید سے فرار ہوا تھا اور اب یہ نہ جانے میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟ اس نے میری تشنگی محسوس کر لی تھی اور پانی کی بوتل میری طرف بڑھائی۔ میں نے بے تابی سے پانی پیا۔ پانی نے حیرت انگیز طور پر گلے کے درد کو کم کر دیا تھا۔ میں نے اسے بوتل واپس کی تو اس نے جوڑے کی طرف اشارہ کیا۔

''تم کو منع کیا تھا کہ ابھی مت جانا اور تم باہر نکلے اور ان کے ہتھے چڑھ گئے۔''

''آگے جانا چاہتے تھے اس لیے میں نے بٹھالیا۔'' میں نے سرگوشی نما آواز میں کہا۔ اگلے کئی دن تک میں اسی طرح بات کرتا رہا تھا۔

''بے وقوف یہ شکاری ہیں۔'' اس نے جھڑک کر کہا۔ ''شکر کرو کہ ہم بروقت آگئے۔ ورنہ اس وقت تمہاری لاش جھاڑیوں میں پڑی ہوتی اور یہ تمہاری ٹیکسی لے کر نو دو گیارہ ہو چکے ہوتے۔''

''تم لوگ مجھے تلاش کر رہے تھے؟''

''صرف میں۔'' اس نے تصحیح کی۔ ''میرے ساتھی تو کہہ رہے تھے کہ لعنت بھیجو اور یہاں سے چلو ابھی تمہیں دور جانا ہے مگر مجھے تمہارا خیال تھا کیونکہ ہم تمہیں یہاں لائے تھے۔ تم ہماری ذمے داری تھے۔ اس لیے تم کو تلاش کرتے رہے۔ پہلے جنگل کے پاس دیکھا پھر واپس آئے تو ٹیکسی غائب تھی۔ ہم سڑک کی طرف آئے اگر ٹیکسی چورنگی تک نہ ملتی تو ہم سمجھ جاتے کہ تم بچ کر نکل گئے ہو اور ہم واپس چلے جاتے۔ مگر تمہاری ٹیکسی یہاں کھڑی تھی اور ہم پہنچے تو تم بس دنیا سے گزرنے ہی والے تھے۔''

''یہ دونوں ڈاکو ہیں۔''

''ڈاکو ان سے اچھے ہوتے ہیں۔'' اس نے نفرت سے کہا۔ ''یہ درندے ہیں۔ لوگوں کو دھوکا دے کر ان گاڑیوں میں بیٹھتے ہیں۔ یہ گھٹیا عورت اپنے حسن و شباب کو استعمال کرتی ہے۔ پھر یہ گاڑی میں موجود افراد کو ہلاک کر دیتے ہیں اور ان کی لاشیں جھاڑیوں میں پھینک کر گاڑی اور دوسری چیزوں سمیت فرار ہو جاتے ہیں۔ ایک آدمی ہو تو تمہارے ساتھ ہونے والا سلوک کرتے ہیں اور زیادہ ہوں تو گولی مار دیتے ہیں۔ یہ دو سال سے یہاں سرگرم ہیں اور اب تک کئی وارداتوں میں کم سے کم ایک درجن لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں۔''

مجھے اس کے ایک ایک لفظ کا یقین تھا کیونکہ میں خود ان میاں بیوی کا شکار ہوتے ہوتے بچا تھا۔ میری زندگی تھی ورنہ انہوں نے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں کھڑا ہو گیا۔ اب میں بہتر محسوس کر رہا تھا۔ ''میں تمہارا شکر گزار ہوں اور یقین کرو میں صرف اس چکر سے نکلنا چاہتا تھا ورنہ میرا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ پولیس کے پاس جانے کی حماقت کروں۔''

''اگر تم چلے بھی جاتے تو کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ عارضی ٹھکانا ہے اور یہاں ہمیں کوئی نہیں جانتا ہے۔ ہاں تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا کہ اپنا منہ بند رکھو اور اس واقعے کو بھول جاؤ۔''

''میں ایسا ہی کروں گا۔'' میں نے اسے یقین دلایا۔ پھر ان میاں بیوی کی طرف دیکھا۔ عورت کی قمیض شاید مزاحمت کی وجہ سے پھٹ گئی تھی اور اس کا بدن جھلک رہا تھا لیکن یقین کریں اس وقت وہ مجھے ایک ناگن لگی جس کے حسین بدن میں زہر بھرا ہوتا ہے۔ مرد خوفزدہ تھا مگر وہ بے خوف لگ رہی تھی۔ اس نے زخمی سے کہا۔ ''ہمیں جانے دو، ہمارے راستے میں مت آ۔''

''بکواس مت کرو۔'' زخمی غرایا۔ ''تمہاری وجہ سے ہمارے لیے حالات خراب ہوئے اور اب پولیس اس طرف زیادہ آنے لگی ہے۔ ویسے بھی تم لوگ مجرم نہیں شیطان ہو۔ میں اس معصوم بچی کو نہیں بھول سکتا جسے تم لوگ لے گئے تھے اور اسے زیادتی کے بعد قتل کر کے اس کی لاش پھینک دی تھی۔ آج تم لوگوں کا یوم حساب ہے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو ہم اکیلے ہیں۔'' عورت چیخ کر بولی۔ ''ہمارے پیچھے لوگ ہیں اور وہ تم سے حساب لیں گے۔''

''انہیں جھاڑیوں میں لے جاؤ۔'' زخمی نے عورت کی بات نظر انداز کر کے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا اور وہ انہیں ہانک کر جھاڑیوں میں لے گئے۔ زخمی نے مجھ سے پوچھا۔ ''تم ڈرائیو کر لو گے؟''

''ہاں کیا مجھے جانے کی اجازت ہے؟''

اس نے سر ہلایا اور جیب سے پرس نکال کر اس میں سے دو ہزار روپے میری طرف بڑھائے۔ میں نے انکار کیا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔''

''رکھ لو یار۔'' اس نے بے تکلفی سے کہا۔ ''مارنے اور بچانے والی اللہ کی ذات ہے۔''

اس نے تقریباً زبردستی دو ہزار میری جیب میں ڈال دیئے۔ میں نے شکریہ ادا کیا تو اس نے کہا۔ ''بس اب جاؤ اور کسی سے ذکر مت کرنا۔ بہتر ہے گھر والوں کو بھی مت بتانا ورنہ بات پھیل جاتی ہے۔ یہ عورت ٹھیک کہہ رہی ہے ان لوگوں کا پورا گروہ ہے وہ تمہارے پیچھے آسکتے ہیں۔''

''میں خود سے بھی نہیں کہوں گا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''بس اب جاؤ۔''

میں ٹیکسی میں بیٹھا اور اسے آگے بڑھا دیا۔ زخمی

جھاڑیوں کی طرف جارہا تھا میں کچھ آگے نکلا ہوں گا کہ عقب سے فائرنگ کی آواز آئی۔ چند فائر ہوئے اور پھر سناٹا چھا گیا۔ میں نے ٹیکسی کی رفتار تیز کر دی۔ گھر جانے سے پہلے میں نے مناسب سمجھا کہ ڈاکٹر کو دکھا دوں۔ ڈاکٹر نے گلے کا معائنہ کیا اور کہا کہ کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے دباؤ سے مسلز سوج گئے ہیں۔ اس نے دوا اور غرارے کے لیے لیکوئیڈ دیا جسے گرم پانی میں ڈال کر غرارے کرنے سے گلا جلد ٹھیک ہو جاتا۔ میں نے گھر جاتے ہوئے فیصلہ کیا کہ صرف آسیہ کو بتاؤں گا کہ میرے ساتھ کیا ہوا۔ وہ پیٹ کی مضبوط تھی اور میں منع کر دیتا تو کسی سے نہ کہتی۔ جب میں نے اسے بتایا تو وہ اسی وقت شکرانے کے نفل پڑھنے کھڑی ہوگئی کہ اللہ نے اس کا سہاگ اور اس کے بچوں کا باپ سلامت رکھا۔ میں دوا لے کر اور غرارے کر کے سویا تو رات سکون سے گزری۔

صبح میں آسیہ کے روکنے کے باوجود معمول کے مطابق کام پر چلا گیا۔ بچوں کو اسکول چھوڑ کر میں واپس آیا اور آتے ہوئے ایک ذرا دیر سے شائع ہونے والا اخبار لیتا آیا اس میں رات والے واقعے کی خبر تھی۔ پولیس کے مطابق رات گئے جھاڑیوں سے نامعلوم افراد کی دو لاشیں ملیں۔ ان میں ایک مرد کی اور ایک عورت کی لاش تھی۔ دونوں کو سر پر گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ انہیں اغوا کر کے کہیں سے لایا گیا تھا اور یہاں شوٹ کر کے لاشیں پھینک دیں۔ پولیس قاتلوں کی تلاش میں ہے۔ گویا زخمی اور اس کے ساتھیوں نے اپنا کہا پورا کیا تھا۔ میں نے پھر اللہ کا شکر ادا کیا کہ ایسے سفاک لوگوں نے مجھے بخش دیا ورنہ وہ ایک گولی اور چلا سکتے تھے اور میری لاش بھی ان جھاڑیوں سے ملتی۔ آسیہ نے خبر دیکھی تو اس کی ہوائیاں اڑ گئی تھیں۔ اس نے جذباتی ہو کر کہا۔

"پلیز آپ ٹیکسی کا کام چھوڑ دیں یہ بہت رسکی ہے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ٹیکسی چھوڑ دوں لیکن کام یہی کروں۔"

"کیا مطلب؟"

ٹیکسی چلانے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ اب ٹیکسی کا کام مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک کا اژدہام ہونے لگا ہے اور ٹیکسی ہر جگہ جا بھی نہیں سکتی ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ ایک اچھی لگژری کار لے لوں اور اسے چلاؤں۔ کار کی وجہ سے پارکنگ کی آسانی ہو جاتی۔ ورنہ ٹیکسی کہیں روک لو تو لوگ شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ کار کا معاوضہ بھی زیادہ ملتا کیونکہ لوگ گاڑی میں خود کو زیادہ معزز ظاہر کر سکتے ہیں۔ مجھے بکنگ مل جاتی۔ میں سوچ ہی رہا تھا مگر اس واقعے کے بعد میں نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ جیسے ہی طبیعت ذرا بہتر ہوئی میں نے گاڑی کی تلاش شروع کر دی اور جلد مجھے دس سال پرانی لیکن بہت اچھی حالت میں ایک لگژری کار مل گئی۔ کچھ رقم جمع تھی اور کچھ بھائیوں سے قرض لے کر میں نے کار لے لی اور ٹیکسی کو ٹھیک ٹھاک کرا کے سیل کر دیا۔ میرا کام ایک دن کے لیے بھی نہیں رکا تھا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ کار کی وجہ سے جلد مجھے ایک ہی دفتر میں کام کرنے والی چار لڑکیوں کی سواری مل گئی۔ بچوں کو اسکول چھوڑنے کے بعد میں انہیں ان کے دفتر تک چھوڑتا۔ اسکول آٹھ بجے لگتا اور آفس ٹائم نو بجے تھا اس لیے مجھے آسانی ہوتی اور پھر وہ ہمارے ہی علاقے میں پاس پاس رہتی تھیں اس لیے انہیں پک اور ڈراپ کرنا بھی آسان تھا۔ انہیں دفتر چھوڑ کر میں گھر آتا۔ ناشتا کر کے آرام یا کچھ کام کرتا پھر بچوں کو لینے چلا جاتا۔ اس کام سے فارغ ہو کر دوپہر کا کھانا گھر میں کھاتا اور پھر خواتین کو لینے ان کے دفتر چلا جاتا۔ آفس کلفٹن میں تھا۔ درمیان میں، میں کہیں نہیں جاتا تھا کیونکہ پھنس جانے کی صورت میں اپنی ڈیوٹی مکمل نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں شام کو جب لڑکیوں کو ان کے گھروں پر ڈراپ کر دیتا تو اس کے بعد فارغ ہوتا اور فیملی یا کسی جانے والے کے ساتھ کہیں جا سکتا تھا۔ اللہ کا شکر ہے اب ٹیکسی سے زیادہ اچھا مل رہا ہے۔

اس واقعے کو دو سال ہو چکے ہیں اور میں شاید اب بھی اپنی زبان بند رکھتا۔ لیکن چند دن پہلے اخبار میں خبر دیکھی کہ شہر کی ایک بڑی ہائی وے کے پاس ویرانے سے دو افراد کی لاشیں ملیں اور ان کی تصویریں بھی تھیں۔ میں نے تصویریں دیکھیں اور شناخت کر لیا۔ ایک میرا محسن تھا جس نے زخمی ہونے کے باوجود مجھے ان میاں بیوی سے بچایا تھا اور دوسرا اس کا ساتھی تھا۔ پتا نہیں وہ کس کا نشانہ بنے تھے۔ میاں بیوی کے ساتھیوں کا یا اپنے ہی کسی دشمن کا۔ مجھے دکھ ہوا کہ بہرحال میرا تو وہ محسن تھا اور تب میں نے سوچا کہ اپنی کہانی لکھوں۔ وہ تو کسی مجبوری کی وجہ سے جرائم کی دنیا میں آ گیا تھا اسی لیے اس نے میرے ساتھ برا سلوک نہیں کیا تھا۔

قسمت

محترمہ عذرا رسول صاحبہ

آداب

اس بار سرگزشت کے قیمتی صفحات کے لیے میں نے نایاب کی روداد لکھی ہے۔ قسمت نے اسے کس طرح اوج پر پہنچایا یہ سبق ہے ہر انسان کے لیے۔ اُمید ہے قارئین بھی پسند کریں گے۔

خورشید اختر

(لاہور)

''ہم آپ فلموں میں ناولوں میں جو کچھ دیکھتے پڑھتے ہیں یہ سب ہماری ہی زندگی سے اخذ کردہ ہوتا ہے۔ لاکھوں واقعات میں سے کسی ایک منفرد واقعے پر فلم بنا دی جاتی ہے یا ناول لکھ دیا جاتا ہے۔ میری زندگی بھی کسی فلم کی کہانی جیسی ہے مگر ابھی تک اسے کوئی فلم ڈائریکٹر نہیں ملا ورنہ سپرہٹ فلم بن جاتی۔'' نایاب نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''تم مجھے سناؤ میں لکھوں گی، اس اُمید پر کہ شاید کسی

فلم والے کو پسند آجائے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تو اس نے اپنے حالاتِ زندگی سنانے شروع کر دیے جسے میں اسی کی زبانی لکھ رہی ہوں تاکہ پڑھنے والے کو مزہ آئے۔

......☆......

اس دن میں نے بیگ میں کتابیں رکھیں اور ماما کو آواز دی۔ ''میں کالج جا رہی ہوں۔''

ماما بیڈ روم سے باہر آ کر بولیں۔ ''کتنی بار کہا ہے کہ تم یہ ڈائمنڈ سیٹ پہن کر ایسے کھلے عام کالج نہ جایا کرو۔ زمانہ بہت برا ہے۔''

میں نے اٹھلا کر کہا۔ ''اب اتنا برا بھی نہیں ہے کہ کالج میں کوئی چھین لے۔ گاڑی میں جاتی ہوں گاڑی میں آتی ہوں۔ ذرا کالج میں دھاک ہی بیٹھ جاتی ہے۔ میرے ڈائمنڈ سیٹ کی'' کہہ کر میں بھاگتی ہوئی گاڑی میں آ کے بیٹھ گئی اور گاڑی کالج کی جانب چل پڑی جیسے ہی کالج میں داخل ہوئی حفصہ مسکرا کر آگے بڑھی۔

''لو جی مل اونر آ گئی۔''

میں نے انکساری سے سر جھکا کر مسکرانے پر اکتفا کیا۔ ہر کوئی ڈائمنڈ سیٹ کی جو مجھے میری منگنی پر میرے منگیتر رضوان نے پہنایا تھا اس کی تعریف ضرور کرتا۔ میں ہر وقت مسکراتی رہتی۔ فخر سے میرا سر بلند ہو جاتا۔ آخر میں دلدار خان کی بیٹی تھی۔ پاپا کی فیکٹری کی ہم دو ہی تو وارث تھیں۔ ایک میں اور دوسری مجھ سے دو سال بڑی رباب۔ پاپا اور ماما کی ہم دونوں لاڈلیاں تھیں۔

میرے پاپا اب سے دو سال پہلے تک ایک سرکاری محکمے میں جنرل منیجر کی پوسٹ پر تھے۔ زندگی بہت مزے میں گزر رہی تھی۔ تنگی حالات کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ پاپا ریٹائر ہوئے تو ان کو گریجویٹی کے نام پر اچھی خاصی رقم ملی تھی۔ احمد ماموں کے دو بیٹے تھے، بڑے بیٹے عرفان سے رباب اور چھوٹے بیٹے رضوان سے میری منگنی زبانی طور پر ہو چکی تھی۔ ماموں کا دھاگا بنانے کا کاروبار تھا اور دونوں بیٹے تعلیم مکمل کر کے ماموں کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ ممانی ذرا چالاک فطرت کی تھیں مگر پھر بھی ہم سب میں خاصی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ پاپا کو گریجویٹی ملی تو ماموں نے مشورہ دیا کہ ان پیسوں میں کمپیوٹرایمبرائڈری مشینیں منگوا کر بڑے پیمانے پر کارخانے بنالیں۔ پاپا نے ایک کروڑ روپیا اس کام پر خرچ کر دیا۔ گاؤں میں کچھ زمینیں تھیں انہیں بیچ کے رباب کی شادی بھی کر دی۔ یہ شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ اس فکر سے آزاد ہو کر انہوں نے فیکٹری کی طرف توجہ دی۔ فیکٹری چلانے کے لیے دو کینال کی جگہ کرائے پر لی تھی جس کا کرایہ دو لاکھ ماہوار تھا۔ ابتدا میں فیکٹری خوب چلی پھر گھاٹا ہونے لگا تو اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے پاپا نے گھر گروی رکھ دیا اور مزید قرضہ لے کے فیکٹری میں لگا دیا۔ دونوں مشینوں پر کمپیوٹرائزڈ کڑھائیاں ہوتی تھیں۔ پارٹیوں کو لاکھوں کا کام تیار کر کے دیا جاتا تھا مگر پارٹیاں آدھے پیسے بھی ادا نہیں کرتی تھیں بلکہ مزید کام تیار کرنے کو دے دیتی تھیں۔

فیکٹری کے لیے دھاگا ماموں کے ہاں سے آتا تھا جس کا پیسا وہ نقد وصول کرتے تھے۔ اس طرح ان کا کاروبار بھی خوب چمک اٹھا تھا۔ یہ بات ابھی چھپی ہوئی تھی کہ پاپا کا کاروبار گھاٹے میں جا رہا ہے اس لیے ماموں مسلسل مجبور کر رہے تھے کہ میری منگنی رضوان سے کر دی جائے۔ ماما بھی یہی چاہتی تھیں اس لیے گزشتہ سال میری منگنی کر دی گئی۔ اس موقع پر رضوان نے مجھے ڈائمنڈ کا لاکٹ سیٹ، ٹاپس اور انگوٹھی تحفے میں دی تھی جسے میں ہمہ وقت پہنے رہتی تھی۔

دیکھتے دیکھتے ایک سال اور گزر گیا۔ میں دیکھ رہی تھی کہ پاپا کا بلڈ پریشر حد سے زیادہ ہائی رہنے لگا ہے۔ رہی سہی کسر شوگر کی بیماری نے پوری کر دی تھی۔ پاپا فیکٹری میں ہونے والی پریشانی کی باتیں صرف مما کو ہی بتاتے تھے اس لیے میں لاعلم تھی مگر مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔ کوئی بڑا حادثہ ہونے والا ہے۔ میرا خیال تھا کوئی بینک کا معاملہ ہوگا کیونکہ کچھ عرصے سے بینک کی اقساط نہیں دی گئی تھیں۔ آج بھی جب میں کالج سے گھر آئی تو ماما نے بتایا کہ فیکٹری کی ایک مشین کسی خرابی کی وجہ سے بند ہو گئی ہے اور دوسری مشین مال تیار کر کے دینے کے لیے ناکافی ہے۔

شام کو پاپا گھر آئے تو وہ بے حد پریشان تھے۔ ماما انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ ڈاکٹر نے بلڈ پریشر اور شوگر کنٹرول میں رکھنے کی ہدایت دی اور ٹینشن لینے سے منع کیا۔ بھلا انسان کو پریشانیاں ہوں اور وہ ٹینشن نہ لے، یہ کیسے ممکن ہے۔ ایک ہفتے پاپا نے بیماری اور پریشانی میں گزارا مگر فیکٹری سے وہ چھٹی نہیں کر سکتے تھے۔ آج بھی وہ صبح سے فیکٹری گئے ہوئے تھے۔ ماما بار بار فون کر کے ان کی طبیعت پوچھ رہی تھیں۔ میں بھی چونکہ بی اے کے پیپر دے کے فارغ تھی اس لیے گھر میں ہی تھی۔ ابھی میں اپنی سہیلی رانیہ

سے فون پر مصروف تھی کہ مجھے ماما کی چیخ سنائی دی۔ میں بھاگ کرٹی وی لاؤنج میں آئی۔ ''کیا ہوا۔''

ماما فون ہاتھ میں پکڑے رو رہی تھیں۔ آگے بڑھ کر میں نے انہیں اپنے ساتھ لگایا اور پوچھا۔ ''ماما کیا ہوا؟''

''تمہارے پاپا بے ہوش ہو گئے ہیں۔ فیکٹری سے فون آیا ہے۔ ڈرائیور اور کچھ ملازمین انہیں اسپتال لے گئے ہیں۔ چلو جلدی کرو۔'' پریشانی کے عالم میں ہم اسپتال پہنچے۔ پاپا آئی سی یو میں تھے۔ انہیں فالج کا شدید اٹیک ہوا تھا۔ ہم سب باہر برآمدے میں بیٹھے تھے۔ پاپا کی حالت سیریس تھی۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔ ''انہیں کیا ہوا تھا۔''

''بی بی جب صاحب کو بتایا گیا کہ دوسری مشین بھی چلتے چلتے بند ہوگئی ہے تو صاحب ٹینشن میں ٹہلنے لگ گئے۔ پھر اچانک گر گئے اور تڑپنے لگے ہم لوگوں نے دیکھا تو وہ بے ہوش ہو چکے تھے۔ ہم انہیں یہاں لے آئے۔''

رباب، اور عرفان بھی آ گئے تھے۔ ماموں، ممانی اور رضوان بھی ساتھ تھے۔ سب حوصلہ دے رہے تھے۔ ڈاکٹر نے بتا دیا تھا کہ 72 گھنٹے انتہائی اہم ہیں۔ اگر یہ ہوش میں آ گئے تو قسمت، اچھی ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ 72 گھنٹے ہم تینوں ماں، بیٹیوں نے اسپتال میں ہی گزارے۔ کبھی ایک دوسرے کو دلاسا دیتے کبھی خوب روتے۔ 72 گھنٹے گزر گئے تھے۔ جب ڈاکٹر نے یہ افسوس ناک خبر دی تھی کہ میرے پاپا کوما میں چلے گئے ہیں۔ کب تک یہ حالت رہے گی۔ کوئی نہیں جانتا۔

مشینیں بند ہونے سے فیکٹری بالکل بند ہو گئی تھی۔ ماما نے ماموں کو مشورے کے لیے بلایا۔ ماموں کے تو مزاج ہی کچھ اور تھے۔ انہوں نے سارا الزام پاپا کی نااہلی پر ڈال دیا۔ میرا دل چاہا کہ میں کہوں کہ یہ فیکٹری لگانے کا مشورہ بھی تو آپ کا ہی تھا مگر جب ماما خاموش تھیں تو میری کیا جرأت۔ ماموں نے کہا جب تک مشینیں نہیں بکتیں جگہ کا کرایہ تو لازمی ادا کرنا ہوگا۔

''مشینیں کیسے بکیں گی؟'' ماما نے پوچھا۔

''ارے، بھائی اگر چلتی ہوئی مشینیں ہوتیں تو میں کسی سے بات بھی کرتا۔ اب دیکھو پچھلے دو ماہ سے مشینیں بند پڑی ہیں۔ کیا پتا کہاں کہاں کیا کیا نقص ہے۔ اب تو لوہے کے بھاؤ ہی بکیں گی۔'' ماموں برا سا منہ بنا کے اٹھ گئے۔

ایک ماہ، مزید گزر گیا۔ ماما نے اپنا سارا زیور بیچ کے تین ماہ کا فیکٹری کی جگہ کا کرایہ ادا کیا۔ گاڑی بھی بک گئی اور گھر تو نہ جانے کب قرقی ہو چکا تھا۔ کسی بھی وقت بینک والے آ کر قبضہ کر لیتے۔

پاپا کو ہم گھر لے آئے تھے۔ وہ بالکل بے حس اپنے بیڈ پر پڑے رہتے تھے۔ ہم نے اٹنڈنٹ میل نرس نہیں رکھا۔ ہم خود ہی دیکھ بھال کر لیا کرتے۔ سارا دن ہم پاپا کی خدمت میں لگے رہتے۔ گھر پر خاموشی سی چھائی رہتی کہ ایسے میں رباب آ گئی۔ ہم نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔ آخر ماما نے پوچھ ہی لیا۔ ''رباب کوئی بات ہے تو بتاؤ؟''

وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ ''ماما رضوان نے نایاب سے منگنی توڑ دی ہے۔''

میں نے سر جھکا لیا۔ وہی رضوان جو میرے چہرے کو دیکھتے نہیں تھکتا تھا۔ ہمارے حالات برے ہونے پر مجھ سے دستبردار ہو گیا۔ میں نے یہ غم بھی اپنے اندر اتار لیا۔ تب ہی میری نظر پاپا کے چہرے پر پڑی۔ میں نے دیکھا پاپا کی ایک آنکھ سے آنسو کا قطرہ نکلا تھا۔ میں تڑپ کر پاپا کے پاس لپکی اور ان کے ماتھے کو بے اختیار چومنا شروع کر دیا۔ ''پاپا...... میرے پاپا مجھے کوئی دکھ نہیں۔ پاپا پلیز آپ غم نہ کریں۔ میں سنبھال لوں گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔''

میں نہیں جانتی تھی کہ جو وعدہ میں پاپا سے کر رہی ہوں اس وعدے کا کیا مقصد ہے۔ مجھے کیا کرنا ہے۔ بس میں اپنے پاپا کا ایک آنسو دیکھ کر تڑپ گئی تھی۔ ماما اپنے بیڈ پر رو رہی تھی اور میں فیصلہ کر چکی تھی۔

صبح ہوتے ہی میں نے ماما سے فیکٹری کی چابیاں لیں اور رکشے میں بیٹھ کر فیکٹری کی طرف روانہ ہو گئی۔ اتنے ماہ بند رہنے کی وجہ سے فیکٹری میں ایک عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ مشینیں بند پڑی تھیں۔ شیشے کا دروازہ کھول کر میں پاپا کے آفس میں داخل ہو گئی۔ پاپا کی کرسی پر بیٹھ کر میں بلک بلک کر رو دی۔ پھر ساری لائٹس آن کر دیں۔ اپنے پاپا کی ایک ایک چیز کو چھو کے دیکھتی رہی کہ ایسے میں باہر کے دروازے کی بیل بجی۔ میں نے باہر جا کر دروازہ کھولا تو ایک نوعمر سا لڑکا کھڑا تھا۔ وہ کوئی کاریگر لگ رہا تھا۔ میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بولا۔ ''میں ابوبکر ہوں۔ یہاں دلدار صاحب کی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ جب یہ فیکٹری بند ہو گئی تو میں نے دوسری فیکٹری میں کام شروع

کر دیا۔ یہاں سے گزر رہا تھا تو بتیاں جلتی دیکھ کر بیل بجا دی۔''

میں نے سے غور سے دیکھا۔لڑکا شریف اور سمجھ دار لگ رہا تھا۔

''اندر آجاؤ۔'' میں نے کہا۔

وہ اندر آ گیا۔ اسے لے کر پاپا کے آفس میں آئی پھر ایک کرسی کی جانب اشارہ کر کے کہا۔''بیٹھ جاؤ۔'' وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''صاب کا کیا حال ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔''سنو ابوبکر کیا تم مجھے بتا سکتے ہو پاپا کی فیکٹری جس پر کروڑوں روپے لگے تھے وہ کیوں ختم ہو گئی، کیوں برباد ہو گئی۔''

وہ کچھ ٹھہر کر بولا۔''باجی اصل میں مشینیں چلانے کے لیے جتنا پیسا فیکٹری پر لگایا جاتا ہے اتنا ہی سائیڈ پر ہونا چاہیے۔ شروع کے دو تین سال فیکٹری پر پیسا ہی لگے جاتا ہے کمائی نہیں ہوتی۔ وہ ہمارے پنڈ میں کہتے ہیں ناں کہ پہلے ہی پھر چٹی پھر کھٹی۔''

مجھے سمجھ نہیں آئی۔ وہ ہنس پڑا۔''باجی! صاحب جی بہت معصوم تھے۔ وہ ہر کسی پر بھروسا کر لیتے تھے۔انہوں نے جو ماسٹر رکھا تھا ان کے ذمے ہر نقصان نہ لگایا ورنہ تو فیکٹری مالک جب ماسٹر رکھتے ہیں تو اس کو تنخواہ اسی چیز کی دیتے ہیں کہ کام نہیں رکے گا اور کوئی نقصان ہوا تو اسی کے سر ہوگا۔ وہ خود بڑا چور تھا جی۔ پرزے چوری کر لیتا تھا۔ پھر صاب کو وہی پرزے لاکھوں میں لا کے دیتا تھا۔ صاب کو اس کام کا کچھ پتا نہ تھا جی وہ اس کے ہاتھوں بلیک میل ہوتے گئے۔ سارے ورکرز اسی کی ٹیم کے تھے۔''

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔''تو کیا تم اس کی ٹیم کے نہ تھے؟''

اس نے مسکرا کے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔''نہیں تھا نا اسی لیے تو ٹک نہیں سکا۔''

میں نے سر گھما کے مشینوں کی طرف دیکھا اور افسوس سے کہا۔''اب ان مشینوں کو کوئی لوہے کے بھاؤ بھی نہیں لے گا۔''

وہ تڑپ گیا۔''ایسے نہ کہیں جی، یہ چل سکتی ہیں اب بھی چل سکتی ہیں۔''

''لو بھلا اب کیسے یہ چلیں گی۔'' میں نے افسردگی سے کہا۔

''باجی پہلے بھی میں نے دو مرتبہ صاب سے حسن کے بارے میں بات کی تھی مگر ماسٹر کی بات صاب زیادہ سنتے تھے۔''

میں نے اس سے پوچھا۔''حسن کون ہے؟''

''حسن صاب کو بڑا تجربہ ہے جی مشینیں ٹھیک کرنے کا۔ شہر میں جتنی بھی مشینیں چل رہی ہیں زیادہ تر لوگ انہی کو بلاتے ہیں۔ ان کا ہاتھ لگنے کی دیر ہوتی ہے اور مشینیں چل پڑتی ہیں۔''

نہ جانے میں نے کیوں کہہ دیا۔''اسے بلا سکتے ہو۔''

''ہاں جی۔ یہ میرے موبائل میں ان کا نمبر ہے مگر میرے پاس بیلنس نہیں ہے جی۔'' وہ بولا۔

''اچھا مجھے بتاؤ میں اپنے موبائل سے نمبر ملا کے تمہیں دیتی ہوں۔'' میں نے نمبر ملایا۔ اس نے ساری بات اسے سمجھائی۔ اسے بتایا کہ اس کی شدید ضرورت ہے۔ اس نے دو گھنٹے بعد آنے کا کہا۔ ابوبکر میرے پاس ہی بیٹھا رہا۔ وہ ٹھیک دو گھنٹے کے بعد آ گیا۔ وہ سانولے رنگ کا لمبے قد کاٹھ کا مضبوط جسم اور گھنگریالے بالوں والا ایک جاذب نظر نوجوان تھا۔ اس نے مجھ سے پاپا کی بیماری کے بارے میں بہت افسوس کیا اور مشینوں کی طرف بڑھ گیا۔ میں اور ابوبکر بھی اس کے پیچھے پیچھے ہال میں بڑھے۔ ابوبکر نے مجھے پاپا کے آفس سے ایک کرسی لا کے بیٹھنے کو دی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے وہ مشینوں کے پرزے کھول کھول کے دیکھتا رہا۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھ سیاہ ہو گئے تھے مگر وہ اپنے کام میں مگن تھا۔ پھر وہ ہاتھ دھو کر میرے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔

''دیکھیے مس نایاب ان دونوں مشینوں سے یہ پانچ پرزے غائب ہیں۔ دیکھیں اس طرح کے ہوتے ہیں یہ۔'' اس نے مجھے دکھائے۔

''کتنے کے آئیں گے۔'' میں نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

''تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ کے۔'' اس نے حساب کرتے ہوئے بتایا۔

''کیا!'' مجھے تو کرنٹ سا لگ گیا۔

اس نے شاپر میں ڈال کر وہ پرزے میرے سامنے رکھ دیے اور اٹھ کھڑا ہوا۔''اچھا تو میں جاؤں۔''

میں پریشان ہو گئی۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔ پاپا کی آنکھ میں اٹکا آنسو میری نظروں میں لہرا گیا۔ میں پُرعزم ہو گئی مگر میں اس پر اور نہ ہی ابوبکر پر اتنی جلدی اعتماد کر سکتی

تھی۔ میں نے اسے کہا۔ ''حسن آپ میرے ساتھ جیولرز مارکیٹ تک جا سکتے ہیں۔ پیسے وہیں سے ارینج ہوں گے۔'' میں نے لاکٹ کو ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

اصل میں، مجھے اکیلے چیزوں کو بیچتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ ایسے میں کسی مرد کی ضرورت تھی وہ فوراً بولا۔ ''جی ضرور، چلیے۔''

میں نے فیکٹری کو تالا لگایا اور سڑک کی طرف کسی رکشے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''تم جا کے رکشا لے آؤ۔'' میں نے ابوبکر سے کہا۔

وہ ہنس پڑا۔ ''حسن صاحب کے پاس گاڑی ہے جی۔''

میں نے دیکھا حسن گاڑی بیک کر کے میری طرف لا رہا تھا۔ اس نے اتر کر آگے کا دروازہ کھولا مگر میں پیچھے کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ اگلی سیٹ پر ابوبکر بیٹھ گیا۔ میں نے انگوٹھی، ٹاپس اور لاکٹ اتار کر جیولرز کے سامنے رکھے۔ جیولرز نے غور سے میری شکل دیکھی اور پھر میرے ساتھ دو فرد تھے ''نو لاکھ'' اس نے کہا۔

میں نے کہا دے دو۔ پیسے لے کر ہم پھر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی اب بہت بڑی ایک بلڈنگ کے باہر رکی۔ وہاں ایک دکان، میں ہم نے ان پرزوں کا سمپل سامنے رکھا۔ دکاندار نے حساب لگا کر کہا۔ ''ساڑھے پانچ لاکھ۔'' میں نے ساڑھے، پانچ لاکھ اس کو دیے۔ حسن نے ابوبکر سے پرزے اٹھوا کر گاڑی میں رکھوائے اور ہم واپس فیکٹری کی طرف چل پڑے۔ مزید ایک گھنٹے میں حسن نے مشینیں تیار کر دیں۔ اب ان کو چلانا تھا مگر لائٹ چلی گئی تھی۔ ہم پاپا کے آفس میں آ کے بیٹھ گئے تھے۔ ابوبکر کو ہم نے چائے اور کچھ کھانے کی چیزیں لانے کے لیے بھیج دیا تھا۔

''ایک مشورہ دوں۔'' اچانک حسن بولا۔

''اب تو آپ کی ہر بات ہی ماننی ہوگی بولیں۔'' میں پہلی بار مسکرائی تھی۔

وہ بھی مسکرا دیا۔ ''ایک لاکھ اور بیس ہزار روپے کا جنریٹر آئے گا جو دونوں مشینوں کو چلائے گا۔ لائٹ جانے سے جو نقصان ہو رہا ہے۔ وہ بھی نہیں ہوگا۔ دوسرا ساٹھ ہزار روپے کے دونوں مشینوں کے سائیڈ میں چھپے ہوئے دو کیمرے لگائے جائیں اگر آپ یہاں اس کمرے سے لیبر کو کام کرتا دیکھنا چاہیں تو لیپ ٹاپ پر دیکھ سکتی ہیں اور اگر آپ موجود نہیں ہیں تو بھی جب آپ آئیں کیمرا ریورس کر کے دیکھ سکتی ہیں کہ کاریگر فارغ تو نہیں بیٹھے اور کسی نے کچھ چوری تو نہیں کیا۔''

مجھے اس کے مشوروں میں وزن نظر آیا۔ میں نے کہا۔ ''آپ منگوا لیں میں ادا کر دوں گی۔ مگر کام کیسے ہوگا۔ لیبر تو نہیں ہے۔''

''سب ہو جائے گا۔ آپ بس ہمت اور حوصلہ کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ۔'' اس نے تسلی دی۔ وہ پھر بولنے لگا۔ ''میں انشاء اللہ دو دن میں آپ کی دونوں مشینوں کے لیے کاریگروں کا انتظام کر دوں گا۔ ماسٹر کی ضرورت نہیں ہے ہاں اگر اس لڑکے ابوبکر کو بھی رکھ لیں تو اچھا ہوگا ایماندار بھی ہے اور محنتی بھی۔''

میں فوراً بولی۔ ''بھئی مجھے کیا پتا کس کو رکھنا ہے اور کیا کیا کام کس کس طرح لینے ہیں۔ آپ ایسا کریں آپ ہی ماسٹر بن جائیں۔''

وہ ہولے سے مسکرا دیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ''آپ یہی سمجھیں میں ماسٹر ہی ہوں۔ بس آپ بے فکر ہو جائیں۔ حالانکہ میرے لاتعداد اور کلائنٹس ہیں، دیکھا نہیں صبح سے کتنے فون آ چکے ہیں۔''

ابوبکر چائے کے ساتھ کافی کچھ لایا تھا۔ میں نے پیسے دینے چاہے تو اس نے بتایا کہ حسن صاحب نے سب کچھ منگوایا ہے۔

لائٹ آ گئی تھی۔ اس نے مشینیں اسٹارٹ کیں تو وہ دونوں چلنے لگیں۔ ابوبکر نے کپڑا لگا کر ٹیسٹ کیا۔ میرا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ باقی کل انشاء اللہ۔'' اس نے کہا اور خدا حافظ کہہ کے روانہ ہو گیا۔

میں گھر پہنچی تو ماما پاپا کے کمرے میں ہی تھیں۔ میں نے اندر جا کر خوشی سے پاپا کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگایا اور رونے لگی۔

ماما نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ خیریت تو ہے نا۔''

میں نے ساری بات بتائی۔ میں نے دیکھا پاپا کے چہرے پر آسودگی تھی۔ سکون تھا۔ میں خود سکون میں آ گئی۔ ایک ہفتے میں حسن نے میری فیکٹری کو ٹھیک ٹھاک فیکٹری بنا دیا۔ کام کے لیے آرڈر دلوا دیے تھے اور وہ بھی ایسی پارٹیوں سے جو کام وصول کرتے ہی فوراً پے منٹ کر دیتیں۔ حسن ہی کے کہنے پر میں نے پارٹ ٹائم ایک

اکاؤنٹنٹ بھی رکھ لیا تھا جو سارے کام کا حساب کتاب کرتا تھا۔ پہلے ہی ماہ میں خرچا نکال کر 5 لاکھ بچ گئے جن میں سب سے پہلے ہم نے بینک جا کر لون کی اقساط جمع کروائیں۔ اگلے چھ ماہ میں کام بہت بہتر چل نکلا تھا۔ میں نے گاڑی لے لی تھی۔ فیکٹری میں کبھی کوئی چوری نہ ہوئی۔ لڑکے بہت اچھا کام کر رہے تھے۔ احسن ہی کے کہنے پر میں نے عید پر سارے کاریگروں کو عید بونس بھی دیا۔ میرا اسٹاف مجھ سے بے حد خوش تھا۔ چھ ماہ تک پتا نہیں چلا کہ حسن کی اپنی ذاتی دو مشینوں کی فیکٹری بھی ہے لیکن وہ خود لوگوں کی مشینوں کے فالٹ ٹھیک کرتا پھرتا تھا۔ وہ بہت سادہ اور محنتی تھا۔ اس کے مجھ پر بے حد احسان تھے ایک وہی تو تھا جس کی وجہ سے میری کباڑیوں کو دینے والی مشینیں فیکٹری کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں بھی اتنی پنکچوئل ہو جاؤں گی کہ زیادہ سے زیادہ وقت فیکٹری کو دوں گی۔ فیکٹری کے زیادہ تر معاملات احسن ہی حل کرتا تھا۔ ہر کام میں ہر مسئلے میں ہر سلسلے میں مجھے اس کی مدد درکار تھی۔ وہ میری کتنی بڑی ضرورت بن گیا ہے اس کا احساس تو مجھے اس وقت ہوا جب ایک بار وہ میرے دفتر میں بیٹھا تھا اور لیپ ٹاپ پر کام کر رہا تھا۔ سرسری سے انداز میں اس نے کہا۔ ”میں کل کوریا جا رہا ہوں۔“

”کیا“ میں بے حد حیران ہوئی تھی۔ ”کیوں کتنے عرصے کے لیے۔ واپس کب آؤ گے۔“

وہ ہنس پڑا۔ ”بھئی ایک دم اتنے سارے سوال، اچھا میں ایک ایک کر کے تینوں سوالوں کے جواب دیتا ہوں۔ پہلا سوال کیوں تو اس کا جواب ہے کہ میں کوریا میں ورک شاپ اٹینڈ کرنے جا رہا ہوں۔ دوسرا سوال کتنے عرصے کے لیے، اس کا جواب ہے چھ ہفتے کے لیے اور تیسرے سوال کا جواب تو تمہیں پتا ہی لگ گیا ہوگا۔ چھ ہفتے کے بعد واپس آ جاؤں گا انشاء اللہ۔“

مجھے لگا جیسے میرا دل بند ہو جائے گا۔ اسے شاید خبر ہو گئی تھی۔ وہ بولا۔ ”میں روز تم سے بات کروں گا تم فکر نہ کرنا، ہر لمحے ہر وقت تم سے اٹیچ رہوں گا۔“

میرے منہ سے نکلا ”مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے۔“

اس نے مسکرا کر کہا۔ ”یہ جو روزانہ یہاں حاضری دیتا ہوں یہ کافی نہیں ہے کیا، ضروری ہے کہ اقرار ہی کروں۔“

میں مسکرا دی۔ وہ چلا گیا۔ حالانکہ اب میں اس قابل ہو گئی تھی کہ فیکٹری کے معاملات خود سنبھال سکوں مگر مجھے اس کی عادت پڑ گئی تھی۔

اس کے بغیر چھ ہفتے کیسے میں نے گزارے وہ میں ہی جانتی ہوں۔ وہ مجھے روز فون کرتا تھا۔ فیکٹری کے معاملات میں مدد کرتا تھا اور بہت ساری محبت کی باتیں بھی کرتا تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے انتظار کی گھڑی ختم کیں۔ وہ آ گیا اور ڈھیر سارے تحفے بھی لایا اور ایک ڈائمنڈ کا لاکٹ سیٹ، انگوٹھی اور ٹاپس بھی لایا جو اس نے خود مجھے پہنائے۔ میں نے کوئی بات ماما اور پاپا سے نہ چھپائی۔ ماما کے کہنے پر میں نے اسے کھانے پر اپنے گھر انوائیٹ کیا۔ وہ بڑی دیر تک پاپا کے پاس بیٹھا ان سے میرے ہی انداز میں ڈھیر ساری باتیں کرتا رہا۔ ماما اس سے مل کر بے حد خوش ہوئیں۔ رباب بھی آ گئی۔ اس کو بھی حسن بے حد اچھا لگا۔

اس کا دھیما لہجہ، بے ساختہ مسکراہٹ میرے دل پر اثر کرتی جا رہی تھی۔ میں بے حد خوش تھی۔ رباب نے اس سے کہا اگر نایاب کو حاصل کرنا ہے تو اپنے والدین کو بھیجو۔

اس نے مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے ہامی بھر لی۔ جاتے ہوئے وہ پاپا کے پاس آ بیٹھا۔ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر کافی دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اگلے دن میں فیکٹری میں اسے ملی تو مجھے اس سے شرم آ رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس سنڈے کو وہ اپنی والدہ کے ہمراہ ہمارے گھر آئے گا اور میرا ہاتھ طلب کرے گا۔

میرے سر جھکانے سے اسے میرے اقرار کا اندازہ ہو گیا تھا۔ مجھے بے چینی سے سنڈے کا انتظار تھا۔

اتوار کو ماما نے اس کے والدین کے لیے کھانے کا انتظام کیا تھا۔ میں نے آج بڑی دیر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کے خود کو سنوارہ تھا۔ چھ بجے میں اور ماما پاپا کے کمرے میں تھے کہ ملازمہ نے آ کے اطلاع دی کہ حسن اور اس کی والدہ آ گئی ہیں۔ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا ہے۔ ماما سیدھی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ میں پردے کے پیچھے سے چھپ کے ان کو دیکھنے لگی جس صوفے پر حسن کی ماں بیٹھی تھی وہ صوفہ پردے کے آگے تھا۔

اس طرح ان کی بیک میری طرف تھی۔ ماما کے اندر داخل ہوتے ہی وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اچانک ماما کے منہ سے نکلا۔ ”تم...... تم یہاں!“ پھر تیز لہجے میں بولیں۔ ”تم میری بیٹی کا رشتہ لینے آئی ہو۔“

حسن نے گھبرا کے مجھے دیکھا۔ مجھے بھی کچھ سمجھ نہیں آیا۔ میں بے ساختہ کمرے میں داخل ہو گئی اور ان کے

سامنے جا کے کھڑی ہوگئی اور خود بھی پریشان ہوگئی تھی۔ کیوں کہ حسن کی ماں کے روپ میں دلشاد تھی۔

آج سے پانچ سال پہلے تک دلشاد ہماری ملازمہ تھی۔ ہمارے گھر کے سارے کام اسی کے ذمے تھے۔ وہ پچھلے سات سال سے ہمارے گھر کام کر رہی تھی۔ ان سات سالوں میں ہمارے اور اس کے بڑے اچھے تعلقات رہے کیوں کہ وہ شاید کسی اچھے بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھتی تھی۔ ہمارے علاوہ بھی وہ کچھ اور گھروں کے کام بھی کرتی تھی۔ جب وہ ہمارا کام ختم کر کے واپس جاتی تو ماما اسے گھر کا بچا کچھا سالن دینا چاہتیں مگر وہ رسانیت سے انکار کر دیتی۔ کہہ دیتی کہ گھر جا کے تازہ سالن بنائے گی کیوں کہ اس کا بیٹا گڈو تازہ سالن پسند کرتا ہے۔ وہ ایماندار بھی تھی۔ چھٹیاں بھی نہیں کرتی تھی اور صاف ستھری نظر آتی تھی۔ گھر کی صفائی ستھرائی کرنا، کچن صاف کرنا، کپڑے دھونا، کپڑے استری کرنا، ہانڈی روٹی کرنا سب کام وہی کرتی تھی۔ وہ زیادہ تر اپنے بیٹے گڈو کا تذکرہ کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ وہ کمپیوٹر کا کام کرتا ہے۔ ماما اور پاپا نے اس سے کبھی اس کی فیملی کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں پوچھی مگر وہ خود ہی ذکر کرتی کہ باپ کے مرنے پر بھی گڈو بگڑا نہیں اس نے بی اے کر لیا ہے۔ کمپیوٹر کا ماہر ہے پھر ایک بار اس کا گڈو کسی ٹریننگ پر ملک سے باہر چلا گیا اور وہاں سے اتنا پیسا بھیجنے لگا کہ دلشاد نے سب گھروں کے کام چھوڑ دیے۔ ہمیں اس کے بغیر بے حد پریشانی ہوئی مگر جب وہ کام ہی نہیں کرنا چاہتی تھی تو زبردستی تو ہم اسے نہیں لگا سکتے تھے۔ اس وقت میں میٹرک میں تھی اور دلشاد ہم سب کی پسندیدہ کام والی تھی۔ اس کے جانے کے بعد ہمیں اس جیسی کام والی کوئی نہ ملی۔ پھر پاپا کا ٹرانسفر لاہور ہوگیا۔ حالانکہ اس کے بعد ہم نے بہت کام والیاں بدلیں مگر ہم لوگ دلشاد کو نہ بھول سکے۔ آج دلشاد، حسن کی ماں کی حیثیت سے ہمارے گھر میں تھی۔ وہ خود ہمیں دیکھ کے حیران تھیں جب کہ ماما پریشان تھیں۔ پھر بھی ماما نے عزت سے ان کو کھانا کھلایا۔ سب اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ دلشاد نے بتایا کہ اس کا بیٹا حسن تین سال کوریا میں ایمرائیڈری مشینوں کی ٹیکنیکل ٹریننگ لے کے آیا ہے۔ یہاں پر لاہور کی ساری مشینیں وہی ٹھیک کرتا ہے اور اس کی اپنی ذاتی دو مشینوں کی فیکٹری بھی ہے اس نے بتایا کہ انہوں نے اپنی کوٹھی بنا لی ہے۔ گاڑی وغیرہ کے علاوہ سب سہولیات ہیں۔ میں تو اس کے لیے کوئی پڑھی لکھی لڑکی ڈھونڈ رہی تھی کہ حسن کو نایاب پسند آگئی۔

ماما نے اس کی ساری بات سنی اور کہا۔ ”دیکھو دلشاد تم نے سات سال ہمارے گھر کام کیا ہے۔ تم کو میرا سارا خاندان جانتا ہے اور تم ہمارے اسٹینس سے بھی واقف ہو۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جو عورت ہمارے گھر سات سال تک کام کرتی رہی ہو۔ اسی کے بیٹے کو ہم اپنی بیٹی دے دیں۔ ہم مانتے ہیں کہ حسن کے ہم پر بے حد احسانات ہیں مگر بیٹی احسان کے بدلے میں تو نہیں دی جا سکتی ناں۔ اس رشتے سے میری طرف سے انکار ہے۔“

دلشاد گنگ ہو کر رہ گئی۔ وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے حسن کی طرف دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں ایک محرومی نظر آئی۔ اٹھتے ہوئے دلشاد نے کہا۔ ”صاب کو دیکھ لوں۔“

ماما اٹھ کھڑی ہوئیں اور انہیں پاپا کے کمرے میں لے گئیں۔ اس کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔ ماما نے مجھے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر میں رات گئے تک روتی رہی۔ پھر میں پاپا کے پاس آگئی۔ پاپا کا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگا کر میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میں نے ان کو ساری بات بتا دی۔ بے چارے پاپا کوئی جواب تو نہیں دے سکتے تھے۔ اگلے دن مجھے بخار ہوگیا۔ میں فیکٹری نہیں گئی مگر پتا چلا کہ حسن آج بھی فیکٹری آیا تھا اور آج کے کام بھی اسی نے سنبھالے تھے۔ میں کب تک چھٹیاں کرتی۔ ایک ہفتے بعد فیکٹری جانا پڑا۔ حسن میرے سامنے لاتعلق بنا لیپ ٹاپ پر کام کر رہا تھا۔ میں نے بات کا آغاز کیا۔ ”حسن اب کیا ہوگا۔“

وہ پھیکی ہنسی ہنس دیا۔ اس کے لہجے میں زمانے بھر کا درد تھا۔ وہ بولا۔ ”کیا ہو سکتا ہے تمہاری والدہ نے تو صاف جواب دے دیا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”حسن تم کہو تو دوبارہ بات کر کے دیکھوں۔“

وہ نا اُمیدی سے بولا۔ ”کوشش کر کے دیکھ لو مگر میں جانتا ہوں وہ نہیں مانیں گی۔“

میں گھر گئی تو پاپا کے کمرے میں ماما بیٹھی تھیں۔ مجھے یقین تھا پاپا سب کچھ سن رہے ہیں میں نے بات کا آغاز کیا۔ ”ماما! میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

وہ تنک کر بولیں۔ ”میں جانتی ہوں تمہیں کیا بات کرنی ہے۔ اسی حسن نے تمہیں مجھ سے بات کرنے کا کہا ہوگا۔“ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی انہوں نے فیصلہ سنا دیا۔ ”مجھ سے بات کرنے کا کچھ فائدہ نہیں کیوں کہ ایک کام

والی کے بیٹے سے، میں اپنی بیٹی بیاہ نہیں سکتی۔ کوئی اور کام والی ہوتی تو میں سوچتی چلو کون جانتا ہے اسے، مگر یہ تو میری ہی ماسی ہے۔ میرا سارا خاندان اسے جانتا ہے۔ سب اس سے واقف ہیں۔ رباب کے سسرال میں بھی ایک بار کام کر کے آئی ہے یہ۔ تم چاہتی ہو کہ ہم اپنی بچی کچھی عزت داؤ پر لگا دیں۔"

میں غصے میں بولی۔ "جو کچھ آپ کے پاس بچا ہے اسی کام والی کے بیٹے نے بچایا ہے اگر وہ نہ ہوتا تو آج نہ یہ گھر ہوتا نہ یہ عیش آرام۔ صرف اسی کی وجہ سے ہم پہلے سے زیادہ اچھے مقام پر آگئے ہیں۔"

وہ میرے پاس آ کے بیٹھ گئیں اور مجھے سمجھاتے ہوئے بولیں۔ "نایاب! میری بیٹی دیکھو پیسے کو دوبارہ کمایا جاسکتا ہے۔ گیا ہوا پیسا دوبارہ لوٹ کے آجاتا ہے مگر عزت خراب ہو جائے تو واپس نہیں آتی۔ ہمارے اپنے کیا کہیں گے۔"

میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ "کون سے اپنے وہی اپنے نا جنہوں نے ہمارے برے وقت میں ہمارا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ جنہوں نے اس لیے منگنی توڑ دی تھی کہ ہم قلاش ہوگئے تھے۔ کیا وہی اپنے ہیں، آپ کے اپنے؟"

وہ رسانیت سے بولیں۔ "اپنوں میں ایسا ہوہی جاتا ہے۔ اپنے اپنے ہی ہوتے ہیں۔ آج رباب آئی تھی اس نے کہا ہے کہ بھائی احمد اب دوبارہ رضوان کا رشتہ تمہارے ساتھ کرنے کو تیار ہیں۔"

"کیا!" میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اور آپ نے ہاں کردی؟"

"ہاں۔" انہوں نے مطمئن انداز میں کہا۔ "میں نے ہاں کردی ہے۔ آخر گھٹنے پیٹ کی طرف ہی جھکتے ہیں۔"

میں تڑپ کے بولی۔ "ہرگز نہیں، میں رضوان سے کبھی شادی نہیں کرسکتی۔ میں اگر شادی کروں گی تو صرف حسن سے۔" میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

وہ بولیں۔ "میں یہ ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔" پھر وہ خوف زدہ سے انداز سے بولیں۔ "کیا تم اس سے کورٹ میرج کرلوگی؟"

میں نے غصے میں کہا۔ "ہوسکتا ہے یہ ہی کر گزروں۔"

"جس دن تمہارے پاپا کو ایسی کسی بات کا پتا چلا اسی وقت ان کی سانس بند ہو جائے گی۔ بے شک یہ بول نہ سکیں گے مگر دیکھتے سنتے تو سب کچھ ہی ہیں۔"

میرا عزم جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ میں پاپا کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ "پاپا میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی۔ آپ مجھے اس حالت میں بھی نظر تو آتے ہیں۔"

ماما غصے میں کمرے سے باہر نکل گئی۔ انہوں نے ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے مصداق اگلے ہی ہفتے میرا نکاح طے کر دیا میں نے ان سے کچھ نہ کہا۔ صبح کو خاموشی سے فیکٹری چلی جاتی۔ حسن مشینیں چیک کرنے آجاتا۔ میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ وہ آنسو چھپاتا ہوا چلا گیا۔ وہ یہ بات سمجھ گیا تھا کہ پاپا کی زندگی مجھے بہت عزیز ہے۔ نکاح سے ایک دن پہلے ماما نے مہندی کا انتظام کردیا تھا۔ ماموں احمد، ممانی، رباب، عرفان اور رضوان ہمارے گھر میں تھے۔ ماما نے اپنے بھائی کو ہاں کہہ دی تھی۔ ہیرے جیسی بیٹی دوبارہ ان کی جھولی میں ڈال رہی تھیں۔ طے یہ ہوا تھا کہ میں شادی کے بعد بھی اسی طرح فیکٹری چلاؤں گی۔ یعنی ماں کے گھر سے ماموں کے گھر میری ٹرانسفر ہو جائے گی۔ باقی ذمہ داریاں میری وہی رہیں گی۔

میں خاموشی سے اٹھ کر پاپا کے پاس چلی آئی اور رو رو کر اپنے دل کا حال پاپا کو کہہ سنایا۔ میرے دل کو یقین تھا کہ پاپا میری تڑپ سے آگاہ ہیں۔ اگلے دن میں ماما کے منع کرنے کے باوجود فیکٹری چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد حسن بھی آگیا۔ میری سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر بولا۔ "نہ رویا کرو جو مقدر میں ہوتا ہے۔ وہی ملتا ہے۔ انسان اپنی قسمت سے نہیں لڑسکتا۔ راضی بہ رضا ہونا پڑے گا۔"

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ غم کی تصویر بنا ہوا تھا مگر وہ مرد تھا نا ضبط کی حدیں پار کر گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "حسن میں کیا کروں۔ اب تو ایک زندہ لاش ہی رضوان کے حوالے ہوگی۔ خوشیاں مجھ سے دور جا چکی ہیں۔ میں ساری زندگی ایسے ہی روتی رہوں گی۔"

وہ بولا۔ "اللہ نہ کرے۔ میری دعا ہے تم ہمیشہ خوش رہو۔"

میں رونے لگی۔ وہ دور سے ہی بولا۔ "اب تم کسی اور کی ہونے جارہی ہو میں تمہارے قریب آ کے تم کو چپ بھی کروانے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔" اس کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہوگئے کہ ایسے میں ماما کا فون آگیا۔ "اب گھر آجاؤ، دولہا والے آنے والے ہیں ابھی تم کو بیوٹی پارلر بھی جانا

ہے۔''

میں نے آرام سے کہا۔ ''بیوٹی پارلر تو میں نہیں جاؤں گی۔ ہاں تھوڑی دیر تک گھر آجاؤں گی۔''

انہوں نے غصے میں فون بند کر دیا۔ حسن نے مجھے سمجھایا۔ ''نایاب تم گھر چلی جاؤ اور ہاں اب نہ رونا میں ہوں یہاں پر سارا کام کروالوں گا۔ تم فکر نہ کرنا کل جب تم یہاں آؤ گی تو کسی اور کی نایاب بن کے آؤ گی۔'' اس نے اپنے بہتے ہوئے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم پھر بھی اچھے دوست رہیں گے کبھی بھی کوئی مشکل کوئی پریشانی ہو میں پہلے کی طرح تمہارے ساتھ ہی ہوں گا۔''

میں خدا حافظ کہہ کر گھر آگئی۔ گھر بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ مجھے رباب پر غصہ آرہا تھا۔ جو شخص اپنے سسرال میں عزت بنانے کے لیے مجھے پھنسا رہی تھی۔ ماما نے بہت زور دیا کہ میں بیوٹی پارلر سے تیار ہو جاؤں۔ میرا دل غم سے بھرا ہوا تھا۔ رباب بھی بہت زور دے رہی تھی مگر میں نے ان کی ایک نہ مانی اور روتے ہوئے پاپا کے کمرے میں آگئی۔ پاپا کے چہرے کو غور سے دیکھ کر میں ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اپنی بے بسی پر مجھے بے حد رونا آیا۔ میں پاپا کے پاؤں تھام کے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔

''پاپا! میں کیا کروں۔ مجھے حسن سے محبت ہے مگر مجھے آپ سے بہت زیادہ محبت ہے۔ میں جانتی ہوں حسن کے بغیر زندگی گزارنا میرے لیے بے حد مشکل ہے اور پاپا اس صورت میں جب کہ مجھے اس سے روز ملنا ہو میں کہاں جاؤں۔ پاپا میں کیا کروں۔ اے میرے اللہ! میرے پاپا کو ٹھیک کردے۔'' میں رو رو کر بلک بلک کر اللہ سے اپنے پاپا کے لیے دعا کرتی رہی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا پاپا کا پاؤں ہلا ہے۔ میں ساکت ہو گئی۔ پاپا کا پاؤں واقعی ہل رہا تھا۔ میں نے پاپا کے ہاتھوں کی طرف دیکھا پاپا کی انگلیاں بھی ہل رہی تھیں۔ میں بھاگ کے پاپا کی سائیڈ پر آگئی۔ پاپا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پھر مجھے ان کی آواز سنائی دی۔ ''نایاب۔''

میں نے بے اختیار ان کے چہرے کو چومنا شروع کر دیا۔ میرے پاپا نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میرے پاپا کومے سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ ہوش میں آگئے تھے۔ انہوں نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر تڑپ تڑپ کے رو دیے۔ میرے پاپا اٹھ کے بیٹھ گئے۔ انہوں نے میرا ماتھا چوما اور ایک بار مجھے گلے سے لگا لیا۔

میں نے پاپا کی مدد کرتے ہوئے ان کے پاؤں بیڈ سے نیچے اتارے اور ان کو کھڑے ہونے میں مدد کی۔ تھوڑی دیر وہ میرے سہارے سے کمرے میں چلتے رہے۔ مجھے یہ سب کچھ ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ پھر ہم صوفے پر بیٹھ گئے۔ میرے پاپا نے میرا ہاتھ ہاتھوں میں لے کے کہا۔ ''میری جان! میں اب تمہیں برباد نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے سب علم ہے میں سب سنتا تھا۔ بس بول نہ سکتا تھا۔ تمہاری ماں صرف اپنے بھائی کو خوش رکھنے کے لیے تمہاری قربانی دے رہی ہے۔ تم بے فکر رہو اب میں ٹھیک ہو گیا ہوں۔ اللہ نے مجھے تمہارے لیے ٹھیک کیا ہے۔ جاؤ تم اپنی ماں کو بلاؤ۔''

میرا موبائل پاپا کے پاس ہی رکھا تھا۔ میں اسے وہیں چھوڑ کر دوڑ کر ماما کے پاس پہنچی۔ ماں اور رباب کمرے میں تیار ہو رہی تھیں۔ میں بھاگ کر ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''ماما وہ پاپا......!'' میرے منہ سے نکلا۔ وہ دونوں سمجھیں کہ پاپا کو کچھ ہو گیا ہے۔ وہ دونوں بھاگ کے میرے سے پہلے پاپا کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ بیڈ پر پاپا نہیں تھے۔ وہ صوفے پر بیٹھے مسکرا رہے تھے اور میرے موبائل سے کسی کو فون کررہے تھے۔ ماما اور رباب دونوں حیران اور خوش ہو کے پاپا کے ساتھ صوفے پر بیٹھیں۔ پاپا نے کسی کو خدا حافظ کہا اور ماما سے کہا۔ ''نایاب کے آنسوؤں میں اتنی جان تھی کہ اللہ نے مجھے اس کے لیے ٹھیک کر دیا۔''

رباب، پاپا کے گلے لگ گئی۔ ماما نے بھی خوشی سے پاپا کے ہاتھ تھام لیے اور پاپا کو لے کے باہر نکل آئیں۔ ایک ہی لمحے میں پہلے ملازموں اور پھر سارے رشتے داروں میں یہ خبر پھیل گئی کہ دلاور صاحب کومے سے باہر آگئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ماموں احمد، عرفان، ممانی، رضوان وغیرہ ڈھیر سارے لوگوں کو بارات کی شکل میں لے کر آگئے اور پاپا کے گلے لگ کے ٹھیک ہونے کی مبارک باد دی۔ پاپا ان کو صرف گہری نظروں سے دیکھتے رہے۔ جب کہ میں، ماما اور رباب تو حقیقت میں بے انتہا خوش تھے۔

دو گھنٹے ایسے ہی گزر گئے۔ نہ ہی میں تیار ہوئی اور نہ ہی کسی نے مجھے تیار ہونے کو کہا۔ ہاں البتہ ماما پاپا کو ان کے کمرے میں لے گئیں۔ بوسکی کی شلوار قمیض پہنے خوب صاف ستھرے جب سامنے صوفے پر آکر بیٹھے تو ان کی مسکراہٹ دیکھ کے میرا دل خوشی میں جھوم اٹھا اور بھی مہمان آتے گئے۔ ماما اور رباب بھی پاپا کے ساتھ صوفے پر بیٹھی

تھیں۔ پاپا۔نے میرے کان میں کہا۔ ''تم تیار ہو کے آجاؤ۔''

یہ میرے پاپا کا حکم تھا۔ میں نے ذرا سی بھی چوں چرا نہ کی۔ رباب مجھے میرے کمرے میں تیار کرنے چل دی اور ایک گھنٹے کے بعد میں تیار ہو کے اپنے پاپا کے ساتھ بیٹھی تھی۔

ماموں احمد نے پاپا سے کہا۔ ''بھائی ولاور مولوی کو تو بلوا لیں اور اب نکاح پڑھوا دیں۔ پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔''

پاپا نے کہا۔ ''کس کا نکاح؟ کس کے ساتھ؟''

ممانی تیزی سے بولیں۔ ''رضوان کا نکاح نایاب کے ساتھ اور کس کے لیے یہاں سب جمع ہوئے ہیں۔''

پاپا نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''رضوان اور نایاب کی منگنی تو ٹوٹ چکی تھی ناں اور یہ منگنی آپ لوگوں نے ہی توڑی تھی۔''

ممانی ہکلا کر بولیں۔ ''وہ......وہ تو بس ایک غلط فہمی تھی اب دوبارہ یہ رشتہ سیماب آپا نے اپنی مرضی سے کیا ہے۔'' انہوں نے ماما کی طرف اشارہ کیا۔

''اللہ کا شکر ہے کہ یہ نکاح ہونے سے پہلے ہی اللہ مجھے ہوش میں لے آیا۔''

ماموں نے پاپا کی طرف غور سے دیکھ کر کہا۔ ''ہاں شکر ہے اللہ کا۔ اب دیر کس بات کی ہے۔ بلائیں مولوی کو۔''

پاپا غصے میں بولے۔ ''ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی ہے احمد میاں، تم نے جب یہ دیکھا کہ میں تو کومے میں ہوں نہ جانے زندہ رہوں یا مرجاؤں۔ فیکٹری ختم ہو گئی ہے۔ گھر بینک والے لے جائیں گے تو نایاب کے پاس کیا رہ گیا۔ یہ سوچ کے تم نے منگنی توڑ دی مگر اللہ نے ایک فرشتہ بھیج دیا۔ اس کی مدد اور اللہ کی مہربانی نے میری نایاب کو اتنا اونچا مقام دے دیا۔ پھر جب تم نے دیکھا کہ اب تو سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے، بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ٹھیک ہو گیا ہے تو تم نے سوچا نایاب، فیکٹری بھی چلاتی رہے گی اور تمہارا گھر بھی۔ اس لیے تم نے اپنی بہن سے دوبارہ نایاب کا ہاتھ مانگ لیا۔ اس کی ماں ہے، بےوقوف اس نے اس فرشتہ جیسے ہیرے کو ٹھکرا کر یہ پتھر پھر سے اپنے سر پر مارنے کا ارادہ کرلیا۔ بھائی احمد! میری نایاب......نایاب ہے۔ یہ آپ جیسے لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ اس کا نکاح رضوان جیسے فضول شخص سے نہیں ہو رہا۔''

ماموں احمد بھونچکے سے رہ گئے۔ کچھ نہ بولے مگر رباب کا شوہر عرفان فوراً بول اٹھا۔ ''اگر آپ نایاب کا نکاح رضوان سے نہیں کریں گے تو میں بھی رباب کو چھوڑ دوں گا۔''

پاپا مسکرائے اور بولے۔ ''ضرور چھوڑ دینا مگر رباب کا نکاح نامہ ابھی تک میرے پاس موجود ہے جس پر تمہارے سائن ہیں اور تم نے نکاح نامہ میں 50 لاکھ حق مہر کے ساتھ ساتھ 50 تولے زیور بھی لکھا ہے۔ سوچ لو میں تم کو چھوڑوں گا نہیں۔'' عرفان نے چہرے سے پسینا صاف کیا اور بیٹھ گیا۔ پاپا نے مزید کہا۔ ''نایاب کا نکاح ہونے والا ہے حسن کے ساتھ۔ حسن کو آپ لوگ نہیں جانتے۔ حسن ہی وہ فرشتہ ہے جس نے نایاب کو سہارا دیا۔ فیکٹری کے ہر مسئلے میں اس کی مدد کی۔ ہر مشکل میں ساتھ دیا۔ اسی حسن سے تھوڑی دیر میں نایاب کا نکاح ہو جائے گا وہ لوگ برات لے کے آنے ہی والے ہیں۔''

ماموں احمد نے پریشانی سے ممانی کو دیکھا۔ ممانی نے انہیں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئے۔ پاپا نے مزید کہا۔ ''آپ لوگ حسن سے تو واقف نہیں ہوں گے، مجھے بہت بعد میں پتا چلا کہ حسن کون ہے آپ لوگوں نے ہمارے گھر ایک کام والی برسوں تک دیکھی ہوگی۔ دلشاد نام تھا اس کا۔ حسن اسی کا بیٹا ہے۔ بہت محنتی ہے۔ خوددار ہے۔ شریف ہے۔ میں نے حسن کو اپنی نایاب کے لیے پسند کیا ہے۔''

سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ ماما بھی کچھ نہ بول سکی تھیں۔ پاپا پھر بولے۔ ''آپ لوگ اگر تقریب میں خوشی سے شامل ہونا چاہیں تو موسٹ ویلکم! اچانک لان میں گیٹ پر نگاہ پڑی تو دلشاد آنٹی، حسن اور کچھ لوگ اندر داخل ہو رہے تھے۔ پاپا جلدی سے اٹھے مگر امی نے آگے بڑھنے سے انہیں روک لیا۔ وہ ان کے اعصاب کو آرام دینے کی فکر میں تھیں۔ دو ڈھائی سال بعد ان کے اعصاب کام کررہے تھے۔ اس لیے اعصاب پر زیادہ بوجھ ڈالنا بھی مناسب نہ تھا۔ پاپا نے کھڑے کھڑے ہی فون کر کے مولوی کو بلوالیا اور میرا نکاح حسن کے ساتھ ہو گیا۔ چھ ماہ بعد میری رخصتی بھی ہو گئی اور میں بیاہ کے حسن کے گھر آ گئی۔ پاپا نے اپنی فیکٹری خود ہی سنبھال لی۔ حسن اب بھی پاپا کی فیکٹری میں چکر لگاتا رہتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے میں حسن کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ اللہ سب کو ایسا باپ اور ایسا شوہر دے، آمین!!''

سوکن

محترم مدیراعلیٰ سرگزشت
السلام علیکم
میں ایک معروف گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں اس لیے میں نے اپنا اور اس سرگزشت میں بیان کردہ تمام نام بدل دیے ہیں۔ ساتھ ہی گزارش ہے کہ میرا اصل نام بھی شائع نہ کریں۔ یہ سرگزشت صرف اس لیے بھیج رہی ہوں کہ ہر بیوی ہوشیار رہے۔ میری ماں کی طرح نادانی سے کام نہ لے۔
ثنا
(کراچی)

اس روز کالج سے واپس آئی تو گھر میں غیر معمولی چہل پہل دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ورنہ اس وقت تو عام طور پر سناٹا ہوا کرتا تھا۔ انجم بوا پورے گھر میں بولائی بولائی پھر رہی تھیں جب کہ امی لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی ملازمہ کو تیز آواز میں ہدایات دے رہی تھیں۔ ان کے لہجے میں بھی بوکھلاہٹ نمایاں تھی۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیوں کہ اس وقت امی عموماً اپنے کمرے میں ہوتی تھیں۔ انہیں دنیا میں صرف دو ہی کام تھے۔ آرام کرنا یا ٹی وی دیکھنا۔ انہیں ٹی وی دیکھنے

کا بہت شوق تھا۔ اگر رات کو سونا ضروری نہ ہوتا تو وہ شاید چوبیس گھنٹے ٹی وی ہی دیکھا کرتیں۔ کون سا ایسا ڈراما تھا جو انہوں نے نہ دیکھا ہو۔ پڑوسی ملک کے ساس بہو شوز سے لے کر اپنے ملک میں بنے ہوئے روتے دھوتے ڈرامے۔ وہ بڑی پابندی سے دیکھا کرتیں اور صبح کا وقت کوکنگ شوز کی نذر ہو جاتا۔ نہیں جو ترکیب پسند آتی اسے وہ کاپی میں لکھ لیا کرتیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس ترکیب کو آزمانے کی نوبت کبھی نہیں آتی۔ جب سے انجم بوا ہمارے گھر آئی تھیں۔ امی نے کچن سے ریٹائرمنٹ لے لی تھی اور گھر کے سارے کام انجم بوا کے سپرد کر دیے تھے۔ یہاں تک کہ صبح کے وقت ابو کو ناشتا بھی وہی دیتی تھیں کیوں کہ اس وقت امی سو رہی ہوتی تھیں۔ انہیں دیر تک سونے کی عادت تھی اور ان کی صبح گیارہ بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔

میں نے لمحوں میں ہی صورت حال کا اندازہ لگا لیا اور سمجھ گئی کہ دوپہر کے کھانے کا اہتمام ہو رہا ہے لیکن کھانا تو روز ہی بنتا تھا پھر یہ اتنی تیاریاں کس سلسلے میں ہو رہی تھیں۔ کچن سے آنے والی اشتہا انگیز خوشبو بتا رہی تھی کہ آج ضرور کسی کی دعوت ہے۔ اب میرے لیے ضبط کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس لیے پوچھ بیٹھی۔

''امی، کوئی مہمان آ رہا ہے کیا؟''

''ہاں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ ''بہت خاص مہمان آ رہے ہیں۔''

''یا اللہ!'' میں سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ ابھی تو میں اٹھارہ کی بھی نہیں ہوئی تھی اور امی کو میری شادی کی فکر ستانے لگی۔ میں نے دل ہی دل میں تہیہ کر لیا کہ اگر امی کا ایسا کوئی ارادہ ہے تو صاف انکار کر دوں گی۔ ابھی میں انٹر سائنس کے دوسرے سال میں تھی اور میرا ارادہ ڈاکٹر بننے کا تھا۔ لہٰذا پانچ چھ سال تک تو شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں اس خاص مہمان کا حدود اربعہ جان سکتی ہوں۔''

''ہاں! میری ایک بہت پرانی سہیلی ہیں۔ آج برسوں بعد ان سے ملاقات ہو رہی ہے۔''

''لیکن پہلے تو آپ نے کبھی کسی ایسی سہیلی کا ذکر نہیں کیا جو کئی برس سے آپ سے نہ ملی ہو۔''

''توبہ ہے، تم تو بال کی کھال نکالنے بیٹھ جاتی ہو۔ بھئی وہ میرے بچپن کی دوست ہے۔ اسکول اور کالج میں ہم ساتھ ہی تھے پھر ہم دونوں کی تقریباً ایک ہی سال میں آگے پیچھے شادی ہو گئی تھی اور وہ بیاہ کر لاہور چلی گئی۔ چند ماہ تک اس کے خطوط آتے رہے۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ میں ہمیشہ سے ہی خط لکھنے کی چور ہوں۔ کبھی جواب دیتی اور کبھی نہیں۔ البتہ ہمارے درمیان کبھی کبھار فون پر بات ہو جاتی پھر بدقسمتی سے اسے طلاق ہو گئی۔ شوہر سے نہ نبھ سکی دونوں کے درمیان زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس کے بعد اس کا دل یہاں نہیں لگا اور وہ انگلینڈ چلی گئی۔ جب تک اس کی والدہ زندہ تھیں تو خیر خیریت معلوم ہو جاتی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد فرزانہ سے کوئی رابطہ نہ رہا۔ اب وہ واپس آئی ہے تو اس نے فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ میں نے اسے کھانے پر بلایا ہے۔ اب وہ آئے گی تو معلوم ہو گا کہ وہ اتنا عرصہ کہاں رہی اور کیا کرتی رہی؟''

''آپ نے بتایا ہے کہ ان کی امی کا انتقال ہو گیا تھا۔ پھر وہ یہاں کس کے پاس ٹھہری ہوئی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اپنے بھائی کے پاس۔'' امی نے جواب دیا۔ ''اب تم زیادہ سوال جواب مت کرو اور جلدی سے فریش ہو کر کپڑے تبدیل کر لو۔ بس وہ آتی ہی ہو گی اور ہاں اس کے سامنے ذرا تمیز سے رہنا۔ الٹا سیدھا بولنے کی ضرورت نہیں۔''

میں دل ہی دل میں امی کی دوست کو برا بھلا کہتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اب مجھے ان محترمہ کے انتظار میں بھوکا رہنا ہو گا جب کہ میں کالج سے واپس آنے کے بعد فوراً ہی کھانا کھانے بیٹھ جاتی کیوں کہ مجھ سے بھوک بالکل برداشت نہیں ہوتی تھی۔ یہی حال چھوٹے بھائی احمر کا بھی تھا۔ ہم دونوں عموماً ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے لیکن ابھی تک وہ بھی نہیں آیا تھا۔ شاید پریکٹیکل کی وجہ سے اسے گھر آنے میں دیر ہو گئی تھی۔

کچھ دیر بعد فرزانہ آنٹی آ گئیں۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی گریس فل عورت نہیں دیکھی تھی۔ امی نے بتایا تھا کہ وہ اور آنٹی اسکول، کالج میں ساتھ پڑھتی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ دونوں ہم عمر بھی ہوں گی لیکن فرزانہ آنٹی امی کے مقابلے میں کم عمر اور جوان نظر آ رہی تھیں۔ ان کے باتیں کرنے کا انداز بڑا دل نشیں تھا۔ ان کی مسکراہٹ بڑی جان دار اور ہنسی میں ایک خاص کھنک شامل تھی۔ میں تو پہلی نظر میں ہی ان کی گرویدہ ہو گئی۔ انہوں نے بھی مجھ سے خوب گھل مل کر باتیں کیں۔ میری پڑھائی، فرصت کے مشاغل اور فلموں وغیرہ کے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔ آج تک کسی عورت نے مجھ سے اتنی محبت اور اپنائیت کا

اظہار نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ امی نے بھی نہیں۔ دوپہر سے شام ہوگئی لیکن ان کی باتیں کسی طرح ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ میں کچھ دیر ان کے پاس بیٹھنے کے بعد اپنے کمرے میں آگئی تاکہ برسوں کی بچھڑی ہوئی سہیلیوں کو کھل کر باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔

شام کی چائے کے بعد فرزانہ آنٹی نے واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو امی نے انہیں روک لیا۔ وہ ابو سے انہیں ملوانا چاہ رہی تھیں جو چھ بجے تک گھر آتے تھے۔ میرے خیال میں امی نے آنٹی کو روک کر اچھا نہیں کیا تھا کیوں کہ ابو انتہائی خشک اور کھردرے انسان تھے۔ انہیں پیسا بنانے کے علاوہ کسی بات سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دن بھر دفتر میں کاروباری معاملات دیکھتے اور گھر آنے کے بعد بھی کمرا بند کرکے فائلیں دیکھنے بیٹھ جاتے۔ کسی کو ان کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ہم لوگوں سے ان کی ملاقات صرف صبح کے ناشتے اور رات کے کھانے پر ہوتی۔ اگر ان کا دل چاہتا تو ہم سے ایک آدھ بات کرلیتے ورنہ خاموشی سے اٹھ کر چلے جاتے۔ امی کے ساتھ بھی ان کا رویہ بے گانوں جیسا تھا۔ دونوں میں بہت کم بات چیت ہوتی۔ ہم لوگ کسی رشتے دار کے گھر یا کہیں گھومنے پھرنے نہیں جاتے تھے اور نہ ہی کوئی ہمارے گھر آتا تھا۔ صرف ایک ماموں تھے جو کبھی کبھار امی کی خیریت معلوم کرنے آجاتے البتہ امی کے میکے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ جب چاہتیں ہم دونوں بہن بھائیوں کو لے کر نانا نانی سے ملنے چلی جاتیں۔ باقی رشتہ داروں سے ہماری ملاقات صرف شادی بیاہ کے موقع پر ہی ہوتی تھی۔ ابو محض دکھاوا کرنے کے لیے ان تقاریب میں چلے جاتے لیکن ان کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ جیسے ہی کھانا ختم ہو اور وہ ہم لوگوں کو لے کر گھر واپس آجائیں۔

گھر میں روپے پیسے کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ابو نے ہم لوگوں کے لیے تمام آسائشیں مہیا کر رکھی تھیں۔ وہ ہر مہینے گھر کے خرچ کے لیے ایک معقول رقم امی کے ہاتھ پر رکھ دیتے۔ ہمیں باقاعدگی سے جیب خرچ ملتا اور ہماری ہر فرمائش پوری کی جاتی۔ میں اکثر ابو کے رویے کے بارے میں غور کرتی لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ ایک دو مرتبہ امی سے پوچھا تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ شروع سے ہی ان کا مزاج ایسا ہے۔ انہیں تو جوانی میں ہی پیسا کمانے کی دھن سوار ہوگئی تھی اور وہ ابھی تک اس چکر سے نہیں نکلے اسی وجہ سے سب لوگوں سے کٹ کر رہ گئے تھے۔

میں سوچ رہی تھی کہ فرزانہ آنٹی کو ابو سے مل کر خاصی مایوسی ہوگی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ امی انہیں جانے دیتیں۔ کم از کم ہمارا بھرم تو رہ جاتا لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ شام کو ابو گھر میں داخل ہوئے تو لاؤنج میں ایک اجنبی چہرے کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہوں نے سوالیہ انداز میں امی کی طرف دیکھا تو وہ بولیں۔ ”احمد یہ میری بہت پرانی سہیلی فرزانہ ہے۔ ہم کئی سالوں بعد ملے ہیں۔ یہ انگلینڈ چلی گئی تھی۔ اس لیے رابطہ نہ ہوسکا۔ یہ تو شام کو ہی واپس جارہی تھی لیکن میں نے روک لیا کہ اتنی جلدی کیا ہے۔ کم از کم میرے شوہر سے تو ملتی جاؤ۔“

”بہت اچھا کیا۔“ ابو صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ”اس وقت اگر گرم گرم چائے مل جائے تو اس ملاقات کا لطف دوبالا ہوجائے گا۔“

میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد پہلی بار یہ منظر دیکھا تھا کہ ابو اپنے کمرے میں جانے کی بجائے لاؤنج میں رک گئے اور گھر آئے ہوئے مہمان کو کمپنی دینے پر تیار ہوگئے۔ یہ شاید فرزانہ آنٹی کی کرشماتی شخصیت کا سحر تھا جس نے ابو کو اپنے کمرے میں جانے سے روک دیا۔ اس موقع پر بھی امی اپنی روایتی کاہلی کا مظاہرہ کرنے سے باز نہ آئیں اور انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے بوا کو چائے لانے کے لیے کہہ دیا۔

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد فرزانہ آنٹی چلی گئیں۔ امی انہیں ایک دو روز کے لیے اپنے پاس روکنا چاہ رہی تھیں کیوں کہ بقول ان کے ابھی دل نہیں بھرا تھا لیکن فرزانہ آنٹی دوبارہ آنے کا وعدہ کرکے چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد امی نے فرزانہ آنٹی کے بارے میں جو کچھ بتایا اسے سننے کے بعد مجھے ان سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ فرزانہ آنٹی نے محبت کی شادی کی تھی اور وہ اپنے انتخاب پر بے حد خوش تھیں لیکن شادی کو ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ ان کی خوشیوں بھری زندگی کو کسی کی نظر لگ گئی۔ ان کا شوہر دفتر میں کام کرنے والی کسی طرح دار حسینہ کی زلفوں کا اسیر ہوگیا اور اس نے فرزانہ آنٹی سے بے رخی برتنا شروع کردی۔ جب انہیں حقیقت کا علم ہوا تو وہ غصے سے آگ بگولا ہوگئیں کیوں کہ انہوں نے والدین اور خاندان والوں کی مخالفت مول لے کر یہ شادی کی تھی۔ اس لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے شوہر کو گل کھلانے کے لیے آزاد چھوڑ دیتیں۔ انہوں نے اپنے شوہر کے سامنے دو شرطیں رکھیں کہ وہ اس لڑکی کو چھوڑ دے یا انہیں طلاق دے دے۔ اس شخص کی نظر اپنی محبوبہ کے باپ کی دولت پر تھی کیوں کہ وہ اکلوتی اولاد تھی اور باپ کے

مرنے کے بعد سب کچھ اسی کا تھا۔ ویسے بھی وہ لڑکی باتوں باتوں میں ان کے شوہر کو جتا چکی تھی کہ اس کے والدین جہیز میں روایتی سازوسامان کے علاوہ ایک لگژری فلیٹ، زیرو میٹر کار اور دس لاکھ روپے نقد دیں گے چنانچہ شوہر نامدار نے آنٹی کی دوسری شرط بخوشی مان لی اور وہ ماتھے پر طلاق کا لیبل سجائے میکے واپس آگئیں۔

اپنے گھر واپس آنے کے بعد بھی ان کی مشکلات میں کوئی کمی نہیں آئی اور بھاوج نے اٹھتے بیٹھتے انہیں طعنے دینا شروع کردیے جب کہ فرزانہ آنٹی بار بار یہ بات دہرا چکی تھیں کہ وہ کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتیں اور عدت ختم ہونے کے بعد کوئی ملازمت کرلیں گی۔ انہوں نے ماسٹرز کررکھا تھا اور کسی بھی کالج میں انہیں لیکچرار کی جاب باآسانی مل سکتی تھی لیکن بھاوج انہیں ایک منٹ بھی گھر میں رکھنے کی روادار نہیں تھی۔ اس نے ساس، سسر اور شوہر کو بھی اپنا ہم خیال بنالیا کہ اس معاشرے میں تنہا عورت کے لیے زندگی گزارنا بہت مشکل ہے لہٰذا جتنی جلد ممکن ہوسکے فرزانہ کی دوسری شادی کردی جائے۔ اس نے عدت ختم ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا اور فرزانہ کی رضا مندی کے بغیر ہی رشتے کرانے والی عورت کو اس کام پر لگادیا۔

فرزانہ اس ناکام شادی کے تلخ تجربے کے بعد اندر سے بری طرح ٹوٹ پھوٹ گئی تھی اور فی الحال ذہنی طور پر شادی کے لیے تیار نہیں تھی لیکن گھر میں کسی نے اس کی مرضی جاننے کی کوشش نہیں کی اور سب اپنے اپنے طور پر اس کے لیے رشتہ تلاش کرنے میں لگ گئے۔ اس دوران اس کے لیے کئی رشتے آئے لیکن ان میں کوئی بھی اس کے معیار اور مزاج کے مطابق نہیں تھا۔ کیوں کہ اس پر طلاق یافتہ کا لیبل لگ چکا تھا اس لیے کوئی بھی کنوارا اور معقول شخص اس سے شادی کرنے پر تیار نہ ہوتا۔ البتہ رنڈوے، ادھیڑ عمر، دو تین بچوں کے باپ اور کسی نہ کسی جسمانی معذوری کے شکار لوگ اس کے اُمیدواروں میں ضرور شامل ہوگئے تھے۔ وہ اس صورتِ حال سے سخت پریشان تھی اور اسے اندیشہ تھا کہ گھر والے کہیں جلد بازی میں آکر اس کی شادی کسی نامعقول شخص سے نہ کردیں۔

اس نے جیسے تیسے عدت کے دن پورے کیے اور انگلینڈ جانے کی تیاری شروع کردی۔ گھر والوں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی اسے طرح طرح کی دھمکیاں دی گئیں۔ طرح طرح کی خوشامد اور لالچ کا سہارا لیا گیا لیکن وہ اپنے ارادے سے باز نہ آئی اور اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اسے روکنے کی کوشش کی گئی تو وہ قانون کی مدد حاصل کرنے پر مجبور ہوجائے گی۔ وہ ایک پڑھی لکھی، عاقل بالغ اور خودمختار عورت ہے اور کوئی بھی اسے اس کی مرضی کے خلاف زندگی گزارنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ اس نے اپنے والدین کو یقین دلایا کہ وہ تعلیم مکمل کرکے وطن واپس آجائے گی۔ تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے وہ پارٹ ٹائم ملازمت کرے گی اور کسی پاکستانی فیملی کے ساتھ رہائش اختیار کرلے گی تاکہ اخراجات کم سے کم ہوں اور اسے اکیلے پن کا احساس بھی نہ ہو۔

گھر والوں نے اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور وہ لندن چلی گئی۔ اس نے صرف اپنی بھاوج کی سازشوں سے بچنے کے لیے یہ قدم اٹھایا تھا لیکن انگلینڈ پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ اس سے کتنی بڑی غلطی سرزد ہوگئی ہے۔ ایک اجنبی ملک میں کسی سہارے کے بغیر رہائش اختیار کرنا آسان نہ تھا۔ وہ اپنے ساتھ جو پیسے لے کر گئی تھی وہ چند ہی روز میں ختم ہوگئے۔ تعلیم حاصل کرنے کا سپنا ادھورا رہ گیا اور اسے گزراوقات کے لیے ایک اسٹور میں ملازمت کرنا پڑی۔

چند روز وہ ایک ہاسٹل میں رہی پھر اسٹور میں کام کرنے والی ایک انڈین لڑکی کے ساتھ کمرا شیئر کرلیا تھوڑے سے حالات بہتر ہوئے تو اسے اپنے مستقبل کی فکر لاحق ہوئی۔ اس کے سامنے ابھی پوری زندگی تھی اور تنہائی کا عذاب سہنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس کی روم میٹ نے بھی یہی مشورہ دیا کہ وہ شادی کرلے لیکن یہ اتنا آسان نہ تھا۔ کئی پاکستانیوں سے اس کی دوستی ہوئی لیکن کسی نے بھی اسے شادی کے لیے پرپوز نہ کیا سب وقتی عیاشی کے خواہاں تھے۔ وہ بھی اس حقیقت سے واقف تھی کہ دیارِ غیر میں رہنے والی ایک بے سہارا اور تنہا لڑکی سے کون شادی کرے گا۔

اس طرح دو سال گزر گئے۔ اس دوران میں اس کی شادی ہوئی اور نہ ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خواب پورا ہوسکا۔ اس نے ایک دو یونیورسٹیوں میں داخلہ لینے کی کوشش کی لیکن وہاں کے اخراجات اتنے زیادہ تھے کہ وہ اسے افورڈ نہیں کرسکتی تھی۔ اسٹور سے اسے جو تنخواہ ملتی تھی۔ اس سے بمشکل کمرے کا کرایہ اور کھانے پینے کے اخراجات ہی پورے ہوتے تھے۔ اس کا ویزا بھی ختم ہورہا تھا۔ ملٹی پل ویزا لینے کے لیے اسے ایک مرتبہ پاکستان واپس آنا پڑتا۔ البتہ اگر وہ کسی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیتی تو اسٹوڈنٹ ویزا مل سکتا تھا لیکن یہ اس کے بس میں نہیں تھا چنانچہ ہر طرف سے

مایوس ہوکر اس نے پاکستان واپس آنے کا ارادہ کرلیا۔
اس بار اس نے کراچی آنے کی بجائے لاہور میں قیام کو ترجیح دی۔ جہاں رشتے کی ایک خالہ رہتی تھیں۔ ان کا صرف ایک ہی بیٹا تھا جو عمر میں فرزانہ سے دو سال چھوٹا تھا۔ خالہ نے کچھ دن تو اسے برداشت کیا پھر آئے دن اسے کراچی جانے کا مشورہ دینے لگیں۔ اس دوران میں فرزانہ کو ایک کالج میں لیکچرار کی جاب مل چکی تھی اور وہ خالہ کو ہر مہینے ایک معقول رقم کھانے اور کرائے کی مد میں دینے لگی۔ اس کے بعد خالہ نے کبھی اسے کراچی جانے کے لیے نہیں کہا۔ البتہ ان کا بیٹا ارشد اس کے وہاں رہنے سے خوش نہیں تھا لیکن خالہ کے سمجھانے بجھانے پر خاموش ہوگیا۔
خالہ کی کوششوں سے اس کی دوسری شادی ہوگئی۔ اس کا شوہر اعجاز خاصا دولت مند لیکن انتہائی ظالم اور سنگ دل انسان تھا۔ شروع شروع میں تو اس نے فرزانہ کی بہت ناز برداری کی لیکن بہت جلد اس کا اصل روپ سامنے آگیا۔ سب سے پہلے تو اس نے فرزانہ کو حکم دیا کہ وہ ملازمت چھوڑ دے اور مکمل طور پر گھر داری سنبھال لے لیکن وہ اس پر تیار نہ ہوئی کیوں کہ چند ہی روز میں اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ گاڑی چلنے والی نہیں۔ یہ ملازمت اس کے لیے بہت بڑا سہارا تھی اور وہ اس سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اسی بات کو لے کر ان کے درمیان جھگڑے شروع ہوگئے اور نوبت مار پیٹ تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد یہ روز کا معمول بن گیا۔
اعجاز انتہائی بدزبان، بدتمیز اور ظالم شخص تھا۔ بات بات پر اسے روئی کی طرح دھنک دیتا۔ گالیاں اس کی زبان پر دھری رہتیں اور وہ اس کے پورے خاندان کو بڑے بڑے القاب سے نوازتا۔ ایک دن یہ انکشاف ہوا کہ اعجاز پہلے سے شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے اس کے بیوی بچے ملتان میں رہا کرتے تھے اور وہ ہر ہفتے کام کا بہانہ بنا کر ملتان جایا کرتا تھا۔ فرزانہ اس کے لیے محض ایک رکھیل تھی اور پھر ایک دن یہ بات اس کی زبان پر آ ہی گئی اور اس نے کھل کر کہہ دیا کہ وہ اسے ایک داشتہ سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا۔ اس نے نکاح صرف اس لیے کیا ہے، تاکہ زنا کی تہمت سے بچ سکے۔
فرزانہ سے یہ گالی برداشت نہ ہوسکی اور اس نے اعجاز سے طلاق کا مطالبہ کردیا۔ پہلے تو وہ اس پر تیار نہ ہوا لیکن خالہ اور ارشد کے دباؤ ڈالنے پر اسے طلاق دینا پڑی۔ فرزانہ نے بھی اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے سیدھی طرح طلاق نہ دی تو وہ عدالت سے خلع کے لیے رجوع کرے گی۔ اعجاز کورٹ کچہری کے چکر سے بہت ڈرتا تھا۔ اس لیے اس نے فرزانہ کو آزاد کردیا۔
جب اس کے والدین اور بھائی کو ان حالات کا علم ہوا تو انہوں نے فرزانہ پر زور دیا کہ وہ اپنے گھر واپس آجائے لیکن اس نے انکار کردیا۔ وہ لاہور میں خالہ کے گھر بہت خوش تھی اور دوبارہ اپنی بھاوج کے چنگل میں نہیں پھنسنا چاہتی تھی۔ وہ ایک دو مرتبہ اپنے والدین سے ملنے کراچی آئی لیکن مہمانوں کی طرح چند دن گزار کر واپس چلی گئی۔
چند دن بعد خالہ کو پھر اس کی شادی کی فکر ستانے لگی لیکن اس نے صاف انکار کردیا۔ دو مرتبہ کے تلخ تجربات کے بعد اب وہ کسی مرد کی غلامی کرنے پر تیار نہ تھی چنانچہ اس نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ چند دن سکون سے گزرے لیکن پھر اسے پریشانیوں نے آن گھیرا۔ ارشد کی شادی ہوگئی تو خالہ کا گھر چھوٹا پڑنے لگا۔ ویسے بھی اس گھر میں دو ہی تو کمرے تھے۔ ایک میں ارشد اور اس کی دلہن رہنے لگے۔ دوسرا خالہ اور فرزانہ کے حصے میں آیا۔ اس گھر میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں کسی مہمان کو بٹھایا جاتا۔ ارشد کی بیوی کو بھی فرزانہ کا رہنا ناگوار گزرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر فرزانہ وہاں سے چلی جائے تو وہ ایک کمرے کو ڈرائنگ روم بنالے گی۔ خالہ کا کیا ہے۔ وہ تو برآمدے میں بھی بستر ڈال سکتی ہیں۔ یہی پٹی اس نے ارشد کو پڑھائی تو وہ بھی اس کا ہم نوا ہوگیا اور ایک دن اس نے فرزانہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اپنا انتظام کہیں اور کرلے۔
فرزانہ کے سامنے اب دو ہی راستے تھے۔ وہ کراچی آجائے یا کسی ہوٹل میں رہائش اختیار کرے۔ اس نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا اور عورتوں کے ہوسٹل میں چلی گئی۔ بھائی کو معلوم ہوا تو اس نے بہت واویلا مچایا اور اسے لینے لاہور پہنچ گیا لیکن فرزانہ نے ایک بار پھر کراچی آنے سے انکار کردیا۔ اس دوران میں اس کے والدین کا انتقال ہوگیا۔ وہ ان کے مرنے پر آئی لیکن چند دن رہ کر واپس چلی گئی۔ اسے تنہا رہنے کی عادت ہوگئی تھی۔ اب اس کی تنخواہ بھی بڑھ گئی تھی اور بینک میں خاصے پیسے جمع ہوگئے تھے۔ وہ بے فکری کی زندگی بسر کررہی تھی۔ اسی طرح دس سال گزر گئے۔ پھر اچانک ہی اس کی ملازمت ختم ہوگئی۔ جس پرائیویٹ کالج میں پڑھاتی تھی وہ کسی وجہ سے بند ہوگیا۔ مجبوراً فرزانہ کو کراچی واپس آنا پڑا اسے یہاں ملازمت مل

گئی لیکن اس نے بھائی بھاوج کے سامنے یہ شرط رکھ دی ہے کہ وہ اس کی ذاتی زندگی میں مداخلت نہیں کریں گے اور نہ ہی اس سے شادی کے لیے کہیں گے۔

☆......☆

اب فرزانہ آنٹی ہر دوسرے تیسرے روز ہمارے گھر آنے لگیں۔ ان کی وجہ سے کافی رونق ہو گئی تھی۔ وہ ہمیشہ لدی پھندی آتیں اور اکثر رات کا کھانا کھا کر واپس جاتیں۔ ہم لوگوں سے تو خیر وہ بے تکلف ہو ہی گئی تھیں لیکن ابو بھی ان سے خوب گھل مل کر باتیں کیا کرتے۔ مجھے ابو کے رویہ پر بڑی حیرت تھی۔ وہ تو کسی کو منہ ہی نہ لگاتے تھے۔ فرزانہ آنٹی بہت خوش قسمت تھیں کہ ابو انہیں لفٹ کرانے لگے تھے۔

ایک دن فرزانہ آنٹی آئیں تو خاصی پریشان نظر آ رہی تھیں۔ امی کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ بھابی نے پھر انہیں تنگ کرنا شروع کر دیا ہے حالانکہ وہ اپنی تنخواہ کا ایک بڑا حصہ ان کے ہاتھ پر رکھ دیتی ہیں اور ان کے بچوں کے لیے بھی آئس کریم، چاکلیٹ، پھل اور چھوٹے موٹے تحفے لاتی رہتی ہیں لیکن پھر بھی بھابی کو ان کا وجود ناگوار گزرتا ہے اور وہ انہیں اپنے گھر میں نہیں رکھنا چاہتیں حالانکہ یہ ان کے باپ کا بنایا ہوا مکان ہے اور اس میں ان کا بھی حصہ ہے۔

امی کو ان کے حالات سن کر بہت افسوس ہوا اور انہوں نے اصرار کر کے آنٹی کو روک لیا۔ وہ ایک ہفتہ ہمارے یہاں رہیں۔ انہیں بیٹھ کر کھانے کی عادت نہیں تھی۔ وہ علی الصبح اٹھ جاتیں اور بوا کے ساتھ مل کر ناشتا تیار کرتیں۔ ان کو دیر تک سونے کی عادت تھی۔ اس لیے بوا ہی ہم لوگوں کے لیے ناشتا تیار کرتیں۔ ابو کو دفتر جانے کی جلدی ہوتی تھی۔ اس لیے وہ سلائس اور چائے پر ہی گزارا کر لیتے تھے۔ پہلے روز آنٹی نے ان کے سامنے پراٹھا اور آملیٹ رکھا تو وہ بہت حیران ہوئے۔ شاید شادی کے بعد پہلی بار ناشتے میں انہیں یہ نعمت نصیب ہوئی تھی۔

آنٹی ایک ہفتہ رہ کر واپس چلی گئیں اور ہماری زندگی میں پھر وہی سونا پن لوٹ آیا۔ ابو مزید چڑچڑے ہو گئے اور انہوں نے ایک بار پھر ہم سب سے قطع تعلق کر لیا۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ وہ ناشتا کیے بغیر ہی گھر سے چلے گئے لیکن امی کو اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ اپنی ہی دنیا میں مگن تھیں۔ میں نے اس جانب ان کی توجہ دلائی تو وہ تنک کر بولیں۔

''وہ کوئی بچے نہیں ہیں جو میں انہیں اپنے ہاتھ سے ناشتا بنا کر کھلاؤں۔ میز پر ڈبل روٹی، مارجرین، جیلی اور ابلے ہوئے انڈے موجود ہوتے ہیں۔ بوا چائے بنا کر دے دیتی ہیں۔ اب انہیں اور کیا چاہیے۔''

چند دنوں بعد فرزانہ آنٹی دوبارہ آ گئیں۔ اس مرتبہ وہ اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس بھی لائی تھیں۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں امی کو بتایا کہ وہ بھائی کا گھر چھوڑ کر آ گئی ہیں اور چند دن ہمارے یہاں قیام کریں گی جیسے ہی ان کی رہائش کا کوئی بندوبست ہو گیا تو وہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر چلی جائیں گی۔ امی نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ یہ بھی ان کا ہی گھر ہے۔ کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ یہاں آرام سے رہ سکتی ہیں لیکن فرزانہ آنٹی بار بار یہی کہتی رہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کے اندر چلی جائیں گی۔

آنٹی نے امی کے احسان کا بدلہ یوں چکایا کہ مہمان کی بجائے گھر کی فرد بن گئیں۔ وہ علی الصبح اٹھ جاتیں اور ہم لوگوں کو ناشتا دینے کے بعد ابو کے لیے انڈے پراٹھے بناتیں۔ ہماری وین پہلے آ جاتی اور اس کے پندرہ بیس منٹ بعد ابو دفتر جانے کے لیے نکلتے تھے۔ ایک دن ہماری گاڑی نہیں آئی تو ہم دونوں بہن بھائی گھر واپس آ گئے ہمارا خیال تھا کہ ابو کے ساتھ نکل جائیں گے۔ دیکھا تو آنٹی اور ابو اکٹھے میز پر بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ آنٹی وفادار بیوی کی طرح ابو کی ناز برداری کر رہی تھیں۔ امی حسب معمول گہری نیند سوئی ہوئی تھیں اور بوا کچن میں کھڑی بڑبڑا رہی تھیں۔ اس وقت میں چھوٹی تھی۔ اس لیے بہت سی باتیں نہیں سمجھ سکی لیکن اتنا ضرور جان گئی کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔

ابو نے ہمیں دیکھا تو سنبھل کر بیٹھ گئے اور آنٹی تیار ہونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ابو نے گھڑی پر نظر ڈالی اور بولے۔ ''بیٹا تم لوگوں کو تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ تمہاری آنٹی تیار ہو جائیں تو انہیں بھی کالج چھوڑ دیں گے۔''

ان کی بات سن کر میں حیران رہ گئی۔ یاالٰہی! یہ کیسا انقلاب آ گیا۔ ابو تو اپنے معمول میں ایک منٹ کی تاخیر برداشت نہیں کرتے تھے اور گھڑی کی سوئی کے مطابق چلتے تھے۔ آنٹی نے ان پر ایسا کیا جادو کر دیا کہ وہ ان کی خاطر آدھا گھنٹا تاخیر سے جا رہے تھے۔ شام کو بوا نے بتایا کہ فرزانہ آنٹی جس دن سے آئی ہیں، روزانہ ہی ابو کے ساتھ کالج جاتی ہیں۔ انہوں نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''بیٹا! اپنی امی کو سمجھاؤ۔ میں تو اس گھر کی ملازمہ ہوں۔ اس لیے یہ بات نہیں کہہ سکتی کہ کسی پر اتنا اعتبار کرنا ٹھیک نہیں

ہوتا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بے خبری میں ماری جائیں۔‘‘

میں امی سے کیا کہتیں۔ انہوں نے خود ہی اپنی آنکھیں بند کررکھی تھیں۔ مانا کہ وہ صبح کے وقت جلدی نہیں اٹھ سکتی تھیں لیکن انہیں تو جاگتے میں بھی کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ فرزانہ آنٹی دو بجے کے قریب کالج سے گھر آتیں اور کھانا کھا کر اپنے کمرے میں آرام کیا کرتیں۔ شام کو وہ فریش ہو کر باہر آتیں تو ان کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھلا ہوتا تھا۔ شام کی چائے پر وہ کوئی نہ کوئی چیز ضرور تیار کرتیں۔ کبھی پکوڑے، کبھی آلو کے چپس تو کبھی چکن نگٹس۔ اب ابو باقاعدگی سے شام کی چائے ہمارے ساتھ پینے لگے تھے۔ اسی طرح وہ رات کے کھانے کے لیے بھی کوئی نہ کوئی خاص ڈش ضرور تیار کرتیں۔ ابو ان کے پکائے ہوئے کھانوں کی دل کھول کر تعریف کرتے اور امی اس طرح خوش ہوتیں جیسے یہ داد انہیں مل رہی ہو۔

فرزانہ آنٹی کو ہمارے گھر آئے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ بوا کو اچانک چھٹی پر جانا پڑ گیا۔ ان کی بہو اُمید سے تھی اور ڈلیوری میں ابھی ایک مہینا باقی تھا اور وہ اس وقت تک اس کے پاس ہی رہتیں۔ امی کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ انہوں نے عرصہ دراز سے گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ سب کچھ بوا کے ذمے تھا۔ جیسا کہ پہلے بتا چکی ہوں کہ امی کو دیر تک سونے کی عادت تھی اور وہ گیارہ بجے سے پہلے بیدار نہیں ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے گھٹنوں میں بھی تکلیف رہنے لگی تھی۔ اس لیے وہ کھڑے ہو کر کوئی کام نہیں کرسکتی تھیں۔ ناشتا کرنے کے بعد وہ بوا کو دوپہر کے کھانے کے لیے ہدایات دے کر ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتیں اور کاپی قلم سنبھال کر کھانا پکانے کی ترکیبیں لکھا کرتیں۔ بعض اوقات مجھے ہنسی بھی آتی کہ جب انہیں کچھ پکانا ہی نہیں تو وہ ترکیبیں کیوں لکھتی ہیں اور جواب میں وہ کہا کرتیں کہ بس دعا کرو۔ جلدی سے اچھی ہو جاؤں پھر تم لوگوں کو مزے مزے کی ڈشیں بنا کر کھلاؤں گی۔ اس موقع پر بھی فرزانہ آنٹی نے اپنی خدمات پیش کردیں اور کہا کہ جب تک بوا واپس نہیں آجاتیں۔ وہ گھر کا سارا کام دیکھ لیں گی۔ ویسے اوپر کے کام کے لیے ایک ملازمہ موجود تھی اور بوا نے اسے اچھی خاصی ٹریننگ دے دی تھی۔ اس لیے آنٹی کو اس سے بھی مدد مل سکتی تھی۔

امی اٹھتے بیٹھتے آنٹی کی تعریفیں کیا کرتی تھیں لیکن میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ بوا کے جانے کے بعد آنٹی نے خوب پر پرزے نکالے تھے اور اب وہ کھل کر کھیل رہی تھیں۔ پہلے ابو ساڑھے سات بجے ناشتے کی میز پر آتے تھے لیکن اب انہیں سات بجے ہی ناشتے کی طلب ہونے لگی تھی۔ اس طرح وہ دونوں تقریباً ایک گھنٹے تک خوش گپیوں میں مصروف رہتے۔ پھر وہ تیار ہونے جاتیں اور پندرہ بیس منٹ بعد باہر آتیں تو ان کی سج دھج ہی نرالی ہوتی۔ وہ لیکچرار کی بجائے انڈین ایکٹریس نظر آتیں۔ پہلے وہ عموماً شلوار قمیص پہنا کرتی تھیں لیکن اب انہوں نے ساڑی کا استعمال زیادہ کردیا تھا۔ پھول دار شیفون کی ساڑی میں ان کا بھرا بھرا جسم خوب غضب ڈھاتا تھا۔ وہ کھلے گلے کا مختصر سا بلاؤز پہنا کرتیں۔ اپنے لمبے بالوں کو سمیٹ کر وہ جوڑے کی شکل دیتیں۔ گلے میں سفید موتیوں کی مالا اور آنکھوں پر سیاہ گلاسز چڑھائے وہ گھر کی مالکن معلوم ہوتی تھیں اور امی اگر ان کے سامنے آجاتیں تو سب انہیں نوکرانی سمجھتے۔

پھر کبھی کبھی یوں ہونے لگا کہ وہ دوپہر کو دیر سے گھر آتیں۔ ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے شاپرز ہوتے تھے جن میں وہ ہمارے لیے بازار سے کھانا لے کر آتی تھیں۔ ان کے پاس دیر سے آنے کے کئی بہانے تھے۔ کبھی کالج میں میٹنگ تو کبھی وہ شاپنگ کے لیے چلی جاتیں۔ اکثر یہ بھی ہوتا کہ وہ رات کے کھانے پر ایک ایکسٹرا ڈش تیار کرلیتیں تاکہ اگلے روز دوپہر میں ہمارے کام آسکے۔

کچھ دنوں سے مجھے آنٹی کے تیور بدلے نظر آرہے تھے۔ وہ امی سے زیادہ بات نہیں کرتی تھیں البتہ ابو کی موجودگی میں خوب چہکا کرتی تھیں۔ انہیں بے شمار اشعار زبانی یاد تھے اور وہ بات بات پر شعر پڑھا کرتی تھیں۔ ابو ان اشعار کو سن کر اس طرح داد دیتے جیسے یہ آنٹی کا اپنا کلام ہو۔ اب مجھے آنٹی کے رویے پر شک ہونے لگا تھا۔ ابو سے ان کی بے تکلفی خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی اور ابو کو بھی اس عمر میں چونچلے سوجھنے لگے تھے۔ وہ شادی شدہ اور نوعمر بچوں کے باپ تھے۔ انہیں ایک غیر عورت سے اتنا بے تکلف نہیں ہونا چاہیے تھا۔

چند روز بعد ہی میرا شک یقین میں بدل گیا۔ ہوا یوں کہ اس روز آنٹی اپنے وقت پر گھر آگئی تھیں۔ کوئی تین بجے کے قریب وہ باتھ روم میں گئیں۔ ان کا موبائل ڈائننگ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا اور میں سامنے صوفے پر بیٹھی ایک میگزین پڑھ رہی تھی کہ ان کے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے یہ سوچ کر فون

اٹھا لیا کہ شاید آنٹی کے لیے کوئی ضروری پیغام ہو لیکن اسکرین پر ابو کا نمبر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اب میرے کچھ بولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں فون بند کرتی۔ ابو کی بھاری آواز سنائی دی۔

''فرزانہ! پانچ بجے تک اسی ریستوران میں آجاؤ جہاں ہم لنچ کیا کرتے ہیں۔ میں بھی وہیں آرہا ہوں۔ آج فلم دیکھنے کا موڈ ہے۔ اس کے بعد کسی اچھے ہوٹل میں ڈنر کریں گے۔'' اسی اثناء میں آنٹی آگئیں۔ میں نے فون انہیں پکڑایا اور تیزی سے اپنے کمرے میں آگئی۔ ابو نے ان سے کیا کہا اور آنٹی نے کیا جواب دیا اس سے مجھے کوئی غرض نہیں تھی۔ میں نے جو سنا وہی بہت تھا۔

کمرے میں آکر میں خوب روئی۔ ہمارے گھر میں یہ کیسا کھیل کھیلا جارہا تھا۔ امی کی بے پروائی، بے خبری اور آنٹی پر اندھا اعتبار رنگ لایا اور آنٹی نے وہ کام کر دکھایا جس کی کسی سہیلی سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ امی تو یہ سن کر ہی پاگل ہوجائیں گی لیکن انہیں خواب غفلت سے بیدار کرنا بہت ضروری تھا۔ ایسا نہ ہو کہ پانی سر سے اونچا ہوجائے اور آنٹی اپنے عزائم میں کامیاب ہوجائیں۔

پانچ بجے سے کچھ پہلے آنٹی بن ٹھن کر باہر جانے کے لیے نکلیں۔ امی سے یہ بہانا بنایا کہ وہ اپنی کولیگز کے ساتھ فلم دیکھنے جارہی ہیں اور رات کے کھانے پر ان کا انتظار نہ کیا جائے۔ تھوڑی دیر بعد ابو کا فون بھی آگیا کہ انہیں ایک کاروباری ڈنر میں جانا ہے۔ اس لیے وہ دیر سے گھر آئیں گے۔

اب مجھ سے ضبط کرنا مشکل ہوگیا اور میں نے امی کو ساری بات بتا دی۔ وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں اور ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس مسئلے سے کیسے نمٹا جائے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولیں۔ ''اب ہم یہاں ایک دن بھی نہیں رہیں گے۔ تم دونوں بہن بھائی اپنا سامان باندھو اور نانا کے گھر چلنے کی تیاری کرو۔''

''یہ مناسب نہیں ہوگا۔'' میں نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اس طرح تو آپ ان دونوں کے لیے میدان کھلا چھوڑ دیں گی۔ کوئی ایسی ترکیب سوچیں کہ سانپ مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

''اب یہ ممکن نہیں۔'' وہ غصے سے بولیں۔ ''میں یہ کیسے برداشت کرسکتی ہوں کہ وہ میری نظروں کے سامنے رنگ رلیاں مناتے رہیں۔''

''یہ موقع آپ نے خود ہی انہیں دیا ہے۔'' میں تلخی سے بولی۔ ''اب بھی وقت ہے کہ آپ خود کو سنبھالیں اور اس عورت کو یہاں سے چلتا کریں۔''

''کیا یہ ممکن ہے؟'' وہ سادگی سے بولیں۔

بالکل اسے یہ احساس دلا دیں کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں اور ہم اپنا کام خود کرسکتے ہیں۔ اس کے لیے آپ کو اپنے معمولات میں تبدیلی لانا ہوگی۔ صبح جلدی اٹھیں۔ کچن سنبھالیں۔ اپنے ہاتھ سے سب کو ناشتا بنا کر دیں۔ اس عورت کو مہمانوں کی طرح میز پر بٹھا کر کھلائیں اور اسے گھر کے کاموں سے الگ کردیں تاکہ وہ اپنے آپ کو ہم پر بوجھ سمجھنے لگے۔ شروع شروع میں آپ کو تکلیف تو ہوگی لیکن بہت جلد آپ اس معمول کی عادی ہوجائیں گی۔ میں بھی آپ کا ہاتھ بٹاؤں گی۔ کچھ دنوں بعد بوا بھی واپس آجائیں گی۔ کوشش کریں کہ ان کے آنے سے پہلے یہ عورت یہاں سے چلی جائے۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' وہ خجالت سے بولیں۔ ''میری غفلت نے یہ دن دکھایا ہے۔ میں نے تو اس کی مظلومیت پر ترس کھا کر اسے اپنے گھر میں پناہ دی تھی مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ بدو کا اونٹ ثابت ہوگی۔''

''خیر اب آپ خاموشی اختیار کرلیں اور یہ ظاہر کریں کہ جیسے آپ کو کچھ معلوم ہی نہیں۔ ابو کے قریب ہونے کی کوشش کریں اور آنٹی کو ان سے دور کردیں۔''

امی کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ اس روز آنٹی کی واپسی رات دس بجے کے قریب ہوئی۔ ابو اس کے پندرہ منٹ بعد گھر میں داخل ہوئے۔ دونوں کے چہروں سے ایک اندرونی جوش جھلک رہا تھا۔ مجھے ابو پر سخت غصہ آیا۔ انہیں اس عمر میں ایک غیر عورت کے ساتھ ڈیٹ پر جاتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آئی۔ آنٹی بھی اب کسی ہمدردی کی مستحق نہیں رہی تھیں بلکہ وہ مجھے ایک ایسی ڈائن لگیں جو دوسروں کا گھر اجاڑنے کے درپے ہو۔

میں نے امی کے ساتھ مل کر دوسرے دن سے ہی اپنے منصوبے پر عمل شروع کردیا۔ امی فجر کی اذان پر ہی اٹھ کھڑی ہوئیں اور نماز کے بعد کچن میں مصروف ہوگئیں۔ سات بجے کے قریب آنٹی اپنے معمول کے مطابق کچن میں تشریف لائیں تو امی ناشتا تیار کرچکی تھیں۔ آنٹی انہیں دیکھ کر حیران رہ گئیں اور بولی۔ ''ارے شہلا! تم کیوں آگئیں۔ میں ہوں ناں۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں فکر کرنے کی کیا

ضرورت ہے۔“

”کچھ اچھا نہیں لگتا فرزانہ۔“ امی نے بے رخی سے کہا۔ ”یہ میرا گھر ہے اور مجھے ہی اپنی ذمے داریاں پوری کرنا چاہئیں۔ تم تو دو چار دن بعد چلی جاؤ گی۔ اس کے بعد بھی سب کچھ مجھے ہی دیکھنا ہے پھر تمہیں کیوں تکلیف دی جائے۔“

فرزانہ آنٹی کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن امی نے انہیں موقع نہیں دیا اور بولیں۔ ”یہ بتاؤ کہ تمہاری رہائش کا بندوبست ہوا یا نہیں۔ میری مانو تو بھائی کے گھر واپس چلی جاؤ۔ آخر کب تک اِدھر اُدھر ماری ماری پھرتی رہوگی۔“

دوسرے الفاظ میں امی نے انہیں اپنے گھر سے جانے کا کہہ دیا تھا۔ فرزانہ آنٹی بچی نہ تھیں جو اتنی معمولی سی بات بھی نہ سمجھ پاتیں۔ امی کے سرد لہجے اور بے رخی کو محسوس کرکے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ سمجھ گئیں کہ امی کو کچھ شک ہو گیا ہے لیکن وہ بھی اوّل درجے کی مکار عورت تھیں۔ چہرے پر دنیا جہان کی مظلومیت لاتے ہوئے بولیں۔ ”تم فکر نہ کرو شہلا، میں کوشش کر رہی ہوں جیسے ہی رہائش کا بندوبست ہو گیا میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔“

”آپ کہیں نہیں جائیں گی۔“ ابو نے گرج دار آواز میں کہا۔ وہ نہ جانے کب سے کچن کے دروازے پر کھڑے ان دونوں کی باتیں سن رہے تھے۔ ”یہ میرا گھر ہے اور کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ آپ سے جانے کے لیے کہے۔“

امی حیران ہوتے ہوئے بولیں۔ ”یہ ہم دونوں کا معاملہ ہے۔ آپ کیوں بیچ میں بول رہے ہیں۔“

”اب یہ میرا معاملہ بھی بن گیا ہے۔“ ابو گھڑی دیکھتے ہوئے بولے۔ ”مجھے دفتر جانا ہے۔ تم سے شام کو بات ہو گی۔“

یہ کہہ کر وہ ناشتا کیے بغیر چلے گئے۔ آنٹی نے فاتحانہ انداز میں امی کو دیکھا اور ایک ادا سے بالوں کو جھٹکتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ امی حیران پریشان کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ پل بھر میں کیا ہو گیا لیکن انہیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ کھچڑی کئی روز سے پک رہی تھی اور اب ابو کسی فیصلے پر پہنچ چکے تھے۔ میں امی کو تسلی دلاسے دینے کے سوا کیا کر سکتی تھی۔ اب ہمیں شام کا انتظار تھا۔

دفتر سے آنے کے بعد ابو نے امی کو کمرے میں بلایا اور کچھ لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ دیا کہ وہ فرزانہ آنٹی سے شادی کر رہے ہیں کیوں کہ امی ایک بیوی کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا کرنے میں ناکام ہو گئی ہیں۔ وہ نوکروں کے ہاتھ

جمعیت

جدید عربی زبان میں یہ اصطلاح جماعت یا انجمن کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ اس اصطلاح کا استعمال موجودہ دور ہی میں شروع ہوا اور پہلی بار یہ اصطلاح غالباً ان منظم خانقاہی فرقوں یا اجتماعات کے لیے جو سترہویں صدی کے آخر اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں شام اور لبنان کے مشرقی یونانی کلیساؤں میں منظر عام پر آئے۔ مثلاً جمعیت المخلص یعنی ایک یونانی کیتھولک فرقہ جس کی بنیاد 1708ء کے قریب رکھی گئی۔ وسط انیسویں صدی میں لبنان اور ازاں بعد عربی بولنے والے دوسرے ممالک میں بھی اس اصطلاح کا استعمال عام ہو گیا اور علمی، ادبی، فلاحی اور سیاسی مقاصد کے لیے رضاکارانہ طور پر قائم ہونے والی جماعتوں پر بھی اس نام کا اطلاق ہونے لگا۔ سب سے پہلی جماعت جو الجمعیۃ السوریہ کے نام سے 1847ء میں قائم ہوئی اس کی بنیاد ان امریکی پروٹسٹنٹ مبلغین نے جو علمی مذاق رکھتے اور تہذیب و ثقافت کے معیار کو بلند کرنا چاہتے تھے بیروت میں قائم کی۔ 1857ء میں اس کی جگہ الجمعیۃ العلمیہ السوریہ نے لی جو ایک بڑی جماعت تھی۔ 1968ء میں عثمانی حکومت نے اس کا وجود سرکاری طور پر تسلیم کر لیا۔ اسی قسم کی ایک تنظیم 1850ء میں الجمعیۃ الشرقیہ قائم کی گئی۔ پہلی انجمن خواتین جو بیروت میں 1881ء میں جمعیت باکورہ ھوریہ تھی۔ جمعیۃ الخیریۃ الاسلامیہ غالباً سب سے پہلی مسلمان فلاحی انجمن تھی اس کی بنیاد 1878ء میں سکندریہ میں رکھی گئی۔ اس کے اغراض و مقاصد میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے قومی مدارس کا قیام تھا لیکن اعرابی تحریک اور برطانوی قبضے کی وجہ سے اس کا خاتمہ ہو گیا۔ بعد میں 1892ء میں ایک اور جماعت الجمعیۃ الخیریۃ الاسلامیہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ مصر کے مشہور عالم شیخ محمد عبدہ، اس جمعیت کے سرگرم رکن تھے۔ اس جمعیت کے ماتحت کئی مدارس قائم کیے گئے۔

مرسلہ: ساجد حنیف۔ لاہور

کا بنا ہوا کھانا کھا کر تنگ آچکے ہیں۔ فرزانہ ان کی ویران زندگی میں بہار کے جھونکے کی مانند آئی ہے۔ اور انہیں پہلی بار اس گھر میں کسی عورت کی موجودگی کا احساس ہوا ہے۔ ان کے لیے امی کا وجود ہونے نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ وہ انہیں دوسری شادی کی اجازت دے دیں ورنہ دوسری صورت میں امی کو طلاق بھی ہو سکتی ہے۔

امی بہت روئیں، گڑگڑائیں۔ ابو کے آگے ہاتھ جوڑے۔ معافیاں مانگیں۔ آیندہ کے لیے ان کی خدمت کرنے کا وعدہ کیا لیکن پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ ابو پوری طرح فرزانہ کے جال میں پھنس چکے تھے۔ انہوں نے امی کی کوئی بات نہیں سنی اور صاف صاف کہہ دیا کہ یہ ان کا اٹل فیصلہ ہے۔ وہ فرزانہ سے شادی کا وعدہ کر چکے ہیں اور اس سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ امی چاہیں تو اسی گھر میں رہ سکتی ہیں ورنہ وہ ان کے لیے دوسرے مکان کا بندوبست کر دیں گے اور معمول کے مطابق گھر کے اخراجات اور بچوں کی تعلیم کے لیے انہیں ہر ماہ ایک معقول رقم ملتی رہے گی۔

امی شدید غصے اور طیش کے عالم میں ہم لوگوں کو لے کر میکے چلی گئیں۔ نانا، نانی اور ماموں نے جب یہ ماجرا سنا تو وہ بھی پریشان ہو گئے لیکن بڑی عجیب بات تھی کہ نانا نے امی سے ہمدردی کرنے کی بجائے انہیں ہی برا بھلا کہا۔ وہ ہمیشہ ہی امی کے دیر سے سو کے اٹھنے پر ناراض رہا کرتے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ امی کی یہی عادت ان کی بربادی کا سبب بن گئی۔ وہ سوتی رہ گئیں اور اس عورت کو ان کے گھر میں نقب لگانے کا موقع مل گیا۔ لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ امی کے میکے والے ابو کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھے اور جانتے تھے کہ وہ پیچھے ہٹنے والے نہیں۔ اگر امی نے انہیں دوسری شادی کی اجازت نہیں دی تو وہ واقعی انہیں طلاق دے دیں گے۔ اس کے بعد کا منظر نامہ بہت خوفناک تھا۔ امی بقیہ زندگی کس طرح گزاریں گی۔ بچے جوان ہو رہے تھے۔ ان کی تعلیم اور شادی بیاہ کے لیے بھاری رقم کی ضرورت تھی۔ نانا ریٹائر ہو چکے تھے اور ان سے کسی مدد کی توقع نہیں تھی۔ ماموں بھی بہت پیسے والے نہیں تھے۔ ان کی اپنی فیملی تھی اور وہ جیسے تیسے سفید پوشی کا بھرم رکھے ہوئے تھے۔

ان حالات کے پیش نظر سب نے امی کو یہی مشورہ دیا کہ وہ اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کی خاطر ابو کو دوسری شادی کی اجازت دے دیں۔ میں اور احمر بھی اس مشورے میں شامل تھے کیوں کہ ہم دونوں بہن بھائی کسی بھی صورت ابو کی شفقت سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔ امی پہلے تو کسی طرح تیار نہیں ہو رہی تھیں لیکن سب کے سمجھانے بجھانے پر وہ راضی ہو گئیں اور انہوں نے ابو کو دوسری شادی کی اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھ دی کہ وہ اپنی عزیز ترین سہیلی کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتیں جو ان کی سوکن بننے والی تھی۔ لہٰذا ان کے لیے علیحدہ رہائش کا بندوبست کیا جائے۔ ابو نے یہ شرط مان لی اور چند ہی دنوں بعد ہم لوگ گلشن اقبال کے ایک بنگلے میں شفٹ ہو گئے اور ابو نے فرزانہ آنٹی سے شادی کر لی۔

شادی کے بعد بھی ابو اپنی اولاد سے غافل نہیں رہے۔ وہ ہفتے میں ایک دو مرتبہ ہمارے گھر کا چکر ضرور لگاتے۔ امی تو انہیں دیکھتے ہی دوسرے کمرے میں چلی جاتیں۔ ابو کو بھی ان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ ہم دونوں بہن بھائی سے بیٹھے باتیں کرتے رہتے، ہماری پڑھائی کے بارے میں پوچھتے اور بغیر کہے ہماری ہر فرمائش پوری کر دیتے تھے لیکن ابھی چند ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ مجھے ابو کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آنے لگے۔ ان سے پوچھنے کی ہمت نہیں تھی لیکن اتنا ضرور سمجھ گئی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ امی سے ذکر کیا تو وہ چیخ کر بولیں۔ ”میری بددعا رنگ لا کر رہے گی۔ اللہ نے چاہا تو وہ بھی سکون سے نہ رہ سکیں گے۔“

ایک سال سے بھی کم وقت میں اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا۔ فرزانہ آنٹی نے ابو کو پوری طرح اپنے جال میں جکڑ لیا تھا اور وہ ان کی ہر فرمائش بلا چوں و چرا اس پورا کیا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک رومان پرور لمحے میں فرزانہ آنٹی نے وہ مکان اپنے نام کرنے کی خواہش ظاہر کر دی جو ابو نے بڑے شوق اور چاؤ سے بنوایا تھا۔ ڈیفنس کے علاقے میں ہزار گز پر بنے ہوئے اس مکان کی قیمت کروڑوں میں تھی۔ ابو بخوشی آنٹی کے نام کرنے پر تیار ہو گئے اور دوسرے دن ہی وکیل کو ضروری کارروائی کے لیے گھر بلا لیا۔ ایسا کرتے وقت وہ یہ بالکل بھول گئے کہ اس مکان میں ان کی پہلی بیوی اور بچوں کا بھی حصہ ہے۔

دوسرے دن وکیل صاحب مکان کے کاغذات پر دستخط کروانے کے لیے گھر آئے اور جیسے ہی ان کی نظر آنٹی پر پڑی وہ کچھ پریشان نظر آنے لگے لیکن انہوں نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور بریف کیس کھول کر مکان کی منتقلی کے کاغذات نکالے تاکہ اس پر ابو اور آنٹی کے دستخط کروا سکیں۔ پھر انہوں

نے دونوں سے شناختی کارڈ مانگے۔ ابو نے تو فوراً ہی اپنا کارڈ ان کے حوالے کر دیا لیکن آنٹی آئیں بائیں شائیں کرنے لگیں پھر کچھ سوچتے ہوئے بولیں کہ شاید ان کا شناختی کارڈ بھائی کے گھر رہ گیا ہے وہ ایک دو روز میں لے آئیں گی۔

یہ سن کر وکیل صاحب نے کاغذات دوبارہ بریف کیس میں رکھ لیے اور بولے۔ ''شناختی کارڈ کے بغیر یہ کارروائی نہیں ہو سکتی۔ جب آپ کا شناختی کارڈ مل جائے تو مجھے فون کر دیجیے گا میں دوبارہ حاضر ہو جاؤں گا۔''

آنٹی کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ انہوں نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''کیا شناختی کارڈ بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کام نہیں ہو سکتا۔''

وکیل صاحب طنزیہ لہجے میں بولے۔ ''محترمہ آج کل تو اس کے بغیر قبر کے لیے بھی جگہ نہیں ملتی۔ یہ تو پھر کروڑوں کی جائیداد کا معاملہ ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ اگر شناختی کارڈ گم ہو گیا ہے تو دوسرا بن جائے گا۔ اصولاً تو شادی کے بعد آپ کو یہ کام فوراً کر لینا چاہیے تھا۔''

یہ کہہ کر وکیل صاحب چلے گئے لیکن دوسرے ہی دن وہ ابو کے دفتر پہنچ گئے اور انہوں نے جو انکشاف کیا وہ کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ انہوں نے ابو کو بتایا کہ فرزانہ آنٹی ان کے لاہور میں مقیم کلائنٹ اعجاز احمد کی بیوی ہیں۔ انہوں نے اس کے ساتھ بھی یہی حرکت کی تھی اور اسے اپنے حسن کے جال میں پھنسا کر اس کی ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی اپنے نام کروالی تھی۔ اس نے ان کے نام سے ایک الگ اکاؤنٹ بھی کھول رکھا تھا جس میں لاکھوں روپے جمع تھے۔ پھر اس عورت نے لڑ جھگڑ کر اعجاز سے طلاق لے لی۔ چپکے سے کوٹھی کا سودا کیا اور ساری دولت سمیٹ کر غائب ہو گئی۔ وہ تو اسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ اسی لیے انہوں نے کارروائی ٹالنے کی غرض سے شناختی کارڈ کی شرط رکھ دی۔ شاید اس نے ابھی تک نیا شناختی کارڈ نہیں بنوایا اور پرانے شناختی کارڈ میں شوہر کے خانے میں اعجاز احمد کا نام ہی لکھا ہوا ہے اسی لیے وہ ٹال مٹول کر رہی تھی۔

''لیکن اس نے تو نکاح کے وقت شناختی کارڈ کی کاپی جمع کروائی تھی۔'' ابو بولے۔

''یہ کمپیوٹر کا دور ہے۔ بڑی آسانی سے شوہر کی جگہ باپ کا نام لکھا جاسکتا ہے۔ فوٹو کاپی میں یہ تبدیلی محسوس نہیں ہوتی۔''

''غضب ہو گیا۔'' ابو سر پکڑتے ہوئے بولے۔

''میں نے تو اس کے ساتھ بینک میں جوائنٹ اکاؤنٹ بھی کھول رکھا ہے۔ وہاں بھی اس نے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی ہی دی تھی اور اس اکاؤنٹ میں اچھی خاصی رقم بھی جمع کروا دی تھی تاکہ وہ بوقت ضرورت پیسے نکال سکے۔''

''اس اکاؤنٹ میں اندازاً کتنی رقم ہو گی؟'' وکیل صاحب نے پوچھا۔

''مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں۔ اندازاً بیس پچیس لاکھ تو ہوں گے۔''

''آپ ابھی بینک منیجر کو فون کر کے معلوم کریں کہ اکاؤنٹ میں کتنی رقم ہے۔''

''منیجر کا جواب سن کر ابو کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے بتایا کہ مختلف تاریخوں میں تقریباً ساری رقم نکال لی گئی ہے اور اب اکاؤنٹ میں صرف ایک لاکھ روپے باقی ہیں۔'' ابو نے فوراً آنٹی کا نمبر ملایا لیکن انہوں نے فون نہیں اٹھایا۔ وہ وکیل صاحب کے ساتھ گھر آئے تو آنٹی گھر میں نہیں تھیں۔ البتہ ڈائننگ ٹیبل پر گلاس کے نیچے ایک خط ضرور رکھا ہوا تھا۔ ابو نے وہ خط اٹھایا۔ اس میں لکھا تھا۔

''احمد صاحب! مجھے افسوس ہے کہ میرا منصوبہ ادھورا رہ گیا۔ تاہم آپ کے اکاؤنٹ سے نکالی ہوئی رقم کافی دنوں تک میرے کام آئے گی۔ اس کے لیے تہہ دل سے آپ کی مشکور ہوں۔ اس کاغذ پر بھائی کا ایڈریس لکھا ہے۔ طلاق نامہ اسی پتے پر بھیج دیں۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کی جائے۔ ویسے بھی قانونی طور پر میں جوائنٹ اکاؤنٹ سے رقم نکالنے کی حق دار تھی۔ اس لیے آپ میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔ میری وجہ سے عزیز از جان نبیلی کو جو اذیت برداشت کرنا پڑی اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ میری دعا ہے کہ وہ اپنے گھر میں خوش اور آباد رہے۔''

ابو کے پاس اب دکھ اور پشیمانی کے سوا کچھ نہ بچا تھا۔ وہ شرمندہ شرمندہ سے آئے اور معافی تلافی کر کے ہم سب کو اپنے ساتھ لے گئے۔ فرزانہ آنٹی نے انہیں اور امی کو ٹھیک ٹھاک سبق سکھایا تھا۔ ابو کے رویے میں حیرت انگیز تبدیلی آچکی ہے اور وہ گھر آنے کے بعد سارا وقت ہم لوگوں کے ساتھ گزارتے ہیں۔ امی نے بھی دیر تک سونے کی عادت ترک کر دی ہے اور صبح سے شام تک گھرداری کے معاملات میں الجھی رہتی ہیں۔ انہیں بہت دیر بعد یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔

آسیبِ محبت

مکرمی مدیر سرگزشت

سلام مسنون

مرسلہ سچ بیانی میں ایک عزیز کی ہے۔ کیسی انوکھی ہے اس کا ادراک پڑھ کر ہو گا۔ ذرا الگ انداز کی سچ بیانی ہے۔ اس لیے مزہ خوب دے گی۔ انوکھے پن کا لطف آئے گا۔

صائمہ اقبال
(کراچی)

چاند بجھ گیا تھا۔ ستارے غائب ہونے لگے۔

چہار سو ویرانی تھی۔ جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوتی، تو لگتا کہ کوئی حرکت کر رہا ہے۔ میری آنکھیں بھاری ہونے لگیں۔ سر گھوم رہا تھا۔ سینے میں کئی سوالات تھے۔

وہ پہاڑی کی چوٹی پر واقع ایک اجڑا ہوا پارک تھا۔ گھاس بڑھی ہوئی، دیواریں ٹوٹی ہوئیں۔ سامنے ایک منحوس بنا تھا۔ اس سرد رات وہ میرے پہلو میں بیٹھی تھی۔ زلفیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ اس کا سیاہ لباس پُراسرایت بڑھا

رہا تھا۔

اچانک وہ چونکی۔ ”کیا آپ نے وہ آواز سنی؟“

”نہیں۔“ میری دھڑکن تیز ہو گئی۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جھاڑیوں کی سمت بڑھنے لگی۔

”وہ... یہیں ہے۔“

یہی وہ پریشان کن لمحہ تھا جب میں... ڈاکٹر وحید خان، جو خود کو ایک ذہین ماہرِ نفسیات سمجھتا تھا، ایک معمے میں الجھ گیا۔ ایک پیچیدہ کیس میرے سامنے آن کھڑا ہوا جس نے میری زندگی بدل ڈالی۔

سدرہ شیخ کا کیس جسے میں کبھی حل نہیں کر سکا۔

یہ محبت کی کہانی ہے۔ جس کا آغاز ایک اجنبی کی آمد سے ہوا۔ بعض واقعات اور باتیں عقل کی کسوٹی پر کھری نہ اتریں مگر انہیں جھٹلایا نہیں جاسکتا جیسے یہ واقعہ۔

☆☆☆

کلینک میں داخل ہونے والے نوجوان کے چہرے سے بوکھلاہٹ عیاں تھی۔

جلد جلی ہوئی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے۔ میرا پہلا اندازہ یہی تھا کہ اس پر ایک آسیب سوار ہے۔

میں کئی برس سے کراچی کے ایک متمول علاقے میں پریکٹس کر رہا تھا۔ گزشتہ کچھ عرصے میں بدامنی، معاشی مسائل اور عدم برداشت کے باعث نفسیاتی عوارض میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ مجھ جیسے ماہرین اچھا خاصا کما لیتے ہیں۔

میں نے اجنبی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ نظریں چرا رہا تھا۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ بالآخر میں آگے کو جھکا۔ ”تو تمہیں کسی سے محبت ہو گئی ہے؟“

نوجوان اچھل پڑا۔ حیرت آنکھوں سے عیاں۔ کھڑکی سے آنے والی دھوپ چہرے پر پڑ رہی تھی۔

میں نے بات جاری رکھی۔ ”تمہارا تاثر بتا رہا ہے کہ میری بات درست ہے۔ شاید یہ رقابت کا معاملہ ہے۔ جس سے تم محبت کرتے ہو، وہ لڑکی کسی اور کے عشق میں مبتلا ہے۔“

کچھ دیر وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”رفیق صاحب کیسے ہیں۔“ میں نے بات کا رخ موڑا۔ ”انہوں نے مجھے تمہاری آمد سے مطلع کیا تھا۔“

”جی... ٹھیک ہیں۔“ وہ کچھ سنبھلا۔ ”انہوں نے کہا تھا کہ آپ ان کے دوست ہیں اور میری مدد کر سکتے ہیں۔ مگر آپ نے کیسے اندازہ لگایا کہ میں...“

میں مسکرایا۔ تجربے نے مجھے خاصا ماہر بنا دیا تھا۔

نوجوان کا نام ناصر تھا۔ وہ ایک کال سینٹر ایجنٹ تھا۔ اس نے صاف ستھری قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے آتے ہی کمرا مردانہ پرفیوم سے مہک اٹھا۔ ہاتھ میں موٹر سائیکل کی چابیاں اور یہ باتیں عکاسی کرتی تھیں کہ وہ معاشی مسائل کا شکار نہیں۔ یہ محبت کا معاملہ ہے۔

”آنکھیں سب کہہ دیتی ہیں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم خوش لباس ہو، مگر تمہارے چہرے پر خوشی نہیں۔ ناخن اور شیو بڑھی ہوئی۔ اس کا فقط یہی مطلب ہے کہ جسے تم چاہتے ہو، وہ پری وش تم میں دلچسپی نہیں رکھتی۔ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ چائے لو گے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے ریسیور اٹھا لیا۔

”ہیلو۔“ مجھے اپنی سیکریٹری نازیہ کی شیریں آواز سنائی دی۔

”محترمہ، ایک عاشق ہمارے سامنے ہے۔ ذرا اُس کی تواضع کیجیے۔“

ریسیور رکھ کر میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ”مکالمہ سب سے اچھی دوا ہے دوست۔ بولو، میں سن رہا ہوں۔“

☆☆☆

ناصر کی کہانی میری توقع سے تھوڑی مختلف ضرور تھی، مگر مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ یہ کیس مجھے نامعلوم کھائی میں دھکیل دے گا۔

واقعی وہ ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ سدرہ اس کی دور پرے کی رشتے دار تھی۔ بلا کی حسین۔ شوخ اور چنچل۔ شاعری کی دلدادہ۔ ان کے گھرانے فقط تہواروں ہی پر ملتے۔ دو برس قبل ناصر کی اس سے ایک تقریب میں ملاقات ہوئی۔ سوشل میڈیا نے مزید رابطے کی سبیل پیدا کی۔ جلد ہی ناصر اُس کا گرویدہ ہو گیا۔ سدرہ کا کالج ناصر کے آفس کے قریب ہی تھا۔ دھیرے دھیرے ملاقاتیں بھی ہونے لگیں۔ رشتے داری تو تھی ہی۔ وہ اس کے گھر آنے جانے لگا۔ ناصر نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ویلنٹائن ڈے پر وہ اپنی محبت کا اظہار کرے گا، مگر پھر... کہانی میں ایک ڈرامائی موڑ آیا۔

سدرہ کا رویہ بدلنے لگا۔ شوخی ماند پڑ گئی۔ بجھی بجھی سی رہنے لگی۔ شاعری میں دلچسپی جاتی رہی۔

ایک روز ناصر نے پوچھ ہی لیا۔ پہلے اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔ مگر ناصر اصرار کرتا رہا۔ اور بعد میں اپنے اصرار پر بہت پچھتایا۔

''میں کسی سے محبت کرتی ہوں۔'' سدرہ کا یہ جملہ سنتے ہی اس کی دھڑکن رک گئی۔ زندگی کے رنگ ماند پڑنے لگے۔

''کون ہے وہ؟'' ناصر کے اندرون میں کرب کے دھماکے ہورہے تھے۔

سدرہ دھیرے سے مسکرائی۔ ''اس کا نام فیاض ہے۔''

فیاض اُس کی سہیلی شائستہ کا بڑا بھائی تھا۔ شائستہ کی سالگرہ والے روز وہ اُس سے ملی اور دل دے بیٹھی۔ وہ ایک دراز قد، وجیہہ اور بااخلاق آدمی تھا۔ ایک بڑی میڈیسن کمپنی میں مینیجر۔ سدرہ اب شائستہ کے گھر جانے کے بہانے تلاش کرنے لگی۔ فیاض کو جلد اندازہ ہوگیا کہ نیلی آنکھوں والی یہ لڑکی اُسے چاہنے لگی ہے۔ وہ بھی سدرہ کو پسند کرتا تھا۔ جلد ہی یہ معصوم رشتہ محبت کی خوشبو سے مہکنے لگا۔

ناصر یہاں تک کہہ کر چپ ہوگیا۔

میں نے اسے گھورا۔ ''یہ تو روایتی کہانی ہے۔ ہر لو اسٹوری میں ایسا ہی ہوتا ہے، مگر تمہاری پریشانی کی وجہ کچھ اور ہے۔''

میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ یہ رقابت کا معاملہ نہیں۔ جس طرح ناصر نے فیاض کا تذکرہ کیا تھا، اس میں کہیں نفرت یا غصے کی جھلک نہیں تھی۔

لڑکا آگے کو جُھکا۔ ''ہاں، پریشانی کی وجہ کچھ اور ہے۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں فکرمندی اور کرب کے ساتھ کچھ ایسا تھا، جسے میں پہلی نظر میں نہیں جانچ سکا تھا۔ اُن آنکھوں میں خوف تھا۔

''یہ انکشاف کرب ناک تھا کہ جس لڑکی کو میں چاہتا ہوں، وہ کسی اور کے عشق میں مبتلا ہے مگر میں نے حالات سے سمجھوتا کرلیا ہے۔ اِس وقت تو مجھے اس پُرپیچ صورتِ حال نے پریشان کررکھا ہے، جو سدرہ کو درپیش ہے۔''

تازہ چائے لیے اندر داخل ہوئی۔ وہ ناصر کو دیکھ کر مسکرائی۔ جواباً ناصر نے سر ہلایا۔ چائے کا گھونٹ بھر کر اس نے کہا۔ ''سدرہ کے گھر والے کبھی اس کی شادی فیاض سے نہیں کریں گے۔''

''اور اس کا سبب؟'' مجھے بے چینی محسوس ہورہی تھی۔

''فیاض لاپتا ہے۔'' اس نے اچانک کہا۔

میں نے گہرا سانس لیا۔ کہانی میں ایک موڑ آگیا تھا۔

ناصر نے بات جاری رکھی۔ ''جیسا کہ میں نے بتایا کہ فیاض اس کی سہیلی شائستہ کا بھائی تھا۔ شائستہ اکثر اس کے گھر آیا کرتی۔ اس نے سدرہ کی والدہ کو قائل کرلیا تھا۔ سب کچھ اپنی ڈگر پر جارہا تھا کہ ایک سانحہ ہوا۔ شائستہ ایک کار حادثے کا شکار ہوگئی۔ اس واقعے کے بعد فیاض اور سدرہ کا رابطہ منقطع ہوگیا۔ کچھ عرصے بعد پتا چلا کہ فیاض اور اس کے اہلِ خانہ نے وہ مکان چھوڑ دیا ہے۔ فیاض کی جدائی نے اُسے یاسیت میں دھکیل دیا۔ ہر چیز سے جی اچاٹ ہوگیا۔ وہ اداس رہنے لگی اور پھر ایک روز میں اُس کی اداسی کا سبب پوچھ بیٹھا تو اس نے اپنے غم کی کتاب کھول کر سامنے رکھ دی۔''

ناصر پھر چپ ہوگیا۔ مجھے اُس کی خاموشی کھلنے لگی تھی۔

''تو پھر... کیا تم نے ایک اچھے دوست کی طرح اس کے محبوب کو تلاش کرنے کا فیصلہ کرلیا؟'' میں بھنایا۔

''میں ایسا کرنا چاہتا تھا، مگر اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔'' وہ مسکرایا۔ اب وہ ایک بدلا ہوا انسان نظر آرہا تھا۔ اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''کیونکہ سدرہ کو پُراسرار خطوط موصول ہونے لگے۔ ایسے خطوط، جن پر کسی کا پتا درج نہیں ہوتا۔''

☆☆☆

یہ انکشاف کہ جو اجنبی میرے سامنے بیٹھا ہے، وہ میری مدد کا طلب گار نہیں، بلکہ اصل مریض تو وہ لڑکی ہے، جسے وہ ٹوٹ کر چاہتا ہے، مجھے پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میرا اندازہ یکسر غلط ثابت ہوا۔

ناصر نے بات جاری رکھی۔ یہ پُراسرار خطوط اسے یاسیت سے باہر نکال لائے۔ وہ زرد رنگ کے پرانے لفافوں میں موصول ہوتے، جنھیں سدرہ اسٹڈی میں چھپ کر پڑھتی اور پھر اپنی دراز میں ڈال کر تالا لگادیتی۔ اُس نے اپنی بہن اور والدہ کو بتایا کہ یہ فیاض کے خطوط ہیں جو شہر لوٹ آیا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

سدرہ کی ہنسی واپس آگئی۔ سب خوش تھے، مگر جلد اس کے اہلِ خانہ کو ایک پریشانی نے آن لیا۔ یہ سدرہ کی چھوٹی بہن سارہ تھی، جس نے اتفاق سے ایک روز دراز کھلا دیکھ کر اندر جھانکا اور اس نے اُن زرد لفافوں کو دراز میں پڑا دیکھ لیا۔ ان پر سدرہ کا نام اور پتا تو درج تھا مگر بھیجنے والے کا ایڈریس نہیں لکھا تھا۔ تجسس کے زیرِ اثر اس نے لفافہ اٹھایا۔ تہ کیا ہوا خط نکالا۔ اسے کھولا۔ اگلے ہی پل اس کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ ورق خالی تھا۔ بالکل سفید۔ اس پر ایک بھی لفظ درج نہیں تھا۔

اس نے دوسرا خط نکالا۔ وہ بھی خالی۔ پھر تیسرا۔ پھر چوتھا۔ ہر ورق خالی تھا۔ کوئی تحریر نہیں تھی۔

اس نے یہ بات اپنی والدہ کو بتائی۔ احتیاط کے پیشِ نظر وہ دونوں خاموش رہے۔ پھر ایک روز سارہ نے باتوں باتوں میں سدرہ سے اُن خطوط کا تذکرہ کرتے ہوئے انہیں پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔

''کسی کے لو لیٹرز نہیں پڑھتے۔'' سدرہ مسکرائی۔ ''خیر، میں تمہیں یہ بتا دیتی ہوں کہ وہ انتہائی خوبصورت الفاظ میں محبت کا اظہار کرتا ہے۔ شاعرانہ پیرائے میں۔ یوں لگتا ہے، جیسے کسی ادیب کا خط ہے۔''

''آپ نے کبھی ان خطوں کا جواب نہیں لکھا؟'' سارہ نے لاتعلقی سے پوچھا۔

''جواب؟'' وہ یکدم چپ ہوگئی۔ چہرے پر تذبذب تھا۔ جیسے کسی گمشدہ چیز کے بارے میں سوچ رہی ہو۔

''کیا آپ دونوں کی کبھی ٹیلی فون پر بات ہوئی؟''

اب وہ سنجیدہ تھی۔ سدرہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

تین دن بعد اُس نے اپنی بہن کو ٹیلی فون پر کسی سے بات کرتے ہوئے پایا۔ سدرہ کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ وہ کبھی شرماتی۔ کبھی مسکراتی۔ کبھی ہنس پڑتی۔ جب اس نے ریسیور رکھا تو سارہ سامنے کھڑی تھی۔

''کس کا فون تھا؟'' اس نے اپنے اندیشے چھپاتے ہوئے کہا۔

''تمہارے دولہا بھائی کا۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔

''انہوں نے فون کیا تھا؟'' سارہ نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے خوشی سے تالی بجائی۔

''تو نہیں گھر بلائیں کبھی۔'' سارہ نے اصرار کیا۔

''بلواؤں گی۔ اتنی جلدی کیا ہے۔'' سدرہ نے اس کے گال پر چپت لگائی۔

دو روز بعد سدرہ پھر ڈرائنگ روم میں کھڑی کسی سے ٹیلی فون پر بات کر رہی تھی۔ پوچھنے پر یہی بتایا کہ فیاض کا فون تھا۔ اِس عمل میں تواتر آتا گیا۔ خطوط کا سلسلہ یکدم بند ہوگیا تھا۔

شک کا سانپ سارہ میں کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ فیاض کا روز ہی فون آتا، مگر حیران کن طور پر اس نے کبھی ٹیلی فون کی گھنٹی نہیں سنی تھی۔ ایک روز سدرہ کے ریسیور رکھنے کے بعد اس نے چپکے سے فون کالرز کا ریکارڈ چیک کیا۔ اس پر ایک بھی اجنبی نمبر نہیں تھا۔ آخری کال چند گھنٹے پہلے اُس کے چچا کے گھر سے آئی تھی۔ اپنے شک کو یقین میں بدلنے کے لیے وہ اگلے روز ٹیلی فون کے اردگرد منڈلاتی رہی کہ جونہی بجے، ریسیور اٹھا لے۔ بہت دیر انتظار کیا مگر کوئی فون نہیں آیا۔ پیاس نے ستایا تو فریج تک گئی۔ لوٹی تو دیکھا، سدرہ کسی سے ہنس ہنس کر بات کر رہی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ ریسیور رکھ کر چلی گئی۔

سارہ نے دھڑکتے دل سے فون ریکارڈ چیک کیا۔ نہیں، وہاں کوئی نمبر نہیں تھا۔

وہ ڈر گئی۔ کیا سدرہ پاگل ہوگئی ہے؟ سارہ نے اپنی بہن کے کمرے میں وہ پُراسرار خطوط تلاش کرنے کی کوشش کی، مگر وہ غائب ہو چکے تھے۔

اگلے روز جب سدرہ فیاض سے بات کر رہی تھی، تو سارہ پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ ''میری بھی بات کروائیں ناں۔''

سدرہ کی ہنسی غائب ہوگئی۔ ''کیوں بات کرو گی تم؟''

''کروائیں ناں میری بات۔'' اس نے جھٹ سے ریسیور لے لیا، مگر اس سے پہلے کہ وہ ہیلو کہہ پاتی، سدرہ نے لائن کاٹ دی۔

''بڑی آئی بات کرنے والی۔'' وہ اپنے کمرے کی سمت جا رہی تھی۔

اگلے دن سے ٹیلی فون کالز کا سلسلہ بند ہوگیا۔ کچھ روز بعد سدرہ نے ضد کر کے اپنے والد سے موبائل فون منگوالیا۔ اب وہ بیٹھک میں پڑے ٹیلی فون کی محتاج نہیں تھی۔ وہ اچانک گھر میں کہیں گم ہوجاتی۔ سارہ تلاش کرتی، تو کبھی وہ اسٹور میں دبکی بیٹھی ہوتی، کبھی تاریک گیلری میں کھڑی ہوتی۔ وہ موبائل فون ہمیشہ اپنا پاس رکھتی۔ سارہ کبھی اس کا ریکارڈ چیک نہیں کرسکی۔ اب وہ اکثر تیار ہوکر باہر جانے لگی۔ جب ماں اور بہن نے پوچھا، تو وہ مسکرائی۔ ''آپ کے داماد سے ملنے جاتی ہوں۔ جلد رشتہ لے کر آ رہے ہیں۔''

سارہ کو اندیشے کھائے جا رہے تھے۔ ایک روز اس نے سرسری طور پر سدرہ سے ان ملاقاتوں کا احوال پوچھا۔ پہلے تو سدرہ خوشی خوشی واقعات بیان کرنے لگی، مگر جلد ہی چہرے کا رنگ بدل گیا۔ یوں لگتا تھا، جیسے وہ تفصیلات بھول گئی ہے۔ وہ یہ بتانے سے بھی قاصر تھی کہ ان کی آخری ملاقات کس ریسٹورنٹ میں ہوئی۔ فیاض نے کس رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی۔ ان کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔

سدرہ کی والدہ ایک سیدھی سادی عورت تھیں۔ وہ سمجھیں کہ ان کی بیٹی پر کسی نے تعویذ کروادیا ہے۔ وہ کسی عامل کو بلوانا چاہتی تھیں کہ سارہ درمیان میں آگئی۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔'' اس نے

اپنی ماں سے کہا۔ ''آپ ناصر بھائی کو بلوائیں۔ ہمیں اُن کی مدد درکار ہوگی۔''

☆☆☆

''تو انہوں نے تمہاری مدد لینے کا فیصلہ کیا۔'' میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالیا۔

ناصر اب خاصا مطمئن ہوگیا تھا۔ ''جی ہاں۔ انہوں نے مجھے تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔ مجھے اندیشوں کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ پھر سارہ نے ایک منصوبہ تیار کیا۔ اگلی بار جب سدرہ یہ کہتے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑی میک اپ کررہی تھی کہ وہ فیاض سے ملنے جارہی ہے، سارہ نے فوراً میرا نمبر ڈائل کیا۔ میں موٹر سائیکل لیے سدرہ کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بنی ٹھنی گھر سے نکلی اور اسٹاپ کی سمت چلی گئی۔ کچھ ہی پلوں بعد سارہ دروازے سے برآمد ہوئی اور سیدھی میری طرف آگئی۔''

آگے کی کہانی کچھ یوں ہے:

اُنہوں نے سدرہ کا تعاقب کیا۔ وہ رکشے میں سوار ہوئی، جو ایک ریسٹورنٹ کے سامنے جاکر رکا۔ وہ ریسٹورنٹ کے اندر چلی گئی۔ سارہ اور ناصر باہر ہی ٹھہرے۔ وہ ہر آنے جانے والے پر نظر رکھ رہے تھے۔ مگر ان میں کوئی ایسا نہیں تھا، جسے سدرہ کے بیان کردہ فیاض کے چوکھٹے میں فٹ کیا جاسکتا۔ آخراُکتا کر ناصر اندر داخل ہوا۔ ریسٹورنٹ میں حیرت اس کی منتظر تھی۔ سدرہ غائب تھی۔ اس نے ایک ویٹر کو اس کا حلیہ بتایا۔

''جی وہ آئیں تو تھیں، مگر فوراً یہاں سے چلی گئیں۔''

''مگر کہاں کیسے۔ دروازے پر تو...'' ناصر نے جملے ادھورا چھوڑ دیا۔

''جی کچن میں ایک دروازہ ہے۔ انہوں نے وہی استعمال کیا۔'' ویٹر نے کہا۔ ''جب ہم نے پوچھا تو کہنے لگیں کہ اس گلی میں ان کی ایک سہیلی رہتی ہے۔''

''ان کے ساتھ کوئی اور تھا؟'' دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''وہ اکیلی تھیں۔''

یہاں تک پہنچ کر ناصر خاموش ہوگیا۔

میں نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور سگریٹ سلگائی۔ ''دلچسپ۔ یعنی تم ایک ایسی لڑکی سے محبت کرتے ہو، جس کا محبوب ایک آسیب ہے۔ ایک التباس۔ ایک گمشدہ شخص، جسے اس نے اپنی یادوں میں زندہ کررکھا ہے۔''

''بالکل۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی نفسیاتی مرض کا شکار ہوگئی ہے۔''

''اچھا۔'' میں نے قہقہہ لگایا۔ ''مگر اس کا دوسرا زاویہ بھی ہے۔ ذرا سوچو، ممکن ہے کہ فیاض نے واقعی خطوط لکھے ہوں، جنہیں احتیاط کے پیشِ نظر سدرہ نے چھپادیا ہو اور ان کی جگہ خالی ورق رکھ دیے ہوں۔ ممکن ہے، فیاض حقیقتاً فون کرتا ہو اور سارہ کو ٹیلی فون ریکارڈز کے بارے میں غلط فہمی ہوئی۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ جس ریسٹورنٹ سے وہ اچانک غائب ہوئی، اس کی پچھلی گلی میں واقعی اس کی سہیلی رہتی ہے۔''

''میں نے اس زاویے سے نہیں سوچا۔'' ناصر تذبذب کا شکار ہوگیا۔ ''اس کا امکان تو ہے مگر سدرہ کا مجموعی رویہ بدل گیا ہے۔ وہ پہلے والی سدرہ نہیں رہیں۔ مطالعے میں اس کی دلچسپی دم توڑ چکی ہے۔ ایک بات اور۔ فیاض پہلے جس کمپنی میں کام کرتا تھا، میں وہاں گیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ لگ بھگ دس ماہ پہلے اچانک غائب ہوگیا تھا۔ پھر اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ اس نے اپنی تنخواہ بھی نہیں لی۔''

''ہوں۔ یہ معاملہ پریشان کن ہے۔'' میں نے سگریٹ کا کش لیا۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ اس سے ملیں۔'' اس نے بالآخر کہا۔ ''میں شدید اندیشوں کا شکار ہوں۔''

''ویسے میں اپنے کلینک کے علاوہ کہیں کسی سے نہیں ملتا، مگر تمہاری کہانی دلچسپ لگی۔ ٹھیک ہے اس سے ملنا چاہوں گا۔''

آج سوچتا ہوں، میں نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری۔ اگر میں انکار کردیتا، تو بے سکونی کے عفریت سے محفوظ رہتا۔

☆☆☆

کھڑکی میں لگے گملوں میں بہار کے پھول کھلے تھے۔ مکان سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ باورچی خانے سے اٹھتی خوشبو خبر دے رہی تھی کہ چائے کے ساتھ پکوڑے تلے جارہے ہیں۔

سدرہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ واقعی حسین تھی۔ گہری نیلی آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔ ناصر پہلو میں بیٹھا تھا۔ میں یہاں سارہ کا مہمان تھا، جس نے مجھے اپنے کالج ٹیچر کی حیثیت سے متعارف کروایا تھا۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق سدرہ کی والدہ مجھ سے مل کر چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد ناصر بھی کسی بہانے اٹھ گیا۔

اب سدرہ سامنے تھی اور مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وہ نفسیاتی مریض ہے یا اس کے اہلِ خانہ کسی غلط فہمی کا شکار ہوگئے ہیں۔

گفتگو کا آغاز اس کی پسندیدہ کتابوں سے ہوا۔ ان شعراء کا تذکرہ ہوا، جنھیں پڑھ کر اس کے دل میں جل ترنگ بجنے لگتا۔ ان رائٹرز کا ذکر آیا، جن کی سسپنس سے بھرپور کہانیاں اسے کسی اور دنیا میں لے جاتی۔ اس کا اعتماد جیتنے کے لیے میں نے اپنے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں تاکہ جلد بے تکلفی کی فضا قائم ہو۔ اور تب میں نے، چالیں چلنی شروع کیں۔ اسے تعریف کی رسی میں باندھنا شروع کیا۔ اس کے ادبی ذوق کی تعریف کی، تہذیبی طور طریقوں کو سراہا، پھر لباس کا ذکر کیا، میں نے اپنی ایک کلاس فیلو کا تذکرہ کیا، جس کی نیلی آنکھیں ٹھیک سدرہ کی آنکھوں کے مانند حسین اور دل کش تھیں۔

پہلے وہ فقط مسکرا رہی تھی۔ مگر اب دھیرے دھیرے شرمانے لگی۔ یہی حملے کا وقت تھا۔

''کیا فیاض بھی تمہاری آنکھوں کی تعریف کرتا ہے؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

اسے جھٹکا لگا۔ آنکھوں میں تذبذب تھا۔ میں نے خود کو نارمل رکھا۔ ''سارہ نے مجھے بتایا تھا۔ دراصل میرے ایک دوست کا نام بھی فیاض ہے۔ بہت عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی۔ نہ جانے، اب کہاں ہو، وہ ایک میڈیسن کمپنی میں ملازم تھا۔''

''اوہ...اچھا۔'' سدرہ نے گردن ہلائی۔ اطمینان لوٹ آیا۔ اب وہ گفتگو کے لیے تیار تھی۔ وہ فیاض کے بارے میں بتانے لگی۔ اس سے ہونے والی پہلی ملاقات۔ اس کے گھنگریالے بال، دراز قد۔ بھاری آواز۔ خوش لباسی۔ اس کی ہیوی بائیک۔ اس دوران میں شائستہ کی موت کا اور پھر فیاض سے جدائی کا بھی تذکرہ آیا، مگر میں نے اس پر زور نہیں دیا۔ مجھے موجودہ حالات میں دلچسپی تھی۔

''مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ فیاض تمہاری زندگی میں لوٹ آیا ہے۔ آج کل مہذب اور سمجھ دار لڑکوں کی ویسے بھی کمی ہے۔ تو اب اس کی رہائش کہاں ہے؟''

''رہائش...'' وہ ایک لمحے کو رکی۔ ''جی وہ بیرون شہر چلے گئے تھے۔ پہلے تو ناظم آباد میں رہتے تھے۔ اب لوٹے ہیں تو... دراصل میں نے کبھی پوچھا نہیں۔''

''اور تم نے اس کی کمپنی کا نام کیا بتایا تھا؟'' میں نے چائے کا گھونٹ لیا۔

''کمپنی۔ لائف سیونگ میڈیسن...''

''وہ تو پہلے اس کمپنی میں کام کرتا تھا۔'' میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''اب کہاں ہے؟''

''اب۔'' اس نے یادداشت پر زور ڈالا۔ ''وہ...''

''اب تو اس نے کار لے لی ہوگی۔'' میں نے لاتعلقی سے کہا۔ ''یا اب بھی موٹر سائیکل پر آتا ہے؟''

سدرہ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔

''سنا ہے، وہ تمہیں بہت ہی رومانوی خطوط لکھتا ہے۔ ضرور شاعری میں دلچسپی ہوگی۔ تو کون ہے اس کا پسندیدہ شاعر؟''

''وہ شاعر۔ جی شاید غالب...'' وہ بڑبڑائی۔ اس کے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ فقط پرانی یادیں۔

''سدرہ۔'' بالآخر میں آگے کو جھکا۔ ''فیاض فقط تمہاری ذہنی اختراع ہے۔ تم نے اسے اپنے ذہن میں تراشا ہے۔''

''نن نہیں۔ فیاض ہے۔'' وہ چلائی۔

''وہ صرف ایک جھوٹ ہے۔ تمہارے ذہن...'' میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ چہرہ جھلس گیا۔ اس نے چائے کی پیالی میرے چہرے پر الٹ دی تھی۔ ناصر اور سارہ بھاگے بھاگے آئے۔ سدرہ کھڑی کانپ رہی تھی۔

''تم لوگ سمجھتے ہو کہ میں پاگل ہوگئی ہوں۔'' اس نے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں۔ ''نہیں۔ تم لوگ پاگل ہوگئے ہو۔ میرا فیاض...'' وہ ہچکیاں لینے لگی اور دوڑتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

ڈرائنگ روم میں خاموشی کا بسیرا تھا۔ وہاں ایک معما تیر رہا تھا۔ ناصر اور سارہ چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گئے۔ ہمیں اوپری منزل سے اس کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ میرے ذہن میں طوفانوں نے ڈیرا ڈال لیا۔ یہ جذبات کا ریلہ تھا، جس میں یہ احساس بھی تھا کہ میں نے نیلی آنکھوں والی اس لڑکی کو تکلیف پہنچائی۔ میں کھڑا ہوگیا اور زینے کی سمت بڑھنے لگا۔ سارہ نے ساتھ آنے کی کوشش کی، مگر میں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ سدرہ کے دروازے پر پہنچ کر میں نے ہلکی سے دستک دی۔ ہچکیوں میں وقفے آنے لگے۔

میں نے دروازے پر دباؤ ڈالا۔ وہ کھلا تھا۔ میں اندر داخل ہوا۔ میرے سامنے ایک پری وش، آنکھوں میں نمی لیے اپنے بستر پر بیٹھی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ حسین لگ رہی تھی۔

مجھے اس کا اعتماد بحال کرنا تھا اور اس کے لیے میں ایک

کہانی گھڑنے والا تھا۔ پہلے میں نے معافی مانگی۔ چہرے پر اداسی سجائے اُسے اپنی چھوٹی بہن کے بارے میں بتایا، جسے ایک بے وفا شخص نے شدید اذیت دی، وہ ذہنی توازن کھو بیٹھی اوراس نے خودکشی کرلی۔ اسی وجہ سے محبت کے سحر میں مبتلا ہر لڑکی کو دیکھ کر میرے دل میں اندیشے پنپنے لگتے ہیں۔

اس نے میری کہانی پر یقین کرلیا۔ آنسو پونچھے۔ ''وحید صاحب۔ فیاض مجھے دھوکا نہیں دے گا۔ اور آپ میرا یقین رکھیں کہ وہ ایک جیتا جاگتا انسان ہے، کوئی واہمہ نہیں۔''

''مجھے یقین ہے۔'' میں نے گردن ہلائی اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اگلے کئی منٹوں تک ہم باتیں کرتے رہے۔ میں نے اس کا اعتماد حاصل کرلیا۔ اس نے بتایا کہ گھر والوں کے خوف سے اس نے فیاض کے خطوط ایک سہیلی کے گھر چھپا دیے ہیں۔

''میں وہ خط آپ کو دکھاؤں گی۔'' وہ بولی۔ ''اور فیاض سے چھپ کر ملنے کی بھی ایک وجہ ہے، جس کا میں نے کسی سے تذکرہ نہیں کیا۔''

میں خاموشی سے سنتا رہا۔

''اس کی جان کو خطرہ ہے۔'' اس نے زار داری سے کہا۔ ''اس کا بزنس پارٹنر اس کا دشمن بن گیا ہے۔ وہ اسے قتل کرنا چاہتا ہے۔''

''بزنس پارٹنر؟ اچھا۔'' میں نے دلچسپی ظاہر کی۔

''ہاں، فیاض امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتا ہے۔ چند روز پہلے اس کی گاڑی پر حملہ ہوا تھا۔ اس کی بہن کو بھی اسی شخص نے قتل کروایا تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنی رہائش بدل لی تھی۔''

''ہونہہ۔'' میں نے گہرا سانس لیا۔ اب وہ ایک کہانی گھڑنے کی کوشش کررہی تھی۔ سدرہ تخیل کی دنیا میں پھنس گئی تھی۔ اس کا علاج ضروری تھا۔

''سدرہ، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اور قسم کھاتا ہوں کہ تمہیں اور فیاض کو ملا کر دم لوں گا۔'' میں کھڑا ہوگیا۔ ''کیا یہ ممکن ہے کہ تم ہفتے والے روز میرے کلینک چلی آؤ۔ میری سیکریٹری نازیہ تم سے مل کر خوش ہوگی۔ وہ بھی ہماری مدد کرے گی۔ اور وہ خط بھی وہیں لے آنا۔ سوچ رہا ہوں کہ فیاض سے مل کر کوئی ایسی صورت نکالی جائے، جس سے تمہاری اور اس کی جلد از جلد شادی ہوجائے۔''

''اوہ۔ میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔'' اس کی آنکھوں میں تشکر تھا۔

میں اس کے کمرے سے باہر آگیا۔ ڈرائنگ روم میں سارہ منتظر تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''معاملہ پیچیدہ ہے۔'' میں نے گہرا سانس لیا۔ ''لیکن ہم کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔ ایک بار وہ اس سحر سے نکل آئے تو ناصر اسے سنبھال لے گا۔''

''ناصر؟'' سارہ کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ''بے چارہ۔ میرے نزدیک وہ سدرہ آپی کی دیوانگی سے کچھ زیادہ کا حقدار ہے۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک نامعلوم جذبہ تھا۔

''کیا ایک گلاس پانی ملے گا سارہ۔''

''ضرور۔'' وہ کچن کی طرف چلی گئی۔ میں تیزی سے ٹیلی فون سیٹ تک گیا۔ اس کا سی ایل آئی خاموش تھا۔ میں نے سیٹ پلٹا۔ بیٹری نصب کرنے کی جگہ میں دھول بھری تھی۔ لگتا تھا، جیسے اسے برسوں سے استعمال نہیں کیا گیا ہو۔

میری پریشانی دوچند ہوگئی۔

☆☆☆

موسم نے غیر متوقع کروٹ لی۔ کوئٹہ کی سرد ہوائیں یکدم شہر میں داخل ہوگئیں۔ سورج کی روشنی ماند پڑگئی تھی۔ دن مختصر ہونے لگے اور راتوں کا دورانیہ بڑھ گیا۔

سارہ کا فون آیا تھا۔ اس نے فیاض کی کمپنی سے اُس کا ایڈریس حاصل کرلیا۔ حیران کن طور پر یہ ناظم آباد کے اُسی علاقے کا پتا تھا، جہاں سدرہ کے بقول فیاض کچھ برس پہلے رہا کرتا تھا۔ یعنی اس نے کبھی رہائش گاہ تبدیل نہیں کی تھی۔ واضح تھا کہ سدرہ نے اس کے بیرونِ شہر جانے کی کہانی گھڑی تھی۔ مگر کیوں؟

ہفتے والے روز سدرہ کو میرے کلینک آنا تھا۔ اس سے قبل میری اس سے ٹیلی فون پر بات ہوئی۔ اس نے فیاض کو میرے نیک جذبات سے مطلع کیا تھا۔ جواب میں فیاض نے شکریہ ادا کیا اور جلد ملاقات کی توقع ظاہر کی۔

جب سدرہ کلینک آنے کے لیے گھر سے نکلی، ناصر اور سارہ اس علاقے کی سمت روانہ ہوگئے، جہاں فیاض مقیم تھا۔ وہیں اس کہانی کا راز چھپا تھا۔

سدرہ کی آمد سے چند لمحات قبل ایک لطیف خوشبو نے میرے کمرے کو گھیر لیا۔ نازیہ اور میں کوشش کے باوجود اس کا سراغ نہیں پاسکے۔ شام جلدی اتر آئی تھی، جس میں ٹھنڈ تیر رہی تھی۔ موسم کی تبدیلیوں نے مجھے بخار میں مبتلا کردیا۔ سردرد کی بھی شکایت تھی۔

وہ سیاہ لباس میں ملبوس تھی۔ ہونٹوں پر گہرے رنگ کی لپ اسٹک۔ آنکھوں کی نیلاہٹ کہیں غائب ہوگئی تھی۔ آواز بھی کچھ بدلی ہوئی لگی۔ اس نے پرس سے ایک زرد رنگ کا بوسیدہ لفافہ نکالا اور میرے سامنے رکھ دیا۔

میری دھڑکن تیز ہوگئی۔ لفافہ کھولا۔ اس میں ایک کاغذ تھا، جس سے دھیمی دھیمی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ سدرہ گہری نظروں سے میرا جائزہ لیتی رہی۔

میں نے تہ کھولی۔ وہ انتہائی عمدہ خط میں لکھی تحریر تھی۔ ایک محبت نامہ۔ جس کی زبان میں چاشنی تھی۔ جسے رومانوی اشعار سے سجایا گیا تھا۔ جس میں وعدے تھے۔ ارادے تھے۔ وہ ایک خط تھا، جسے وصول کرنے کی خواہش ہر لڑکی کے دل میں ہمکتی ہے۔ ایک ایسا خط، جسے وہ ہر رات، تکیے کے نیچے چھپا کر رکھ دے اور جب سب سو جائیں، تو بار، بار پڑھے۔ ہاں، وہ پڑھنے کے قابل تھا۔

خط کے آخری میں درج تھا: ”تمہارا فیاض۔“

میرے جسم کا درجہ حرارت کچھ بڑھ گیا۔ شاید کوئی کھڑکی کھلی رہ گئی تھی۔ سدرہ خاموش بیٹھی رہی۔ پھر اس نے ایک اور لفافہ میرے سامنے رکھا۔ ایک اور عمدہ تحریر۔ ایک اور پریم سُر میں ڈوبا ورق۔

ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی۔ میرا سر چٹخنے لگا۔

”وہ کچھ دیر بعد فون کرے گا۔“ سدرہ کی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔ ”میں چاہتی ہوں کہ آپ اس سے مل لیں۔“

”ہاں ضرور۔“ میں نے ہتھیلیاں رگڑیں، تاکہ کچھ گرمائش حاصل کرسکوں، مگر میری کوشش رائیگاں گئی۔

اسی اثنا میں نازیہ چائے لیے اندر داخل ہوئی۔ میں اسے سدرہ کے بارے میں بتا چکا تھا۔ وہ سدرہ سے باتیں کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد دونوں اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ ان کی آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں اور میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ یہ وہ سدرہ نہیں تھی، جس سے چار روز پہلے میں ملا تھا۔ وہ ایک بدلی ہوئی روح تھی۔

مجھے ناصر کی ٹیلی فون کال کا انتظار تھا۔ موبائل سامنے رکھا تھا اور اس کی خاموشی اذیت ناک تھی۔ ہر گزرتا پل بھاری تھا۔ اچانک کہیں سے شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی کی سمت دیکھا۔ وہ سلامت تھی۔ اور تب... فون پر پوری قوت سے چلایا۔

دوسری طرف ناصر تھا۔ ”ڈاکٹر صاحب، ایک عجیب خبر ہے۔“

”بولو میں سن رہا ہوں۔“ میں نے آواز دھیمی رکھی۔

”ایڈریس صحیح تھا۔ یہ فیاض ہی کا گھر ہے۔ مگر یہاں صرف ایک بوڑھی عورت رہتی ہے۔ جب ہم نے کہا کہ ہم فیاض سے ملنے آئے ہیں، تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور وہ صدمے سے زمین پر...“ ناصر کی آواز کٹ رہی تھی۔ شاید نیٹ ورک کا مسئلہ تھا۔

”میں اور سارہ اسے مکان کے اندر لے گئے۔ گھر کی حالت بہت خستہ تھی۔ لگتا ہے کئی ماہ سے صفائی... کچھ دیر بعد عورت کی حالت سنبھلی تو... نے بتایا کہ فیاض... ہے۔ اس نے...“

”کیا؟ فیاض کیا؟ میں سن نہیں سکا۔“

ناصر نے شاید میری بات نہیں سنی۔ وہ کہتا رہا۔ ”اس نے اپنی بیٹی شائستہ کا بھی بتایا، جو کچھ عرصے پہلے ایک کار حادثے میں... وہ مجھے اور سارہ کو فیاض کے کمرے تک لے گئی... وہ دھول سے اٹا تھا... اور وہاں... دیوار پر ایک تصویر لگی... ایک لڑکی کی تصویر... فیاض کی ماں نے بتایا کہ وہ اس کی منگیتر...“

”منگیتر؟“ میرا سر چٹخنے لگا۔ ”فیاض کی منگیتر؟“

”ہاں سر۔ عجیب بات۔ وہ تصویر میرے لیے اجنبی تھی...“

”اسے چھوڑو۔ فیاض سے ملاقات ہوئی؟“

”فیاض؟“ ناصر کی آواز میں بلا کی حیرت تھی۔ مجھے باہر سے سدرہ کا قہقہہ سنائی دیا۔ وحشی قہقہہ۔

”سر فیاض تو... آپ نے شاید سنا نہیں۔ میں نے بتایا ناں، اس کا انتقال ہو چکا... وہ اس نے خودکشی کرلی تھی... دس ماہ پہلے ایک برج سے کود...“

میں ٹھٹھرنے لگا۔ ٹھنڈ میری رگوں میں اترنے لگی تھی۔

”ایک بات اور... عورت نے بتایا کہ چند ماہ پہلے ایک لڑکی یہاں آئی... وہ کچھ چیزیں لے... جو حلیہ بتایا وہ سد...“

ایک سیاہ ہیولا کمرے میں داخل ہوا۔ ایک جھونکا مجھ سے ٹکرایا۔ وہ سدرہ تھی۔ اس کی آنکھیں مجھ پر ٹکی تھیں۔ اُن کی نیلاہٹ غائب تھی۔ اس کے لب وا ہوئے اور ایک اجنبی آواز میرے کانوں میں اتری۔

”فیاض سے بات ہوئی ہے۔ ہم آدھے گھنٹے بعد لائٹ پارک میں ملیں گے۔“

”لائٹ پارک؟“ میں نے دھیرے سے کہا۔

''ہاں، جو گرین برتج کے عین سامنے ہے۔'' وہ آگے کو جھکی۔ ''آپ چلیں گے ناں؟''

☆☆☆

چاند غائب ہو گیا اور ستارے چھپ گئے۔

پارک میں ویرانی کا بسیرا تھا۔ جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوتی تو لگتا کہ کوئی بدروح ہے۔ ٹھنڈ بڑھ چکی تھی۔ ہم جس بینچ پر بیٹھے تھے، وہ برف کی سِل معلوم ہو رہی تھی۔ میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور سر میں آندھیاں چل رہی تھیں۔

میں اپنے کیریر کے سب سے عجیب موڑ پر کھڑا تھا۔ کئی سوالات تھے، جن کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔

وہ پہاڑی چوٹی پر واقع ٹوٹی ہوئی دیواروں والا ایک خاموش پارک تھا۔ جب سے سامنے برتج تعمیر ہوا تھا، اس کی رونق ماند پڑ گئی تھی۔ اس رات بھی سناٹا تھا۔ برتج پر ٹریفک کم تھا۔ اِکّا دُکّا گاڑیاں ہی دکھائی دیتیں۔

سدرہ بالکل خاموش تھی۔ تاریکی میں اس کا سیاہ لباس پُراسراریت بڑھا رہا تھا۔ اس کے سینے میں کئی راز چھپے تھے۔

اچانک وہ چونکی۔ نظریں چاروں طرف گھمائیں۔ ''کیا آپ نے اس کی آواز سنی؟''

''آواز؟ اوہ نہیں۔''

اس نے جھاڑیوں کی سمت دیکھا۔ وہاں سرسراہٹ ہوئی۔ دور کہیں موٹر سائیکل کا انجن گڑگڑایا۔ وہ میری طرف پلٹی۔ ''وہ آ گیا ہے۔''

اگلے ہی پل وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جھاڑیوں کی سمت بڑھنے لگی۔

میں توہم پرست نہیں تھا، مگر میں نے اس کے پیروں کی طرف دیکھنے سے اجتناب برتا۔

''رکو سدرہ۔ یہاں کوئی نہیں۔''

اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ ''کیا آپ نے اس کی آواز نہیں سنی؟ وہ مجھے پکار رہا ہے۔''

وہ ٹوٹی ہوئی دیوار کی سمت بڑھی، جس کے آگے کھائی تھی۔

''سدرہ ٹھہرو۔'' میں چلّایا۔ اس کے پیچھے دوڑا۔ اچانک میرا پاؤں ایک پتھر سے ٹکرایا۔ میں منہ کے بل زمین پر گرا۔ سر پر شدید چوٹ آئی۔ درد کی شدت سے منظر دھندلانے لگا۔ ہر شے گھوم رہی تھی۔ میں نے قوت یکجا کی۔ ہاتھوں کے بل اٹھا، مگر کوئی پُراسرار قوت مجھ پر سوار ہو گئی تھی۔ جسم نے انکار کر دیا۔

تاریکی گہری ہونے لگی۔ یخ بستہ ہواؤں نے حواس معطل کر دیے۔ میں نے جھاڑیوں میں دو سائے حرکت کرتے دیکھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو تھام رکھا تھا۔ عین اس لمحے پل سے ایک گاڑی گزری۔ ہیڈلائٹس کی روشنی جھاڑیوں پر پڑی۔

ایک دراز قد شخص نے سدرہ کو تھام رکھا تھا۔ آدمی کے گھنگریالے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اگلے ہی پل وہ سائے غائب ہو گئے۔

میں غنودگی کی دنیا میں اتر چکا تھا۔

☆☆☆

''سدرہ۔'' میں چلّایا۔

سر میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ سامنے تیز دودھیا روشنی تھی۔ سفید لباس میں ملبوس ایک شخص مجھ پر جھکا ہوا تھا۔

''لیٹے رہو وحید۔'' اس نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا۔

میرے حواس لوٹنے لگے۔ وہ میرا دوست ڈاکٹر اعظم تھا۔ اس کے پیچھے ناصر کھڑا تھا۔ تیز تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ کچھ کرخت چہرہ لوگ کمرے میں داخل ہوئے۔

میں نے پھر اٹھنے کی کوشش کی۔ ''سدرہ کہاں ہے؟''

اعظم نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے لِٹا دیا۔ ''وہ... مر چکی ہے وحید۔ لیٹے رہو۔''

''کیا؟ نہیں۔ وہ تو...'' مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''اس نے خودکشی کر لی...'' ایک سسکی سنائی دی۔ یہ ناصر کے الفاظ تھے۔

''یہ ناممکن ہے۔ وہ فیاض کے ساتھ...''

''فیاض؟'' ناصر کے چہرے پر الجھن تھی۔ ''میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ وہیں گرین برتج...''

ایک لمبا چوڑا شخص ناصر کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھا۔ ''ڈاکٹر وحید۔ میں انسپکٹر طاہر اعوان۔ مجھے سدرہ کی خودکشی سے متعلق آپ کا بیان لینا ہے۔ آخری لمحات میں وہ آپ کے ساتھ تھی۔ آپ بتا سکتے ہیں کہ اس نے کیوں خودکشی کی؟''

''خودکشی؟ نہیں وہ...'' میں رُک گیا۔ ''وہ کسی کے ساتھ تھی انسپکٹر... کوئی اس سے ملنے آیا تھا۔''

انسپکٹر نے مجھے گھورا۔ ''ہم نے چوکیدار کا بیان لیا ہے۔ وہ چیخ سن کر چوٹی کی طرف آیا۔ آپ زمین پر گرے ہوئے تھے... اس نے سدرہ کو وہاں سے کودتے دیکھا۔''

''مگر... اُس کے ساتھ ایک دراز قد آدمی تھا۔''

انسپکٹر نے آنکھیں سکیڑلیں۔ ''چوکیدار نے ایسے کسی شخص کے بارے میں نہیں بتایا۔ اس وقت ایک گاڑی برج سے گزر رہی تھی۔ اس کے ڈرائیور نے بھی بیان دے دیا ہے۔ سدرہ چھلانگ لگاتے ہوئے بالکل اکیلی تھی۔''

''ایسا نہیں ہوسکتا۔'' میرا سر پھٹنے لگا۔

''مسٹر وحید، مجھے لگتا ہے کہ آپ کو ایک ماہرِ نفسیات کی ضرورت ہے۔ خیر آپ کا بیان...''

''وحید ابھی صدمے میں ہیں انسپکٹر۔'' ڈاکٹر اعظم نے مداخلت کی۔ ''بیان لینے کے لیے یہ وقت مناسب نہیں۔''

انسپکٹر پاؤں پٹختے ہوئے چلا گیا۔

''میں یہاں کیسے پہنچا؟'' میں نے بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''میں آپ کو اسپتال لایا۔'' ناصر نے کہا۔ ''میں آپ سے ٹیلی فون پر بات کر رہا تھا، جب مجھے دوسری طرف سدرہ کی آواز سنائی دی۔ اُس نے گرین برج کہا تو میں چونکا۔ دراصل اسی مقام سے فیاض نے کود کر خودکشی...''

میں پھر نیند میں اتر گیا۔

☆☆☆

میں گزشتہ بارہ برس سے پریکٹس کر رہا ہوں اور اس عرصے میں کبھی میرا کسی ایسے کیس سے سامنا نہیں ہوا، جسے میں حل نہ کرسکا ہوں۔ ایسا کوئی معما، کوئی پیچیدہ کیس نہیں، جسے میں سلجھا نہ سکا ہوں، ماسوائے سدرہ شیخ کی خودکشی کے۔

میں نے پولیس کو حقیقت نہیں بتائی۔ اعظم کے کہنے پر زبان بند کرلی۔ اسے خدشہ تھا کہ میری بیان کردہ کہانی کی بنیاد پر میرا لائسنس بھی منسوخ ہوسکتا ہے۔

اس نے خود ہی ایک رپورٹ تیار کی۔ ایک سیدھی سادی رپورٹ۔ جس میں سدرہ کو ایک ذہنی مریضہ کے طور پر پیش کیا، جو ایک ایسے شخص سے محبت کرتی تھی، جس نے کسی نامعلوم وجہ سے خودکشی کرلی۔ سدرہ نے اس حقیقت کو قبول نہیں کیا اور اپنے تخیل میں فیاض کو دوبارہ زندہ کرلیا۔ فیاض کی ماں نے تصویر دیکھ کر تصدیق کردی تھی کہ سدرہ اس کے بیٹے کی موت کے بعد دوبارہ اس کے گھر آئی تھی۔ زرد لفافے اور نارنجی رائٹنگ پیڈ فیاض ہی استعمال کرتا تھا۔ سدرہ اپنے نام خود ہی خط پوسٹ کرتی تھی۔ ٹیلی فون بھی ایک ڈھونگ تھا۔ فقط اس کے تخیل کی پیداوار۔ فیاض سے ملاقاتوں کا تعلق حقیقت کی دنیا سے نہیں تھا۔

''مگر اس نے مجھے ایک خط دکھایا تھا۔'' میں نے اعتراض کیا۔

''پولیس کو اس کے پرس سے کوئی خط نہیں ملا۔'' اعظم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس کی بہن نے گھر میں جو زرد لفافے دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا، وہ بھی تلاش نہیں کیے جاسکے۔''

تو ڈاکٹر اعظم نے ایک سیدھی سادہ رپورٹ بنائی۔ سدرہ ایک ذہنی مریضہ تھی اور میں مخلص معالج، جو اس کا نفسیاتی مسئلہ حل کرنے کے لیے آخری حد تک گیا مگر ناکام رہا۔

میں نے خاموشی سے رپورٹ پر دستخط کردیے اور اس کیس کو بھولنے کی کوشش کرنے لگا، مگر وہ ڈراؤنے خوابوں کی صورت میرا تعاقب کرتا رہا۔ ایک عفریت میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔

اس سانحے کے ڈیڑھ برس بعد، جب میں سدرہ کا چہرہ دھیرے دھیرے بھولنے لگا تھا، ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا، جس نے یکدم بہت سی یادیں تازہ کردیں۔

میں دفتر میں داخل ہوا، تو سامنے نیلے رنگ کا ایک لفافہ رکھا تھا۔ شادی کا دعوت نامہ۔ ناصر اور سارہ کی شادی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ مجھے بیٹری سے محروم ایک ٹیلی فون سیٹ یاد آیا... پھر ایک لڑکی کا سرد لہجہ ذہن میں تازہ ہوا... کہانی کے سقم عیاں ہونے لگے۔

میں نے ڈاکٹر اعظم کا نمبر ڈائل کیا۔ سدرہ کا نام سنتے ہی وہ سنجیدہ ہوگیا۔ ''کیوں گڑے مردے اکھاڑ رہے ہو۔ شاید فیاض کا واہمہ اب بھی تمہارے ذہن میں زندہ ہے؟''

''نہیں۔ بس ایک بات پوچھنی تھی۔'' میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ''ٹھیک ہے، خطوط نہیں ملے۔ مگر سدرہ کے پاس ایک موبائل فون بھی تھا... جس پر وہ فیاض سے باتیں کیا کرتی تھی۔ تو ان کے ریکارڈ...''

''وحید۔ میری بات غور سے سنو۔'' اس کا لہجہ سرد تھا۔ ''سدرہ کے پاس کوئی موبائل فون نہیں تھا۔''

''مگر اس کی چھوٹی بہن نے تو ناصر کو بتایا تھا کہ سدرہ نے اپنے والد سے ضد کر کے...''

''نہیں وحید۔ اس کے گھر والوں سے میری تفصیلی بات ہوئی ہے۔ انہوں نے کسی موبائل فون کا ذکر نہیں کیا۔ بہتر ہے کہ تم اس کیس کو اب بھول جاؤ۔''

میں نے فون رکھ دیا۔ شادی کا دعوت نامہ میرے سامنے رکھا تھا۔ اس کا رنگ نیلا تھا، ٹھیک سدرہ کی آنکھوں کی مانند۔

سنہری دھوپ

محترمہ عذرا رسول
سلام تہنیت
یہ سرگزشت جسے میں نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے، میری اپنی نہیں ہے۔ یہ خود ہی سنہری دھوپ سے نکل کر چلچلاتی دھوپ میں آجانے والی میری ایک کم عقل سہیلی کی ہے۔ میری بروقت ایک کال نے اس کو تباہ ہونے سے بچالیا اور آج وہ میری بھابی ہے۔ جس نے مجھے یہ واقعہ سنایا اس کا اور اس روداد کے مرکزی کردار کا نام میں نے بدل دیا ہے۔

آصفہ ضیا احمد
(حیدرآباد)

میرے سیل فون اسکرین پر حسنی کا نام جگمگا رہا تھا۔ دل تو چاہا کہ فوراً اس سے گٹ پٹ شروع کردوں لیکن موقع کی نزاکت کے سبب، میں نے آہستہ سے کہا۔ ''حسنی میں معذرت چاہتی ہوں ذرا مصروف ہوں تھوڑی دیر بعد میں خود تمہیں کال کروں گی۔''

''اس نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ ''بھول مت جانا مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

میں نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا ''شوہر

نامدار کے آفس روانہ ہوتے ہی سارے کام پسِ پشت ڈال کر سب سے پہلے تم سے بات کروں گی۔"

مطمئن ہو کر اس نے موبائل آف کر دیا۔ احمر کے دفتر جانے کے بعد میں نے فوراً اپنا وعدہ پورا کیا۔ وہ شاید میری کال کے انتظار میں ہی بیٹھی تھی۔ ہوا کے دوش پر اس کی آواز لہرائی جو کافی کھنک دار اور پُرجوش تھی۔ اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔ "میری جان بلکہ میری جانِ جگر یہ تو مجھے اچھی طرح علم ہے کہ تم ایک عدد شوہر اور ایک عدد بیٹا رکھتی ہو لیکن اے خانہ بر انداز چمن کچھ ہم پر بھی نظرِ عنایت ڈال لیا کر۔ تم تو ماضی کے تمام رشتے ناتوں پر پانی پھیر کر پیا گھر ایسی سدھاری کہ پلٹ کر خبر ہی نہیں لیتیں۔" اس نے شکوے شکایتوں کا ایسا ڈھیر لگایا کہ میری بولتی ہی بند ہو گئی۔ وہ بول رہی تھی اور میں سن رہی تھی جیسے ہی وہ سانس لینے کے لیے رکی میں نے فوراً استفسار کیا۔

"اور کچھ کہنا ہے؟"

اس بار اس نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ "جانِ من حد ہو چکی بس اب تم فوراً اپنی خوشدامن صاحبہ اور شوہر نامدار سے اجازت لے کر آجاؤ۔ عرصہ ہوا تمہیں دیکھے ہوئے اور مجھے تم سے ایک اہم معاملہ شیئر کرنا ہے اس لیے میں تمہاری راہوں میں آنکھیں بچھائے بیٹھی ہوں تمہیں کیا پتا کہ......"

میں نے بیچ میں ہی جملہ اچک لیا اور تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔ "تم پہلے بھی یہ بات کہہ چکی ہو کہ کسی خاص مسئلے پر ڈسکس کرنا ہے۔ ایسا کیا ٹاپ سیکرٹ ہے کہ فون پر نہیں بتا سکتیں۔"

اس نے خفگی بھرے انداز میں الفاظ چباتے ہوئے کہا۔ "بس کہہ دیا نا کہ ملنے پر روبرو بیٹھ کر ساری روداد تمہارے گوش گزار کروں گی۔ میں بہت بے چینی سے تمہاری منتظر ہوں۔" اس کے بعد الوداعی کلمات کہتے ہوئے اس نے موبائل آف کر دیا۔

میں نے بھی اپنا موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور سوچنے لگی کہ حسنیٰ پر ایسی کیا افتاد آن پڑی کہ وہ مجھے مسلسل آنے کی تاکید کر رہی ہے۔ بہت سوچنے کے بعد بھی کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا تو میں سر جھٹک کر اپنی روزمرہ کی مصروفیات میں گم ہو گئی لیکن کام کے دوران بھی میرے خیالات حسنیٰ کے تعاقب میں رہے۔ شام میں جب احمر دفتر سے آئے تو میں نے ان سے اور اپنی ساس صاحبہ سے میکے جانے کی اجازت طلب کی جو مجھے باآسانی مل گئی۔

☆......☆

حسنیٰ میری بہت اچھی دوست اور پڑوسی تھی۔ ہم دونوں ایسے علاقے کے رہائشی تھے جہاں لوگ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونا اپنا فرض اوّلین سمجھتے ہیں۔ گھر بھلے ہی چھوٹے اور تنگ و تاریک تھے لیکن دل سب کے بڑے اور کشادہ تھے۔ میرے اور حسنیٰ کے گھرانوں کے مراسم بھی قرابت داروں جیسے تھے۔ میرے گھر میں جتنے افراد تھے اتنے ہی افراد پر مشتمل حسنیٰ کا خاندان تھا۔ یعنی میں، میرے والدین اور ایک بڑا بھائی حارث۔ کچھ اسی طرح حسنیٰ کے یہاں اس کے والدین، وہ خود اور ایک بھائی انصر۔ میرے اور حسنیٰ کے والدین غریب ضرور تھے لیکن شعور اور آگہی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اسی لیے جہاں میرے والدین نے ہم دونوں بہن بھائی کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا وہیں حسنیٰ اور اس کے بھائی انصر نے بھی تعلیمی میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کر کے اپنے والدین کا نام روشن کیا۔ میں اور حسنیٰ بی ایس سی کر چکے تھے۔ میرے بھائی حارث حصول تعلیم کے بعد ایک فارماسیکل کمپنی میں سیلز منیجر کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔ حسنیٰ کے بھائی انصر کا بی ای فائنل تھا۔ بذاتِ خود حسنیٰ کا ارادہ یونیورسٹی میں ماسٹر کرنے کا تھا۔ ارادہ تو میرا بھی یہی تھا لیکن ان ہی دنوں احمر کی والدہ نے رشتے کی بات چلا دی اور بقول میری امی کے آج کل اچھے رشتے اسی طرح ناپید ہو گئے ہیں جیسے اس جہانِ فانی سے خوشیاں، محبتیں اور امن و امان رخصت ہو چکے ہیں۔

میری اعلیٰ تعلیم کی تمنا دل ہی دل میں رہ گئی۔ کیوں کہ حارث بھائی بھی امی کے ہمنوا تھے۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق سب کام انجام پایا اور میں بابل کے گھر سے رخصت ہو کر سسرال سدھاری۔ حسنیٰ میری شادی کے ہر کام میں پیش پیش رہی۔ اس کی تعریفیں کرتے کرتے امی کی زبان خشک ہو رہی تھی کیوں کہ اس نے شادی کی آدھی ذمہ داریاں اپنے سر لے رکھی تھیں۔ حارث بھائی کی آنکھوں میں بھی اس کے لیے اظہارِ تشکر تھا کیوں کہ وہ انصر کو ساتھ لے کر باہر کے بھی کئی کام نمٹا رہی تھی۔ شادی کی تقریبات سے فارغ ہونے کے بعد سب نے سکھ کا سانس لیا اور مہمان بھی اپنے اپنے گھر رخصت ہوئے تو گھر میں ہونے والا شور و غل اور ہنگامہ آرائی ختم ہوئی۔ میں اپنی سسرال میں ہی تھی کہ اچانک حسنیٰ کا فون آیا۔ اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگی

ہوئی تھی۔ میں اس کے کہے ہوئے الفاظ نہ سمجھ پا رہی نہ ٹھیک سے سن پا رہی تھی۔ بدقت تمام میں صرف ایک جملہ سن پائی کہ اس کے والد ہوسپٹلائزڈ ہیں۔ میں احمر کو ساتھ لے کر اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچی تو پتا چلا کہ اس کے والد کو انتہائی نگہداشت میں رکھا گیا ہے کیوں آج ہی ان پر فالج کا زبردست اٹیک ہوا تھا۔ حسنیٰ کے خاندان کے لیے یہ گھڑی کسی قیامت سے کم نہیں تھی۔ میرے بھائی حارث بھی ان کے ساتھ تھے۔ میں اور احمر بھی وہاں رکے رہے اور ان لوگوں کو مسلسل تسلی تشفی دیتے رہے لیکن سارا کنبہ ہی اس ناگہانی آفت کی وجہ سے زبردست شاک میں تھا۔ کچھ عرصہ اسپتال میں رکھنے کے بعد انہیں ڈسچارج کر دیا گیا لیکن اب وہ مکمل چارپائی سے لگ گئے تھے۔ گھر کے سربراہ اور واحد کفیل ہی جب بستر پکڑ لے تو گھر کا چولہا خود بخود ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور یہی سب کچھ ان لوگوں کے ساتھ ہوا۔ ناآسودگی پریشانیاں، محرومی اور تنگدستی نے اس گھر میں ڈیرے ڈال لیے۔ حسنیٰ نے وقت کی نبض پہچان کر ایم ایس سی کرنے کے خواب کو بالائے طاق رکھا اور ہوم ٹیوشن اکیڈمی سے رابطہ کر کے مناسب اور مہنگی ٹیوشنز حاصل کیں۔

یہ اکیڈمی مخصوص اور خطیر ٹیوشن فیس کے بدلے اپنی ضمانت پر ہوم ٹیوشن مہیا کرتی تھی۔ حسنیٰ کی تعلیمی قابلیت کو دیکھتے ہوئے اکیڈمی نے اسے ایسے گھرانوں کی ٹیوشنز فراہم کی تھیں جہاں کے بچے کوٹھیوں اور بنگلوں کے رہائشی تھے اور کانونٹ اسکولز میں زیر تعلیم تھے۔ ان کے سلیبس دیکھنے کے بعد حسنیٰ نے فوراً ہامی بھر لی لیکن ساتھ ہی زبردست ٹیوشن فیس کی ڈیمانڈ رکھی جو تھوڑی سی ردوکد کے بعد طے پا گئی کیوں کہ تقریباً سب ہی پوش علاقے میں رہنے والے باحیثیت لوگ تھے اور اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے خواہاں تھے اس لیے منہ مانگی ٹیوشن فیس دینے پر مجبور تھے۔ حسنیٰ نے اپنی تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا لیکن اس نے انصر کی تعلیم کا سلسلہ منقطع نہیں ہونے دیا۔ وقت کے تھپیڑوں کی زد میں آکر جو خاندان خس و خاشاک کی طرح بکھرنے والا تھا وہ حسنیٰ کی وجہ سے دوبارہ جی اٹھا۔ اپنے والد کے علاج معالجے میں بھی اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ گھر کا بجھا چولہا بھی پھر سے جلنے لگا۔ انصر بھی فارغ اوقات میں خالی نہ بیٹھتا بلکہ کچھ نہ کچھ کر کے اپنی کمائی ماں کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ دونوں بہن بھائی اپنے بل بوتے پر جینا سیکھ گئے تھے لیکن اتنی سخت محنت کے باوجود زندگی غربت کی پگڈنڈی پر رواں دواں تھی۔ میری اور حسنیٰ کی راہیں جدا جدا ضرور ہو گئی تھیں لیکن جب بھی ملاقات ہوتی ہم دونوں اپنا دل کھول کر ایک دوسرے کے سامنے رکھ دیتے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے کھلی کتاب کی طرح تھے۔ گو ہمیں ملنے جلنے کا موقع اب بہت کم ملتا تھا اور ٹیلی فونک گفتگو بھی بہت کم ہوتی تھی لیکن دل ایک دوسرے کی یاد سے غافل نہیں تھے۔

☆......☆

میرے بڑے بھائی چونکہ برسرِ روزگار ہو چکے تھے۔ اس لیے دنیا کی تمام ماؤں کی طرح امی کے دل میں بھی گھر میں بہو لانے کی خواہش کلبلانے لگی۔ چونکہ حسنیٰ انہیں شروع سے بے حد پسند تھی اس لیے قرعۂ فال اسی کے نام نکلا۔ حارث بھائی کی آنکھوں میں بھی حسنیٰ کے لیے میں پسندیدگی کی جھلک دیکھ چکی تھی لیکن حسنیٰ کی والدہ کے پاس جانے کے لیے قدم نہیں اٹھ رہے تھے کیوں کہ گھر کے تمام اخراجات کا دارومدار حسنیٰ کے ناتواں کندھوں پر تھا۔ معاشی مسائل سے پورا کنبہ نبرد آزما تھا۔ اس لیے رشتے کی بات چھیڑنے کے لیے زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ حارث بھائی نے بھی امی کو یہ کہہ کر روک دیا کہ فی الحال آپ اس تذکرے کو رہنے ہی دیں کیوں کہ میں کسی اچھے علاقے میں اپنا ذاتی گھر یا تو خریدوں گا یا پلاٹ خرید کر گھر تعمیر کرواؤں گا۔ اس کے بعد ہی یہ سلسلہ چھیڑیے گا۔ امی کے جوش اور ولولے پر برف پڑ گئی لیکن ہم دونوں بہن بھائی کے سامنے انہوں نے اپنے خدشے کا اظہار کر دیا کہ اگر ہم اسی طرح ٹال مٹول سے کام لیتے رہے تو کہیں حسنیٰ ہاتھ سے نہ نکل جائے کیوں کہ حسنیٰ کروڑوں میں ایک نہیں تو ہزاروں میں ایک ضرور تھی۔ متناسب جسم، دلکش قدوقامت اور انتہائی جاذبِ نظر چہرہ اس کے علاوہ تعلیم یافتہ اور سلیقہ مند لڑکی تھی۔ امورِ خانہ داری میں بھی کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا تھا۔ میں نے امی کو تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ یہ خدشات اور خوف اپنے دل سے نکال دیجیے۔ انشاء اللہ حسنیٰ ہی آپ کی بہو بن کر آئے گی۔“

امی نے بظاہر تو ہم دونوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے لیکن دل ہی دل میں وہ مجھ سے اور حارث بھائی سے سخت برہم تھیں۔ ان کا چہرہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا۔ حارث بھائی بھی امی کو دلاسہ دیتے رہے لیکن امی کا موڈ آف ہو گیا تھا۔

☆......☆

حسنیٰ مجھ سے ملنے کے لیے کچھ زیادہ ہی بے تاب تھی کیوں کہ جیسے ہی اپنے میکے پہنچ کر میں نے اسے کال کی وہ فوراً چراغ کے جن کی طرح حاضر ہوگئی۔ اس کا چہرہ ایک انجانی خوشی سے جگمگا رہا تھا۔ انگ انگ سے مسرت پھوٹ رہی تھی۔ کچھ دن پہلے میری اس سے ملاقات ہوئی تھی تو وہ عجیب سی پژمردہ اور بیمار لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تھا کہ اس کے گھرانے پر یہ افتاد نہ پڑتی تو وہ یوں نہ مرجھاتی لیکن آج تو جوبن پر بہار تھی۔ رنگ روپ ہی بدلا ہوا تھا۔ میرے اپنے دل نے چپکے سے سرگوشی کی ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ اس سے بغلگیر ہوتے ہوئے میں کہے بنا نہیں رہ سکی۔ ”کیا بات ہے بہت خوش نظر آرہی ہو۔“

اس نے شگفتہ شگفتہ کھلے کھلے لہجے میں آہستہ سے کہا۔ ”میری بہنا مجھے میرے خوابوں کی تعبیر مل گئی۔ زندگی بھر ساتھ نبھانے والا وہ حسین ساتھی مل گیا۔ جس کے خواب دنیا کی ہر لڑکی ہوش سنبھالتے ہی دیکھتی ہے۔“

میرے دل میں ایک برچھی سی اتر گئی۔ اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ آتشی سیال بن کر میرے سارے وجود کو بھسم کرگئے۔ بڑوں کے تجربات کتنے صحیح ہوتے ہیں مجھے اس روز احساس ہوا لیکن میں نے حسنیٰ پر کوئی بات ظاہر نہیں ہونے دی بلکہ اس کی خوشی میں خوش ہونے کی بھرپور اداکاری کی اور نہایت گرم جوشی سے اسے لپٹاتے ہوئے کہا۔ ”واؤ زبردست اب بتا بھی دو کون ہے؟ کیا نام ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کیا رشتہ لے کر اس کے والدین تمہارے گھر آچکے ہیں؟“

میرے تابڑتوڑ سوالوں پر اس نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور کہا۔ ”ساری داستان سناتی ہوں اسی داستان میں تمہیں اپنے سارے سوالات کے جوابات مل جائیں گے۔“ اور پھر جو اس نے کہانی شروع کی وہ کوئی عام روداد یا داستان نہیں بلکہ مکمل افسانہ عشق تھا جس کا ہیرو ایک امیر زادہ اور ہیروئن حسنیٰ تھی۔ اس نے اپنی داستان کا آغاز کچھ اس طرح کیا۔

☆......☆

میری دوست! میں نے زندگی کی راہوں میں ہمیشہ دھول ہی دھول دیکھی ہے۔ کبھی پھول نہیں دیکھے۔ انتھک محنت، جدوجہد اور اس کے بعد دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی اور جسم پر موٹے کھردرے کپڑے، تنگ آگئی تھی میں ان مسائل سے لڑتے لڑتے اس لیے ایسے موقع کی تلاش میں تھی جس سے مجھے ایک آرام دہ محفوظ اور خوش گوار مستقبل مل جائے۔ سنہرے خواب میرے ہو جائیں اور بس رب نے میری سن لی۔ تمہیں تو اچھی طرح علم ہے کہ میرے پاس تمام ٹیوشنز امیر کبیر گھرانوں کی ہیں۔ تم ان لوگوں کی زندگی قریب سے دیکھو گی تو تمہیں احساس ہوگا کہ یہ زندگی کتنی حسین ہے۔ ہم لوگ تو اس دنیا میں آکر صرف عمر کاٹ رہے ہیں۔ زندگی تھوڑی گزار رہے ہیں۔ میں ٹکٹکی لگائے حیران نظروں سے اسے دیکھے جارہی تھی اور وہ بلا تکان بولے جارہی تھی۔ میرے بغور دیکھنے پر وہ چونکی اور کہنے لگی ”اوہ، وہ ایک بات تو رہ ہی گئی۔“

میں نے ایک استہزائیہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”تو تم اتنی دیر سے کیا کر رہی ہو۔ جب سے آئی ہو مسلسل باتیں ہی تو کر رہی ہو۔“

اس نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ”میں دراصل تمہیں شوکت کے بابت کچھ بتانا چاہ رہی ہوں۔“

میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے نہایت بھولپن سے کہا۔ ”کون شوکت؟“

حسنیٰ نے جھلاتے ہوئے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔ ”تمہارے سامنے تو رات بھر کوئی یوسف زلیخا پڑھے اور صبح اٹھ کر تم اس سے سوال کرو گی زلیخا آدمی تھا یا عورت۔“

اس کی اس تمثیل پر میں بے ساختہ ہنس پڑی۔ پھر اپنی ہنسی کو بریک لگاتے ہوئے استفسار کیا۔ ”اوہ یاد آیا تو موصوف کا اسم گرامی شوکت ہے اور کرتے کیا ہیں؟“

اس نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”وہ کیوں کچھ کرنے لگے، کروڑوں کا بزنس ہے۔ ان کے ورکرز ان کے ملازمین تمام کاروبار سنبھالتے ہیں۔ الواحد بلڈرز کا نام سنا ہے جن کے کئی تعمیراتی پروجیکٹ پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں پائے تکمیل کو پہنچ چکے اور کئی ابھی زیر تعمیر ہیں۔ میں الواحد والوں کے یہاں گئی تو تھی بحیثیت ٹیوٹر لیکن عنقریب اب میں عبدالواحد صاحب کی بہو بن جاؤں گی۔ کیوں کہ میں اور ان کا بیٹا شوکت ایک دوسرے کو بے تحاشا پیار کرنے لگے ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر ہم جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ بس یہ سمجھو حسنیٰ اور شوکت ایک جان دو قالب ہیں۔ ہم دونوں جب تک ایک دوسرے کو دیکھ نہ لیں قرار نہیں آتا۔“

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور دھڑکتے دل

کے ساتھ کہا۔ ''حسنیٰ الواحد والوں کے یہاں تم کتنے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہو اور شوکت کا ان سے کیا رشتہ ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ چار بچے۔ تین بچے شوکت کے بڑے بھائی کے بچے ہیں اور ایک بڑی بہن کا بچہ ہے۔ چاروں پرائمری اسٹینڈرڈ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن چونکہ کانونٹ کا سلیبس ہے اس لیے کام محنت طلب ہے۔ شوکت صاحب اور ان کے گھر کے سارے افراد پہلے پہل تو میری ٹیچنگ اور علمی قابلیت سے بہت متاثر ہوئے۔ سب ہی مجھ سے نہایت ادب احترام اور خلوص سے پیش آتے ہیں اگر کسی دن چھٹی کر لیتی ہوں تو گھر کے سارے افراد مجھے مس کرتے ہیں۔ بچوں کو پڑھانے کے دوران میں میرے لیے ریفریشمنٹ اور چائے میز پر لگا دی جاتی تھی لیکن رفتہ رفتہ اب تو شام کی چائے میں ان کے فیملی ممبرز کے ساتھ ہی پیتی ہوں اور ان کے خاندان میں، میں اس طرح گھل مل گئی ہوں کہ نہ اب مجھے اجنبیت کا احساس ہوتا ہے اور نہ غیریت کا۔ سب اپنے اپنے سے لگتے ہیں خصوصاً شوکت تو اب میری زندگی ہے۔ بس میری دل کی دنیا ان ہی سے شاد و آباد ہے۔ گفتگو کے دوران میں اس نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا تو میں نے بھی اسے کریدتے ہوئے پوچھا۔

''ان کے گھر میں جو خواتین ہیں وہ تمہیں پسند کرتی ہیں۔''

حسنیٰ نے ایک ادائے ناز سے اپنے بالوں کو جھٹکا دیا اور فخریہ انداز میں کہا۔ ''یہ پوچھو کون نہیں پسند کرتا۔ ان کے گھر کی بزرگ خواتین یعنی ان کی والدہ اور بیوہ پھوپی وہ دونوں تو مجھے بیٹیوں کی طرح چاہتی ہیں۔ ان کی بھابی یعنی میرے اسٹوڈنٹس کی والدہ سے بھی میری اچھی انڈراسٹینڈنگ ہے۔ شوکت کی سب سے چھوٹی بہن سے تو خوب یارانہ ہو گیا ہے۔ ہم دونوں بہت اچھی دوست بن گئی ہیں حالانکہ یقین کرو اتنی ضدی، سرکشی اور شاہانہ مزاج رکھنے والی لڑکی ہے کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ غرور سے ہمیشہ گردن اکڑی ہوئی رہتی ہے لیکن اب تو یہ حال ہے کہ مجھے پہنچنے میں ذرا سی تاخیر ہو جاتی ہے تو فوراً میرے موبائل پر کال آ جاتی ہے کہ اپنا پتا بتاؤ ڈرائیور کو بھجوا رہی ہوں۔ ویسے کوک کو سمجھنا ذرا مشکل کام ہے، کبھی نرم کبھی گرم لیکن اس کی سائیکی میری سمجھ میں آ گئی ہے۔ اس لیے فی الحال تو ہم دونوں کی خوب گاڑھی چھن رہی ہے۔''

میں نے بھی اپنے ترکش میں سے ایک تیر چھوڑا۔

''جب وہ تمہاری نند بن جائے اور تم بھاوج بن جاؤ اس وقت بھی چھنے اور بنے تو ہم آپ کے حضور میں کورنش بجا لائیں گے۔''

اس نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔ ''اے بس تم دیکھتی رہنا مستقبل قریب میں اس وسیع و عریض کوٹھی پر راج ہوگا میرا۔ یقین کرو مجھے تو یقین ہی نہیں آتا کہ میرے نصیب، میرے بخت اچانک اتنی بلندی پر کس طرح پہنچ گئے۔ کہاں ہم زمین پر رہنے والے اور کہاں وہ ستاروں میں بسنے والے لوگ مگر وہ کہتے ہیں نا کہ عشق نہ دیکھے ذات پات۔ یہ مثل شوکت پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ بخدا انہوں نے نہ میرے معاشی و مالی حالات کریدنے کی کوشش کی اور نہ میرے خاندان اور رہائش کے بارے میں کوئی سوال کیا۔ ہاں البتہ ایک بار انصر مجھے اپنی بائیک پر چھوڑنے کے لیے گیا تھا تو شوکت کوٹھی کے گیٹ سے نکل رہے تھے۔ نہایت تپاک اور گرم جوشی سے انصر سے ملے۔ انصر بھی ان سے بے حد متاثر ہوا اور وہ خود بھی......''

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے ایک اور لٹھ مارا۔

''اچھا ایک بات تو بتاؤ تمہارے شوکت، شان و شوکت سے تمہاری دہلیز پر کب تشریف لا رہے ہیں؟'' میرے اس سوال پر حسنیٰ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، کترنی کی طرح چلنے والی زبان کو ایک دم تالا لگ گیا۔ چند لمحے توقف کرتے کے بعد مدھم لہجے میں کہا۔ ''اس سلسلے کو لے کر تو میں بھی اشارتاً کنایتاً کہہ چکی ہوں لیکن شوکت کہتے ہیں ابھی ایسی کیا جلدی ہے پہلے دل بھر کر کورٹ شپ کریں گے بعد میں شادی بیاہ کریں گے۔''

حسنیٰ کے اس جواب سے میرے کان فوراً کھڑے ہو گئے۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ کوئی بہت خوب صورت جال بچھا کر اسے پھانسنے میں لے رہا ہے۔ میں نے اپنے طور پر زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتے ہوئے اسے ہوشیار رہنے کی تلقین کی لیکن وہاں تو عشق کا بھوت سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ میری نصیحتوں پر اس نے ناک بھوں چڑھائی اور تنتنا کر کہا۔

''میں تو سمجھ رہی تھی میری پریم کتھا سن کر تم خوشی سے جھوم اٹھو گی لیکن یہاں تو بقول غالب دوست ہی ناصح بن بیٹھے ہیں تو ہم غم گسار اور چارہ گر کہاں تلاش کریں۔'' پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔ میں دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں اس کے ہی متعلق سوچتی رہی کہ کل تک جو لڑکی ڈری سہمی گھر کی چار دیواری

میں مقید تھی۔ آج کتنی اونچی اڑان اڑ رہی ہے۔ اتنی بلندی پر اڑتے اڑتے زمین پر گر کر اپنا وجود ہی نہ کھو بیٹھے۔ میں اپنے ہی خیالوں میں غلطاں و پیچاں تھی کہ امی کی آواز پر ہوش میں آئی۔ وہ مستفسر تھی۔

''یہ تمہاری دوست یوں آئی اور یوں چلی گئی۔ آج حسنیٰ کچھ جلدی میں تھی کیا میں تو اسے کھانے پر روکنا چاہ رہی تھی لیکن وہ بجلی کی سی سرعت سے نکل گئی۔''

میں نے ایک افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''امی اب اپنے دسترخوان کا کھانا اسے کہاں اچھا لگے گا۔'' امی نے استعجاب انگیز نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا۔

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی کیا کہہ رہی ہو تم۔''

میں نے بات ٹال کر امی کو دوسری باتوں میں الجھالیا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

☆......☆

اس کا راز مکمل طور پر میرے سینے میں دفن تھا۔ نہ میں نے اس کی ہوا امی کو لگنے دی اور نہ حارث بھائی کو۔ اب امی میرے سر سوار تھیں کہ ''کب چل رہی ہو حسنیٰ کے گھر اس کی والدہ سے بات کرنے۔ اب تو میرے بیٹے نے پلاٹ بھی خرید لیا ہے اور عنقریب تعمیری کام شروع ہو جائے گا۔ کوئی نیک ساعت دیکھ کر بات چھیڑ دیں گے۔''

میں نے فوراً حسنیٰ کے والد کی بیماری کو مزاحمتی کارڈ بنا کر امی کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیے۔ امی کا پارہ پھر چڑھ گیا۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں منایا سمجھایا۔ اسی اثناء میں، میں نے اپنی سسرال سے دو تین بار حسنیٰ کو کال کیا لیکن فوراً نمبر کاٹ دیا گیا۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ محترمہ مجھ سے سخت ناراض اور خفا ہیں۔ کیوں کہ میں نے سب کچھ سننے کے بعد اختلاف رائے جو کی تھی ہاں اگر داستانِ عشق سننے کے بعد ہاں میں ہاں ملاتی تو وہ خوشی سے نہال ہو جاتی۔ ایک اچھی دوست کھونے کا ملال ضرور تھا۔ لیکن میں اپنی جگہ خاموش رہی۔ پھر اچانک ایک دن خود ہی کال کی اور حکم صادر کیا کہ جلدی سے آجاؤ تمہارے ساتھ ایک خفیہ میٹنگ کرنی ہے۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''محترمہ حسنیٰ صاحبہ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں کل ہی امی کے گھر آئی ہوں۔ آپ کو ملاقات کرنی ہے تو آپ ہی فوراً آجائیے اور مجھ سے یہ امید مت رکھنا کہ میں ان سب خرافات میں تمہارا ساتھ دوں گی۔ نیور۔ تمہاری داستانِ عشق بظاہر تمہیں جتنی

رنگین نظر آرہی ہے نا بعد میں یہ اتنی ہی سنگین ہو جائے گی۔''

جواب میں وہ غرائی۔ ''تم تو پاگل ہو۔ پتا نہیں کون سی بوڑھی روح تمہارے بدن میں حلول کر گئی ہے۔ بہر حال میں آرہی ہوں۔''

تھوڑی ہی دیر بعد وہ میرے پاس بیٹھی پھر اپنی بپتی سنا رہی تھی۔ تھوڑی دیر تو جھجک مانع رہی اس کے بعد اس نے راز فاش کیا کہ شوکت اس سے تنہائی میں ملنے کا خواہاں ہے اور آج شام کا وقت دیا ہے۔ ڈنر بھی کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوگا اور اس کے بعد لمبی ڈرائیو اور پھر گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر آگے کا لائحہ عمل طے کریں گے۔

میں نے حسبِ عادت پھر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''آگے کا لائحہ عمل میں سمجھی نہیں۔''

اس نے پھر برا سا منہ بنایا اور چیں بہ چیں ہو کر بولی۔

''او بھئی شادی بیاہ کے معاملات طے کرنا ہیں نا۔''

میں نے حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو ہمارے یہاں گھر کے بڑے اور بزرگ طے کرتے ہیں۔ لڑکا یا لڑکی کسی پکنک پوائنٹ پر جا کر نہیں کرتے۔''

اب وہ بری طرح بھنا گئی تھی اس نے درشت لہجے میں جواب دیا۔ ''ایک تو تمہاری یہ عادت بہت خراب ہے۔ بات کو گھما پھرا کر کدھر سے کدھر لے جاتی ہو۔''

میں نے اس کی خفگی اور ناراضگی کا کوئی اثر نہیں لیا بلکہ اس بار میں نے بھی ذرا سخت لہجہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔ ''تم جانو اور تمہارا کام جانے مجھے بس اتنا بتاؤ کہ میں اس سارے معاملے میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔ میرے لائق جو بھی خدمت ہو مجھے بتاؤ۔ اگر میرے بس میں ہوا تو ضرور کروں گی۔''

میرے بدلتے موڈ کو دیکھ کر وہ بھی ذرا نرم پڑی اور نہایت لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میری اچھی دوست میری پیاری بہن ناراض ہوگئی ہو۔ پلیز تمہارے پاس ایک بہت ضروری کام سے آئی ہوں۔''

میں نے بھی اپنی خفگی برقرار رکھتے ہوئے قدرے تیز آواز میں کہا۔ ''جی فرمائیے۔ کیا خدمت کر سکتی ہوں میں آپ کی۔''

اس نے دبی دبی سی آواز میں ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے دراصل تمہارا عبایہ اور نقاب چاہیے تمہیں معلوم ہے نا میں تو چادر بھی استعمال نہیں کرتی۔ لیکن آج شوکت کے ساتھ گھومنے پھرنے کا پروگرام ہے۔ جانے انجانے میں کسی

کی نظر پڑ گئی تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔"

"اوہ۔ میرے لہجے میں گہرا طنز تھا، دریا بھی اتر رہی ہو اور چاہتی ہو کہ کپڑے بھی نہ بھیگیں۔ واہ حسنیٰ واہ' خوب منطق ہے۔ وہ جو تمہارا عاشق زار ہے وہ اگر تمہیں لے جا کر کہیں قتل کرتا ہے تو عدالت میں اپنی چیزوں کی وجہ سے میں بھی گھسیٹی جاؤں گی اور تم کیا سمجھ رہی ہو پھر احمر مجھے اپنے گھر میں گھسنے دیں گے۔ کبھی بھی نہیں۔ وہ بہت غیور اور غیرت دار انسان ہیں مجھ سے میرا بچہ چھین کر ہمیشہ کے لیے مجھے میکے بھیج دیا جائے گا اور میکے میں مجھے، نہ میری ماں برداشت کریں گی اور نہ بھائی۔ ہمارے یہاں یہ باتیں انتہائی معیوب سمجھی جاتی ہیں۔ اس لیے اس سارے معاملے سے مجھے تو تم دور ہی رکھو بلکہ امی اور بھائی کو تمہاری ان حرکات کا پتا چل گیا تو شاید میرا اور تمہارا ملنا جلنا اور دوستی ہمیشہ کے لیے ختم ہی سمجھو۔ میرا گھرانا کیا کوئی بھی شریف خاندان اپنی بہو بیٹی کے قریب تمہاری پرچھائیں بھی برداشت نہیں کرے گا۔ ایک غیر مرد سے تنہائی میں ملنے جا رہی ہو تو شرم و حیا پر تو پڑ گئی خاک اب رہ کیا گیا جسے عبائے اور نقاب سے ڈھانکا جا رہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں جاتے جاتے اپنے بیمار، مفلوج اور بوڑھے باپ اور دکھاری ماں کو زہر دیتی جاؤ۔ کیوں کہ تمہاری بے حیائی کا پردہ چاک ہونے پر بے عزتی کی موت سے تو یہ موت زیادہ بہتر رہے گی اور تم سے میری آخری گزارش ہے کہ اپنے دل سے میرا نام کھرچ کر پھینک دینا اور اپنے سیل فون سے میرا نمبر بھی ڈیلیٹ کر دینا۔ بڑی مہربانی ہوگی۔ اب تم میرے گھر سے دفع ہو جاؤ۔"

حسنیٰ کا چہرہ غصے اور احساسِ تذلیل سے سرخ ہو رہا تھا۔ محنت سے کیا ہوا میک اپ اعصابی کشیدگی سے بدنما اور بھدا لگ رہا تھا۔ اس کا غصہ اور اشتعال اپنے عروج پر تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں لیکن مسکارا اور آئی شیڈ کا خیال بھی دامن گیر تھا۔ اس لیے جلدی سے پرس میں سے ٹشو پیپر نکال کر ہولے ہولے نم آنکھوں کو صاف کیا اور تنتناتی ہوئی نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی میری آنکھیں بھی ساون بھادوں بن گئیں۔ آج برسوں کے یارانے اور خوب صورت تعلقات دونوں دم توڑ گئے تھے۔ ہماری دوستی کا یہ انجام ہوگا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میں اپنے خیالوں میں گم، دل برداشتہ وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے گئی تھیں۔ میرا بیٹا بھی گہری نیند سو رہا تھا۔ حارث بھائی بھی ابھی تک گھر نہیں لوٹے تھے۔ اس لیے کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ میرے اور حسنیٰ کے درمیان کس بات پر گرما گرمی اور بحث و مباحثہ ہوا ہے۔ امی کی علالت کی وجہ سے کھانا پکانے کی ذمہ داری میری تھی اس لیے دل نہ چاہتے ہوئے بھی بھاری بھاری قدموں سے چلتی ہوئی میں کچن میں جا کر مصروف ہو گئی۔ سب سے پہلے آٹا گوندھا اور اپنا سارا غصہ، جلال اور تنتناہٹ آٹے پر نکالی۔ اتنے زور زور سے مکی دی کہ آٹا تھوڑی ہی دیر میں نرم و ملائم ہو گیا۔ ہنڈیا کرنے کے لیے کھڑی ہوئی تو پھر اس بے وقوف کا خیال آ گیا اور بقول شاعران کے خیال آئے تو آتے چلے گئے۔ لاکھ اپنے دل کو سمجھانا چاہا اپنے آپ کو کام میں بہلانے کی کوشش کی لیکن پتا نہیں دل زور زور سے دھڑک کر کسی خطرے کی پیش گوئی کر رہا تھا۔ سانسیں بے ترتیب ہوئی جا رہی تھیں۔ موسم سرما کی آمد آمد تھی لیکن پیشانی اور ہتھیلیوں میں پسینے کی چپچپاہٹ کا احساس ہو رہا تھا۔ بمشکل کچن سے فارغ ہو کر امی کے کمرے کی راہ لی۔ انہیں بخار کی غفلت تھی وہ اسپتال سے واپس آ کر بے خبر سو رہی تھیں۔ میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا کچھ دیر موبائل پر احمر سے ادھر اُدھر کی باتیں کیں اور پھر موبائل آف کر دیا کیوں کہ صاحبزادے بیدار ہو گئے تھے۔ انہیں فیڈ کروایا اور اس سے اسی کی زبان میں غوں غاں کرتی رہی۔ اس کی معصوم شرارتوں سے دل بہلانے کی کوشش کرتی رہی لیکن لے دے کر خیال روحی کی طرف مڑ جاتی۔ جب دھڑکنیں بالکل ہی بے قابو ہو گئیں اور اس کی یادوں کا مدو جزر طوفان کی شکل اختیار کر گیا تو میں نے بے ساختہ اس کا نمبر ڈائل کرنے کی کوشش کی لیکن پھر معاً خیال آیا کہ ہمارے درمیان تو اب کچھ نہیں رہا۔ سارے رشتے ہی ختم ہو گئے۔ پھر بھلا میں اس کا نمبر کیوں ملا رہی ہوں۔ موبائل ایک طرف پٹخا اور ٹی وی لگا کر بیٹھ گئی لیکن سوچوں کے دھارے پھر اس بے وفا کی طرف مڑ گئے۔ بالآخر میں ہار گئی اپنے آپ سے محبت سے۔ ایک بار موبائل پھر میرے ہاتھ میں تھا اور میں اسے کال کر رہی تھی۔ میں ہار گئی تھی محبت جیت گئی تھی اور پھر حسنیٰ کی خوف زدہ اور گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

☆......☆

اس کے ساتھ ہوا کیا تھا یہ اس نے بعد میں بتایا تھا جسے الفاظ کا پیرہن دے رہی ہوں۔

شوکت نہایت نفیس اور بیش قیمت سوٹ میں اپنی نئی ماڈل کی مہنگی گاڑی سے ٹیک لگائے اس کی آمد کا منتظر تھا۔ حسنیٰ کو دیکھتے ہی اس نے ایک پُرتسکین سانس لی اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ شوکت کو دیکھتے ہی حسنیٰ کے موڈ میں بھی یکلخت تبدیلی رونما ہوئی۔ پیشانی پر پڑی شکنیں اور تیوریوں کا اب نام ونشان نہیں تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہونے والی تو تو میں میں حرف غلط کی طرح ذہن سے محو ہو چکی تھی۔ موڈ نہایت خوشگوار اور شگفتہ ہو گیا تھا۔ پرستائش اور پیار بھری نظروں سے اس نے شوکت کو دیکھا۔ نپے تلے قدموں سے چلتی ہوئی وہ شوکت کی گاڑی کے پاس آ کر رک گئی۔ شوکت نے جھک کر نہایت مہذب طریقے سے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور حسنیٰ کو بیٹھنے کی پیشکش کی۔ حسنیٰ احساسِ تفاخر کے ساتھ اکڑی ہوئی گردن سے شوکت کے برابر براجمان ہو گئی۔ گاڑی فوراً ہی کشادہ سڑک پر سبک روی سے چلنے لگی۔ حسنیٰ نہایت مسرور اور شاداں تھی اپنی چشم تصور سے وہ اپنا مستقبل دیکھ رہی تھی جہاں وہ تھی شوکت تھا اور آسائشوں اور عیش وعشرت کے سامان تھے۔ اپنے خیالوں سے وہ تب چونکی جب شوکت نے ایک مہنگے اور عالیشان ہوٹل کے سامنے گاڑی روکی۔ شوکت نے نہایت باوقار انداز سے اس کے پھول جیسے ہاتھ کو تھاما اور اپنی بانہوں کا سہارا دے کر اسے گاڑی سے اتارا۔ حسنیٰ کے اَن چھوئے اور کنوارے بدن میں بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ رگ و پے میں ایک ایسا ارتعاش برپا تھا کہ وہ بن پیے جھوم رہی تھی۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے لیکن پھر بھی شوکت کی معیت میں شانہ بشانہ چل رہی تھی۔ شوکت اس کے نازک وجود کو سنبھالے ہوٹل کی لابی میں داخل ہوا۔ یہاں ان کے لیے ایک ٹیبل بک تھی۔ دونوں نے انتہائی خواب ناک ماحول میں ڈنر کیا۔ دونوں کے درمیان خاموشی تھی لیکن آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ جانی انجانی کہانیاں سنا رہی تھیں۔ ڈنر کے بعد دونوں وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ اب چونکہ لانگ ڈرائیو بھی کر چکے تھے کھانا بھی کھا چکے تھے۔ اس لیے حسنیٰ نے استفسار کیا۔

''اب جناب کا کیا پروگرام ہے؟''

شوکت نے بہکی بہکی گستاخ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''یہاں سے کچھ فاصلے پر ہمارا تعمیری کام جاری ہے۔ مصروفیت کی وجہ سے کئی دن سے ادھر کا وزٹ نہیں کیا اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو کام پر ایک نظر ڈال لوں۔ حسنیٰ تو خود بھی چاہ رہی تھی کہ یہ مسافت یہ لمحات طویل سے طویل تر ہو جائیں۔ اس لیے اس نے فوراً ہامی بھر لی۔ شوکت نے فوراً گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ اب گاڑی تیز رفتاری سے رواں دواں تھی۔ حسنیٰ پھر خیالوں کی دنیا میں محوِ پرواز تھی۔ وہ سوچ رہی تھی شوکت کی سنگت میں گزاری ہوئی یہ گھڑیاں اتنی دلفریب اور دل آویز ہیں تو پھر آئندہ زندگی کتنی دلکش، خوب صورت اور حسین ہو گی۔ اچانک گاڑی ایک زیرِ تعمیر بلڈنگ کے سامنے رکی تو حسنیٰ کو ہوش آیا۔ اس نے چاروں طرف ایک طائرانہ نظر ڈالی تو خوف کی ایک خفیف سی لہر سارے جسم میں سرائیت کر گئی۔ علاقہ قریب قریب غیر آباد اور سنسان تھا۔ بلڈنگ کے قریب الیکٹرک پول سے عارضی طور پر بجلی لی گئی تھی۔ اس لیے روشنی ٹھیک ٹھاک تھی۔ اینٹوں اور ریت پتھر کے ڈھیر دور دور تک بکھرے ہوئے تھے اور نگرانی کے لیے کرسیوں پر دو چوکیدار بیٹھے ہوئے تھے۔ شوکت کی گاڑی دیکھتے ہی دونوں بھاگتے ہوئے آئے اور مؤدب کھڑے ہو گئے۔ شوکت نے ان کا حال احوال پوچھنے کے بعد ان سے چابی طلب کی اور چابی لے کر حسنیٰ کو اپنے عقب میں آنے کا اشارہ کیا۔ حسنیٰ سحرزدہ سی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ شوکت نے اپنا آفس دکھایا اور آفس سے متصل کمرا جو کہ سٹنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ وہاں حسنیٰ کے ساتھ داخل ہوا اور ایک نرم و گداز صوفے پر نیم دراز ہو کر ایک طویل انگڑائی لی اور حسنیٰ کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن حسنیٰ بجائے بیٹھنے کے کھڑکی کے پاس جا کر باہر کا نظارہ کرنے لگی۔ حد نظر تک ہو کا عالم تھا۔ وہ متوحش نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔ دونوں چوکیداروں کے بھی یہاں سے ہیولے ہی نظر آ رہے تھے۔ ماحول پر عجیب سی ویرانی اور پُراسراریت چھائی ہوئی تھی۔ شوکت سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتے ہوئے حسنیٰ کو بغور دیکھے جا رہا تھا۔ معاً وہ اٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا اس کے عقب میں آن کھڑا ہوا۔ حسنیٰ کو جیسے ہی آہٹ محسوس ہوئی وہ فوراً پلٹی اور ہڑبڑا کر بولی۔ ''آپ وزٹ کر چکے ہوں تو واپس چلتے ہیں۔''

شوکت نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اتنی جلدی، یہاں آ کر تو میں کچھ دیر آرام کرتا ہوں۔ شہر کے شور و غل اور ہنگامہ آرائیوں سے دور یہ پُرسکون علاقہ مجھے بے حد پسند ہے۔ آؤ تمہیں اپنا ریسٹ روم دکھاتا ہوں۔ سٹنگ روم سے ملحقہ کمرے کا دروازہ جب شوکت نے کھولا تو حسنیٰ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کمرا ڈیل ڈیکوریٹیڈ اور قیمتی

سازوسامان سے آراستہ تھا۔ جدید طرز کا بیڈ، سائیڈ میں ڈیک، مخملی صوفے، اور قیمتی فانوس لائٹ۔ نہایت سحر انگیز ماحول تھا جو کہ دعوتِ عیش دے رہا تھا۔ حسنیٰ آنکھیں پھاڑے کمرے کو دیکھے جا رہی تھی۔ شوکت نے ایک جھٹکے کے ساتھ اس کے لچکیلے بدن کو اپنی طرف گھسیٹا اور دروازے کو زور سے بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ حسنیٰ وحشی ہرنی کی طرح اچھلی اور لرزتی کپکپاتی سہمی سہمی سی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بری طرح خائف تھی۔ اس کی حالتِ زار پر شوکت نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔ ”تم تو خوف زدہ ہو گئی ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھیں۔ چلو تمہاری دل بستگی اور ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے کچھ سنتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ڈیک کا بٹن آن کر دیا۔ ہوا کے دوش پر خوب صورت گیت کا ارتعاش تھرتھرانے لگا۔

یہ پربتوں کے دائرے یہ شام کا دھواں
ایسے میں کیوں نہ چھیڑ دیں دلوں کی داستاں
یہ روپ رنگ یہ پھبن چمکتے چاند سا بدن
برا نہ مانو تم اگر تو چوم لوں کرن کرن
کہ آج حوصلوں میں ہیں بلا کی گرمیاں
یہ پربتوں کے دائرے یہ شام کا دھواں

جیسے ہی نغمہ فضا میں بکھرا اور گیت کے بول سماعت سے ٹکرائے۔ پل ہی پل میں حسنیٰ کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا کہ شوکت اسے یہاں کیوں لے کر آیا ہے۔ خواب گاہ کی مدہوش کن فضا میں شوکت دل میں خواہشوں اور شوق کا طوفان لیے آہستہ آہستہ حسنیٰ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ حسنیٰ کے قدموں میں جنبش ہوئی اور وہ پیچھے سرکتی سمٹتی کمرے میں لگے قیمتی طلسمی پردے میں چھپنے لگی۔ اس وقت حسنیٰ سہمی ہوئی فاختہ تھی تو شوکت ایک ماہر شکاری جو تاک کر نشانہ لگانا جانتا تھا۔ حسنیٰ بے بس اور التجا آمیز نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ مدد کی طالب تھی لیکن یہاں اگر شوکت اس کا گلا بھی گھونٹ دیتا تو کسی کو پتا بھی نہیں چلتا۔ اس کے اور شوکت کے درمیان چند قدموں کا فاصلہ رہ گیا تھا کہ اچانک اس کا موبائل چیخ اٹھا۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں ”ہیلو“ کہا اور پھر دوسری جانب سے آنے والی آواز سن کر کہا۔

”تم.....تم.....کہاں ہو.....اچھا مجھے پتا بتاؤ۔ گھبرانا بالکل نہیں.....میں شوکت کو لے کر آ رہی ہوں.....تم اطمینان رکھو۔ آج میں انصر کو چھوڑوں گی نہیں۔ بس یہ سمجھ لو آج وہ میرے ہی ہاتھوں مارا جائے گا۔ بس ہم دونوں نکل رہے

جنبہ

عمان کے سربرآوردہ قبائل میں سے ایک قبیلہ۔ ایک زمانے میں اس قبیلے کو عمان کے بدوی قبائل میں سب سے زیادہ فوقیت اور قوت حاصل تھی۔ موجودہ دور میں بھی اس قبیلے کی تعداد اتنی ضرور ہے کہ صحرا میں ان کا درجہ امرائے دروع اور آل وہیبہ سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ اس قبیلے کے بڑے بڑے حصے ہیں جو یہ ہیں۔ مجاعلہ، فوارس، آل ذُبیان اور آل ابو غالب۔ ان میں مجاعلہ کو دوسرے تمام گروہوں پر برتری حاصل ہے۔ جنبہ ایک وسیع و عریض علاقے پر قابض ہیں۔ یہ عام طور پر دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک مشرقی اور دوسرا مغربی۔ مشرق میں یہ لوگ خلیج عمان میں صور کے مقام پر ساحلوں کے ساتھ ساتھ بستے چلے گئے ہیں۔ یہاں بوعلی ان کے شریک ہیں۔ ساحل بحیرہ عرب کی چھوٹی بندرگاہوں میں جازر کی حد تک کی آبادی بحری امور سے خاص دل چسپی رکھتی ہے۔ یہاں کے بعض باشندوں نے تاجروں کی حیثیت سے دوسرے ممالک میں بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اس گروہ کے خانہ بدوش اونٹوں اور بکریوں کے بڑے بڑے گلوں کے مالک ہیں۔ سردیوں میں یہ لوگ ساحلوں پر ڈیرے ڈالتے ہیں اور گرمیوں میں اندرونِ ملک منتقل ہو جاتے ہیں۔ ماہی گیری بھی بہت سے افراد کا پیشہ ہے جو شارک پکڑنے میں بڑے ماہر ہیں۔ جنبہ کا دوسرا گروہ جو مغربی گروہ کہلاتا ہے ان میں سے بعض لوگوں کی کچھ نہ کچھ املاک بھی ہیں۔ قبیلے کا سردار جاسر محمود عز میں جو قبیلے کا دارالحکومت سمجھا جاتا ہے کچھ اراضی کا مالک ہے۔ اس گروہ کی دل پسند جائے سکونت سلسلہ کوہ اور شہرادم کی نواحی وادیاں کوہستان وردوع کے مشرق میں واقع ہیں۔ جنبہ کا تعلق غافری فریق سے ہے۔ یہ لوگ وہیبہ کے خلاف ہیں۔ دروع کے حلیف ہیں۔ اگرچہ اب ان قبائل کی باہمی عداوت پہلے جیسی شدید نہیں رہی۔

مرسلہ: عرفان ارشد۔ جہلم

ہیں۔"

حسنیٰ کی طرف بڑھتے ہوئے شوکت کے قدم فوراً رک گئے۔ وہ حیرت اور تعجب سے حسنیٰ کو دیکھنے لگا۔ دورانِ گفتگو جب حسنیٰ نے اس کا نام لیا تو بری طرح چونکا۔ بڑھ کر پہلے ڈیک آف کیا اور پھر حسنیٰ کی طرف استفسارانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ حسنیٰ نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور تھوک نگلتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "کوکب کا فون تھا۔"

شوکت کو زبردست شاک لگا۔ اس نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ "کون کوکب؟"

حسنیٰ نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔ "جی آپ کی بہن کوکب۔"

شوکت اچھل پڑا۔ حیران کن لہجے میں دوسرا سوال داغ دیا۔ "میری بہن...... میری بہن کوکب کا کیا تذکرہ ہے۔"

حسنیٰ نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔ "شوکت صاحب جس طرح آپ اور میں ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح میرا بھائی انصر اور آپ کی بہن کوکب بھی دیوانگی کی حد تک ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں۔ ان دونوں کی پیار کہانی بھی ہماری طرح ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پہلی ہی نظر میں دل دے بیٹھے اور آج وہ بھی انصر کے ساتھ ڈیٹ پر ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو۔" شوکت دہاڑا۔ اس کی آنکھوں میں خون کی چادر تنی ہوئی تھی۔ آتش فشاں پھٹ کر شعلہ بن چکا تھا۔ حسنیٰ بھیگی بلی بنی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں زمین پر مرکوز تھیں۔ اس نے لرزیدہ لہجے میں استدعا کی۔ "تاخیر نہ کیجیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا بھائی کوکب کی عصمت پامال کر ڈالے۔ خدارا جلدی کیجیے۔"

"ناممکن...... ناممکن......" شوکت اتنی زور سے چیخا کہ گلے میں پھندا سا لگ گیا۔ حسنیٰ نے فوراً جگ میں سے پانی انڈیل کر گلاس اس کے سامنے پیش کر دیا۔ شوکت نے گلاس چھین کر پوری قوت سے دیوار پر دے مارا۔ زوردار چھناکے کی آواز ہوئی اور شیشے کی کرچیاں قالین پر بکھر گئیں۔ وہ آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ لہجے کی ملائمت اور شائستگی رخصت ہو چکی تھی۔ موقع اور وقت اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ وہ تو حسنیٰ کو اپنی بانہوں میں بھر کر اپنی ہوس کو تسکین دینا چاہتا تھا لیکن پل ہی پل میں صورتِ حال بدل چکی تھی۔ وہ ہذیانی انداز میں غرّایا۔ "جلدی چلو، کہاں ہیں دونوں۔ آج میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" لہجہ ایسا خونخوار اور خوف ناک تھا کہ حسنیٰ کا انگ انگ تھرا اٹھا۔ وہ نہ صرف حسنیٰ اور انصر کو گالیوں سے نواز رہا تھا بلکہ اپنی چہیتی بہن کے لیے بھی ایسے گستاخانہ کلمات زبان سے نکال رہا تھا کہ حسنیٰ نے اپنے ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لیے۔

دروازہ کھول کر اس نے پوری قوت سے حسنیٰ کو باہر کی جانب دھکیلا۔ حسنیٰ منہ کے بل گرتے گرتے بچی۔ بڑی مشکل سے اس نے سنبھالا اور باہر کی طرف دوڑی اور کار کے قریب جا کر اپنی سانسیں درست کرنے لگی۔ دونوں چوکیدار حیرت زدہ سے اسے دیکھ رہے تھے۔ شوکت بھی اس کے پیچھے لپکا۔ دونوں وہاں سے کچھ ایسی عجلت سے نکلے کہ شوکت نے اپنے دونوں ملازمین کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ وہ دونوں تحیر آمیز نگاہوں سے جاتی ہوئی کار کو دیکھتے رہے۔ ایک چوکیدار نے ٹھنڈی گہری سانس لی اور کہا۔ "اس قسائی کی چھری سے یہ بکری کیسے بچ گئی۔"

دوسرے نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔ "ایسا لگتا ہے آج شکاری خود ہی شکار ہو گیا۔ لڑکی ہوشیار لگتی ہے۔"

☆......☆

شوکت جنونی انداز میں کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ حسنیٰ خوفزدہ سی بیٹھی تھی۔ اس وقت شوکت کی ڈرائیونگ دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی بڑا ایکسیڈنٹ ہونے والا ہے اور اس کا اور شوکت کا وقت پورا ہو چکا ہے۔

باہر ہوا کے جھونکے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ موسم سرد ہو چکا تھا لیکن شوکت کا مزاج اور گاڑی کی رفتار دونوں گرم اور تیز تھے۔ اس نے ہونٹ چباتے ہوئے کرخت اور تیز لہجے میں کہا۔ "تم دو ٹکے کے لوگوں کو منہ لگانا ہی غضب ہو جاتا ہے۔ اپنی اوقات بھول کر اونچے اونچے خواب دیکھنے لگتے ہو۔ انسان کی سوچ اس کی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔"

حسنیٰ نے خشمگیں اور خون آلود نگاہوں سے اسے گھورا اور ایک گہری سانس خارج کی۔ اس وقت وہ شوکت کے ہر کڑوے بول کو شربت سمجھ کر پی رہی تھی۔ گاڑی اب ایسے علاقے سے گزر رہی تھی جہاں رات میں بھی دن کا سماں ہوتا ہے۔ روشنی و نور کا سمندر تھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے لیکن لوگوں کی سیر گشتی اپنے عروج پر تھی۔ پیٹرول پولیس پر

نظر پڑتے ہی اس نے شوکت کو ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور دروازہ کھول کر کار سے چھلانگ لگائی۔ اس کے چہرے پر چھائی بے بسی مسکینی اور عاجزی یکسر غائب ہو چکی تھی۔ آنکھیں شیرنی کی طرح بے خوف چمک رہی تھیں۔ ساری سراسیمگی دور ہو چکی تھی۔ تحفظ کا احساس ہوتے ہی اس نے کینچلی بدلی اور دبنگ آواز میں کہا۔ ''مسٹر شوکت! آج جو کچھ بھی ہوا اس سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اگر میرے ہمدرد میرے چاہنے والے مجھے زندگی بھر بھی سمجھاتے تو میں انہیں غلط سمجھتی اور آپ کی ہم قدم بن کر اس سنہری دھوپ میں چلتی رہتی جو مجھے تاریک اور اندھیری کھائیوں کی جانب لے جا کر میرے تقدس اور عصمت کی دھجیاں اڑا دیتی۔ آج اگر عین وقت پر میری دوست کا فون نہ آیا ہوتا تو اس وقت میں کسی ریلوے ٹریک پر لیٹی اپنی موت کا انتظار کر رہی ہوتی۔''

شوکت نے غور سے حسنیٰ کو دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ اس نے جو شاطرانہ چال چلی تھی اب بہ خوبی اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس کا چہرہ متغیر اور غضب ناک ہو گیا لیکن قہر درویش بر جان درویش سارا غصہ اپنے آپ پر اتارتے ہوئے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ''مکار ہو لومڑی کی طرح۔''

حسنیٰ نے اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹتے ہوئے ہیئر پن لگایا اور کہا۔ ''اگر اپنی حفاظت کے لیے لومڑی نہ بنتی تو آج تم جیسے درندے کی بربریت کا شکار ہو چکی ہوتی۔ تمہاری بہن پر جو الزام تراشی کی تھی اس میں ذرا برابر صداقت نہیں ہے۔ میرے بھائی نے آج تک آپ کی بہن کو دیکھا بھی نہیں ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی ہیں۔''

شوکت کی شعلہ بار نگاہیں حسنیٰ پر ٹھہری ہوئی تھیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسے اٹھا کر کچا کھا جائے۔ اس کی نظر میں حسنیٰ نچلے اور پسماندہ طبقے کی ایک معمولی سی لڑکی تھی اور بہت آسانی سے اس کے دام میں آ چکی تھی لیکن اس معمولی اور کمتر لڑکی نے اسے جو ڈاج دیا تھا اور اس کے اندر کے ہوس ناک مرد کو جو شکست دی تھی اس پر وہ انگارے چبا رہا تھا۔ طیش میں آ کر وہ پلٹا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور ایک جھٹکے سے گاڑی اسٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا۔ حسنیٰ اس کی جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھتی رہی۔ اس کے لبوں پر ایک زخمی مسکراہٹ تھی لیکن آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور سے بات کرنے کے بعد وہ ٹیکسی میں بیٹھی اور ایک لمبی گہری آسودہ سانس لی۔ دل مطمئن اور خوش تھا کہ بھٹکتے قدم اور بھٹکتے جذبات جلد ہوش میں آ گئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو...... آگے کا سوچ کر ہی وہ کانپ گئی۔ پھر سیدھا میرے گھر کے دروازے پر آ رکی۔

☆......☆

اچانک کسی نے زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا اور میرا دل بھی یکبارگی زور سے دھڑکا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ انصر اور اس کی والدہ میرے دروازے پر آ گئے ہیں اور اب مجھ سے پوچھ گچھ شروع ہو جائے گی اور پھر...... امی اور حارث بھائی بھی نیند سے بیدار ہو جائیں گے اور مجھے سب کچھ بتانا پڑے گا۔ اف میرے اللہ۔ تو نے مجھے کس امتحان میں ڈال دیا ہے۔ اس بے وقوف کی وجہ سے سب کس قدر پریشان ہوں گے۔ ڈرتے ڈرتے کپکپاتے ہاتھوں سے میں نے دروازہ کھولا تو وہاں انصر کی بجائے حسنیٰ کھڑی تھی۔ میں پتھر کی مورت بنی اسے حیران پریشان نظروں سے تکے جا رہی تھی اور وہ شرمسار بدحواس سی خجالت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان اعصاب شکن خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ طرح طرح کے اندیشے زہریلے سانپوں کی طرح دماغ میں پھنکار رہے تھے۔ بدقت تمام میں نے تھرتھراتے لبوں سے پکارا۔ ''حسنیٰ تم۔'' میری زبان سے اپنا نام سنتے ہی وہ میرے کندھے پر سر رکھ کر بلک بلک کر رو پڑی اور گلوگیر آواز میں کہا۔

''تمہاری قدر و قیمت کا احساس آج مجھے ہوا ہے۔ تمہاری ہر بات سچ اور صحیح ثابت ہوئی۔ میرے پاس واقعی عقل نام کی چیز نہیں۔ اگر آج میں تم سے ملے بغیر چلی جاتی تو شاید کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔ یا تو خودکشی کر لیتی یا وہ خبیث انسان ہی مجھے قتل کر کے کہیں دفن کر چکا ہوتا۔''

میں نے اپنی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کانپتی آواز میں استفسار کیا۔ ''حسنیٰ تم ٹھیک تو ہو نا، میرا مطلب...... آئی مین...... اس نے کوئی دست درازی تو نہیں کی۔''

اس نے دوپٹے سے اپنی نم آنکھوں کو پونچھتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔ ''نہیں میری بہن میں بالکل ویسی ہی پاک و صاف ہوں جیسے پہلے تھی۔ اس نے تو برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔''

اس کا تقدس اور پاکیزگی محفوظ ہے۔ یہ سن کر نہ صرف مجھے خوشی ہوئی بلکہ سارا ذہنی انتشار کافور ہو گیا۔ سارے

شیطانی وسوسے اور خدشات ایک سیکنڈ میں ختم ہو گئے۔

وہ سہمی ہوئی اور حواس باختہ سی ابھی تک دروازے میں ہی لٹک رہی تھی۔ اسے کھینچتے ہوئے میں اپنے کمرے میں لے کر آئی اور اپنے نرم گرم بیڈ پر تکیے کے سہارے اسے بٹھایا تو مجھے احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ پیر بالکل ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اس سرد موسم میں بھی اس کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔ میں سردیوں میں ہمیشہ کافی سے بھرا تھرماس اپنے کمرے میں رکھتی تھی۔ کیوں کہ مجھے مطالعے کا شوق جنون کی حد تک تھا اور دورانِ مطالعہ کافی پینے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ میں نے جلدی سے اسے کافی کا ایک مگ تھما دیا جسے پی کر اس کی جان میں جان آئی۔ گھبراہٹ کم ہوئی تو ہوش ٹھکانے آئے۔ کافی نے آبِ حیات کا کام کیا۔ اس کے بدن میں زندگی کی رو دوڑ گئی۔ میرے اصرار اور استفسار پر اس نے بلا کم و کاست ہر وہ بات دہرا دی جو پچھلے چند گھنٹوں میں اس پر گزری تھی۔ میں نے سب کچھ سننے کے بعد اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے اسے حوصلہ دیا اور کہا۔ ”حسنیٰ بزرگوں سے سنتے آئے ہیں جہاں ایک مرد اور عورت ہوتے ہیں، تنہائی اور سناٹا ہوتا ہے تو مرد و عورت کے ساتھ تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ تم آج اس شیطان کو شکست دے کر آئی ہو۔ حسنیٰ نے ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور زار و قطار روتے ہوئے نیم مردہ آواز میں کہا۔ ”میں اپنے سابقہ رویے کی وجہ سے تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ خدارا مجھے معاف کر دینا۔ پتا نہیں اس نے کیا جادو کر دیا تھا کہ میں نے آگے پیچھے کچھ نہ سوچا۔ خاندان اور ماں باپ کی عزت و ناموس کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ اگر بروقت تمہاری کال اور صحیح سوچ اور عقل نہ آتی تو اس کے آگے بولنے کے لیے شاید اس کے پاس الفاظ ہی ختم ہو گئے تھے۔ آنسوؤں سے سارا چہرہ تر ہو رہا تھا۔ بدقت تمام میں نے اسے خاموش کروایا اور اس کی توجہ وال کلاک کی جانب مبذول کروائی رات کا تقریباً ڈیڑھ بج چکا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ معاً کسی نے دروازے پر زوردار دستک دی۔ ہم دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا خوف کے مارے حسنیٰ کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ اس نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ ”یقیناً انصر ہوگا۔“

میں نے محبت اور گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبایا اور آہستہ سے کہا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نمٹ لوں گی۔ آؤ میرے ساتھ۔“ دروازے پر حسنیٰ کی والدہ اور انصر تھے۔ دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ مجھ پر اور حسنیٰ پر نظر پڑتے ہی دونوں ایک ساتھ برس پڑے۔ شور و غل کی آواز پر امی اور حارث بھائی بھی جاگ گئے تھے۔ اب ان کی صلواتیں بھی مجھ پر پڑ رہی تھیں۔ میں نے بمشکل صورتِ حال کو قابو میں کیا اور سب سے یہ کہہ کر معافی مانگی کہ کافی عرصے سے حسنیٰ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اس لیے آج رات اپنے پاس روک لیا تھا۔ بس غلطی یہ تھی کہ چونکہ موبائل میں بیلنس نہیں تھا اس لیے اطلاع نہیں دے سکی۔ انصر نے فوراً شکایت کی۔ میں تو آپ کے موبائل پر کافی دیر سے کال کر رہا ہوں۔ آپ اٹھا ہی نہیں رہی تھیں۔ میں نے فوراً اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ”بس بھئی ہو گئی غلطی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔“ پھر میں نے حسنیٰ کی والدہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”خالہ میں اور امی عنقریب آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آنے والے ہیں۔“

حسنیٰ کو دیکھنے کے بعد ان کی فکر و پریشانی دور ہو چکی تھی۔ چہرے سے اطمینان اور خوشی عیاں تھی۔ انہوں نے نہایت خوش دلی سے جواب دیا۔ ”ضرور آؤ تمہارا اپنا گھر ہے۔ شادی کے بعد تو تم نے آنا ہی بند کر دیا۔“ میں نے حارث بھائی کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ ”اس بار تو آپ سے ایک قیمتی چیز مانگنی ہے سوالی بن کر آ رہے ہیں۔“

حسنیٰ نے میری ڈھکی چھپی باتوں کو فوراً تاڑ لیا۔ اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا۔

☆......☆

آج حسنیٰ میری بھابی ہے۔ یہ راز ہم دونوں کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم کہ اس رات حسنیٰ کہاں گئی تھی، کس کے ساتھ گئی تھی اور کس طرح وہاں سے نکلی۔ آپ لوگوں کے ساتھ اس لیے شیئر کر رہی ہوں کہ اس دنیا میں قدم قدم پر شوکت جیسے بھیڑیے ہیں۔ ہمیں آنکھیں کھلی رکھ کر ایسے درندوں سے ان معصوم کلیوں کو بچانا ہے۔ انہیں تحفظ دینا ہے۔ انہیں عقل و شعور اور آگاہی دے کر یہ سمجھانا ہے کہ چوکنا رہ کر اپنے گرد و پیش ہونے والی آہٹوں کو پہچانیں۔ نیک و بد اور اچھے برے میں تمیز کریں۔ کاش میری یہ خواہشات اور دعائیں بارگاہِ الٰہی میں شرفِ قبولیت پا جائیں۔

خانہ بدوش

جناب ایڈیٹر صاحب
السلام علیکم
ایک عجیب و غریب واقعہ نظر نواز ہوا اور میں نے اسے حرف بہ حرف لکھ لیا۔ آپ خود اندازہ کریں کہ اس لڑکی کی زندگی کس دوراہے پر آکھڑی ہوئی ہے۔

انور زکی
(کراچی)

وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔

لڑکیاں تو عام طور پر خوب صورت ہی ہوتی ہیں۔ خاص طور پر وہ جو حاصل نہ ہوسکیں اور جو حاصل ہو جاتی ہیں کچھ دنوں کے بعد ان کی خوب صورتی ختم ہو جاتی ہے پھر وہ صرف بیویاں رہ جاتی ہیں۔ بہر حال میں نے اسے اس وقت دیکھا جب بس شیونگ کریم لینے ایک بڑے اسٹور میں داخل ہوا۔ اس قسم کی چیزیں میں عام طور پر محلے کی دکانوں سے ہی لے لیا کرتا ہوں لیکن اس دن نہ جانے کون سی ترنگ آئی کہ میں ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں داخل ہو گیا۔ میں اس قسم کے اسٹورز میں کبھی نہیں جاتا۔ کیوں کہ میری جیب ہی اجازت نہیں دیتی۔

بہر حال میں نے اس لڑکی کو پرفیومز والے حصے میں سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ اس کے پاس ایک ٹرالی تھی جس میں دنیا بھر کے سامان رکھے ہوئے تھے۔

ہائے! یہ پیسا بھی کیا چیز ہے جو ہر قسم کی خریداری کا شوق ولا دیتا ہے۔ اس لڑکی نے ذرا سی دیر میں ہزاروں کا سامان خرید لیا ہوگا اور ایک میں تھا جو صرف شیونگ کریم لینے آیا ہوا تھا۔

میرے قریب سے گزرتے ہوئے اس لڑکی نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر ٹرالی دھکیلتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ ظاہر ہے میرا اس سے تعلق ہی کیا تھا۔

میں نے اپنی پسند کی شیونگ کریم اٹھائی اور کاؤنٹر پر آ گیا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے شخص نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے میرے حال پر ترس کھا رہا ہو کہ بے چارہ صرف شیونگ کریم کے لیے آیا تھا۔ میں نے قیمت ادا کی اور باہر آ گیا۔ وہ لڑکی اپنی ٹرالی کے ساتھ باہر کھڑی تھی اور کچھ مضطرب ہو کر ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ میں اس سے کچھ فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس لڑکی کی جھنجلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے مجھے دیکھا اور زیرِ لب کچھ بول کر رہ گئی۔

مجھے نہ جانے کیا سوجھی کہ میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے شاید پہلی بار ایسی ہمت کی ہو گی۔ ''معاف کیجیے گا آپ کچھ پریشان سی معلوم ہو رہی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اوہ...... وہ میرا ڈرائیور نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں فون بھی کر رہی ہوں لیکن فون ریسیو نہیں کر رہا۔''

''اوہ...... ہو سکتا ہے کسی پرابلم میں ہو۔''

''پتا نہیں۔'' اس نے اپنے شانے اچکائے۔ پھر اچانک ہی مجھ سے پوچھ بیٹھی، ''ایکسکیوزمی! آپ کے پاس تو گاڑی ہو گی۔''

''میرے پاس...... ! جی...... جی ہاں، گاڑی ہے میرے پاس۔ لیکن آج میں نہیں لا سکا ہوں۔ آج ٹیکسی پر جاؤں گا۔''

''آپ رہتے کہاں ہو۔''

''ڈیفنس۔'' میں نے بتایا۔ ''اور آپ؟''

''میں بھی ڈیفنس میں رہتی ہوں۔'' اس نے خوش ہو کر بتایا۔ ''خیابان شہباز۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو مجھے ڈراپ کر دیجیے گا۔''

میری تو جان ہی نکل گئی۔ کیوں کہ میں بالکل ہی مخالف سمت یعنی ناظم آباد کی طرف رہتا تھا۔ لیکن اس لڑکی سے جھوٹ بول چکا تھا۔ اس لیے ایک ٹیکسی کرنی پڑی۔

میرا خیال تھا کہ کم از کم اتنا تو ہو گا کہ ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ جائیں گے۔ لیکن اس نے بڑی پھرتی اور ہوشیاری کے ساتھ اپنا سارا سامان سیٹ پر ایک طرف رکھ دیا اور خود برابر میں بیٹھ گئی اب پچھلی طرف بیٹھنے کی جگہ ہی نہیں تھی۔ اس لیے مجبوراً مجھے آگے بیٹھنا پڑ گیا۔

اب کیا اس سے خاک گفتگو ہوتی۔ بہرحال اس نے اتنا ضرور بتایا کہ اس کا نام سارا تھا اور وہ ڈیفنس کالج میں پڑھتی تھی۔ اس کے پاپا کوئی بزنس مین تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ جب کہ میں نے بھی اپنے بارے میں یہ بتایا کہ میرا نام انور ہے اور میرا اپنا بزنس ہے۔ (حالانکہ میں ایک فرم میں ملازمت کر رہا تھا)۔

میرا خیال تھا کہ وہ کم بخت ڈیفنس کے شروع میں ہی رہتی ہو گی لیکن اس کا مکان خدا کی پناہ۔ بالکل ساحل کے پاس تھا۔ بہرحال ٹیکسی ایک شاندار سے مکان کے پاس آ کر رک گئی۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ اپنا سامان سمیٹا اور اندر چلی گئی۔

''صاحب اب کدھر جانا ہے؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

''اس علاقے کی جو مارکیٹ ہے نا وہاں اتار دو۔'' میں نے کہا۔

''صاحب آپ تو بولا تھا کہ ڈیفنس فیز ٹو جانا ہے؟''

''نہیں جانا ہے فیز ٹو مارکیٹ میں ایک کام ہے۔''

مارکیٹ پہنچ کر میں نے جب کرایا پوچھا تو اس نے سات سو بتایا۔

''سات سو...... !'' میری تو جان ہی نکل گئی۔ ''سات سو تو بہت ہیں۔''

آپ یہ تو دیکھو صاحب کہ میڈم کیسے کیسے راستے سے لائی تھی۔ اگر ہم کو بولا ہوتا تو میں شارٹ کٹ لے آتا۔

''چلو تم چھ سو دے دو۔''

اپنے آپ کو دل ہی دل میں برا بھلا کہتے ہوئے میں نے چھ سو نکال کر اس کے حوالے کیے اور وہاں سے کوچ پکڑ کر صدر آ گیا اور وہاں سے دوسری بس پکڑ کر ناظم آباد اور وہاں سے اپنے فلیٹ۔

میں گیا تھا ساٹھ روپے کی شیونگ کریم لینے اور ایک ہزار خرچ کر کے ٹھنڈے ٹھنڈے واپس آ گیا تھا۔ پتا نہیں کس قسم کی بدبختی میرے سر پر سوار ہو گئی تھی۔

اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کا نام سارا ہے۔ وہ ایک بڑے مکان میں رہتی ہے۔ اس کا باپ ایک پیسے والا آدمی ہے جب کہ میں ایک ممکھو انسان تھا۔ پھر میں اس سے دوبارہ کیسے مل سکتا تھا۔

اس کے شاندار مکان میں جانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہاں جاتا تو کیا بہانہ لے کر جاتا۔ میرا اس سے واسطہ ہی کیا

تھا لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں اسے بھلا نہیں سکا تھا۔
کئی دن گزر گئے۔ ایک دن میں اپنے دوست سے ملنے ناظم آباد بڑے میدان کی طرف گیا (کراچی کے رہنے والے اس لوکیشن سے اچھی طرح واقف ہیں)۔ یہ اوسط درجے کی اچھی خاصی آبادی ہے۔ کسی زمانے میں کراچی میں سرکلر ٹرین چلا کرتی تھی۔ وہ ٹرین میریا لانڈھی سے چل کر مختلف اسٹیشنوں سے ہوتی ہوئی لیاقت آباد اور ناظم آباد کے درمیان سے گزرا کرتی۔ وہ سروس عرصے ہوا ختم ہو چکی ہے لیکن ریل کی پٹڑیاں ابھی تک باقی ہیں جن کے دونوں جانب کچروں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں اور خانہ بدوش مختلف شہروں سے آکر وہاں ڈیرہ ڈالا کرتے ہیں۔ میرے دوست کا مکان ریلوے پٹڑیوں کی دوسری طرف ناظم آباد کے علاقے میں تھا۔ جب کہ ایک طرف پاپوش نگر کا علاقہ ہے۔
میں پٹڑیوں کو عبور کرتا ہوا دوسری طرف جا رہا تھا کہ میں نے خانہ بدوشوں کی ایک بستی دیکھی۔ یہ بستی خالی میدان میں بسائی گئی تھی۔ ان کی بستیوں کو دیکھنا بھی ایک دل چسپ عمل ہوتا ہے۔ رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس عورتیں، مختلف کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں کوئی رنگین پنکھے بنا رہی ہے، کوئی بانسوں کی ڈگڈگی بنا رہی ہے۔ یہ شاید ان کا صدیوں پرانا مشغلہ اور کاروبار ہے۔ ایک طرف بچے میلے کچیلے لباسوں میں کھیل رہے ہیں۔ ایک طرف ان کے مرد بیٹھے حقے پی رہے ہیں۔ غرض یہ کہ بہت عجیب زندگی ہوتی ہے ان کی اور ان ہی کے درمیان مجھے وہ لڑکی دکھائی دے گئی۔
جی ہاں وہی لڑکی جو مجھے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں ملی تھی۔ جس نے بہت سا سامان خریدا تھا۔ جس نے مجھ سے لفٹ مانگی تھی۔ جس نے اپنا نام سارا بتایا تھا۔ جو ڈیفنس کالج میں پڑھتی تھی۔ جس کا گھر بہت شاندار تھا۔ وہی لڑکی ان خانہ بدوشوں کے درمیان تھی۔
لیکن یہ تو ہو نہیں سکتا تھا۔ دونوں کی صورتیں ایک جیسی تھیں اور یہ حیرت انگیز مماثلت تھی۔ ایسے کم ہی دیکھے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ خانہ بدوش لڑکی وہ تو نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر بھی وہ اس جیسی تھی۔
میں اس کی طرف دیکھتا ہی رہا۔ اس نے بھی میری دل چسپی محسوس کر لی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا لگا جیسے وہ بھی مجھے پہچان رہی ہو۔ میں نے اس کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک دیکھی تھی۔
پھر کیا ہوا۔ وہ لڑکی بہت تیزی سے میرے پاس آگئی۔ ”کیا بات ہے رے۔“ اس نے غصے سے پوچھا۔ اس کا لہجہ ہی خانہ بدوشوں جیسا تھا۔ اکڑا اکڑا سا۔ ”یہ تو اتنی دیر سے مجھے کا دیکھے جا رہا ہے؟“
”معاف کرنا۔“ میں جلدی سے گڑبڑا کر بولا۔ ”میں نے اس شہر میں تم جیسی ایک لڑکی دیکھی تھی۔ اس لیے حیران ہو کر تمہیں دیکھ رہا تھا۔ تم دونوں بالکل ایک جیسی ہو۔“
”ارے جاتا ہے یا بلاؤں بابا کو۔“ اس نے کہا۔ ”اچھا بہانہ لے کر آیا ہے۔ ہجاروں ایک جیسی صورت کے ہووے ہیں تو پھر۔ اس کا کیا مطلب؟“
ظاہر ہے کہ یہ وہ لڑکی نہیں تھی۔ اس کا لہجہ یہ بتا رہا تھا۔ صرف اتنا تھا کہ یہ اس کی ہم شکل تھی لیکن ایسی زبردست مماثلت کہ اگر یہ اپنی زبان نہیں کھولتی تو میں اس کو وہی لڑکی سمجھتا رہتا۔
میں نے جلدی جلدی اس سے معذرت کی اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر اس نے اپنے باپ کو آواز دے کر بلا لیا تو پورا خانہ بدوش قبیلہ مجھ پر ٹوٹ پڑے گا۔
میں نے بہت آگے جا کر مڑ کر دیکھا تو وہ لڑکی اسی جگہ کھڑی ہوئی میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہا کہ میں اس کے پاس واپس جاؤں۔ اس سے کہوں اے لڑکی جھوٹ مت بول تو وہی ہے۔ میری آنکھوں کو اتنا بھی دھوکا نہیں ہو سکتا۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ تو وہی ہے۔ اب تو خانہ بدوشوں کے ساتھ کیسے آگئی ہے۔ میں یہ نہیں جانتا۔
بہرحال وہ لڑکی اپنی جھونپڑی کی طرف جا چکی تھی۔ اس لیے میں بھی واپس آگیا۔
میں اپنے دوست کے پاس بھی نہیں گیا۔ حالانکہ اس کے پاس جانے کا ارادہ لے کر نکلا تھا لیکن اس لڑکی نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔
مشابہت میں نے صرف کہانیوں میں پڑھی تھی۔ یہاں میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا تھا۔ عقل تو یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھی کہ دونوں ایک ہو سکتی ہیں۔ لیکن دل کہہ رہا تھا کہ دونوں ایک ہیں۔ کیسے ہیں اس کا فی الحال کوئی جواب نہیں تھا۔
میں نے پھر فیصلہ کر لیا کہ اس بھید سے پردہ اٹھانے کا ایک طریقہ ہے کہ میں اس لڑکی سارا کے گھر پہنچ جاؤں کسی

بہانے اس سے، جاکر ملوں۔ اس کو بتاؤں کہ اس شہر میں ایک اس کی ہم شکل بھی ہے۔ بالکل اسی جیسی۔ اگر سارا چاہے تو میرے ساتھ چل کر اس لڑکی کو دیکھ لے۔ لیکن سارا کے پاس جانے کا بھی کوئی جواز نہیں تھا۔ میں اس سے کیا کہتا کہ میں اس سے کیوں ملنا چاہتا ہوں۔ بس ایک بار ہی تو میں نے اسے لفٹ دی تھی۔ اس کے علاوہ تو اس سے اور کوئی تعلق نہیں تھا۔

میں ذہنی کوفت میں مبتلا ہو کر رہ گیا۔ کیا تھا یہ سب۔ اگر کوئی عام سی مماثلت ہوتی تو شاید میں ان دونوں کو بھول بھی جاتا لیکن یہ تو ایسا ہی تھا جیسے شہر کی ماڈرن لڑکی نے یوں ہی تفریحاً خانہ بدوش لڑکی کا لباس پہن لیا ہو۔

بہرحال کئی دنوں کی بے چینی کے بعد جب مجھ سے برداشت نہیں ہوا تو ایک بار پھر وہیں پہنچ گیا۔ جہاں خانہ بدوشوں نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔

وہ پڑاؤ موجود تھا اور وہ لڑکی بھی موجود تھی۔ وہ اس وقت ریلوے لائن کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ پھر میرے پاس آگئی۔ ''اے تو وہی ہے نا جو اس دن میرا دماغ کراب کر رہا تھا؟''

''دیکھو مجھے غلط مت سمجھو۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو پاگل ہونے لگا ہوں۔ میں نے جس لڑکی کو دیکھا ہے وہ بالکل تمہاری طرح ہے۔ بلکہ تم ہی ہو۔ اس لیے تو میں حیران ہو کر پھر آگیا ہوں۔''

''تو پھر یہ سن لے بابو کہ میں وہی ہوں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''کیا!'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم وہی ہو۔ تم یہ خود کہہ رہی ہو۔''

''ہاں میں اس لیے کہہ رہی ہوں مسٹر کہ تم میرے پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔'' اس نے کہا۔ اب اس کا لہجہ ویسا ہی تھا جیسا شہر کی لڑکیوں کا ہوتا ہے صاف ستھرا۔

''میرے خدا میں پاگل ہو جاؤں گا۔ کیا ہے یہ سب! اگر تم وہی ہو تو پھر یہ خانہ بدوش قبیلہ۔''

''یہ میرا ہی قبیلہ ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''آؤ میرے ساتھ میں تمہیں بابا سے ملوا دوں۔ پھر تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔''

اب تو اس بھید کو معلوم کرنا ہی تھا۔ اس لیے میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی خانہ بدوش لڑکی کے ساتھ اس کے خیمے کی طرف جا رہا تھا۔ بالکل فلمی سچویشن دکھائی دے رہی تھی۔

وہ مجھے اپنے خیمے میں لے آئی۔ وہاں موجود خانہ بدوش مرد اور عورتیں مجھے بہت حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں بھی کچھ عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ شرمندگی سی ہو رہی تھی۔ یہ کن چکروں میں پھنس گیا تھا۔ میرا کیا واسطہ تھا ان لوگوں سے۔

اس کے خیمے میں گندے کپڑوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ایسی بدبو تھی کہ جس سے دماغ کی چولیں ہل کر رہ گئی تھیں۔ ایک طرف گندے سندے برتنوں کا ڈھیر تھا۔ ایک طرف ٹین کا ایک بڑا سا صندوق تھا اور ایک چارپائی تھی جس پر ایک بوڑھا بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔

اس نے لنگی اور بنیان پہن رکھا تھا۔ بوڑھا ہونے کے باوجود وہ ایک مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں اور سرخ سرخ آنکھوں نے اسے خاصا ہیبت ناک بنا دیا تھا۔

وہ بہت حیران ہو کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''بابا!'' اس لڑکی نے اسے مخاطب کیا۔ ''یہ وہی بابو ہے میں نے جس کے لیے آپ کو بتایا تھا۔''

''اچھا اچھا۔'' بوڑھا چارپائی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ''آؤ بیٹا، بیٹھو۔''

میں اس کے لہجے کی نرمی اور شفقت کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے جس انداز سے مجھے بیٹا کہہ کر مخاطب کیا تھا اس سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ دل کا اچھا آدمی ہے۔ میں اس کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ لڑکی سامنے ایک مونڈھا کھینچ کر بیٹھ گئی تھی۔

''بابا! یہ بابو ہم کو یہاں دیکھ کر بہت حیران ہو رہا ہے۔'' لڑکی نے کہا۔ ''اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میرا وہ روپ سچ ہے یا یہ روپ سچ ہے۔''

''اس کے دونوں روپ ہی سچ ہیں بیٹا۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''یہ پارو وہاں بھی ہے اور یہاں بھی ہے۔ وہاں اس کا نام سارا ہے اور یہاں اس کا نام پارو ہے۔''

میرے خدا تو پھر یہ وہی لڑکی تھی لیکن اگر یہ خانہ بدوش تھی تو پھر اس بڑے گھر میں اتنی ماڈرن بن کر کیا کر رہی تھی۔ پتا نہیں کیا بھید تھا۔

''بابو! یہ بھی اچھا ہوا کہ یہ پارو تمہیں اپنے ساتھ لے آئی ہے۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''اب تم اس کو سمجھا سکتے ہو شاید تمہاری بات اس کی سمجھ میں آجائے۔''

''مجھے کچھ نہیں سمجھنا بابا۔'' سارا یا پارو نے جلدی سے

کہا۔ ''سو بات کی ایک بات ہے کہ میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتی۔''

''دیکھیں میری سمجھ میں ہی نہیں آرہا ہے کہ یہ سب کیا ہے۔'' میں اس بوڑھے سے مخاطب ہوا۔ ''اگر یہ سارا ہے تو پارو کیسے ہوگئی۔ اگر پارو ہے تو پھر سارا کیسے ہوگئی۔''

''بیٹا! میں تمہیں بتاتا ہوں۔'' بوڑھے نے ایک گہری سانس لی۔ ''تم یہ کہانی سن لو گے تو تمہیں سب پتا چل جائے گا۔''

بوڑھے نے اپنی گردن جھکالی جیسے گزرے دنوں کو یاد کررہا ہو۔ پھر اس نے حقے کے دو چار گہرے گہرے کش لگائے اور دھواں بکھیرتا ہوا آہستہ آہستہ بتانے لگا۔

☆......☆

یہ بہت پہلے کی بات ہے بابو، تقریباً اٹھارہ سال پہلے۔ ہم خانہ بدوش لوگ ہیں۔ ہمارا کنبہ بہت بڑا ہے۔ ہماری برادری کے کئی حصے ہیں اور ہر حصے کا ایک سردار ہوا کرتا ہے۔

میں اپنے حصے کا سردار تھا اور آج تک ہوں۔ ہمارا کام پورے ملک میں گھوم پھر کر اپنے لیے روزی پیدا کرنا ہے۔ ہم ہاتھوں کے کاریگر ہوتے ہیں۔ ہم مسلمان بھی ہوتے ہیں اور ہندو بھی۔ ہم ہاتھوں سے بچوں کے لیے رنگین کھلونے بنا کر بیچتے ہیں۔

خیر تو اس زمانے میں ہم نے ملتان سے آگے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ پڑاؤ کیا ہوا تھا۔ شام کا وقت تھا میں پٹڑیوں کے ساتھ ساتھ سیر کرتا ہوا جارہا تھا کہ میں نے جھاڑیوں کے پیچھے سے کسی کے رونے کی آواز سنی۔ کسی بچے کی آواز تھی بابو۔ میں پریشان ہوکر جھاڑیوں کی طرف گیا اور وہاں مجھے ایک بچی دکھائی دے گئی۔ وہ زخمی ہورہی تھی۔ میرے دل میں اس کے لیے محبت پیدا ہوگئی۔ میں اسے اٹھا کر اپنے پڑاؤ میں لے آیا۔ وہ بہت خوب صورت تھی بابو۔ بہت حسین۔ ایسی کوئی ہمارے خانہ بدوشوں میں نہیں ہوگی۔''

بوڑھا بولتے بولتے خاموش ہوا تو اس لڑکی نے بتانا شروع کیا۔ ''اب تھوڑی سی کہانی مجھ سے سن لو۔ میں اس وقت صرف چار سال کی تھی۔ چار سال کی کیا عمر ہوتی ہے لیکن مجھے اپنا گھر یاد تھا۔ اپنے ماں باپ کے نام یاد تھے۔ میرا دو سال کا چھوٹا بھائی تھا وہ بھی یاد تھا مجھے۔''

''کیا وہ بچی تم تھیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں وہ میں ہی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''میرے والدین بہت پیسے والے لوگ تھے۔ باپ کا نام ارشد سلطان تھا۔ جو مجھے اس وقت بھی یاد تھا اور ماں کا نام عابدہ تھا۔ چھوٹا بھائی اویس تھا۔ ہم کراچی سے لاہور ٹرین کے ذریعے جارہے تھے۔ ایک جگہ کسی وجہ سے ٹرین کی رفتار کم ہوگئی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں پورے ڈبے میں اچھلتی پھر رہی تھی۔ ریل کے سفر میں بڑا مزہ آرہا تھا کہ اچانک نہ جانے کس طرح میں ڈبے سے نکل کر باہر جاگری اور لڑھکتی ہوئی ایک بڑی سی جھاڑی کے پیچھے چلی گئی۔ بس مجھے اتنا ہی ہوش ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا یہ میں نہیں جانتی۔''

''اس کے بعد یہ ہوا بیٹا کہ میں اسے اٹھا کر اپنے پڑاؤ میں لے آیا۔ تیرے ماں باپ نے ریل رکوادی ہوگی۔ تجھے ہر جگہ تلاش کیا جارہا ہوگا لیکن تو تو ایک جھاڑی کے پیچھے تھی اور بے ہوش ہوگئی تھی۔ اسی لیے تو آوازیں نہیں سن سکی اور نہ وہ تجھے دیکھ سکے۔''

''کیا تم نے اپنے طور پر تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟'' میں نے بوڑھے سے پوچھا۔

''بہت کوشش کی بابو۔'' اس نے کہا۔ ''ہم غریب خانہ بدوش لوگ کہاں جاتے۔ کس کے پاس جاتے۔ لیکن ہم نے اس کے ماں باپ کا نام یاد رکھا اور اس کو اپنے سینے سے لگا کر اس کی پرورش کی۔ ہمارے پاس تھا کیا۔ سوائے پیار کے۔ تو وہ پیار ہم نے اس کے نام کردیا۔''

''ہاں بابا اور ماما نے مجھے اتنا پیار دیا کہ میں بھول ہی گئی کہ میں کون ہوں کہاں سے آئی ہوں۔ میرے اصل گھر والے کون ہیں۔ میں ان ہی لوگوں کے درمیان پرورش پاتی رہی۔''

''پھر ایسا ہوا بابو کہ ہمارا قبیلہ ایک بار کراچی آگیا۔ یہ اب سے پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ یہ بھی میرے ساتھ تھی۔ اس کو یہ تو یاد نہیں تھا کہ اس کا مکان کہاں تھا، کس محلے میں تھا۔ لیکن مجھے اس کے ماں باپ کا نام یاد تھا۔ بس اسی نام سے میں انہیں تلاش کرتا رہا اور کہتے ہیں ناں کہ تلاش کرنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ آخر ایک دن اس کے باپ کا پتا چل گیا۔ میں اس کے مکان پہنچ گیا۔ وہی مکان جو تم نے دیکھا ہوا ہے۔''

''تو کیا تمہارے ماں باپ پہلے سے اسی مکان میں رہتے تھے؟'' میں نے سارا یا پارو سے پوچھا۔

''نہیں وہ پہلے نارتھ ناظم آباد میں رہتے تھے۔'' اس

نے بتایا۔ ''یہ سب مجھے اس گھر میں جا کر معلوم ہوا ہے۔''
''بابو جی جب میں اس مکان کے گیٹ پر پہنچا تو وہاں چوکیدار کھڑا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کس سے ملنا ہے۔''
''اکبر صاحب سے۔'' میں نے اس کے باپ کا نام بتایا۔
چوکیدار اوپر سے نیچے تک مجھے دیکھنے لگا۔ ظاہر ہے اسے تعجب ہوا ہوگا کہ ایسے حلیے کا خانہ بدوش صاحب سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔
شاید وہ مجھے ملنے ہی نہیں دیتا لیکن اسی دوران میں اس کا باپ اندر سے گیٹ پر آ گیا اس کا ڈرائیور گاڑی نکال رہا تھا۔ چوکیدار نے جب اسے میرے بارے میں بتایا تو وہ میرے پاس آ گیا۔ ''کیا بات ہے کون ہو تم! مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟''
''صاحب ایک بات بتائیں۔ کیا اب سے پندرہ سولہ سال پہلے کراچی سے لاہور جاتے ہوئے، آپ لوگوں کے ساتھ کوئی حادثہ ہو گیا تھا؟''
''ہاں ہاں۔'' وہ مضطرب ہو گیا تھا۔ ''بہت بڑا حادثہ ہوا تھا۔ ہماری بیٹی ہم سے بچھڑ گئی تھی۔''
''آپ کی وہ بیٹی ہمارے پاس ہے صاحب۔'' میں نے کہا۔ ''اس کو اپنے سینے سے لگا کر پالا ہے اور اب آپ کی امانت آپ لوگوں کو واپس کرنے آیا ہوں۔''
''کیا کہہ رہے ہو! میری بیٹی تمہارے پاس ہے؟''
اس کی بے چینی دیکھنے والی تھی۔
''جی صاحب۔''
''کہاں ہے وہ۔'' اس نے پوچھا۔
''ہماری خیمہ بستی میں۔'' میں نے بتایا۔ ''ہم اسے اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔''
''چلو۔ ہمارے ساتھ چلو۔ کہاں ہے وہ۔ کہاں ہے تمہاری خیمہ بستی۔ ٹھہرو میں اس کی ماما کو بھی ساتھ لے لیتا ہوں۔ میرے خدا یہ کتنی بڑی بات ہو رہی ہے۔ ہماری سارا مل گئی ہے۔ چلو۔''
''مختصر یہ صاحب کہ ان دونوں نے اپنی بچی کو پہچان کر اسے سینے سے لگا لیا۔ بلک بلک کر روتے رہے۔ پھر میرا شکریہ ادا کر کے اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ مجھے بہت سی رقم بھی دے رہے تھے صاحب لیکن میں نے نہیں لی۔ کیوں کہ یہ تو اولاد کا سودا ہو جاتا اور پارو تو ہماری اولاد تھی صاحب۔''
کیا عجیب کہانی تھی اس لڑکی کی۔ ایک لمحے کے حادثے نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔
''اب بقیہ کہانی مجھ سے سن لیں۔'' سارا یا پارو نے کہا۔ ''میرے لیے تو یہ بہت عجیب مرحلہ تھا۔ اچانک ہی پتا چلا تھا کہ میں نے جن کی آغوش میں پرورش پائی جنھوں نے مجھے سونے کا نوالہ کھلایا جو مجھ سے بے انتہا پیار کرتے تھے وہ میرے حقیقی والدین نہیں تھے۔ میرا گھر کوئی اور تھا۔ میرے ماں باپ کوئی اور تھے۔ یہ کیسی عجیب بات تھی۔''
''ظاہر ہے۔'' میں نے اپنی گردن ہلائی۔ ''میں تمہارے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''
''بہرحال میرے ماں باپ نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ کیوں کہ ایک عرصے کے بعد ان کی کھوئی ہوئی بیٹی ان کے پاس واپس آ گئی تھی۔''
اتنا بتا کر وہ خاموش ہو گئی۔ میں اندازہ کر رہا تھا کہ اس کے ذہن میں کیسی آندھیاں چل رہی ہوں گی۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔
کچھ دیر بعد اس نے پھر بتانا شروع کیا۔ ''میرے ماں باپ نے میری تعلیم کا بندوبست کر دیا۔ میں ذہین تھی۔ مجھ میں ایک جذبہ یہ بھی تھا کہ میں اپنے شہری والدین کی توقعات پر پوری اتروں۔ اس لیے میں نے خوب محنت کی اور پرائیوٹ میٹرک کر لیا۔''
''اس کے بعد تم ڈیفنس گرلز کالج چلی گئیں۔'' میں نے کہا۔
''ہاں میں نے غلط نہیں کہا تھا۔''
''اور یہ سب کتنے دنوں کے مرحلے تھے۔''
''پانچ سال کے۔'' اس نے بتایا۔ ''میرے بابا مجھے پانچ سال پہلے میرے شہری والدین کے حوالے کر گئے تھے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں ان کے رنگ میں رنگ جاتی لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ مجھے اپنے بابا اور اپنے قبیلے کے درمیان گزارے ہوئے دن ہمیشہ یاد رہے۔ میں انہیں کبھی نہیں بھلا سکی اور کیسے بھلاتی یہ میری احسان فراموشی ہوتی اگر میں ان کو بھول جاتی جنھوں نے میری پرورش کی تھی۔ میرے انداز وہی رہے۔ وہی خانہ بدوش لڑکیوں جیسے۔ وہ تو میری فطرت میں شامل ہو چکا تھا۔ وہ کیسے ختم ہوتا اور یہی بات میرے گھر والوں کو بری لگ رہی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ان میں ایڈجسٹ ہی نہیں ہو پا رہی تھی اور ابھی تک نہیں ہو سکی ہوں۔''
اور اسی وقت اس خانہ بدوش سردار نے بولنا شروع

کیا۔ ''ہم نے تو کراچی کی طرف آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ پاگل ہماری محبت کو اپنے سینے سے لگائے رکھے۔ سب بھول جائے اور اپنے گھر والوں کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کر دے۔ لیکن یہ ایک دفعہ گھر سے چل کر ہماری بستی رحیم یار خان تک پہنچ گئی تھی۔''

''ہاں۔'' اس لڑکی نے بتایا۔ ''بابا اپنے قبیلے کو لے کر جب دو سال تک کراچی نہیں آیا تو میں خود اس کے پاس پہنچ گئی۔''

''تو جی بابو اب تم ہی اس کو سمجھاؤ کہ ہمارے پیچھے کیوں اپنا دماغ خراب کر رہی ہے۔ اللہ نے ہمیں ایک امانت دی تھی ہم نے اس کی خدمت کر کے اس کے اصل مالکان تک پہنچا دیا۔ اب دعا ہے کہ جہاں رہے خوش رہے اور ہم کو بھول جائے۔''

سارا نے اپنی گردن جھکا لی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں اس کی ذہنی حقیقت کو بہت اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

قدرت نے اسے دو کشتیوں کا مسافر بنا دیا تھا۔ ایک طرف اس کے حقیقی ماں باپ تھے اور دوسری طرف یہ خانہ بدوش قبیلہ تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اس کو مان دیا تھا۔ پیار دیا تھا۔ وہ انہیں کیسے بھول سکتی تھی۔

''سارا ایک بات بتاؤ۔ تمہارے ماما باپ کا تمہارے ساتھ کیا رویہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''انہی جیسا۔'' اس نے بتایا۔ ''میں ان کی سگی اولاد تو ہوں لیکن میں ان کے لیے غیر جیسی ہوں۔ کیوں کہ میں ان سے بہت مختلف ہوں وہ مجھے اپنے مہمانوں کے سامنے نہیں آنے دیتے کہ کہیں ان کی سبکی نہ ہو جائے۔ میں نے کئی بار دیکھا ہے جیسے اگر وہ آپس میں باتیں کر رہے ہیں اور میں اچانک پہنچ جاؤں تو بالکل خاموش ہو جاتے ہیں۔ جیسے انہیں میرا آنا برا لگا ہو۔ اس لیے ان کے درمیان میرا دل نہیں لگتا۔ ہم ایک دوسرے کے لیے بدل چکے ہیں اور یہ ایک بڑی تلخ حقیقت ہے۔''

''یہ سب درست ہے سارا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تمہارا خمیر کہیں اور کا ہے۔ تم ان خانہ بدوشوں کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتیں۔''

''تو پھر کیا کروں میں؟'' وہ اچانک بپھر اٹھی۔ ''قدرت نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے۔ میں اپنی مرضی سے تو دو کشتیوں پر سفر نہیں کر رہی ہوں۔ پھر میرے ساتھ ایسا مذاق کیوں ہوا؟ میں کیا کروں کس کے پاس جاؤں۔''

اس کے سوال کا میرے پاس تو کیا کسی کے پاس بھی کوئی جواب نہیں ہو سکتا تھا۔

''بابو۔'' بوڑھے نے میری طرف دیکھا۔ ''تم ہی اس کو سمجھاؤ۔ ہمارا دھیان چھوڑ دے۔ اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ چکی ہے بس وہیں دل لگائے۔''

''نہیں بابا میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔''

''پاگل مت بن۔'' بوڑھا دکھ اور غصے سے بولا۔ ''اپنے آپ کو سنبھال لے۔''

پھر میں بھی اسے سمجھانے لگا۔ میں نہیں جانتا کہ میرے سمجھانے کا اس پر کیا اثر ہوا ہوگا لیکن اس وقت وہ خاموش ہو گئی تھی۔

میں بھی کچھ دیر بیٹھ کر چلا آیا۔

وہ اچھی لڑکی تھی۔ میں نے اسے پسند کیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ جس قسم کے حالات تھے۔ ان کا کیا ہو سکتا تھا۔

کئی دنوں تک میں اس کی طرف نہیں جا سکا۔ میرا مطلب ہے اس کی خیمہ بستی کی طرف۔ ویسے اس کی یاد آتی رہی تھی۔

بالآخر ایک دن جب برداشت نہیں ہوا تو میں خیمہ بستی پہنچ ہی گیا لیکن اب وہاں کچھ بھی نہیں۔ بنجارے اپنی بستی لپیٹ کر کسی طرف کو جا چکے تھے۔

میں ایک خاموشی کے عالم میں کھڑا ہی رہ گیا تھا۔ وہ لڑکی تو کسی خواب ہی کی طرح میری زندگی میں آئی اور خواب ہی کی طرح چلی بھی گئی تھی۔

کیا عجیب کہانی تھی اس کی۔ نہ جانے کیوں قدرت کبھی کبھی ایسے تماشے دکھاتی ہے۔ اب اس کے بھید وہی جانے۔

نہ جانے اس میں اس کی کیا مصلحت ہوگی۔

میں اس مکان کی طرف بھی نہیں جا سکتا تھا جو اس کے ماں باپ کا مکان تھا۔ نہیں معلوم۔ وہ وہاں واپس گئی یا خانہ بدوشوں کے ساتھ چلی گئی۔

بہرحال یہ ایک ایسی داستان ہے کہ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود میں اس کے ٹرانس میں ہوں۔

اور میں جب بھی ریلوے پٹریوں کے اردگرد کسی خیمہ بستی کو دیکھتا ہوں تو یہی گمان ہوتا ہے کہ شاید وہ ان میں ہی سے کسی میں ہو۔ لیکن کون جانے وہ کہاں ہوگی۔

شیطان، فرشتہ

محترم و مکرم معراج رسول
سلام تہنیت
میں کوئی رائٹر نہیں مگر سرگزشت سے عشق ہے۔ شاید ہی کوئی شمارہ مجھ سے چھوٹا ہو۔ میں مصروفیت میں بھی سرگزشت کا مطالعہ ترک نہیں کرتا۔ دوسروں کی سچ بیانی پڑھتے پڑھتے میں نے بھی اپنا ایک واقعہ لکھ ڈالا۔ اگر اسے دوبارہ کسی رائٹر سے لکھوا کر شائع کردیں تو نوازش ہو گی۔

فرخ جمال
(کراچی)

آج کل جب میں آئے دن معصوم بچوں کے ساتھ شیطان صفت لوگوں کے بہیمانہ سلوک اور پھر ان کے قتل کی خبریں دیکھتا، سنتا اور پڑھتا ہوں تو میرے اندر خوف سا پیدا ہونے لگتا ہے کیونکہ میں خود ایک باپ ہوں اور میری کل کائنات میرا بیٹا شاہ رخ ہے۔ اس نے اسی سال سے اسکول جانا شروع کیا ہے۔ میں اور سارہ اس کے معاملے میں اتنے حساس ہیں کہ ہم نے اسکول کے لیے وین بھی نہیں لگوائی ہے۔ صبح میں اسے اسکول میں کلاس تک چھوڑ کر آتا ہوں اور دوپہر میں سارہ خود جاکر اسے لے آتی ہے۔ اسکول ہمارے علاقے میں ہی پیدل مسافت پر ہے۔ ہمارے محلے کے کئی بچے یہاں پڑھنے آتے ہیں اور شاہ رخ ان کے ساتھ بھی آجا سکتا ہے کیونکہ وہ ماشاءاللہ سے چھ سال کا ہو رہا تھا۔ پانچ سال کی عمر تک تو ہم نے اسے اسکول میں داخل ہی نہیں کرایا تھا کیونکہ ہم دونوں کے خیال میں اس سے کم عمر بچے کو اسکول بھیجنا اس کے بچپن کے ساتھ زیادتی ہو گی۔

ہم نے اسے گھر میں ہی پڑھایا اور جب وہ اسکول پہنچا تو اس کا ٹیسٹ لینے کے بعد ٹیچر نے اس کے لیے دوسری کلاس تجویز کی تھی مگر میں نے اور سارہ نے پہلی کلاس کو ترجیح دی۔ وجہ وہی تھی کہ ہم اس پر بوجھ ڈال کر اسے مشقت میں مبتلا کرنا نہیں چاہتے تھے جیسا کہ آج کل بچوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ماں باپ اور اسکول والے انہیں علم کا بوجھ ڈھونے والا گدھا سمجھ لیتے ہیں اور اس سے توقع کرتے ہیں کہ وہ یہ کام کرے گا۔ ہم یہ کام گھر میں کر رہے تھے اور اسے آگے کے لیے تیار کرتے جاتے۔ ہم نے اس کے لیے ایک ایسا لچکدار نظام الاوقات ترتیب دیا تھا جس میں اس کی رضامندی اور خوشی بھی شامل تھی اور اس کے ساتھ ساتھ وہ تمام قاعدے اور اصول بھی تھے جو ایک بچے کی اچھی پرورش کے لیے لازمی ہوتے ہیں۔ مگر کوئی چیز ہم نے لازمی نہیں رکھی تھی۔ تھوڑی بہت گنجائش چھوڑی تھی جو کہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔

میں اور سارہ شاہ رخ کے لیے حساس تھے لیکن اپنی حساسیت اس پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ ہمارا بچہ ایک عام بچے کی طرح پرورش پائے اور وہ خود کو خاص نہ سمجھے۔ یہ حساسیت قدرتی نہیں تھی بلکہ حالات نے پیدا کی تھی۔ اسکول اور گھر سے باہر ہمیں شاہ رخ کی فکر لگی رہتی تھی۔ جب وہ باہر کھیل رہا ہوتا تھا تو سارہ یا میں گھر میں ہوتا تو بار بار باہر جھانک کر اسے دیکھتے مگر یوں کہ شاہ رخ کو احساس نہ ہو کہ ہم اصل میں اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اگر وہ اتفاق سے گلی میں نظر نہ آتا تو ہم بے قرار ہو کر اس کو دیکھنے نکل جاتے۔ ہماری یہ حساسیت غیر منطقی نہیں تھی کیونکہ نہ صرف اس ملک اور شہر بلکہ ہمارے علاقے میں ایسے واقعات ہو چکے تھے جب درندہ صفت لوگوں نے معصوم بچوں اور بچیوں کو اپنی درندگی کا نشانہ بنایا اور راز افشا ہونے کے خوف سے معصوم بچوں کو قتل بھی کر دیا۔

ایسا ہی ایک واقعہ چند مہینے پہلے ہمارے محلے میں پیش آیا جب ایک چار سالہ بچی غائب ہوگئی اور تلاش کے بعد اس کی لاش ایک خالی پلاٹ میں جھاڑیوں سے ملی۔ کسی زمانے میں شہر کے وسط میں ہونے کے باوجود اس علاقے کی اہمیت نہیں تھی۔ یہاں پلاٹ اور مکان سستے مل جاتے تھے اس لیے یہاں نچلے طبقے کے افراد زیادہ تھے اور اکا دکا ہی اچھے گھرانے تھے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہاں سہولتیں آئیں، سڑکیں اور فلیٹس بنے۔ ان کے نیچے شاپنگ سینٹر بنے تو علاقے کی اہمیت اور قیمت خود بہ خود بڑھتی چلی گئی اور جب قیمتیں بڑھیں تو نچلے طبقے کے لوگوں نے یہاں سے پراپرٹی سیل کر کے دوسرے علاقوں کا رخ کیا اور مشکل سے ایک عشرے میں یہ علاقہ نچلے طبقے سے اوپری متوسط طبقے کا بن گیا۔ اب یہاں اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ تقریباً سب کے پاس اپنی گاڑی تھی۔ اس کے باوجود کچھ گھروں میں اب بھی پرانے لوگ رہ رہے تھے۔

ان میں ایک عبدل بھی تھا۔ اس کا پورا نام کسی کو نہیں معلوم تھا۔ وہ تقریباً پینتالیس برس کا سیاہ رنگ اور اکھڑے نقوش والا دبلا سا آدمی تھا۔ اس کے ہاتھوں کی نسیں ابھری ہوئی تھیں جیسے کسی درخت کی جڑیں ابھر آتی ہیں۔ سر کے بال سامنے سے اڑ گئے تھے۔ گٹکے سے اس کا منہ لال رہتا تھا۔ آنکھیں یوں سرخی لیے ہوئے تھیں جیسے وہ نیند کی کمی کا شکار ہو۔ اپنے پرانے خستہ حال گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ دو کمروں کے اس مکان کا بڑا حصہ صحن پر مشتمل تھا جو اب اس علاقے میں آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہے۔ چھت پر ٹین کی شیٹیں تھیں۔ وہ کوئی کام کرتا تھا کیونکہ صبح جاتا اور شام کو آجاتا تھا۔ محلے میں کسی سے اس کی میل ملاقات نہیں تھی اور لوگ اسے منہ لگانا پسند بھی نہیں کرتے تھے۔ وہ خود کسی میں دل چسپی نہیں لیتا تھا۔ جب گھر سے نکلتا تو سر جھکائے تیز قدموں سے چلا جاتا۔ بچی کی لاش جس خالی پلاٹ سے ملی تھی وہ عبدل کے مکان سے کچھ ہی دور تھا۔ یہ ثابت ہونے کے بعد کہ بچی کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی اور اسے سانس گھونٹ کر مارا گیا تھا تو پولیس نے قاتل کی تلاش شروع کی اور شبہے میں عبدل کو بھی پکڑ کر لے گئی۔ مگر دو دن اسے زیرِ تفتیش رکھ کر چھوڑ دیا کہ اس نے نہ تو اقرارِ جرم کیا تھا اور نہ ہی اس کے خلاف کوئی ثبوت ملا۔

تھانے سے آنے کے بعد وہ کئی دن اپنے گھر سے نہیں نکلا تھا کیونکہ اس کی حالت ہی ایسی نہیں تھی۔ محلے والے اس

سے نفرت کرنے لگے تھے۔ خاص طور سے جن کی بچی کے
ساتھ یہ سانحہ پیش آیا تھا انہوں نے باقاعدہ پریس کانفرنس
کر کے الزام لگایا کہ پولیس نے اسے ملی بھگت سے چھوڑ دیا
ہے ورنہ وہی ان کی بچی کا قاتل ہے۔ پولیس کا کہنا تھا کہ وہ
اس کے خلاف کوئی ثبوت حاصل نہیں کر سکی اس لیے اسے
کیسے قاتل قرار دے سکتی ہے۔ کچھ دن اس پر ہنگامہ ہوا۔
علاقے کے مشتعل نوجوانوں نے ایک بار اس کے گھر پر
پتھراؤ بھی کیا مگر بزرگوں نے انہیں قابو کر لیا۔ پھر مقتول بچی
کی ورثا علاقہ چھوڑ گئے اور کچھ عرصے بعد لوگوں کے جذبات
بھی ٹھنڈے پڑ گئے اور اب اہلِ علاقہ نے پھر اسے نظرانداز
کر دیا تھا۔ اس کا وہی معمول تھا کہ صبح جاتا اور شام کو
آ جاتا۔ مگر لوگ اپنے بچوں کے سلسلے میں محتاط تھے اور کوئی
بچہ اس کے گھر کے پاس بھی نہیں جاتا تھا۔ بڑوں کی طرف
سے اس معاملے میں سخت ہدایات تھیں۔

عبدل کا گھر ہمارے گھر سے دو گلی آگے نالے کے
ساتھ آخری سرے پر تھا۔ اس سے آگے چند غیر آباد پلاٹ
تھے جن پر جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ وہاں کوئی نہیں جاتا تھا۔
بچی والے واقعے کے بعد اہلِ محلہ نے یہ جھاڑیاں کٹوا دی
تھیں۔ نالے کی طرف پہلے ہی دیوار کھڑی کر دی تھی تاکہ
علاقہ محفوظ رہے۔ جب یہاں اچھی فیملی آئیں تو چور ڈکیتوں
نے بھی ادھر کا رخ کیا تھا۔ اس لیے اہلِ محلہ نے مل کر اس کا
سدباب کیا۔ آنے جانے کے لیے صرف ایک راستہ چھوڑ کر
باقی سارے راستے بند کر دیے اور آنے جانے والے راستے
پر بیریئر لگا کر اس پر چوبیس گھنٹے کے لیے مسلح گارڈ بٹھا دیا۔
اس کے بعد سے امن و سکون ہو گیا تھا۔ پہلے وہ لوگ پریشان
رہتے تھے جن کے پیچھے گھروں میں صرف عورتیں اور بچے رہ
جاتے تھے۔ یہاں ایسے واقعات بھی ہوئے کہ مردوں کے
جانے کے بعد ڈاکو گھروں میں گھسے اور مال کے ساتھ آبرو
بھی لوٹ لیا۔

مگر اتنی سیکیورٹی میں بچی والا واقعہ پیش آیا تو اہل
علاقہ اور خاص طور سے والدین میں تشویش کی لہر دوڑ گئی
تھی۔ ان میں میں اور سارہ بھی شامل تھے۔ دس سال پہلے
ہم نے محبت کی شادی کی تھی۔ اس وقت میں نے ایم بی اے
کیا تھا اور جاب کر رہا تھا۔ حالانکہ مجھے جاب کی ضرورت
نہیں تھی کیونکہ ہمارا خاندانی کاروبار تھا مگر میں پہلے تجربہ
حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سارہ سے یونیورسٹی میں ملاقات ہوئی
تھی۔ جلد یہ ملاقات پسندیدگی میں ڈھل گئی۔ مگر جب بات
خاندانوں تک آئی تو دونوں خاندانوں نے اس رشتے سے
انکار کر دیا۔ اس وقت تک بات اتنی بڑھ گئی تھی کہ ہم ایک
دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے ہم نے اپنے
اپنے گھر والوں کے سامنے کورٹ میرج کا آپشن رکھ دیا تب
وہ بادل ناخواستہ اس شادی پر رضامند ہوئے مگر کسی تقریب
کے بغیر نکاح کیا گیا اور سارہ کے گھر والے اسے تین کپڑوں
میں ہمارے پاس چھوڑ گئے اور نکاح کے فوراً بعد والد
صاحب نے حکم دیا کہ میں اپنا بندوبست کر لوں، اب میرا
اس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

میرا اور سارہ کا خاندان پڑھا لکھا ہے مگر دونوں کے
ہاں رواج ہے کہ خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے۔ اس
لیے ہمارے بڑے اس رشتے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے۔ میں
نے اور سارہ نے شادی کی اوّلین رات میرے ایک دوست
کے گھر میں گزاری۔ چند مہینے تک ہم کرائے کے ایک فلیٹ
میں رہے پھر میری والدہ کو ترس آیا اور انہوں نے چپکے سے
مجھے کچھ رقم دی جس سے میں نے یہاں نیم تعمیر شدہ پلاٹ
خرید لیا اور پھر جہاں جاب کرتا تھا وہاں سے اور کچھ دوستوں
سے قرض ادھار لے کر اسے مکمل کرا کے اس میں آ گیا۔ چند
سال تک میں قرض اتارتا رہا۔ مگر اپنے گھر میں آنے سے
سکون آ گیا۔ پھر تنخواہ بڑھی تو مالی مشکلات کم ہوئیں۔ پہلے
میرے پاس بائیک تھی پھر ایک چھوٹی گاڑی لے
لی۔ ابتدائی مشکلات میں اولاد کا خیال نہیں آیا مگر جب اپنے
گھر میں آئے اور ذرا سکون ہوا تو سارہ کو تنہائی پریشان
کرنے لگی۔ ہم نے ڈاکٹروں سے رجوع کیا۔ ٹیسٹ ہوئے
مگر سب کلیئر آیا۔ اب قدرت کی طرف سے دیر تھی اور ہم
دونوں ہی قدرتی طریقے کے قائل تھے اس لیے صبر سے
انتظار کرنے لگے کہ کب اوپر والا ہمارے مقدر میں اولاد لکھتا
ہے۔ یہ موقع چار سال بعد آیا۔

شاہ رخ نے آ کر ہمارا گھر مکمل کر دیا۔ سارہ کو پہلے
فراغت کی شکایت تھی تو اب اسے فرصت نہیں ملتی تھی۔ میں
پہلے کہتا تھا کہ گھر میں کتنی خاموشی ہے اور اب بعض اوقات
جب برخوردار ٹی وی پر گیمز لگا کر کھیل رہے ہوتے تھے تو
مجھے سکون کے لیے باہر کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ شاہ رخ کی
پیدائش کے بعد گھر والوں سے تعلق کسی قدر بحال ہوا تھا۔
نواسے اور پوتے کی خوشی میں وہ آئے تھے اور ہم بھی گئے
تھے۔ یوں آنا جانا ہوا مگر تعلق بس اسی حد تک تھا۔ نہ تو والد
نے مجھے واپس آنے کو کہا اور نہ ہی سارہ کے گھر والوں نے

زیادہ گرم جوشی دکھائی خاص طور سے اس کے بہن بھائی اس معاملے میں سرد مہری دکھا رہے تھے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ سارہ کہیں دولت اور جائیداد میں حصے دار نہ بن جائے۔ مگر ہم اپنی زندگی سے مطمئن تھے اس لیے ہم نے پروا نہیں کی۔ جو ہم سے مل رہا تھا ہم بھی اس سے مل رہے تھے اور جو نہیں مل رہا تھا تو وہ اپنے گھر میں خوش اور ہم اپنے گھر میں خوش تھے۔

شاہ رخ کی پرورش کے سلسلے میں ہم نے طے کیا تھا کہ میں اپنا رعب رکھوں گا مگر اسے جسمانی سزا نہیں دوں گا اور یہ کام سارہ کرے گی مگر وہ اس سے بے تکلفی رکھے گی۔ ماں باپ کا بنیادی کردار یہی ہوتا ہے۔ اس لیے شاہ رخ مجھ سے ڈرتا تھا اور صرف ایک آواز دینے کی دیر ہوتی فوراً سیدھا ہو جاتا مگر ساتھ ہی اسے پورا اعتماد تھا کہ میں صرف اسے ڈانٹوں گا ماروں گا نہیں۔ میں نے اسے کبھی مذاق میں بھی ہلکا سا تھپڑ نہیں لگایا تھا۔ میں باپ والا بھرم برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے کسی شرارت یا نقصان کے بعد وہ میرے آس پاس ہی رہتا تھا اسے معلوم تھا کہ اب ماں سے پٹے گا۔ جب اسے میرا خوف ہوتا کہ میں ڈانٹوں گا تو وہ ماں کے پاس گھستا تھا۔ بڑا ہونے پر اس کی شرارتیں اور چیزوں میں گھسنے کی عادت بڑھی تو سارہ نے اسی حساب سے اس پر سختی شروع کر دی۔

ہم نے طے کیا ہوا تھا جب ایک اپنے طریقے سے شاہ رخ کی کلاس لے رہا ہوگا تو دوسرا اس میں دخل نہیں دے گا۔ میں اسے کبھی اکیلے میں سمجھاتا کہ وہ ایک حد سے زیادہ سختی نہ کیا کرے ورنہ پھر اس پر سختی بھی بے اثر ہو جائے گی۔ سارہ کوشش کرتی مگر جب اسے غصہ آتا تو وہ بے قابو ہو جاتی تھی۔ سارہ کو زیادہ غصہ اس وقت آتا جب شاہ رخ پڑھنے کے اوقات میں کوتاہی کرتا تھا مگر ہم نے طے کیا ہوا تھا کہ تعلیم کو اس پر ٹھونسنا نہیں ہے اس لیے سارہ اس وقت تو اسے کچھ نہیں کہتی تھی مگر بعد میں جب وہ کوئی شرارت یا حرکت کرتا تو تب کا غصہ بھی اسی وقت نکال لیتی۔ چھوٹا تھا تو ہمارے ہاتھ میں تھا اور ہمیں اس کی اتنی فکر نہیں تھی مگر تین چار سال کی عمر میں وہ باہر نکلنے لگا۔ گلی کے بچوں کے ساتھ کھیلتا تھا۔ سارہ بہت فکر مند رہتی تھی کہ گلی میں گاڑیاں آتی جاتی رہتی تھیں اور بعض لوگ ایسے تھے جو یہاں بھی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے تھے۔ شاہ رخ کو باہر جانے سے روک بھی نہیں سکتے تھے اس لیے سارہ کی جان باہر ہی اٹکی رہتی تھی۔ چھٹی والے دن میری ڈیوٹی ہوتی کہ جب شاہ رخ باہر کھیل رہا ہے تو میں اس کے آس پاس ہی موجود رہوں۔ میں نے سارہ کو سمجھایا۔

''اس طرح وہ کھل کر کھیل نہیں سکے گا بچہ نگرانی سے گھبراتا ہے۔''

''میں کچھ نہیں جانتی بس آپ باہر رہا کریں میں ایک دن تو سکون سے رہوں۔''

مجبوراً میں باہر آ جاتا مگر میں نے اس کا طریقہ یہ نکالا کہ براہ راست نگرانی کی بجائے کسی محلے والے سے گپ شپ کرنے لگتا یا اخبار لے آتا تاکہ شاہ رخ یہ نہ سمجھے کہ میں اس کی نگرانی کر رہا ہوں۔ تھوڑا بڑا ہوا اور ہوشیار ہو گیا تو ہمیں اس طرف سے اطمینان ہو گیا کہ وہ اب خود اپنی حفاظت کر سکتا ہے۔ پھر اس کا بچوں کے ساتھ گروپ بن گیا تھا وہ سب مل کر کھیلتے تھے۔ اس کے باوجود ہم یہ فکر کرتے رہتے تھے کہ وہ گلی سے باہر نہ جائے۔ اس کے لیے وقفے وقفے سے باہر دیکھتے رہتے تھے۔ مگر جب بچی والا واقعہ ہوا تو ہماری فکر حدوں کو چھونے لگی تھی۔ سارے ہی لوگ سہم گئے تھے۔ کچھ دن تو بچوں کو گھر سے باہر جانے کی اجازت بھی نہیں ملی تھی۔ مگر سارہ نے شاہ رخ کو پورے مہینے گھر سے باہر جانے نہیں دیا تھا۔ وہ بہت مچلتا اور کبھی کبھی رونے لگتا تھا مگر سارہ کا دل نہیں مان رہا تھا۔ بہ مشکل میں نے اسے رضا مند کیا اور شاہ رخ کو باہر جانے کی اجازت ملی تھی۔

حساس تو میں بھی تھا لیکن مرد ہونے کے ناطے میں اپنے جذبات پر بہتر قابو رکھ سکتا تھا اور اسی لیے میں نے دل پر جبر کر کے شاہ رخ کو باہر جانے کی اجازت دلوائی۔ میں نے سارہ سے کہا کہ ہم اسے ہمیشہ کے لیے گھر میں قید نہیں رکھ سکتے اور اسی عمر میں بچے باہر کے ماحول.... سے آشنائی اختیار کرتے ہیں اور یہ چیز بعد میں ان کے کام آتی ہے۔ جن بچوں کو اس عمر میں باہر جانے سے روک دیا جائے تو وہ باقی ساری عمر گھر سے نکلتے ہوئے اور لوگوں سے تعلقات قائم کرتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ یہ چیز ان کی معاشرتی اور معاشی ترقی میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ شاہ رخ گھر میں بند تھا تو چڑچڑا ہو گیا تھا بات بات پر لڑتا اور الجھتا تھا۔ کہنا مشکل سے مانتا اور زیادہ تر وقت منہ سجا کر رکھتا تھا مگر باہر جانے کی اجازت ملتے ہی اس کی فطری شوخی اور خوش مزاجی لوٹ آتی تھی۔ میں نے سارہ سے کہا۔ ''تم نے اس کے رویے میں فرق دیکھا؟''

''لیکن کیا کروں خوف مجھے مارے ڈالتا ہے۔ فرخ

یہ ہمارے معاشرے میں کیا ہورہا ہے؟''

''بے راہ روی اور انتشار کا نتیجہ یہی نکلنا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''بعض لوگ کہتے ہیں کہ آزاد خیالی نے یہ دن دکھائے ہیں حالانکہ آزاد خیالی تو اس معاشرے میں ہمیشہ سے رہی ہے۔ ایلیٹ کلاس خود کو مذہب اور معاشرے سے بالاتر سمجھتی ہے۔ یہ سب اصل میں اجتماعی نفسانفسی اور نظام انصاف کے ناکارہ ہونے سے ہوا ہے۔ آج کا مجرم سمجھتا ہے کہ وہ جرم کرکے آسانی سے بچ جائے گا اور دیکھا جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے معاشرے کے وہ نا آسودہ لوگ جو اپنے اندر تلخی رکھتے ہیں وہ اس طرح سے اپنی تلخی نکال رہے ہیں۔''

''آپ کے خیال میں یہ انفرادی فعل نہیں ہے؟''

''نہیں کوئی فعل انفرادی نہیں ہوتا ہے۔ ہمیشہ معاشرے کے رویے کا مظہر ہوتا ہے۔'' میں نے انکار کیا۔ ''ہاں جب ایسا ہوجاتا ہے تو لوگ اسے انفرادی قرار دے کر صرف کرنے والے کے سر تھوپ دیتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ اس کے پیچھے معاشرے کی اجتماعی نفسیات کا کتنا حصہ ہے۔''

''تو کیا ایسا کرنے والوں کو چھوڑ دینا چاہیے؟''

''نہیں ان کو فوری اور سخت سزا دینی چاہیے لیکن اتنے عرصے میں ایسے سینکڑوں واقعات ہوئے ہیں اور مجھے نہیں یاد کہ کسی ایک فرد کو بھی سزا ہوئی ہو یا اس کا اعلان ہوا ہو کہ فلاں کو اس جرم میں سزا دی جارہی ہے۔ جیلوں میں سزائے موت کے ہزاروں قیدی ہیں مگر یہاں تو مغرب کو خوش کرنے کے لیے سزائے موت پر ہی پابندی لگائی ہوئی ہے۔ یقین کرو صرف سزائے موت پر عمل درآمد ہوجائے تو جرائم میں آدھی کمی آجائے۔''

میں کوئی دانش وریا بہت گہری سوچ رکھنے والا شخص نہیں ہوں۔ میں وہی باتیں کررہا تھا جو ہمارا میڈیا ہمارے ذہنوں میں ڈالتا ہے اور ہمیں مزید منتشر کرتا ہے کہ جو بات ایک عام آدمی سمجھ سکتا ہے وہ ارباب اختیار کی سمجھ میں کیوں نہیں آرہی ہے؟ عوام اور ملک کے مفاد میں بہت آسان فیصلے کرتے ہوئے وہ اتنی سوچ بچار کرتے ہیں کہ ان کی حکومت کی مدت ہی پوری ہوجاتی ہے مگر ایسا فیصلہ جو ان کے مفاد میں ہو اور اس سے ملک و قوم کو کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو رہا ہو وہ فوراً کرلیتے ہیں۔ حکمرانوں کی اس روش نے لوگوں میں اعتماد ختم کردیا ہے۔ وہ ایسی کیفیت میں زندگی گزار رہے ہیں جس میں خوف ہی خوف ہے۔ نہ ان کے پیروں تلے زمین ہے اور نہ ہی وہ اپنے سروں پر آسمان دیکھتے ہیں۔ میں خود ایسی زندگی گزار رہا ہوں۔ مگر اسے گزارنا بھی مجبوری ہے۔

اس معاملے میں عورتیں اور بچے خوش قسمت ہیں کہ باہر کی دنیا سے ان کا واسطہ کم پڑتا ہے اور وہ اس سنگینی حالات کو اتنا محسوس نہیں کرتے ہیں۔ ان کے لیے گھر ٹھیک ہے تو سب ٹھیک ہے۔ مگر ہم مردوں کا واسطہ باہر کی دنیا سے پڑتا ہے اور اتنی آسانی سے پُرسکون نہیں ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے دنیا کا کوئی مرد اتنی ٹینشن برداشت نہیں کرتا ہے جتنی کہ پاکستانی مرد کرتا ہے۔ گھروں سے لے کر دفتروں اور روزگار کے مقامات تک اس کے لیے ٹینشن ہی ٹینشن ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ جب یہاں سے نکل کر کسی دوسرے ملک میں جاتا ہے تو زندگی اس کے لیے یک دم ہی بہت سہل ہوجاتی ہے اور وہ ساری توجہ کمانے پر لگاتا ہے اور نہ صرف اپنی بلکہ اپنے گھر والوں کی زندگی بھی بنادیتا ہے۔ دیکھا جائے تو ہمارا ملک چل ہی ان لوگوں پر رہا ہے جو باہر ہیں اور کما کر بھیجتے ہیں ورنہ یہاں تو آدمی اپنا گزارہ نہیں کرپارہا ہے۔ بات اصل واقعے سے کہیں اور نکل گئی ہے۔ میں اس کی طرف آتا ہوں۔ اس دن میں آفس میں تھا کہ دوپہر تین بجے سارہ کا فون آیا وہ پریشان تھی۔

''فرخ، شاہ رخ پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے؟''

''کیا مطلب کہاں چلا گیا ہے کیا وہ گھر سے نکلا تھا؟''

''سیما باجی کے گھر گئی تھی۔'' سارہ نے پڑوسن کا ذکر کیا۔ ''شاہ رخ نے ان کی بیٹی کو دھکا دیا تو اسے چوٹ لگی۔ سر سے ہلکا سا خون نکل آیا تھا۔ میں نے اسے سخت سنائیں اور کہا کہ میں اسے بتاتی ہوں۔ میں سیما باجی اور بچی کو دیکھ رہی تھی۔ جب میں اس سے فارغ ہوئی تو دیکھا شاہ رخ غائب ہے۔ میں گھر پر تالا لگا کر آئی تھی اس لیے وہ گھر تو نہیں جاسکتا میں نے اسے گلیوں میں دیکھ لیا ہے اس کے دوستوں کے ہاں پوچھ لیا ہے مگر وہ کہیں نہیں ہے۔'' سارہ رونے لگی تھی۔

''رو نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں آرہا ہوں۔''

''پلیز جلدی آئیں میرے بچے کو تلاش کریں مجھے لگ رہا ہے میرا دل رک جائے گا۔''

''میں آتا ہوں۔'' میں نے کہا اور دفتر میں ایمرجنسی کا

کہہ کر گھر روانہ ہوا۔ عام طور سے شام کے وقت آنے میں پون گھنٹا لگتا ہے کیونکہ رش بے پناہ ہوتا لیکن اس وقت سڑکیں خالی تھیں اور میں نے بھی گاڑی تیز دوڑائی تھی صرف بیس منٹ میں گھر پہنچ گیا۔ اس وقت تک گھر کے آگے محلے والے بھی جمع ہو گئے تھے اور ان کو یوں جمع دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں کار سے اتر کر لپکا اور گھر کے سامنے موجود واحد بھائی سے پوچھا۔ ''کیا ہوا شاہ رخ ملا؟''

''نہیں یار ہم سب نے پورا محلہ دیکھ لیا ہے۔'' وہ بولے۔ واحد بھائی کا تعلق ایک سیاسی تنظیم سے تھا اور وہی محلے کی سیکورٹی کے معاملات دیکھتے تھے۔ مسائل کے لیے بھی لوگ ان کے پاس آتے تھے۔ ذاتی طور پر بہت اچھے اور مہذب انسان تھے۔ ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی تھی کہ ان کے پاس جو مسئلہ آیا ہے اسے حل کر دیں۔ ''ایک ایک گھر میں گئے ہیں۔ مگر بچہ نہیں ہے۔''

میں اندر گیا تو سارہ محلے کی عورتوں کے ساتھ تھی اور اس کا رو رو کر برا حال تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بلبلائی۔ ''فرخ میرا بچہ لا کر دیں، کہیں سے بھی لا کر دیں۔''

میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے اسے تسلی دی کہ میں جلد شاہ رخ کو تلاش کر لوں گا۔ میں باہر آیا تو واحد بھائی کے ساتھ چند افراد اور تھے۔ واحد بھائی نے انہیں ذمے داریاں سونپ دیں کہ وہ آس پاس کی مسجدوں میں اعلان کرا دیں۔ سارہ پہلے ہی شاہ رخ کا حلیہ بتا چکی تھی۔ واحد بھائی نے اسے کاغذ پر لکھ لیا تھا اور اس کی کاپیاں کرا کے انہوں نے سب کو دے دیں۔ پھر مجھ سے کہا۔ ''اگر تم کہو تو پولیس کو اطلاع دیں۔ ویسے تو ہماری پولیس کچھ نہیں کرتی لیکن بعض اوقات اس کی دہشت سے بھی کام ہو جاتا ہے۔''

''پہلے بیریئر پر موجود گارڈ سے پوچھتے ہیں۔'' میں نے کہا کیونکہ گارڈ کو سختی سے ہدایت تھی کہ وہ کسی بھی چھوٹے بچے کو اکیلے باہر جانے کی اجازت نہ دے۔

''اس سے میں پہلے ہی پوچھ چکا ہوں اور اس نے یقین سے کہا ہے کہ اس عمر اور حلیے کا کوئی بچہ باہر نہیں گیا ہے۔ وہ شاہ رخ کو نام اور چہرے سے بھی پہچانتا ہے۔''

دن اور رات میں دو گارڈز بیریئر پر ہوتے تھے تاکہ ایک کسی وجہ سے بیریئر پر نہ ہو تو دوسرا ضرور ہو اور پھر وہ باری باری گلیوں کا چکر بھی لگاتے تھے۔ واحد بھائی نے اپنا اطمینان کر لیا تھا مگر میں اپنا اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ میں خود گارڈ کے پاس گیا اور اس سے پوچھا، اس نے تقریباً وہی بتایا جو واحد بھائی بتا چکے تھے۔ میں نے اسے وقت بھی بتایا تو اس نے کہا۔ ''اس وقت میں اکیلا تھا دوسرا گارڈ گشت پر تھا۔''

''وہ ابھی کہاں ہے؟''

''اس وقت بھی گشت پر ہے۔''

گارڈ ایک گھنٹے میں ایک چکر لگاتے تھے۔ یعنی ہر گارڈ دو گھنٹے بعد ایک چکر لگاتا تھا۔ یہ سات آٹھ گلیاں تھیں اور ان

کا چکر لگانے میں پندرہ بیس منٹ ضرور لگ جاتے تھے۔ مگر اس سے پوچھنا بیکار تھا کیونکہ جس وقت شاہ رخ غائب ہوا بھی گارڈ بیریئر پر تھا۔ اس دوران میں آس پاس کی مسجدوں سے اعلان ہونے لگے تھے اور واپس آنے والوں نے بتایا کہ اعلان آج عشا کی نماز تک ہر آدھے گھنٹے بعد نشر ہوتے رہیں گے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس مشکل وقت میں میں اکیلا نہیں تھا بلکہ محلے والے بھی ساتھ ہیں۔ چار بجے ہم پولیس اسٹیشن روانہ ہوئے۔ راستے میں میں نے کال کر کے اپنے اور سارہ کے گھر والوں کو اطلاع دی۔ وہ بھی پریشان ہو گئے تھے اور انہوں نے کہا کہ وہ جلد از جلد پہنچ رہے ہیں۔ دوسری طرف واحد بھائی نے سیاسی پارٹی کے مقامی آفس کال کر کے کہا کہ وہ چند لڑکے محلے کی طرف بھیج دیں۔ وہ اپنے طریقے سے شاہ رخ کو تلاش کریں۔

جب یہ سب ہو رہا تھا تو میرے اندر رہ رہ کر دل اٹھ رہے تھے اور وہ تمام واقعات میرے ذہن میں تازہ ہو رہے تھے جو معصوم بچوں کے بارے میں ٹی وی پر دیکھتا اور اخبار میں پڑھتا آیا تھا۔ محلے کی معصوم بچی کی لاش میں نے خود دیکھی تھی۔ نہ جانے کس ظالم نے اس ننھی سی کلی کو یوں مسل دیا تھا۔ اب میرا بچہ غائب تھا اور نہ جانے کہاں اور کس کے پاس تھا۔ اگر اس کے ساتھ کچھ ہو جاتا تو میں اور سارہ جیتے جی مر جاتے۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں اللہ سے دعا کرنے لگا کہ وہ خیریت سے ہو۔ میں نے اپنے گناہوں کی معافی مانگی کہ ان کا سایہ میرے بچے پر نہ پڑے، وہ جہاں کہیں بھی ہو خیریت سے ہو۔ واحد بھائی میری کیفیت محسوس کر رہے تھے انہوں نے مجھے تسلی دی۔ ''حوصلہ کرو یار بچہ مل جائے گا اللہ نے چاہا تو کچھ نہیں ہوگا۔''

''میں جانتا ہوں لیکن کیا کروں واحد بھائی شاہ رخ کی گم شدگی سے زیادہ مجھے یہ خوف ہے کہ وہ کسی درندے کے پاس نہ پہنچ گیا ہو، یہ سوچ ہی مجھے مارے ڈال رہی ہے۔''

''وہ علاقے سے باہر نہیں نکلا ہے۔'' واحد بھائی نے سوچتے ہوئے کہا۔

''مگر وہ کسی دوسری جگہ سے بھی تو نکل سکتا ہے آنے جانے کے سارے راستے بند نہیں ہیں نا۔'' اشفاق بھائی بولے۔

وہ ٹھیک کہہ رہے تھے کہ جو گلیاں بیریئر لگا کر بند کی گئی تھیں ان میں بھی ایسے رخنے تھے کہ پیدل لوگ گزر سکتے تھے صرف گاڑی، بائیک اور سائیکل سے گزرنا ممکن نہیں تھا۔ شاہ رخ ان راستوں سے بھی باہر جا سکتا تھا۔ مگر وہ خود گیا تھا تو اسے آ جانا چاہیے تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ علاقے سے واقف نہیں تھا جب میں کوئی چیز لینے نزدیکی مارکیٹ تک جاتا تو لازمی اسے بھی لے کر جاتا تھا۔ وہ تمام راستوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہاں سیدھی سیدھی گلیاں تھیں جن میں راستہ بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے دل سے دعا کی کہ میرا بچہ خیریت سے گھر آ جائے۔ یا اگر کسی کو ملے تو وہ انسان ہو کوئی درندہ نہ ہو۔ پولیس اسٹیشن میں پولیس کا رویہ وہی تھا اگر واحد بھائی ساتھ نہ ہوتے تو شاید وہ ایف آئی آر بھی نہ کاٹتے۔ ایف آئی آر کاٹنے کے باوجود انہوں نے کوئی خاص دل چسپی نہیں لی، ایس ایچ او نے ٹکا سا جواب دیا۔

''ادھر نفری ابھی کم ہے۔ ابھی بندے آتے ہیں تو آپ کی طرف بھیجتے ہیں۔''

''آج ہی بھیج دیجئے گا۔'' واحد بھائی نے کہا۔ ''معاملہ بچے کا ہے ممکن ہے اب تک گھر پر میڈیا والے پہنچ گئے ہوں۔''

اس بار ایس ایچ او الرٹ ہو گیا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''نہیں جی جلدی آئیں گے۔ ہمارے بھی بچے ہیں۔''

''اگر آپ لوگوں کو یہ احساس ہوتا تو آئے دن لوگوں کے بچے نہ غائب ہوتے۔'' میں نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔ ''میرا اکلوتا بیٹا غائب ہے اور وہ ابھی چھ سال کا بھی نہیں ہوا ہے۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ پولیس آئے گی تو آپ بھیجیں گے۔ ابھی کسی بڑے آدمی کا بچہ غائب ہوا ہوتا تو پورے شہر کی پولیس پہنچ جاتی۔''

اس بار وہ مجبور ہوا اور اس نے ایک اے ایس آئی کو ہمارے ساتھ ہی بھیجا۔ میں اس اُمید کے ساتھ گھر واپس آیا کہ شاید شاہ رخ مل گیا ہو یا اس کے بارے میں کہیں سے خبر آئی ہو مگر کچھ بھی نہیں ہوا۔ میرے اور سارہ کے گھر والے آ گئے تھے۔ وہ سارہ کو دیکھ رہے تھے کیونکہ اس کی طبیعت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ وہ بار بار بے ہوش ہو رہی تھی۔ میرے ایک برادر ان لا ڈاکٹر ہیں وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ اب وہ ہوش میں تھی مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا۔ ''فرخ میرا بچہ۔''

''مل جائے گا۔'' میں نے لہجے میں اُمید بھر کر کہا۔ ''ہم کوشش کر رہے ہیں۔ دیکھو سب آ گئے ہیں میں

پولیس لے کر آیا ہوں۔ مسجدوں میں اعلان کر دیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو کچھ ہی دیر میں ہمارا شاہ رخ مل جائے گا۔''

سارہ کے بجھے چہرے پر رونق آ گئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا سننا چاہتی تھی میں نے اس سے وہی کہا تھا۔ ہمارے ساتھ آنے والا اے ایس آئی نوجوان تھا اور وہ اس وقت گارڈز سے تفتیش کر رہا تھا۔ اس نے آتے ہی کہہ دیا کہ گارڈز نہیں جائیں گے، جب تک پولیس انہیں اجازت نہ دے۔ جس سیکورٹی کمپنی کے یہ گارڈز تھے اسے بھی اطلاع کر دی گئی تھی۔ ان کی ڈیوٹی شام چھ بجے بدلتی تھی اور دوسرے گارڈز آتے تھے۔ ان سے بات کرنے کے بعد اس نے ہماری گلی کے لوگوں کے کوائف پوچھنا شروع کر دیئے۔ میں اسے بتا رہا تھا کہ کس گھر میں کون رہتا تھا اور کیا کرتا تھا۔ اتفاق سے اپنی گلی کے تمام ہی لوگوں سے میری بہت اچھی واقفیت اور سلام دعا تھی اور یہ سب اچھے، شریف اور فیملی والے لوگ تھے۔ مگر اے ایس آئی نے ان سے اپنے انداز میں پوچھ گچھ شروع کر دی۔

جو لوگ اس وقت گھر پر تھے وہ ان سے بات کر رہا تھا۔ اگرچہ اس کا انداز بہت جارحانہ تھا مگر میں اسے روک نہیں سکتا تھا۔ لوگوں کے منہ بن رہے تھے البتہ وہ اس کے سوالوں کے جواب دینے پر مجبور تھے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اس گلی کی بجائے علاقے پر توجہ دے۔ ایک دو بار میں نے کہا تو وہ جھنجلا گیا اس نے کہا۔ ''دیکھیں جناب اگر تفتیش آپ نے کرنی ہے تو آپ کر لیں یا پھر مجھے کرنے دیں۔''

''میں ان لوگوں کو جانتا ہوں۔''

''جناب اس قسم کے نوے فیصد کیسز میں مجرم قریبی رشتے دار یا محلے والے نکلتے ہیں اس لیے ہمیں سب سے پہلے ان پر توجہ دینی پڑتی ہے۔''

میں مجبوراً خاموش ہو گیا۔ واحد بھائی کی پارٹی کے لڑکے آ گئے تھے اور وہ ان سے بات کر رہے تھے۔ میں ان کے پاس آیا تو ایک لڑکے نے مجھ سے کہا۔ ''فرخ بھائی عبدل کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''وہ اس وقت گھر میں نہیں ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہم معلوم کرتے ہیں۔'' لڑکے بولے اور عبدل کے گھر کی طرف چلے گئے۔ واحد بھائی کب سے میرے ساتھ لگے تھے وہ فریش ہونے کا کہہ کر گھر چلے گئے۔ اس دوران میں محلے کے بچوں نے اپنی کارکردگی دکھانی شروع کی۔ انہوں نے ہمارے گھر سے آ کر شاہ رخ کی کئی تصویریں لیں اور پورے علاقے میں ہر جگہ دکھا کر پوچھنے لگے کہ کسی نے اسے دیکھا ہے؟ میرے گھر والے اور سارہ کے گھر والے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر رہے تھے۔ میں نے اپنی شادی کے بعد پہلی بار والد صاحب کو پشیمان دیکھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔

''کاش میں نے تمہیں واپس بلا لیا ہوتا۔''

میں نے سرد آہ بھری۔ ''اس سے کیا ہوتا یہ تو قسمت کا لکھا ہے۔''

''اللہ کرے میرا بچہ مل جائے ......'' والد صاحب بولتے بولتے رک گئے ان کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ ''میں نے کیبل ٹی وی پر ایڈ دلوایا ہے اور اطلاع دینے والے کو پانچ لاکھ روپے انعام دینے کا وعدہ کیا ہے۔''

سب ہو رہا تھا۔ مسجدوں میں اعلان ہو رہے تھے۔ محلے والے تلاش کر رہے تھے۔ اثر و رسوخ پولیس تک پہنچا تو مزید پولیس بھی آ گئی تھی۔ اب وہ پورے علاقے میں لوگوں سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ مگر شاہ رخ کا کہیں سے کوئی اتا پتا نہیں چل رہا تھا۔ سیما باجی تب سے ہمارے گھر میں تھیں۔ محلے میں سارہ کی ان سے سب سے زیادہ بنتی تھی۔ ان کی بھی ایک ہی بچی تھی اور وہ ہمارا دکھ سمجھ رہی تھیں۔ ان کے شوہر ایک ٹیکسٹائل مل میں انجینئر تھے اور وہ بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی کے بعد رات آٹھ نو بجے تک آتے تھے۔ مغرب کی اذان ہوئی تو مجھے بے ساختہ اللہ کی یاد آئی۔ میں گنڈے دار نمازی ہوں کبھی پڑھ لی اور اکثر نہ پڑھی لیکن اس وقت میں بہت خصوع و خشوع سے نماز کے لیے گھر سے نکلا۔

مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کی اور پھر بہت دل سے اللہ سے دعا مانگی کہ اگر ہمارے بچے کی زندگی ہے تو ہمیں اس سے ملوا دے۔ دعا مانگتے ہوئے میں رونے لگا تھا۔ جاننے والے میرے آس پاس جمع ہو گئے۔ مجھے تسلی دینے لگے کہ شاہ رخ مل جائے گا۔ مگر میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ یہ بوجھ کہیں مجھے مار نہ ڈالے۔ اس مسجد سے بھی متواتر شاہ رخ کے بارے میں اعلان ہو رہا تھا جو ہر گھنٹے بعد دہرایا جاتا تھا۔ نماز کے بعد پھر یہ اعلان دہرایا گیا تو میں نے ایک بار پھر دعا کی کہ یہ آخری اعلان ہو اور میرا بچہ مل جائے۔ ہم ہار ہے تو لوگ میرے ساتھ ہی تھے۔ مسجد علاقے سے کچھ ہی دور تھی اور جب ہم وہاں پہنچے تو کچھ شور سنائی دیا۔ شور عبدل والی گلی میں تھا۔ ہم وہاں تک پہنچے تو عبدل کے گھر کے آگے ہجوم موجود تھا۔ ہجوم کے

درمیان میں کچھ ہو رہا تھا۔ ہم بھیڑ کو چیرتے ہوئے وہاں پہنچے تو واحد بھائی کے بلائے لڑکوں کے ساتھ محلے کے لڑکوں نے بھی عبدل کو گھیر رکھا تھا اور بے دریغ مار رہے تھے۔ میرے ساتھ آنے والے کچھ بزرگ آگے بڑھے اور انہوں نے پوچھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو اسے کیوں مار رہے ہو؟''

میں دیکھ رہا تھا کہ عبدل کا حلیہ بگڑ گیا ہے۔ اس کی ناک منہ سے خون بہہ رہا تھا اور اس کا لباس پھٹ گیا تھا۔ لڑکوں نے جو بتایا اس کے مطابق عبدل نہ صرف آج گھر میں رہا تھا بلکہ گشت کرنے والے گارڈ نے اسے دوپہر میں یوں گھر میں داخل ہوتے دیکھا کہ اس کے شانے پر کچھ تھا۔ مگر گارڈ صرف ایک جھلک دیکھ سکا تھا اور پھر عبدل گھر میں چلا گیا اس وقت گارڈ نے اس پر توجہ نہیں دی۔ یہ وہی وقت تھا جب شاہ رخ غائب ہوا تھا۔ مگر جب شاہ رخ کی گم شدگی کا چرچا ہوا ور وہ نہیں ملا تو گارڈ نے یہ بات اے ایس آئی کو بتائی اور پولیس سے یہ بات محلے کے لڑکوں کے علم میں آئی تو وہ مشتعل ہو کر عبدل کے گھر پہنچ گئے۔ گارڈ کے مطابق عبدل نے شانے پر جو چیز لادر کھی تھی اس میں نیلا سا رنگ جھلک رہا تھا اور شاہ رخ نے نیلی اور سفید لائنوں والی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ جب لڑکے عبدل کے گھر پہنچے تو وہ تالا لگا کر کہیں جا رہا تھا لڑکوں نے اسے روکا اور پوچھا تو وہ اس نے انہیں گالیاں دیں اور لڑکے اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ میں نے کہا۔

''تم لوگوں نے اس سے شاہ رخ کے بارے میں پوچھا؟''

''اسی کے بارے میں تو پوچھا تھا تو یہ بکواس کرنے لگا فرخ بھائی۔'' محلے کے ایک لڑکے شہزاد نے کہا۔ وہ مار پیٹ کرنے والوں میں پیش پیش تھا۔ میں نے کہا۔

''اس کے گھر کی تلاشی لو۔''

''میرے گھر میں کوئی نہیں جائے گا۔'' عبدل نے بھر کر کہا تو لڑکوں نے ایک بار پھر اسے مارنا شروع کر دیا۔ ایک بزرگ نے انہیں روکا۔

''مارو مت پہلے اس کے گھر میں دیکھو۔''

لڑکے رکے تھے کہ عبدل نے عجیب حرکت کی اس نے اپنی جیب سے گھر کی چابیاں نکال کر گھر کے اندر پھینک دیں۔ اس بار میں اس کی طرف بڑھا اور اس کا گریبان پکڑ کر پوچھا۔ ''تم نے چابیاں اندر کیوں پھینکی ہیں اندر کیا ہے جو تم دیکھنے نہیں دے رہے؟''

وہ دہشت زدہ لہجے میں بولا۔ ''کوئی میرے گھر میں نہیں جائے گا۔''

''تم کیوں منع کر رہے ہو۔'' میں نے اسے جھنجھوڑا۔ ''تم نے اندر کیا چھپایا ہے؟...... بولو دوپہر میں کیا لے کر گئے تھے اندر؟''

''یہ ایسے نہیں بتائے گا۔'' شہزاد نے اسے پھر پکڑ لیا۔ ''یہ کیا سمجھتا ہے ہم تالا نہیں توڑ سکتے۔''

''اگر تم نے تالا توڑا تو میں پولیس میں رپورٹ کرا دوں گا۔'' عبدل چلایا۔ ''خبردار جو کسی نے میرے گھر کو ہاتھ بھی لگایا۔''

''میرا بیٹا غائب ہے۔''

''تمہارا بیٹا میرے پاس نہیں ہے۔'' عبدل نے یقین سے کہا۔ ''تم بلاوجہ میرے پیچھے پڑے ہو۔''

کچھ لڑکے ایسی چیز کی تلاش میں دوڑے جس سے وہ تالا توڑ سکیں۔ باقی ایک بار پھر عبدل کی دھنائی میں مصروف ہو گئے تھے۔ اتنی مار کھانے کے باوجود اس کی اکڑ کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ چلا رہا تھا اور تالا توڑنے والوں کو دھمکیاں دے رہا تھا۔ ایک لڑکے نے مشتعل ہو کر اس پر وہ سلاخ اٹھائی جو وہ تالا توڑنے کے لیے لایا تھا مگر ایک آدمی نے بروقت اس کا ہاتھ روک لیا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کیا شاہ رخ اندر تھا اور اسے عبدل نے اغوا کیا تھا؟ لڑکے اب تالا توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مزے کی بات ہے کہ پولیس جس نے گارڈ سے یہ معلومات حاصل کی تھیں وہ خود منظر عام سے غائب تھی۔ اسی لیے لوگوں نے قانون اپنے ہاتھ میں لیا ہوا تھا۔ تالا خاصا مضبوط قسم کا تھا اور ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا کسی نے یہ نہیں سوچا کہ دیوار سے اندر کود کر چابی لے آئے۔ بالآخر اس میں سلاخ پھنسا کر دو لڑکوں نے زور لگایا تو وہ ٹوٹ گیا۔ کنڈی کھلتے ہی میں اندر داخل ہوا تھا۔ میں نے چلا کر شاہ رخ کو آواز دی۔

اندر دو کمرے تھے اور دونوں پر تالے لگے ہوئے تھے۔ مگر اب آسانی سے تالے کھل سکتے تھے کیونکہ چابیوں کا گچھا وہیں صحن میں موجود تھا۔ باہر سے شور شرابے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اچانک اے ایس آئی کے گرجنے کی آواز آئی۔ ''تالا کس نے توڑا ہے...... تم لوگوں کو پتا نہیں ہے...... قانونی لحاظ سے یہ جرم ہے؟''

''پولیس......'' میرے ساتھ اندر آنے والے دو لڑکوں نے گھبرا کر کہا اور وہ باہر نکل گئے تھے۔

مگر میں نے چابیاں اٹھائیں اور ایک کمرے کا تالا کھولنے کی کوشش کی۔ دوسری چابی اس میں لگ گئی۔ دروازہ کھول میں نے اندر دیکھا اور تاریکی میں سوئچ بورڈ تلاش کرنے لگا مگر دیوار کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ملی۔ میں نے موبائل نکال کر اس کی ٹارچ آن کی اور اندر داخل ہوا تو پتا چلا کہ وہاں سوئچ بورڈ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ دیواروں پر بے ہنگم بجلی کی تاریں بکھری ہوئی تھیں اور ان سے لائٹ اور پنکھا منسلک تھا یہ تاریں فرش پر بڑے ایکس ٹینشن بورڈ میں لگی ہوئی تھیں۔ کمرے میں کچرہ نما سامان بھرا ہوا تھا اس میں پرانے گدے، رضائیاں، بورے اور نہ جانے کیا کیا تھا۔ میں شاہ رخ کو آوازیں دیتے ہوئے سامان دیکھنے لگا۔ ان چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنا آسان نہیں تھا میں نے پہلے یہ مشکل بلب آن کیا اس کا تار بورڈ سے نکلا ہوا تھا۔ روشنی ہوئی تو میں سامان الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ یہاں بہت سی چیزیں ایسی تھیں جن کے نیچے ایک پانچ چھ سال کے بچے کو آسانی سے چھپایا جا سکتا تھا۔ چیزیں ہٹانے کے دوران میں شاہ رخ کو آوازیں دے رہا تھا۔ مگر نہ تو کوئی جواب آیا اور نہ ہی کہیں کوئی حرکت ہوئی تھی۔ چند منٹ میں میں نے پورا کمرا دیکھ لیا پھر میں باہر آیا تو صحن میں اے ایس آئی دو پولیس والوں کے ساتھ کھڑا تھا اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''جناب آپ غیر قانونی کام کر رہے ہیں۔ کسی کے گھر میں یوں گھسنا جرم ہے۔''

''میں اپنے بیٹے کو تلاش کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور دوسرے کمرے کا تالا کھولا۔ باہر سے عبدل کا شور بدستور سنائی دے رہا تھا مگر اب کوئی اس کے ساتھ مار پیٹ نہیں کر رہا تھا۔ البتہ اسے اندر بھی نہیں آنے دیا تھا۔ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اس کمرے کا حال زیادہ برا تھا۔ یہ رہائشی کمرا تھا مگر اس میں بھی کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ میں نے پھر شاہ رخ کو آواز دی۔ میرے اندر مایوسی سے آنے لگی تھی شاید وہ یہاں نہیں گارڈ کو غلط فہمی ہوئی تھی۔ عبدل کچھ اور لے کر آیا ہوگا مگر گارڈ سمجھا کہ کوئی بچہ ہے۔ مایوسی کے باوجود میں چیزیں الٹ پلٹ رہا تھا۔ ایک طرف لکڑی کی پیٹی تھی۔ اس کا ڈھکن کھلا ہوا تھا میں نے ڈھکن اٹھایا تو اندر بھی گندی پرانی رضائیاں اور کپڑے تھے۔ میں انہیں اٹھانے جا رہا تھا کہ باہر شور سنائی دیا میرا ہاتھ اوپری رضائی کا سرا پکڑ چکا تھا اور میں اسے اٹھا رہا تھا کہ کوئی چلا کر بولا۔

''شاہ رخ مل گیا...... فرخ بھائی کو بتاؤ ان کا بیٹا مل گیا ہے۔''

مجھ پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی اور میرے ہاتھ سے رضائی چھوٹ رہی تھی کہ میری نظر اس کے نیچے گئی جہاں دو ننھے منے سے پاؤں جھانک رہے تھے اور وہ ہل رہے تھے۔ میں نے بے ساختہ رضائی الٹی تو ایک چار پانچ سال کی بہت پیاری اور معصوم سی بچی اس حالت میں لیٹی ہوئی تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ اس کے منہ پر ٹیپ چپکا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں لیکن وہ سانس لے رہی تھی اور کسی قدر ہوش میں تھی۔ میں نے رضائی ایک طرف پھینک کر اسے پیٹی سے نکالا تو اس کا جسم بالکل سرد ہو رہا تھا۔ حالانکہ وہ خاصی گرمی میں رضائی تلے لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے پہلے اس کے منہ سے ٹیپ اتارا۔ وہ سسکیاں لینے لگی تھی اور میں اس کے نازک سے ہاتھ پیروں سے بندھی رسی کھول رہا تھا کہ مجھے خیال آیا اور میں نے چلا کر کہا۔

''یہاں ایک بچی ہے عبدل کو پکڑو۔''

بچی کا سنتے ہی پولیس والے اندر گھس آئے تھے۔ ایک پولیس والا جلدی سے پانی لے آیا اور میں نے تھوڑا تھوڑا کر کے بچی کو پلایا تو وہ ہوش میں آئی اور پھر چیخ چیخ کر رونے لگی۔ میں اسے تسلیاں دیتا اور بہلاتا ہوا باہر آیا۔ لوگ بچی کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ جیسے ہی شاہ رخ کے ملنے کی اطلاع آئی لوگوں نے عبدل کو چھوڑ دیا اور وہ خاموشی سے سرک رہا تھا جب میں نے چلا کر اسے روکنے کو کہا تب اس نے بھاگنے کی کوشش کی مگر لڑکوں نے اسے پھر پکڑ لیا اور میں نے بتایا کہ میں نے بچی کو اندر کس حال میں پایا تو ایک بار پھر لوگوں نے اشتعال میں آکر اسے مارنا شروع کر دیا تھا۔ پولیس نے بروقت آکر اسے چھڑایا ورنہ لوگ اسے مار ہی ڈالتے۔ میں نے کہا۔ ''یہی بتائے گا کہ بچی کو کہاں سے لایا ہے۔''

''اس کا تو باپ بھی بتائے گا۔'' اے ایس آئی بھی مشتعل تھا۔

بچی نے نیلے رنگ کا فراک پہنا ہوا تھا اور نیلی نیکر تھی میں نے محسوس کیا کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے وہ محفوظ تھی شاید عبدل کو موقع نہیں ملا اور شاہ رخ کی گمشدگی کا شور ہوا تو وہ ڈر گیا تھا۔ ورنہ شاید اب تک وہ اپنی شیطانیت پوری کر چکا ہوتا۔ بچی اب خاموش تھی اور مجھ سے لپٹی ہوئی تھی اس نے کسی اور کے پاس جانے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے شاہ رخ کی بے تابی تھی اس لیے

میں اسے لے کر ہی روانہ ہو گیا۔ گھر میں جشن کا سماں تھا۔ شاہ رخ سارہ کی گود میں دبا ہوا تھا اور سب اس کے گرد جمع تھے۔ سب میری گود میں بچی کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ سارہ نے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

میں نے مختصر لفظوں میں بتایا کہ بچی کہاں سے اور کس حالت میں ملی تھی۔ باقی یہ کس کی بچی تھی یہ تو میں بھی نہیں جانتا تھا۔ سارہ ابھی کچھ دیر پہلے اس مرحلے سے گزر چکی تھی اور اسے اندازہ تھا کہ بچی کے ماں باپ پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اس نے شاہ رخ کو الگ کر کے بچی کو گود میں لے لیا۔ اس بار وہ آرام سے چلی گئی۔ ورنہ پہلے مجھے نہیں چھوڑ رہی تھی۔ میں نے شاہ رخ کو سینے سے لگا لیا۔ میرے دل میں جیسے ٹھنڈ سی پڑ گئی۔ سارہ بچی کو پیار کرتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی کہ وہ کون ہے۔ اس کا خوف کم ہوا تو اس نے بولنا شروع کیا مگر اسے بس اتنا بتا تا آرہا تھا اس کا نام ایشل ہے اور اس کی ماں کا نام ثمینہ ہے باپ کو وہ پاپا کہہ رہی تھی۔ اپنے لباس اور انداز سے وہ کسی اچھی فیملی کا حصہ لگ رہی تھی۔ ابھی اس کے ماں باپ کو تلاش کرنا تھا مگر وہ ہمارے پاس محفوظ ہی تھی۔ جلد یا بدیر اس کے گھر والے بھی مل جاتے۔

شاہ رخ کی گم شدگی کی کہانی حیران کن تھی۔ جب اس نے سیما باجی کی بیٹی کو دھکا دیا اور سارہ نے اسے دھمکی دی کہ وہ ابھی اسے دیکھتی ہے تو وہ ڈر کے مارے ان کے بیڈ کے نیچے چھپ گیا۔ پھر اس کی ڈھونڈ کا شور مچا تب بھی وہ یہی سمجھا کہ اسے سزا کے لیے تلاش کیا جا رہا ہے۔ وہ بیڈ کے نیچے ہی چھپا رہا۔ پھر سیما باجی گھر کو تالا لگا کر ہمارے ہاں آگئیں اور سارہ کے ساتھ رہیں۔ شاہ رخ ان کے گھر میں بند رہا۔ پورا محلہ دیکھ لینے کے بعد بھی کسی کو خیال نہیں آیا کہ سیما باجی کے ہاں دیکھ لیا جائے۔ سب نے یہی سوچا کہ وہیں سے تو غائب ہوا تھا اس لیے وہاں دیکھ لیا ہوگا مگر سارہ سمجھی تھی کہ وہ باہر نکل گیا ہے۔ یوں بچہ بغل میں تھا اور ہم اسے سارے شہر میں تلاش کر رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے سیما باجی کے شوہر رمیز بھائی گھر آئے اور تالا کھول کر اندر گئے تو انہیں بیڈ روم میں کسی بچے کے رونے کی آواز آئی اور جب انہوں نے آواز کے تعاقب میں بیڈ کے نیچے دیکھا تو وہاں شاہ رخ موجود تھا۔ اتنی دیر سے بند رہنے کی وجہ سے وہ خوفزدہ تھا اور جب اس نے کسی کے آنے کی آواز سنی تب بھی باہر نہیں نکلا مگر رونے لگا تھا۔ اسے پا کر رمیز بھائی بھاگتے ہوئے ہمارے گھر تک لائے۔ سارہ شاہ رخ کو دیکھ کر پاگل ہو گئی تھی۔ اس کے بعد شور مچ گیا۔ میری تلاش میں لوگوں کو دوڑایا گیا اور کسی نے اتنا نہیں سوچا کہ مجھے کال کر کے اطلاع دے دے۔ میرے پاس موبائل تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر باہر سے چند سیکنڈ پہلے بھی اطلاع آجاتی تو میں پیٹی کی رضائی نہ اٹھاتا جس کے تلے ایشل تھی۔ اس بار پولیس نے عبدل کے ساتھ صحیح سے تفتیش کی اور اس نے اگل دیا کہ اس نے بچی کہاں سے اٹھائی تھی۔ وہ اسے چپس اور ٹافیوں کے بہانے لے آیا تھا۔ علاقے تک وہ اسے چلا کر لایا اور جب گھر کے پاس آیا اور بچی نے رونا شروع کیا کہ اسے امی کے پاس جانا ہے تو اس نے اسے کلوروفارم سونگھا کر بے ہوش کیا اور کندھے پر لاد کر گھر میں لے گیا۔ اس کی بدقسمتی اور ایشل کی خوش قسمتی کہ گارڈ نے عبدل کو دیکھ لیا۔ پھر شاہ رخ کی گم شدگی کا شور اٹھا تو وہ گھبرا گیا اور اس نے ایشل کو ہاتھ پاؤں باندھ کر پیٹی میں رضائی تلے ڈال دیا۔ اس کے باوجود اس کے دل میں چور تھا اور اس نے گھر کو تالا لگا کر وہاں سے نکلنا چاہا مگر محلے والے بروقت پہنچ گئے۔

شاہ رخ محفوظ تھا مگر اس کے توسط سے اللہ نے اس معصوم سی بچی کو محفوظ رکھا۔ اس نے مجھے وسیلہ بنایا۔ پولیس نے جلد اس کے ماں باپ کا پتا چلا لیا۔ وہ بھاگتے دوڑتے ہمارے گھر تک آئے تھے کیونکہ سارہ نے بچی کو پولیس کی تحویل میں دینے سے انکار کر دیا تھا اور وہ بھی سارہ اور مجھ سے مانوس ہو گئی تھی بلکہ رات گئے وہ شاہ رخ کے ساتھ کھیلنے اور شوخیاں دکھانے لگی تھی۔ ایشل کے ماں باپ میرا شکریہ ادا کرتے نہیں تھک رہے تھے کہ میں نے جیسے انہیں نئی زندگی دے دی مگر یہ سب خدا کا کرم تھا۔ وہ سب کے بچوں کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ شاہ رخ کے ملتے ہی بابا نے مجھ سے کہا۔

''تم ہمارے ساتھ چلو گے۔ بس اب تم الگ نہیں رہو گے۔''

مزید چند دن بعد عبدل نے اس بچی کے قتل و زیادتی کا اقرار بھی کر لیا جس کی لاش جھاڑیوں سے ملی تھی۔ وہی اسے اغوا کر کے لے گیا تھا مگر سخت نگرانی کی وجہ سے وہ لاش باہر نہیں لے جا سکا اور اس نے وہیں جھاڑیوں میں پھینک دی۔ ان دنوں اس کے خلاف مقدمہ چل رہا ہے اسے یقیناً سزائے موت ہوگی مگر بچ کی سزائے موت کب ہوگی اس کا کچھ پتا نہیں ہے۔

حوادثِ زمانہ

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
یہ روداد میرے پڑوس میں رہنے والی نصرت کی ہے۔ اس نے جب اپنی رودادِ زندگی سنائی تو مجھے کہانی جیسا مزہ آیا اور میں نے اسے سرگزشت کے لیے رقم کردیا اگر مناسب سمجھیں تو اسے سرگزشت کا حصہ بنا دیں۔
ڈاکٹر عبدالحفیظ

میرے ابو کو یورپ جانے کا اس قدر شوق تھا کہ وہ اس کی خاطر زندگی کی بازی لگا بیٹھے۔ ہمارا اچھا خاصا گزارہ ہو رہا تھا۔ اپنا فلیٹ تھا اور ابو ٹھیک ٹھاک کماتے تھے۔ یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ 45 سال کی عمر میں بھی وہ یہ فیصلہ کرتے ہوئے ذرا ہچکچائے اور نہ ہی ان کو کچھ خوف آیا۔ وہ امی کے لاکھ منع کرنے کے باوجود ایک ایجنٹ کے ذریعے براستہ ایران ترکی پہنچے اور وہاں سے لانچ کے ذریعے کسی یورپی ملک جارہے تھے کہ چالیس آدمیوں کا یہ قافلہ سمندر کی

نذر ہوگیا۔ لوگ۔ میری اس بات کو مانیں یا نہ مانیں مگر میں تو ان کے اس قدم کو سراسر خودکشی ہی کہوں گی۔

ہم تین بہن بھائی تھے۔ میں سب سے بڑی تھی۔ میرا نام نصرت ہے۔ مجھ سے چھوٹا بھائی تھا جس کا نام امجد اور چھوٹی بہن مسرت ہے۔ یہ دونوں مجھ سے بہت چھوٹے ہیں۔ ان کی عمریں بالترتیب 10 اور 8 سال تھیں۔ یہ خدا کا بڑا احسان تھا کہ اس مہنگائی کے زمانے میں ہمارے سر پر چھت موجود تھی۔ ابو نے یہ خوب صورت فلیٹ خریدا تھا۔ یہ شہر کے عین وسط میں ہے۔ ابتدائی ایام میں تو گھر میں موجود جمع پونجی سے گزارہ ہوا پھر بعد میں بگڑتے حالات اور مہنگائی کے باعث امی کو اپنے زیور فروخت کرنا پڑے جس کے بعد دوسری اشیاء کی باری آتی رہی۔ نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ گھر کے فالتو کمبل اور میرے اَن سلے کپڑے تک اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے بیچ دیے گئے۔ ہمارے زیادہ تر رشتے دار بھارت میں تھے جو چند ایک یہاں تھے وہ خود ہماری طرح اس مہنگائی میں بمشکل اپنا گزارہ کر پا رہے تھے۔ امی کے لیے مصیبتوں کا گویا ایک پہاڑ کھڑا تھا۔ گھر میں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ بیٹا بہت چھوٹا تھا۔ اب میں ہی وہ واحد فرد تھی جسے اپنے کاندھوں پر یہ بوجھ اٹھانا تھا۔ میں سب سے بڑی تھی یا شاید ابو کی موت کے بعد بڑی ہوگئی تھی۔ کیوں کہ میں نے ابھی صرف انٹر ہی پاس کیا تھا۔ لہٰذا سمجھ لیں کہ میں کتنی بڑی رہی ہوں گی۔ مجھے اس بے رحم اور سفاک معاشرے اور زمانے کی کچھ خبر نہیں تھی۔ جب گھر کا سامان بھی ٹھکانے لگ چکا تب فلیٹ کے بارے میں سوچا جانے لگا۔ وہ ہماری ضرورتوں سے زائد تھا۔ اچھے علاقے میں ہونے کے باعث اس کی قیمت زیادہ مل سکتی تھی۔ یہی فیصلہ کیا گیا کہ اسے فروخت کرکے کسی چھوٹے اور پسماندہ علاقے میں مکان لے لیا جائے۔ جہاں پر اشیائے ضرورت بھی سستی ہوتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ امی خود کچھ کام کرنا چاہتی تھیں جو اس علاقے میں رہتے ہوئے ممکن نہ ہوتا چنانچہ ہم سب وہاں سے ایک دوسرے علاقے میں منتقل ہو گئے۔ امی کی تعلیم کچھ بھی نہ تھی۔ لہٰذا وہ سوائے گھروں میں کام کرنے کے کچھ بھی نہ کر سکتی تھیں۔ چنانچہ اس علاقے میں آکر انہوں نے ہمت کی اور آس پاس کے اچھے گھروں میں اوپری کام کرنے لگیں۔ وہ صبح کو نکلتیں اور دوپہر 4 بجے تک لوگوں کے گھروں کا بچا کھچا کھانا لے کر گھر واپس آجاتیں۔ میں نے کئی مرتبہ انہیں چوری چوری روتے دیکھا تھا۔ یقیناً لوگوں کا بچا ہوا کھانا ہمیں دیتے ہوئے ان کے دل پر قیامت گزر جاتی ہوگی۔ یہ وہ کھانا ہوتا تھا جو لوگ اپنے بچوں کو کھلانا پسند نہیں کرتے اور اپنے نوکروں کو دے دیتے ہیں۔

مجھ سے امی کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ میں نے ان سے بات کی کہ میں ملازمت کر لیتی ہوں اس طرح ان کا کچھ بوجھ ہلکا ہوجائے گا اور میری تعلیم کسی کام آجائے گی۔ تھوڑی سی ردوقدح کے بعد انہوں نے مجھے ملازمت کرنے کی اجازت دے دی۔

میں نے نوکری کے لیے گھر سے قدم باہر نکالے تو اندازہ ہوا کہ لوگ کس طرح کے جال بچھائے بیٹھے ہیں۔ یہ ہوس پرست مجھے لوٹ کا مال سمجھتے اور مختلف ذریعے سے اپنا الو سیدھا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے۔ کوئی باتوں ہی باتوں میں مجھے پھانسنا چاہتا تھا تو کوئی دولت کے سنہری جال میں قید کر کے میری عزت سے کھیلنے کے درپے تھا۔ میں نے دو مختلف جگہوں پر ملازمت کی اور بمشکل ایک ایک ماہ ہی گزار سکی۔ یہ دو ماہ مجھ پر کچھ اس طرح گزرے کہ بسا اوقات میں خودکشی تک کا سوچنے لگتی تھی مگر پھر یہ خیال آتا کہ زندگی ایک بار ملتی ہے، مشکلات سے گھبرا کر اسے موت کی نذر کر دینا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہوتا۔

یہ میری تیسری ملازمت تھی۔ امپورٹ ایکسپورٹ فرم تھی۔ انہوں نے نوکری کے لیے اخبار میں اشتہار دیا تھا جس کے جواب میں، میں نے اپلائی کیا اور رسمی کارروائیوں کے بعد مجھے ملازمت مل گئی تھی۔ تنخواہ بہت اچھی تھی۔ دیکھنے میں نجمی صاحب جو کمپنی کے پارٹنر اور میرے باس تھے۔ نیک اور بردبار نظر آتے تھے۔ میں بہت خوش تھی کہ خدا نے میری سن لی ہے۔ دفتر میں میرے اور نجمی صاحب کے علاوہ ایک بزرگ چپراسی تھا۔ نجمی کا پارٹنر مسٹر حمید تو باہر کے کام ہی میں مصروف رہتا تھا۔ کبھی کبھی آدھ گھنٹے کے لیے آجاتا تھا۔ کام مشکل نہ تھا۔ پھر بھی نجمی صاحب نے مجھے بڑے خلوص سے سمجھایا۔ میں بھی کام محنت سے کرتی تھی اور اگر کچن کی صفائی چپراسی ٹھیک طرح سے نہیں کرتا تھا، میں وہ بھی فارغ وقت میں کر دیتی تھی۔

ہمارا دفتر چوتھے فلور پر تھا۔ نجمی صاحب میرے کام سے بہت خوش تھے۔ حمید صاحب سے میری بڑی تعریفیں کرتے۔ حقیقت یہ تھی کہ کام میں وہ میری ابھی تک بہت مدد کر رہے تھے اور بڑے نرم لہجے میں مجھے سمجھاتے۔ نہیں

اکیس دن ہوئے تھے مجھے یہاں کام کرتے ہوئے کہ میری بدنصیبی مجھے یہاں لے آئی۔ ہوا یوں کہ میں کافی بنا کر لائی تو نجمی صاحب بڑے خوش گوار موڈ میں تھے۔ کیوں کہ میں تو 9 بجے آجاتی تھی وہ 11 بجے کے بعد آتے تھے۔ نور محمد آج نہیں آیا تھا۔ وہ بیمار تھا۔ انہوں نے ضد کر کے مجھ سے کافی بنوائی اور ساتھ بیٹھ کر پینے کے لیے بھی کہا۔

''دیکھو نصرت تم مجھے ہر وقت صاحب صاحب کہہ کر مت مخاطب کیا کرو۔ ہم سب ایک ہیں اور تم ابھی تک ماحول کو سمجھ نہیں پا رہی ہو۔ اس لیے ضروری ہے ہم اب ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور تم مجھے نجمی کہہ کر مخاطب کر سکتی ہو۔''

میں ابھی تک ان کے پاس ہی کھڑی تھی۔ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کو کہا تو میری پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ بجائے میں خوش ہوتی مجھے بدنصیبی کی بو آنے لگی۔ میں نے جلد ہی خود کو ہیجان سے نکالا اور ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ سلائس کا ایک ٹکڑا کاٹ کر کھاتے ہوئے نجمی کی طرف دیکھا تو وہ مجھے پھر سمجھانے لگے۔ ''یہ دنیا کیا عجیب دنیا ہے۔ یہاں ہر انسان غیر محفوظ ہے۔ کوئی غربت سے پریشان ہے، کوئی اپنی بیوی کی بیماری سے پریشان ہے اور کوئی......'' نجمی نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑا تھا اور کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے بڑی رکھائی سے بولے۔ ''میں تمہارا دکھ سمجھتا ہوں۔ تم دل چھوٹا نہ کرو۔ میں تمہاری تنخواہ جلد ڈبل کروا دوں گا۔ تم ذرا، جب حمید آیا کرے تو ان سے تھوڑا مسکرا کر۔ میرا مطلب ہے......''

میں چند سیکنڈ تو مبہوت رہی نجمی کی باتیں مجھ پر بڑی شاق گزر رہی تھیں لیکن میں نے یہ محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔ یہ اس لیے کہ مجھے پہلے بھی ایسا تجربہ ہو چکا تھا۔ اس وقت میں نے اشتعال میں آکر نوکری چھوڑ دی تھی لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ تنخواہ تک خود کو جیسے تیسے بھی ان لوگوں کو برداشت کرنا تھا۔ نور بابا دوسرے دن بھی آفس نہیں آیا تو مجھے کچھ گڑبڑ سی لگی۔ پھر میں نے دل میں سوچا کہ میں کوئی ہاٹ کیک نہیں ہوں۔ دیکھا جائے تو آج میں نے صفائی بھی نہیں کی۔ صرف اپنی میز اور کرسی پر کپڑا مار کر بیٹھ گئی اور اپنا کام کرنے لگی مگر میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر کچن میں گئی اور ایک کپ چائے بنا کر میز پر رکھ دی۔ اگر والد صاحب آدھی چھوڑ پوری کے چکر میں نہ پڑتے تو آج ان کی لاڈلی بیٹی اس مشکل میں نہ ہوتی۔ ابو مجھے اکثر بیٹی نہیں بیٹا کہا کرتے تھے اور حقیقت میں اب مجھے اس چھوٹے سے خاندان کا بیٹا بن کر زندہ رہنا تھا۔ میں کچھ دیر تذبذب کے عالم میں کھوئی رہی۔ پھر میں نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر کام شروع کر دیا۔

دوپہر دو بجے نجمی اور حمید صاحب دونوں ہاتھ میں کچھ کھانے کی چیزیں لے کر آگئے۔ مجھے کام میں مصروف دیکھ کر نجمی بولے۔ ''بھئی کام وام چھوڑو۔ پہلے پیٹ پوجا پھر کام دوجا۔ جلدی سے اٹھ جاؤ اور یہ کھانا لگاؤ۔''

وہ کچھ زیادہ شوخ ہو رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ اٹھ کر کچن میں گئی تو وہ بھی آگئے اور خود ہی برتنوں کو ترتیب سے رکھ کر مجھے اندر والے روم میں آنے کو کہا۔ یہ روم صرف حمید صاحب کے لیے مخصوص تھا۔ نجمی نے میرے سے پہلے ہی کمرے میں دسترخوان بچھا دیا تھا۔ میں کھانا وغیرہ رکھ کر آگئی کیوں کہ میں اپنا لنچ گھر سے ساتھ لاتی تھی۔ میں ابھی کرسی پر بیٹھ بھی نہیں پائی تھی کہ نجمی نے مجھے بلایا۔ ''یہ کیا ہے؟ میں نے کل کہا تھا کہ اب تم خود کو اس ٹیم کا حصہ سمجھو، ایسی بے رخی، حمید کیا سوچے گا۔''

وہ ایسے بول رہے تھے جیسے ہم سال دو سال سے ساتھ ہیں۔ مجھے سات، آٹھ دن جیسے تیسے کاٹنے تھے۔ میں ان کے ساتھ جا کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ کھانا کھاتے ہی نجمی اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''آج میں آپ لوگوں کو چائے بنا کر پیش کروں گا۔ کیوں کہ ان یادگار خوشگوار لمحوں کو میں مزید تقویت دینا چاہتا ہوں۔'' مگر اس سے پہلے کہ نجمی کچن میں جاتے، میں کھڑی ہوئی اور بولی۔

''نہیں سر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میرے ہوتے ہوئے آپ کچن میں کام کریں۔ آپ پلیز بیٹھیے۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' نجمی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا اور بیٹھ گئے۔ پھر چائے پر ہلکی پھلکی باتیں ہوتی رہیں۔ یوں ایک دن خیریت سے اور گزر گیا۔

رات کو میں خود سے سوالوں جوابوں کی جنگ لڑتی رہی مگر سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ نجمی مجھ سے اب بات کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ ویسے بھی وہ نمبر 2 قسم کا آدمی تھا۔ اچھا خاصا پڑھا لکھا بندہ ایسے کام کیوں کرتا ہے؟ میری سمجھ سے باہر تھا۔ اس کی اپنی ایک چھوڑ دو بیٹیاں تھیں جو ہائی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ آج نہ سہی کل وہ جوان ہو جائیں گی۔ اس دن آتے ہی نجمی نے نحوست پھیلا دی۔

ایک فائل لانے کو کہا اور ساتھ بیٹھنے کی فرمائش کر دی۔ میں ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ فائل کے اندر سے ایک انوائس ہاتھ میں لیتے ہوئے بولے۔ ''نصرت ہر لڑکی نے شادی تو کرنی ہی ہوتی ہے اور ایسے اچھے موقعے بار بار نہیں ملتے۔ حمید صاحب تم کو کہاں سے کہاں پہنچانا چاہتے ہیں یہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔'' پھر میرے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے تھوڑے توقف کے بعد بولے۔ ''وہ کوئی بوڑھا تھوڑی ہے۔ وہ تم سے شادی ضرور تا کر رہا ہے۔ اس کی بیوی بیمار رہتی ہے۔ بیماری نے اسے چڑچڑی بنا دیا ہے۔''

وہ مسلسل بولے جا رہے تھے کہ میں نے کہا۔ ''میں چائے بناؤں؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں مگر دو کپ بنا کے لانا اکیلے چائے پینے میں مزہ نہیں آتا۔'' ابھی نجمی نے بات ختم بھی نہیں کی تھی کہ میں چائے بنانے کے لیے اٹھ گئی۔ میرا دل تو چاہ رہا تھا۔ چائے نہیں کچلا کھلا دوں۔ مرتی کیا نہ کرتی۔ مجھے یہ باتیں کچھ دن برداشت کرنی تھی۔ میں ابھی چائے بنا ہی رہی تھی کہ نور محمد آ گیا۔ نجمی نے بلند آواز میں مجھے پکارا۔ ''نصرت تم آ جاؤ نور محمد آ گیا ہے۔''

میں آ کر سامنے بیٹھ گئی۔ ''ہاں تو تم نے کیا سوچا؟''

''سر میری امی ابھی بیمار ہیں اور یہ میری سمجھ تو......''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ تمہاری امی اللہ کرے جلد تندرست ہو جائیں پھر تم بات کر لینا کوئی پرابلم ہو تو کسی تکلف کے بغیر ہمیں بتا دینا۔ ہم شیئر کر لیں گے۔''

نجمی کی بات ختم ہوتے ہی موقع ضائع کیے بغیر میں نے آہستہ سے کہہ دیا۔ ''سر کچھ ایڈوانس رقم مل جائے......!''

''ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔'' نجمی نے پانچ ہزار روپے میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''ان سے کام چل جائے گا؟''

''جی سر چل جائے گا۔ بہت بہت شکریہ۔''

''اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔ تم ہمیں ہر مشکل میں کام آنے والا پاؤ گی۔'' تھوڑی دیر بعد ہی نجمی کچھ کاغذات لیے چلے آئے۔ نجمی کے جانے کے بعد میں نے آج کا کام جلدی ختم کر کے بابا نور محمد، جنہوں نے کئی دن بعد آفس جوائن کیا تھا ان کو بلا کر ساری بات بتائی تو وہ بولے۔

''بیٹا! میں تو اسی دن سمجھ گیا تھا جس دن تمہیں جاب ملی تھی مگر میری مشکل یہ ہے کہ مجھے نوکری کرنی ہے اور اس کے لیے حکم زباں بندی ہے مگر تمہاری خاطر میں زبان بند نہیں رکھوں گا۔ کیوں کہ تم یتیم ہو اور مجبوری میں آئی ہو۔ حمید صاحب بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ ان کی ٹرانسپورٹ کمپنی ہے۔ بیس پچیس گاڑیاں چلتی ہیں اور شیئرز کا کام بھی کرتے ہیں مگر عیاش ہیں۔ میں تو حیران تھا کہ تمہارے ساتھ اتنے دنوں میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ یہ بہت عیاش لوگ ہیں۔ تین مہینے پہلے حمید صاحب کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ جو ان کے چہرے پر نشان ہے یہ ایکسیڈنٹ میں ہی چوٹ لگی تھی اور بھی بہت چوٹیں آئی تھیں مگر بچ گئے۔ ایک ہفتہ اسپتال میں رہے۔ جب سے انہوں نے توبہ کر لی ہے۔ شاید اسی لیے شادی کا کھیل کھیلنا چاہ رہے ہیں۔ اگر دولت کا لالچ ہے تو دولت یہاں بہت ہے مگر ان وحشیوں کا کیا بھروسا؟''

میں نے بابا نور محمد کا شکریہ ادا کیا اور آج بھی اس بزرگ کی احسان مند ہوں۔ تنخواہ کے بعد میں نے نوکری چھوڑ دی۔ دوسرے دن میری سہیلی یاسمین بھی آ گئی۔ یہ میری چوتھی کلاس کی کلاس فیلو ہے۔ بہت ہی ہنس مکھ، گورا رنگ اور بڑی بڑی عنابی آنکھوں نے اسے اور حسین بنا دیا تھا۔ کھاتے پیتے لوگ تھے۔ ان کے والد کا اپنا کاروبار تھا۔ ابو کی وفات کے بعد جب بھی وہ آتی دوپہر کے وقت آتی اور ہمارے لیے بریانی اور فروٹ وغیرہ ضرور لاتی۔ یہ سارا دن فلک شگاف قہقہے لگاتی اور ہنسا ہنسا کر ہمارے پیٹ میں درد کر دیتی۔ بہت زندہ دل ہے۔ آج بھی وہ کھانا ساتھ لے کر فلک شگاف قہقہوں کے ہمراہ گھر میں داخل ہوئی۔ امی کو سلام کرتے اور کھانا کچن میں رکھنے کے بعد مجھے میرے کمرے میں دھکیلتے ہوئے بولی۔ ''اب بتاؤ کیوں نوکری چھوڑی؟''

''وہی پرانی کہانی یار۔'' میں نے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بتایا تو اس نے ایک لمبی سانس لی اور تھوڑی ہی خاموشی کے بعد بولی۔

''اس طرح تو بڑی مشکل ہو جائے گی نوکری تمہاری ضرورت ہے مگر تم فکر نہ کرو اللہ بہتر کرے گا۔'' اس نے مجھ سے ساری کہانی مزے لے کر سنی۔ پھر زوردار قہقہہ مارتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''مجھے امی کو لے کر ڈاکٹر کے پاس بھی جانا ہے۔'' ہاتھ ملا کر خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔ میرے

دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔
چار بجے میں ماریہ سے ملنے اس کے اسکول چلی گئی۔ ماریہ اسکول کی پرنسپل ہے۔ اس نے مجھے پڑھانے کی آفر دی تو میں نے ہاں کر دی۔ کیوں کہ اسکول کا ماحول بہت اچھا تھا۔ یہ دوپہر کی شفٹ کا اسکول تھا۔ 15 سو روپے تنخواہ کے ساتھ دونوں بہن بھائیوں میں سے ایک کی فیس الاؤنس میں ہو گئی۔ اس طرح اٹھارہ سو روپے بن جاتے تھے۔ اس ملازمت سے میں نے خود کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ یہاں وقت کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ صبح گھر کا کام کاج ختم کرتے ہی اسکول ٹائم ہو جاتا پھر میں تیار ہوتی۔ بہن بھائیوں کو ساتھ لیتی اور اسکول پہنچ جاتی۔ جیسے تیسے چھ ماہ گزر گئے۔ رفیق صاحب کی دکان سے دال، چاول، آٹا، تیل اور ضروریات کی چیزیں آتی تھیں۔ ان سے پرانے تعلقات تھے وہ منع نہیں کرتے تھے ورنہ عام لوگوں کا تو وہ پانچ تاریخ تک اگر پیسے نہ آئے تو کھاتا بند کر دیتے تھے۔ ہمارے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ امجد علی کو جب بھیجتی تو وہ سامان دے دیتے۔ انہوں نے بل بھی بھیج دیا تھا۔ ہماری طرف چار ہزار نکل رہے تھے۔ جس کا مطلب تھا پیسے ادا کر دیے جائیں۔ میں نے بل اپنے پاس ہی رکھا۔ امی کو نہیں دیا۔ امی کو ویسے بھی اب ہائی بلڈ پریشر رہتا تھا۔ بات سمجھ سے باہر تھی۔ ادھر مسرت اور امجد کے یونیفارم کا بھی مسئلہ تھا۔ کتابیں تو اسکول سے پرانی دستیاب ہو گئی تھیں۔ اس کشمکش میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران میں سودے کی خاص ضرورت پیش نہیں آئی مگر اب ضرورت تھی۔ اس بار سودا لینے میں خود گئی۔

''سلام انکل۔'' میں نے مسکراتے ہوئے ایک ہزار روپے دیے اور پھر سامان کی لسٹ بھی تھما دی۔ وہ وعلیکم السلام کہہ کر مسکراتے ہوئے بولے۔ ''ایک ہزار لائی ہو اور بارہ سو کے سامان کی لسٹ ہے۔''

جواب میں، میں نے مسکرانے کے سوا کوئی جواب نہ دیا اور اس طرح میں سامان لے کر آ گئی۔ وقت زیادہ جب بھی مشکل ہوا تو خدا ہم پر مہربان ہو گیا۔ نعمان صاحب، ابو کے دور کے رشتے دار اچانک ایک دن ہمارے گھر تشریف لائے اور جاتے ہوئے ایک لفافہ امی کو دے گئے۔ لفافہ کھولا تو اس میں تین ہزار روپے تھے۔ اس کے بعد نعمان صاحب ہر ماہ باقاعدگی سے تین ہزار روپے بند لفافے میں دینے لگے۔ انکل کسٹم میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ ہم ایک بار گلشن اقبال میں ان کی کوٹھی میں ان کی بڑی صاحب زادی

ایک دفعہ مجھے ایک دوست کے پوتے کی شادی پر اسلام آباد جانا ہوا۔ اسلام آباد پہنچ کر مجھے پیغام ملا کہ ایک بابا آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں بابوں کا بڑا دیوانہ ہوں۔ چنانچہ میں ان سے ملنے ان کے پاس گیا۔ جب میں ان کے پاس گیا تو کہنے لگے۔ تم بڑی مٹھار مٹھار باتیں بناتے ہو۔ میں تم کو Warn کرتا ہوں۔ (یہی لفظ انہوں نے استعمال کیا)۔ تم لوگ بہت بے خیال ہو گئے ہو اور ایک بہت خوفناک منزل کی طرف رجوع کر رہے ہو۔ میں تم کو بتا تا ہوں یہ پاکستان ایک معجزہ ہے، یہ جغرافیائی حقیقت نہیں ہے۔ تم بار بار کہا کرتے ہو ہم نے یہ کیا، پھر یہ کیا، پھر سیاست کے میدان میں یہ کیا، پھر اپنے قائد کے پیچھے چلے، ہم نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ ایسے مت کہو۔ پاکستان کا وجود میں آنا ایک معجزہ تھا، اتنا بڑا معجزہ ہے جتنا بڑا قوم ثمود کے لیے اونٹنی کے پیدا ہونے کا تھا۔ اگر تم اس پاکستان کو حضرت صالح کی اونٹنی سمجھنا چھوڑ دو گے تو نہ تم رہو گے نہ تمہاری یادیں رہیں گی۔ تم نے صالح کی اس اونٹنی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ باون برس گزر گئے تم نے اس کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا ہوا ہے جو ثمود نے کیا تھا۔ اندر کے رہنے والوں اور باہر کے رہنے والوں دونوں کو Warn کرتا ہوں، تم سنبھل جاؤ، ورنہ وقت بہت کم ہے۔ اس اونٹنی سے جو تم نے چھینا ہے اور جو کچھ لوٹا ہے۔ اندر کے رہنے والو اس کو لوٹاؤ اور اس کو دو اور باہر کے رہنے والو۔ ساؤتھ ایشیا میں سارے ملکوں کو Warn کرتا ہوں، اس کو کوئی عام چھوٹا سا، معمولی سا جغرافیائی ملک سمجھنا چھوڑ دیں۔ یہ حضرت صالح کی اونٹنی ہے۔ ہم سب پر اس کا ادب اور احترام واجب ہے۔ اس کو ایک معمولی ملک نہ سمجھنا اور اس کی طرف رخ کر کے کھڑے رہنا اور اب تک جو کوتاہیاں ہوئی ہیں ان کی معافی مانگتے رہو اور اس کو Recompensate کرو۔ میں ان کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا اور خوف زدہ ہو کر کھڑا رہا اور پھر ان کو سلام کر کے سر جھکا کے واپس چلا آیا۔
اقتباس: زاویہ از اشفاق احمد

نورین کی شادی پر گئے تھے۔ بڑے بڑے چار بیڈ روم بڑا سا ٹی وی لاؤنج اور لان میں بہت سے پھولوں کے پودے تھے جن میں گلاب کے پودے بہت نمایاں تھے۔ نعمان صاحب ہمارے لیے فرشتے سے کم نہ تھے۔ بھائی کو الگ خرچی دے جاتے۔ اسی دوران میں، میں نے بی اے کا امتحان پاس کرلیا تھا۔ امی اب کام پر نہیں جاتی تھیں۔ میں نے منع کردیا تھا۔ آج اسکول کی چھٹی تھی۔ شام کے چار بجے میں کمرے سے باہر نکلی تو میں نے دیکھا نعمان صاحب آئے ہوئے ہیں۔ میں سلام کر کے واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی انکل نے امجد کو مجھے بلانے کے لیے بھیجا۔ میں آکر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی۔ میں ابھی کچھ استفسار کرنہ پائی تھی کہ نعمان صاحب بول پڑے۔ ”ان دونوں کو تو میں ساتھ لے جارہا ہوں شاپنگ پر۔ تم بتاؤ ساتھ چلوگی یا پھر اپنی پسند کے کپڑے تمہارے لیے لے آؤں۔“

”جی آپ ان کو لے جائیے۔“ میں میز پر سے چائے وغیرہ کے برتن لے کر کچن میں چلی گئی۔ انکل ان دونوں کو ساتھ لے کر چلے گئے۔

”امی یہ سب کیا ہے؟“ میں برتن رکھتے ہوئے بولی۔

”کیا ہے؟“ امی نے الٹا مجھ سے سوال کرڈالا۔

”امی، یہ سب مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ انکل اب آئے دن چلے آتے ہیں۔ کتنی قیمتی چیزیں مسرت کو اور امجد......“

”خدا ترس آدمی ہے۔“ امی نے میری بات کاٹ کر اتنا ہی کہا تھا کہ میں بولی۔

”نہیں امی ایسا نہیں ہے، کچھ گڑبڑ ہے۔“

امی میرا منہ دیکھتی رہ گئیں اور میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔

انکل دو گھنٹے بعد شاپنگ سے واپس آگئے تھے۔ بھائی کو کپڑے، مسرت کو گڑیا، سوٹ اور میرے لیے تین عدد ڈریس اور ایک گولڈ کا نیکلس لائے تھے۔ سامان دے کر فوراً چلے گئے تھے کیوں کہ ان کے گھر سے فون آگیا تھا۔ میں نے ساتھ والے فلیٹ سے فون کرکے یاسمین کو بلالیا تھا۔ یاسمین آدھے گھنٹے میں پہنچ گئی تھی۔ میں نے جب اسے ساری چیزیں دکھائیں تو وہ بولی۔ ”دال میں کچھ کالا ہے۔ بنو میری دلہن بنے گی۔“

میں پہلے ہی گھمبیر ہورہی تھی۔ مجھے پریشان دیکھ کر وہ خود ہی کہنے لگی۔ ”ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے، تم غم کیوں کرتی ہو۔ ہم مر تھوڑی گئے ہیں۔“ پھر ایک زوردار قہقہہ مارتے ہوئے بولی۔ ”تم نے تو گھر بیٹھے ہی مرغا کاٹ ڈالا ہے۔ چلو اٹھو میرے لیے ایک اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔“

میں کچن میں چلی گئی تو اس نے امی کو سمجھایا جو انکل کو فرشتہ کہہ رہی تھیں۔

یاسمین جاتے ہوئے کہہ گئی تھی کہ ”یہ ڈریس سلوانا نہیں، ابھی اس مہذب اور عزت دار انسان کا دوسرا روپ کھل کر سامنے آجانے دو۔“

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے چلی گئی مگر مجھے پھانسی کا پھندا قریب سے قریب ہوتے ہوئے دکھائی دے رہا تھا۔

ابھی ہفتہ بھر بھی نہیں گزرا تھا کہ سانپ تھیلے سے باہر آگیا۔ اس روز میں بالکونی میں بیٹھی چاول چُن رہی تھی کہ امی میرے پاس آکر بیٹھ گئیں اور چاول چننے لگیں پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”میں دو تین روز سے تم سے کچھ کہنا چاہ رہی تھی کہ نعمان ابھی جوان ہے اور امجد، مسرت کا خیال بھی رکھتا ہے۔ اچھی تنخواہ ہے۔ کار، بنگلا ہے۔ وہ اگر تم سے شادی کرنا چاہتا ہے تو......“ امی ابھی پوری بات بھی نہ کہہ پائی تھیں کہ مجھے ایسا لگا میرے سر سے چھت ہی نہیں پاؤں سے زمین بھی کسی نے کھینچ لی ہے۔ امی مسلسل نعمان صاحب کے لیے تعریفوں کے پل باندھے جارہی تھیں اور مجھے یہ باتیں شاک گزر رہی تھیں۔ میں نے چاول کا تھال امی کو پکڑاتے ہوئے غصے سے کہا۔ ”جو آپ کی مرضی وہ کریں، اب پلیز کچھ اور مت بولیے۔“ میں روتے ہوئے اپنے بیڈ پر آکر ڈھے گئی اور رات کا کھانا کھائے بغیر ہی سوگئی۔

میں یہ بات یاسمین کو ابھی بتانا نہیں چاہتی تھی۔ جب گھر کو آگ لگ جائے گھر کے چراغ سے تو پھر کسی سے کیا گلا کیا شکوہ۔ میں نے تو خود فیصلہ کیا ہوا تھا۔ مسرت کی شادی سے پہلے شادی نہیں کروں گی اور بھائی کی تعلیم مکمل ہونے تک اس گھر کو نہیں چھوڑوں گی۔ یہاں تو معاملہ ہی اور تھا۔ ماں نے فیصلہ صادر کردیا تھا اور یہ زہر کا پیالہ مجھے بہرحال پینا تھا۔

نعمان صاحب نے گھر کی حالت ہی بدل دی تھی۔ پرانا صوفہ پھنکوادیا تھا، فریج، ٹی وی سب نئے آگئے تھے۔

اس دن نعمان صاحب جیسے ہی گھر میں آئے دس منٹ بعد بیل بجی۔ ہم ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ نعمان صاحب خود اٹھ کر باہر والے دروازے پر گئے مگر دروازہ

کھولنے کی بجائے پریشان سے لوٹ آئے انہوں نے اپنی بیگم کی آواز پہچان لی تھی۔ خوف کے مارے ان کی پیشانی عرق آلود ہوگئی تھی۔ وہ جلدی سے اوپر چھت پر چلے گئے۔ کیوں کہ ہمارا فلیٹ آخری منزل پر تھا۔ اس لیے لکڑی کی سیڑھی سے چھت پر جانے کا راستہ تھا۔

امی نے جا کر دروازہ کھولا تو ماں بیٹا سلام کر کے اندر آ گئے۔ امی بھی آ کر ان کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ سلام دعا کے بعد خود مسز نعمان بولیں۔ ''ہم آپ کا فلیٹ دیکھنے آئے ہیں کیوں کہ ہم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ علاقہ چھوڑ کر کوئی اچھا سا فلیٹ خرید لیں وہاں آئے دن چوریاں، ڈاکے پڑنے لگے ہیں۔'' پھر اٹھتے ہوئے بولیں۔ ''اگر آپ برا نہ مانیں تو میں بیڈروم اندر سے دیکھ سکتی ہوں۔''

ہماری بھی سٹی گم ہوگئی تھی۔ میں نے انہیں ایک ایک کر کے سارے کمرے حتیٰ کہ بالکونی بھی دکھا دی۔ امی اتنے میں چائے اور کچھ لوازمات ڈرائنگ روم میں میز پر رکھ چکی تھیں۔ پھر وہ باتھ روموں کے دروازے غور سے دیکھتے ہوئے میرے ساتھ آ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئیں۔ کیوں کہ دروازے سارے کھلے ہوئے تھے اس لیے انہیں باتھ روموں کو دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کچن دیکھنے کی خود ہی انہوں نے ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ پھر وہ جلدی جلدی چائے ختم کر کے یہ کہہ کر چلی گئیں کہ مجھے ذرا جلدی ہے پھر کبھی۔

امی نے باہر کا دروازہ بند کر کے نعمان کو اوپر جا کر بتا دیا کہ چلی گئی ہے۔ نعمان صاحب نیچے آئے تو ان کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ بات تک نہیں ہو پا رہی تھی۔ پانی کا ایک گلاس پینے کے بعد ٹشو پیپر جیب سے نکال کر پیشانی کو صاف کر کے تھوڑا ہنستے ہوئے بولے۔ ''اس سے تو بدلہ میں لوں گا ذرا شادی ہو لینے دو۔ میری جاسوسی کرتی ہے۔ الو کی پٹھی۔ قیمہ بنا دوں گا۔'' پھر بات کرتے کرتے آنکھیں بند کر کے صوفے پر جوتوں سمیت ڈھیر ہو گئے۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد باتھ روم گئے اور باتھ روم سے نکلے تو کچھ نارمل نظر آئے۔ امی کو ایک لفافہ دے کر چلے گئے۔ میں نے فوراً امی سے لفافہ لے لیا۔ پورے پچاس ہزار روپے تھے۔ میں نے لفافہ واپس امی کو دے دیا اور اپنے نصیبوں کے لکھے کے بارے میں سوچنے لگی۔ اللہ تعالیٰ اگر اولاد دے تو پہلی اولاد لڑکا دے۔ میں نے یاسمین کو بلانے اور بتانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ یاسمین کو جب میں نے فون پر بتایا کہ نعمان کی بیوی آئی تھی، باقی آنے پر بتاؤں گی تو وہ دوڑی چلی آئی۔ آتے ہی امی کو سلام کرتے ہوئے میرے کمرے میں چلی آئی۔ میں نے اوّل تا آخر ساری کہانی سنا دی۔ شادی والی بات سنتے ہی وہ اچھل پڑی۔ ''تم سے بڑا بے وقوف نہ کوئی پیدا ہوا ہے نہ ہوگا۔ اتنا اچھا موقع ضائع کر دیا۔ تم سیدھی اس کو چھت پر لے جاتیں اور پھر تماشا دیکھتیں۔ مسز نعمان اس کا وہ حال کرتی کہ وہ عمر بھر اس طرف کا رخ نہ کرتا۔'' پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہاں تم بتاؤ تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''میں کیا بتاؤں؟ ماں نے مجھے مہلت ہی نہیں دی ہے۔ میری قسمت میں ہی لکھا ہے کہ بس شمع بن جلا کروں۔''

اس نے گردن کو ہلاتے ہوئے تعریفی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور تالی بجاتے ہوئے بولی۔ ''ہم مشرق کی بیٹیوں کے ساتھ یہ بڑا معاملہ ہے۔'' وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگئی۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''مجھے نہیں معلوم تھا ایسا ہو جائے گا۔ سچ پوچھو نصرت امی تمہیں بہو بنانے کے خواب لیے ہوئے ہیں احسان بھائی کا آخری سال ہے ایل ایل بی کرنے کے بعد جیسے ہی وہ پریکٹس شروع کریں گے۔ امی رشتہ لے کر آجائیں گی۔ پلیز ابھی کچھ نہیں ہوا ہے۔ یہ پیسے واپس کر دو۔''

وہ بولے جا رہی تھی اور میں سنے جا رہی تھی۔ میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی تھی۔ وہ اس روز رات تک ہمارے ساتھ رہی اور پھر کل آنے کا کہہ کر چلی گئی۔

رات بھر میں سوچوں میں غرق رہی۔ احسان ہینڈسم بھی ہے اور جوان بھی اور میری پیاری سہیلی کا بھائی بھی۔ مگر ایک بات مجھے اس کی پسند نہ تھی وہ بہت خودسر تھا۔ موڈی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تھا۔ اس لیے میں نے غور و فکر کے بعد فیصلہ ماں کی ہاں میں بدل دیا۔ کیونکہ نعمان دس ہزار ماہوار اور دو لاکھ حق مہر ایڈوانس دینے کے لیے تیار تھا اور ایک لاکھ پانچ ہزار روپے کا گولڈ کا سیٹ بھی میرے لیے بنوایا تھا۔ یہ ضرور ہے پیسا ہی سب کچھ نہیں ہوتا مگر یہاں تین افراد کی کفالت کا مسئلہ در پیش تھا۔

دو روز بعد میں خود ہی تیار ہوگئی تھی۔ نعمان کے آنے سے پہلے ہمیں ہائی کورٹ جانا تھا۔ یہ شادی عجلت میں اس لیے ہو رہی تھی کہ مسز نعمان نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وکیل سے نعمان صاحب نے ٹائم لے لیا تھا۔ ہم کار میں بیٹھ کر گیارہ بجے کے قریب کورٹ پہنچ گئے تھے۔ کاغذات پہلے ہی تیار ہو چکے تھے۔ ہم دونوں نے دستخط کیے اور وکیل کی فیس

ادا کرنے کے بعد کسی ہوٹل میں لنچ کرنے کا پروگرام بتایا۔ نعمان صاحب کا چہرہ دمک رہا تھا وہ آج کچھ زیادہ خوش دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کچھ شوخ بھی ہو رہے تھے۔ وہ مسلسل بولے جا رہے تھے اور میں خاموشی سے سنے جا رہی تھی۔ ہم کورٹ کی دیوار کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے راستے میں ایک نجومی بیٹھا ہوا نظر آیا۔ نعمان صاحب مجھ سے کہنے لگے۔ ''چلیے اس کو ہاتھ دکھاتے ہیں۔'' میں نے آہستہ سے منع کر دیا۔ تو کہنے لگے۔ ''ان پر یقین نہیں ہے بس سوچا تھا اس بے چارے کی بھی کچھ انکم ہو جائے۔'' وہ میری بات مان گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہم اپنی گاڑی تک پہنچ گئے اور چار منٹوں میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں موجود تھے۔ نعمان نے اتنے سارے کھانوں کا آرڈر دے دیا تھا کہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ کھائے جا رہے تھے۔ مجھے بھی مجبور کرتے رہے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت دنوں سے بھوکے ہیں۔ کھانے سے ابھی فارغ ہی ہوئے تھے کہ بولے۔ ''جان! کلفٹن چلتے ہیں کتنا اچھا موسم ہے۔ آسمان پر بادل ہی بادل چھائے ہوئے ہیں۔''

''جی جیسے آپ کی مرضی۔'' پھر وہ جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بل پے کر کے ہم مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے کلفٹن پہنچ گئے۔ کلفٹن کا اپنا مزہ ہے۔ یہاں رات کو تو بہت رونق ہوتی ہے۔ دن میں بھی وہ لوگ جو مختلف شہروں سے رشتے داروں کے ہاں آتے ہیں وہ کلفٹن ضرور آتے ہیں اور وہ لوگ زیادہ تر دن میں ہی آتے ہیں۔ اس وقت بھی بہت سی فیملیاں موجود تھیں اور کافی رونق تھی۔ آسمان پر بادلوں کی وجہ سے موسم رنگین ہو گیا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی دو تصویریں بنانے والے کیمرے ہاتھ میں پکڑے ہمارے پاس آئے اور طرح طرح کی بولیاں بولنے لگے۔ نعمان نے دونوں کو ایک ایک رول بنانے کا کہہ دیا۔ وہ مختلف زاویوں سے ہماری تصویریں بنا رہے تھے ہم پانی میں تھوڑی دور تک چلے گئے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ پانی میں آ گئے۔ ہمارے کپڑے بھی بھیگ گئے تھے۔ وہاں کچھ بچے بھی نہا رہے تھے اور ان کے ساتھ اور بھی لوگ تھے۔ بڑا مزہ آ رہا تھا۔ کوئی چار سال پہلے ہم ابو کے ساتھ آئے تھے۔ بچوں کو دیکھ کر مجھے امجد علی اور مسرت یاد آ گئے۔ پھر ابو۔ میری آنکھیں نم ناک ہو گئیں تھیں مگر میں نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا اور نعمان کو پتا بھی نہ چلا۔ کیوں کہ پانی کے چھینٹے اڑ رہے تھے اور سمندر کا پانی اس قدر نمکین ہے کہ زیادہ گہرے پانی میں نہانے والوں کی آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ اس طرح مجھے آنکھیں صاف کرتے دیکھ کر نعمان صرف یہی سمجھا کہ آنکھ میں پانی کا چھینٹا چلا گیا ہے۔ وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ ہم پانی سے باہر آئے تو اونٹوں والوں نے گھیر لیا۔ ہم دونوں ایک اونٹ پر بیٹھ گئے۔ اونٹ پر بیٹھنے کا میرا پہلا تجربہ تھا۔ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ ہم ساحل سمندر پر بہت دور نکل آئے تھے کہ اچانک اونٹ تیز تیز دوڑنے لگا۔ اونٹ بے قابو ہو گیا تھا اور ہم دونوں اونٹ سے گر گئے۔ میں تو فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی مگر جب نعمان کو اٹھانے کی کوشش کی تو وہ ڈھے سے گئے لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ جب نعمان کو اٹھایا تو وہ جہاں گرے تھے وہاں ایک پتھر تھا اور اس پتھر نے ان کا کام تمام کر دیا تھا۔ لوگوں نے اٹھا کر انہیں جناح اسپتال پہنچا دیا۔ میں بھی ساتھ تھی مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ ٹیکسی میں ایک بار ضرور انہوں نے مجھے ایک نظر بھر کر دیکھا تھا۔

میں نے فوراً فون پر ان کے گھر اطلاع کر دی تھی اور میرے پاس وہاں رکنے اور مسز نعمان کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں نکاح نامے کی فائل لے کر اپنے گھر آ گئی۔ میں بہت ہمت کر کے گھر پہنچی تھی۔ میری آواز لرز رہی تھی۔ بامشکل میں یہ بتا پائی کہ نعمان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ امی نے آگے بڑھ کر مجھے جیسے ہی سینے سے لگایا میں بے ہوش ہو گئی۔

دوسرے دن صبح سویرے جب ہوش آیا تو یاسمین میرے سرہانے کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ یاسمین مجھے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ''خدا جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔'' اور میری آنکھوں سے آنسو صاف کرنے لگی۔ نعمان مجھے کبھی اچھے نہیں لگے تھے۔ شادی کا جب سے پیغام دیا تھا تو زہر لگنے لگے تھے مگر نکاح نامے کے بعد میرے دل اور دماغ نے انہیں قبول کر لیا تھا اور اب کئی سال گزرنے کے بعد بھی میں وہ پانچ چھ گھنٹے کی رفاقت نہیں بھولتی۔ کئی سال بعد میری شادی ہوئی۔ میں اپنے شوہر حامد کے ساتھ اپنے فلیٹ میں بہت خوش ہوں۔ مسرت کی بھی ہم نے شادی کر دی ہے۔ امجد ابھی پڑھ رہا ہے۔ اس لیے ساتھ ہے۔ یاسمین اب بھی ملنے آتی ہے اور اب بھی وہ قہقہہ لگا کر کہتی ہے۔ ''زندگی حادثوں کے مجموعے کا نام ہے۔ کچھ ہو نہ ہو، نعمان کے نکاح نامے نے تمہیں بہت کچھ دلا دیا۔''

ساحر

مدیر سرگزشت
سلام تہنیت
یہ سرگزشت خود میں عجیب ہے۔ اگر کسی دوسرے کے ساتھ یہ واقعہ گزرا ہوتا اور وہ مجھے سناتا تو شاید میں اس پر یقین نہ کرتی مگر میں اس سرگزشت کی مرکزی کردار ہوں اس لیے یقین کے ساتھ خود بیتی سنا رہی ہوں لیکن نام مقام بدل دیا ہے۔

مہرالنساء مہرو
(شارجہ۔یو اے ای)

مجھے سوائے میرے شوہر کے اور کسی مرد نے نہیں دیکھا تھا۔ میری مراد چہرے سے ہے کیونکہ میرا تعلق جس گھرانے سے ہے۔ وہاں لڑکی کو دس سال کی عمر میں ہی پردے میں بٹھا دیا جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے دس یا گیارہ سال کی عمر میں مجھ پر اکیلے گھر سے جانے پر پابندی عائد ہوگئی تھی۔ میں امی یا بڑی بہنوں یا بھائیوں کے ساتھ جا سکتی تھی۔ وہ بھی پوری طرح برقع میں۔ بابا اور امی اس معاملے میں اتنے سخت تھے کہ ہم بہنیں اپنے کزنز کے سامنے بھی نہیں جا

سکتے تھے اور دس سال کی عمر کے بعد ہم سب بہنوں نے تمام نامحرموں سے پردہ کرلیا تھا۔ جب میری بڑی بہنوں کی شادی ہوئی تو ہم نے بہنوئیوں سے بھی پردہ کیا اور کبھی ان کے سامنے بے پردہ نہیں گئی۔ اسی طرح میری بہنیں ایک دوسرے کے شوہروں سے پردہ کرتی رہیں۔ یہ تو خاندان والوں کا حال تھا باقیوں کے بارے میں آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس معاملے میں کتنی سختی ہوتی ہوگی۔ گلی محلے میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اور نہ ہی ہمارا دوسروں سے کوئی تعلق تھا۔ ملتان جیسے صوفیا کے شہر میں ہمارے جیسے سخت مذہبی گھرانے بہت کم تھے۔

عجیب بات ہے ایک طرف ہم پر اتنی سخت پابندی تھی دوسری طرف ہم سب بہنوں نے گریجویشن تک تعلیم حاصل کی اور یہ ساری کی ساری تعلیم گھر میں ہوئی۔ امی خود گریجویٹ تھیں اور بابا نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے بلکہ وہ دینی علم بھی رکھتے تھے۔ ہم بہنوں نے سب انہی سے پڑھا۔ رواج کے مطابق پہلے ہر بچے کو قرآن کریم ناظرہ کرایا جاتا تھا۔ اس کے بعد اسکول کی تعلیم کا آغاز ہوتا تھا۔ دین کی تعلیم بابا کے ذمے تھی اور اسکول کا نصاب امی پڑھاتی تھیں۔ بھائی اسکول میں پڑھتے رہے اور ہم بہنوں نے گھر میں پڑھ کر پرائمری کا امتحان دیا۔ اسی طرح ہر سال اسکول کا امتحان دیا اور پھر پرائیویٹ پڑھ کر گریجویشن بھی کرلیا۔ میری ایک بڑی بہن نے پرائیویٹ ہی اسلامیات میں ماسٹر کیا اور دوسری بہن نے بی ایڈ بھی کیا۔ میں نے بی اے کیا تھا۔ پیپرز دینے ہم بھائیوں یا بابا کے ساتھ جاتے تھے۔ ویسے تو بابا نے سول انجینئرنگ کی تھی مگر انہوں نے کاروبار کو ترجیح دی اور ملتان شہر میں ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ ماشاءاللہ اچھا کاروبار تھا اور ہمارے بڑے سے گھر میں ہر آسائش تھی۔

میری دو بڑی بہنیں، دو بڑے بھائی اور دو چھوٹے بھائی تھے۔ جب میں نے بی اے کیا تو میری دونوں بہنوں اور بھائیوں کی شادی ہوچکی تھی۔ انٹر کے بعد امی نے ہم سب بہنوں سے پوچھا کہ کیا ہماری شادی کردی جائے یا پھر ہم مزید پڑھنا چاہتی ہیں۔ ہم تینوں نے آگے پڑھائی کا انتخاب کیا۔ میرے دونوں بڑے بھائی بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ سب سے بڑے بھائی نے ماسٹر کے بعد سول سروس کا امتحان پاس کیا اور اب اسلام آباد میں وزارت خارجہ میں جاب کررہے تھے۔ ان سے چھوٹے نے ایم بی اے کیا تھا اور ابو کے ساتھ دکان پر کام کرتے تھے۔ جب کہ مجھ سے چھوٹے دونوں بھائی ابھی پڑھ رہے تھے۔ ہمارا تعلق افغان درانی قبیلے سے ہے اور یہی وجہ تھی کہ ہم سب بہن بھائی گورے چٹے اور خوب صورت ہیں۔ کیونکہ ہمارے گھر کا ماحول ایسا نہیں تھا کہ ہم بہنیں اپنی جسمانی خوب صورتی پر توجہ دیتیں مگر کبھی کبھی میری بہنیں کہتی تھیں کہ ہم تینوں میں، میں ہی سب سے زیادہ خوب صورت ہوں۔ تو مجھے یہی خیال آتا کہ وہ چہرے کے نقوش کی بات کررہی ہیں۔ حالانکہ میرے خیال میں وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت تھیں۔ مگر وہ کہتی تھیں۔

”مہرو تو بہت زیادہ حسین ہے۔“

میں خود کو آئینے میں دیکھتی تو خود کو اپنے گھر والوں سے زیادہ مختلف نہیں پاتی تھی۔ ٹھیک ہے میرا رنگ گلابیت لیے ہوئے شہابی تھا۔ پرخمار آنکھیں اور ستواں ناک ونقشہ تھا۔ جسم متناسب اور سڈول تھا مگر مجھے اپنا آپ اپنی بہنوں سے مختلف نہیں لگتا تھا۔ میرا دوسری لڑکیوں سے واسطہ بھی کم پڑتا تھا کیونکہ امی اور بابا اس معاملے میں بھی بہت محتاط تھے کہ ہم ایسی لڑکیوں سے بھی نہ ملیں جو ذرا مختلف گھرانوں سے تعلق رکھتی ہوں جہاں دین اور خاص طور سے پردے کا اتنا خیال نہ رکھا جاتا ہو اور لڑکیاں شادی سے پہلے ہی بہت سی باتوں سے واقف ہوجاتی ہیں۔ اگر کبھی اتفاق سے میں ایسی کسی لڑکی کے پاس بھی ہوئی تو امی اور بڑی بہنوں نے مجھے فوراً روک دیا۔ اس لیے ایسی کوئی بے تکلف سہیلی بھی نہیں تھی جو مجھے میرے بارے میں بتاتی۔ ہاں ایک بار ہم اپنی خالہ کی بیٹی کی شادی میں ساہیوال گئے تھے تو شادی کی تقریب کے لیے ہم کزنز ایک ہی کمرے میں تیار ہو رہے تھے اور ایک دوسرے سے ذرا ڈھک چھپ کر کپڑے بھی بدل رہے تھے جب میں کپڑے بدلنے لگی تو میری خالہ کی چھوٹی بیٹی کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور اس نے بے ساختہ کہا۔

”مہرو تیرا بدن تو بہت حسین ہے۔“

”ہوگا۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ نسوانی جسم کی خوب صورتی کیا ہوتی ہے۔ کیونکہ میں نے کبھی اس بارے میں سنا نہیں تھا۔ سچی بات ہے کہ مجھے یا بہنوں کو خود بھی ایسی باتوں سے دل چسپی بہت کم تھی۔ کیونکہ پردے اور دین پر سختی سے عمل کرنے کے باوجود ہمارے گھر کا ماحول گھٹا ہوا نہیں تھا۔ ہمارے ہاں وہ ماہانہ اور ہفتہ وار رسالے بھی آتے تھے جن میں ہماری تہذیب اور شائستگی کو اجاگر کیا جاتا تھا۔ گھر خاصا بڑا تھا اور یہاں

تفریح کی کئی سہولتیں تھیں۔ ایک چھوٹا سا بیڈمنٹن کورٹ اور ٹیبل ٹینس کی میز تھی۔ ہم بہن بھائی آپس میں بے تکلف تھے اور شام کے وقت جب سب گھر میں آتے تو بہت مزہ آتا تھا۔ امی اور بابا مہینے میں کئی بار ہمیں گھمانے پھرانے باہر لے جاتے تھے۔ اگر خود نہیں جا پاتے تو یہ ذمے داری بھائیوں کو سونپ دی جاتی۔ شادی سے پہلے ہم نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ ہم اپنی شاپنگ خود کرتے تھے۔ بس امی یا بھائیوں کے ساتھ جانا ہوتا تھا۔ ہمیں ایک حد میں رہ کر سب کرنے کی اجازت تھی۔ اس لیے امی اور بابا کی پابندیاں بھی ہمارے لیے بوجھ نہیں بنیں۔ ہم بہ خوشی ان پر عمل کرتے تھے اور اسے اپنی ذمے داری سمجھتے تھے۔ ہمیں پسند نہیں تھا کہ کوئی نامحرم ہمیں دیکھے اور نہ ہی ہم نے کبھی اس معاملے میں کوتاہی برتی۔ بہنوئیوں سے ملتے سلام دعا کرتے مگر پردے میں رہ کر۔

بڑے بھائیوں کی شادیاں ہوئیں تو مکان کے اوپر والے حصے میں دو بالکل الگ پورشن بنا کر بابا نے انہیں وہاں منتقل کر دیا تاکہ وہ اپنی بیویوں کو پردے کے حساب سے رکھ سکیں۔ صبح جب دوسرے بھائی چلے جاتے تو بھابیاں نیچے آجاتیں اور شام کو جب مرد آنے لگتے تو وہ واپس اپنے پورشن میں چلی جاتیں۔ بہنوں کے جانے کے بعد بھابیوں سے رونق ہونے لگی اور پھر بچے ہوئے تو یہ رونق اور بڑھ گئی۔ بابا ہم بہنوں سے زیادہ محبت کرتے تھے اور جب بھی دکان سے آنے لگتے تو پہلے کال کرکے ہم سے پوچھتے کہ ہمارے لیے کیا لائیں۔ اسی طرح جب بھابیاں آئیں تو بابا ان سے بھی پوچھنے لگے۔ گھر سے متعلق تمام کام امی اور بھابیوں کی مرضی سے ہوتے تھے اور بابا یا بھائی ان میں دخل نہیں دیتے تھے۔ شادی سے پہلے اور اس کے بعد بھی ہم بہنوں کو خصوصی پروٹوکول دیا جاتا تھا۔ جب بابا ہمیں دین کے بارے میں بتاتے تو اکثر وہ ہمارے دین میں عورت کی عظمت اور اہمیت کے بارے میں بات کرتے۔

یہی وجہ ہے کہ میری زندگی کے جو بائیس سال امی اور بابا کے گھر میں گزرے وہ میرے لیے ہمیشہ کے لیے یادگار بن گئے۔ جب میں نے بی اے کرلیا تو امی نے میری شادی کی تیاری شروع کی یعنی رشتہ تلاش کرنے لگیں۔ لڑکیوں اور لڑکوں کے رشتوں کے معاملے میں میرے گھر والوں کی اولین شرط دین سے تعلق کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میری بہنوں اور بھائیوں کی شادیاں دینی اقدار کا خیال رکھنے والے گھرانوں میں ہوئی تھیں۔ اس لیے میری باری میں بھی اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا اور جب احسن سرفراز کا رشتہ آیا تو سب سے پہلے یہی دیکھا گیا۔ احسن کے والد سرفراز چچا بابا کے ساتھ کپڑے کے بزنس سے منسلک تھے اور وہ لاہور سے بابا کو کپڑا بھیجتے تھے۔ ان کا وہاں کپڑے کا ہول سیل کاروبار تھا۔ دورانِ تعلیم وہ سرفراز چچا کے ساتھ کاروبار میں بھی شامل رہے۔ اور ان کا کئی بار ملتان آنا ہوا تھا۔ اس لیے بابا کی ان سے اچھی واقفیت تھی۔ سرفراز چچا سے ملاقاتیں تو سال میں ایک دو ہوتی تھیں مگر فون پر تقریباً روز بات ہوتی تھی ایک دن بابا نے گفتگو کے دوران میں میرا ذکر کیا اور سرفراز چچا سے کہا کہ اگر ان کی نظر میں کوئی شریف اور دین دار گھرانے کا نوجوان ہو تو بتائیں۔ اس پر انہوں نے احسن کا رشتہ پیش کر دیا۔

”میرا بیٹا حاضر ہے آپ کے خیال میں ہم دین دار گھرانے کے ہیں تو مجھے بہت خوشی ہوگی آپ کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنا کر۔ برخوردار نے ایل ایل بی کیا اور اب پریکٹس کر رہا ہے۔ ماشاءاللہ کامیاب ہے۔“

ابو خوش ہوگئے۔ انہوں نے کہا۔ ”تبھی کئی سال سے برخوردار یہاں نہیں آئے۔ اس سے اچھی کیا بات ہوگی لیکن میں گھر والوں سے مشورہ کرکے آپ کو بتاتا ہوں تب بات آگے بڑھائیں گے۔“

”بالکل کیوں نہیں آپ مشورہ کریں اور پھر مجھے بتائیں۔“

ابو نے گھر میں مشورہ کیا۔ بھائی بھی احسن سے واقف تھے اور انہیں بھی یہ رشتہ پسند آیا۔ امی نے بابا کو مطمئن پایا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا اور میں نے جواب دیا۔ ”جسے آپ اور بابا پسند کریں وہی میری پسند بھی ہوگی۔“

یوں سب کی رضامندی سے بابا نے ہاں کر دی۔ سرفراز چچا باقاعدہ رشتہ لے کر آئے۔ ان کی بیگم دنیا سے گزر گئی تھیں اور ان کے چار بیٹے تھے سب سے چھوٹے احسن تھے اور وہ اس وقت ان کے ساتھ رہتے تھے۔ باقی تین بیٹوں کو شادیاں کرکے ان کو الگ گھر لے دیئے تھے البتہ کاروبار میں تین بڑے بیٹے ان کے ساتھ شامل تھے۔ صرف احسن نے وکالت کا پیشہ چنا تھا۔ سرفراز چچا نے بابا سے کہہ دیا کہ احسن بھی شادی کے بعد الگ رہیں گے اور انہوں نے ان کے لیے فلیٹ بھی لے لیا تھا۔ دونوں طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ رشتہ طے ہونے کے بعد ساری کارروائیاں بہت

تیزی سے ہوئیں اور اسی چکر میں کسی کو خیال نہیں آیا کہ وہ مجھے احسن کی ایک تصویر ہی دکھا دیتا۔ میں خود شرم کی وجہ سے کسی سے کہہ نہیں سکی تھی۔ شادی کے دن قریب آ گئے۔ میں نے بہت سی شاپنگ خود کی تھی۔ خاص طور سے اپنے کپڑے وغیرہ خود لیے تھے۔ زیورات میں ایک سیٹ میں نے اپنی پسند کا لیا تھا اور باقی امی نے پسند کیے تھے۔ بھائیوں نے میری پسند کا فرنیچر کیٹلاگ دکھا کر بنوایا تھا۔

شادی کا دن آیا۔ لاہور سے صبح سویرے برات روانہ ہوئی اور دوپہر کے بعد برات ہمارے پاس پہنچی۔ پنجاب کے رواج کے مطابق یہ دن کی شادی تھی۔ لیکن میرا اور احسن کا نکاح اسی شام میں ہو گیا۔ شادی کی تقریب اگلے دن ہوئی اور ظہر کے بعد برات بائی روڈ واپس لاہور روانہ ہوئی لیکن میں اور احسن شام کے وقت بائی ائر لاہور گئے تھے۔ نکاح کے بعد جب احسن مجھ سے ملنے آئے تو پہلی بار میں نے انہیں دیکھا۔ وہ کسی قدر سانولے رنگ کے لیکن مناسب نقوش اور جسامت والے شخص تھے۔ مجھے پہلی نظر میں اچھے لگے۔ اس مختصری ملاقات میں انہوں نے سلام دعا کے بعد بس چند جملے کہے جو سارے کے سارے میری تعریفوں میں تھے۔ ہماری سہاگ رات لاہور میں آئی اور جب احسن نے پہلی بار مجھے پاس سے دیکھا تو پاگل سے ہو گئے تھے۔ ایسی والہانہ محبت اور پیار دیا کہ میں مدہوش ہو گئی۔ انہوں نے میری ایسی تعریف کی کہ مجھے مغرور کر دیا۔ ہماری شادی کی اوّلین رات اسی فلیٹ میں گزری جو سرفراز چچا نے احسن کے لیے لیا تھا۔ لیکن اس وقت ہم اکیلے تھے کیونکہ برات، رات گئے واپس لاہور پہنچی تھی اور سب اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ اس لیے ائر پورٹ سے میں اور احسن ہی گھر پہنچے تھے۔ یہاں سے آگے میری زندگی کا وہ حصہ شروع ہوا جس کی وجہ سے میں یہ سچ بیانی لکھ رہی ہوں۔ ممکن ہے آگے آپ کو میرا انداز بہت کھلا ہوا اور بے باک لگے۔ لیکن مجھے اُمید ہے جب آپ اس سچ بیانی کا آخری حصہ پڑھیں گے تو سمجھ جائیں گے کہ میں نے اپنی ذاتی زندگی کو یوں کیوں بیان کیا ہے؟

☆☆☆

صبح میری آنکھ کھلی تو یہ دیکھ کر میں شرما گئی کہ احسن بیٹھے ہوئے مجھے دیکھ رہے تھے۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“

”تمہیں دیکھ رہا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔ ”بہت دیر سے دیکھ رہا ہوں لیکن جی نہیں بھر رہا۔“

”اللہ آپ تو مجھے پاگل کر دیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”دوسرے آنے والے ہوں گے۔“

”ہاں کیونکہ تم نے مجھے پاگل کیا ہے۔“ وہ والہانہ انداز میں بولے۔ ”میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ چند دن کے لیے سب ہمیں اکیلا چھوڑ دیں، کوئی نہ چھیڑے ہمیں۔ ہم بس ایک دوسرے میں کھوئے رہیں۔“

میں پھر شرما گئی۔ ”کیسی باتیں کر رہے ہیں دوسرے کیا سوچیں گے۔“

”بس یہی تو سوچ کر رہ گیا۔“ احسن نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”ورنہ شاید یہی کرتا۔“

شادی کی صبح میں نے پہلی بار غور سے فلیٹ دیکھا۔ یہ بہت لگژری قسم کا فلیٹ تھا۔ اس میں دو بیڈ رومز اور ایک ڈرائنگ روم کے ساتھ بڑا سا لاؤنج تھا۔ پورا فلیٹ ٹائلز سے آراستہ تھا۔ شاندار قسم کے باتھ روم اور اٹالین کچن تھا۔ یہ فلیٹ جس بلڈنگ میں تھا وہ بھی بہت لگژری اور لاہور کے پوش ترین علاقے مال روڈ میں تھی۔ اب تک مجھے احسن اور اس کی فیملی کے بارے میں بس یہی معلوم تھا کہ وہ بہت کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ کھاتے پیتے تو ہم بھی تھے۔ لیکن یہ فلیٹ دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مالی لحاظ سے ہم سے کہیں زیادہ تھے۔ فرنیچر جو پہلے سے تھا وہ کسی طرح میرے جہیز کے فرنیچر سے کم نہیں تھا بلکہ بعض چیزیں تو برما ٹیک کی تھیں۔ صرف فرنیچر نہیں بلکہ ہر چیز ہی بہت اچھے معیار کی تھی۔ کچھ دیر بعد احسن کی بھابیاں آ گئیں۔ وہ بھی میری تعریف کر رہی تھیں۔ مگر احسن کا انداز ہی کچھ اور ہوتا تھا وہ ایسے الفاظ میں تعریف کرتے کہ میں شرما کر دوہری ہو جاتی تھی۔ وہ کہتے بھی بہت کھل کر تھے۔ سانچے میں ڈھلا بدن...... ایک ایک انگ تراشا ہوا...... رنگ جیسے دودھ میں گلاب گھلا ہوا...... وہ اس قسم کے جملے کہتے تھے۔

میرا خیال تھا کہ شاید پہلی رات کا جنون تھا اور وہ آنے والی راتوں میں نارمل ہو جائیں گے مگر آنے والے دنوں میں بھی ان کا جنون برقرار رہا تھا۔ ایسا لگتا کہ جیسے میں کوئی عام لڑکی نہیں ہوں بلکہ آسمان سے اتری کوئی حور پری ہوں۔ جب احسن میری اس طرح تعریف کرتے تو میں کہتی کہ میں تو عام سی لڑکی ہوں۔ ایک بار انہوں نے کہا۔ ”کیا تم نے خود کو آئینے میں دیکھا ہے۔“

”روز دیکھتی ہوں۔“

"ایسے نہیں......" انہوں نے کہا اور پھر بتایا کہ کیسے دیکھنا ہے۔

"اف کیسی باتیں کر رہے ہیں بھلا! کوئی خود کو اس طرح بھی دیکھتا ہے۔" میں نے سرخ ہو کر کہا۔ "میں نے آج تک خود کو اس طرح نہیں دیکھا۔"

"تب ہی تو تمہیں معلوم نہیں ہے کہ تم کتنا ہوشربا حسن رکھتی ہو۔" وہ بولے۔ "تم سے کہیں کمتر عورتیں خود پر اتنا اتراتی ہیں اور اپنے حسن کا سب سے زیادہ خیال رکھتی ہیں۔ تم تو قدرت کا شاہکار ہو۔"

"یہ تو آپ کو معلوم ہے نا اور آپ کو اچھا لگتا ہے تو میرے لیے یہی بہت ہے۔"

احسن میرے چہرے کے نقوش کی تعریف تو کرتے تھے مگر ان کا زیادہ زور جسمانی خدوخال اور پیچ وخم پر ہوتا تھا۔ جب وہ گھر میں ہوتے اور ہمارے درمیان بات ہوتی تو زیادہ موضوع یہی ہوتا تھا۔ پھر ہم رہتے بھی اکیلے تھے اس لیے ان کو بولنے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ میرے سسر سرفراز چچا ہفتے میں ایک دو دفعہ آتے تھے۔ وہ عام طور سے شام کے وقت آتے اور پھر کھانا ہمارے ساتھ کھا کر جاتے تھے۔ یہ ان کا معمول تھا کہ شام کا کھانا کسی بیٹے کے ہاں کھاتے تھے۔ صبح کا ناشتا اور دوپہر کا کھانا وہ اپنے دفتر میں کھاتے تھے۔ اپنے پورے ہفتے کے معمولات وہ بیٹوں سے بات کر کے پہلے ہی طے کر لیتے تھے کہ کس دن کس کے ہاں جانا ہے۔ احسن سمیت تمام بیٹوں نے ان سے بارہا کہا کہ وہ ان کے ساتھ رہیں مگر وہ اپنے برسوں پرانے گھر میں رہتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ وہاں انہیں سکون ملتا ہے کیونکہ وہاں ان کے ماں باپ، بہن بھائیوں اور بیوی کی یادیں تھیں۔ وہ ان یادوں کے درمیان خوش رہتے تھے۔ وہ صبح سے شام تک دفتر میں ہوتے تھے اور شام کو بیٹوں کے ہاں جاتے تھے۔ اس کے بعد نو بجے تک گھر جاتے تھے۔ چھٹی والے دن کوئی بیٹا بیوی بچوں سمیت ان کے پاس چلا جاتا تھا۔ یوں اکیلے ہونے کے باوجود انہیں اکیلے پن کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

ہفتے میں ایک دو بار ہی احسن کے بھائی یا کوئی دوست ملنے آجاتا تھا۔ اس لیے ہم زیادہ تر اکیلے ہی ہوتے تھے۔ شادی کے شروع دنوں میں مصروفیات بہت تھیں۔ آنا جانا لگا رہا۔ میں ایک ہفتہ امی بابا کے پاس رہ کر آئی پھر دعوتیں ہوتی رہیں۔ دس دن کے لیے ہم شمالی علاقے گئے اور وہاں گھوم پھر کر آئے۔ واپسی پر بھی کچھ رہ جانے والی دعوتیں

دبیر الملک۔ نواب مرزا نوشہ۔ اسد اللہ خان غالب اور نواب مصطفیٰ خان شیفتہ دونوں ہم عصر تھے۔ نہ صرف ہم عصر بلکہ ہم نوالہ و ہم پیالا۔ ہم خیال و ہم ذوق اور ہم سخن و ہم ساز بھی تھے۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ 1809ء دہلی میں پیدا ہوئے۔ فارسی، عربی اور مروجہ علوم کی تحصیل کی۔ شعر و سخن سے آپ کو فطری مناسبت تھی۔ شعر اچھا کہتے تھے۔ فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے۔ ان کا مشہور شعر ہے کہ ۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

پہلے مومن خاں مومن کے شاگرد ہوئے اور ان کی وفات کے بعد غالب خستہ حال سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ 1834ء میں جب کہ شیفتہ کی عمر صرف چھبیس سال تھی انہوں نے گلشن بے خار کے نام سے فارسی زبان میں شعرائے اردو کا تذکرہ مرتب کیا تھا۔ 1869ء میں وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ غالب کو غزل تخلیق کرتے ہوئے اور پھر اس کو لکھتے وقت۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے تصور۔ ان کی رائے و تاثر کے اشتیاق اور انتظار سے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ غالب کو ان کی داد و تحسین سے جو تقویت و اطمینان حاصل ہوتا تھا اس کا اعتراف غالب نے برملا طور پر کیا۔ دوستوں کی محفل میں دورانِ گفتگو زبان حال سے بھی اور تحریری طور پر بھی۔ اس کا اندازہ غالب کے اس فارسی مقطع سے بھی ہوتا ہے

غالب بہ فن گفتگو نازد بہ ایں ارزش کہ او
نہ نوشت در، دیوں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نہ کرد

یعنی سخن گوئی میں غالب کو اس خوبی پہ ناز ہے کہ جب تک مصطفیٰ خان نے نہ کہہ دیا کہ یہ غزل اچھی ہے میں نے اس غزل کو دیوان میں درج نہیں کیا۔ اس مقطع سے نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی سخن فہمی کے کمال کی بھی سند ملتی ہے۔ سخن فہمی جو سخن گوئی سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔

اقتباس: یادوں کی بستی: از محمد ایاز راہی

بھگتائیں۔ ان دنوں احسن نے کام سے چھٹی لی ہوئی تھی۔ وہ دو اور وکیلوں کے ساتھ پارٹنر شپ میں فرم چلا رہے تھے۔ جب آفس جانا شروع کیا تب بھی وہ چار بجے چھٹی کر کے گھر آجاتے تھے۔ اس لیے مجھے اکیلے رہنے کا موقع کم ملتا تھا اور تنہائی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہمیشہ نہیں ہوگا ایک وقت آئے گا جب احسن کا زیادہ وقت گھر سے باہر گزرے گا مگر اس وقت تک مجھے کسی بچے کی صورت میں مصروفیت مل جائے گی۔

امی اور ابا نے ہم بہنوں کی پرورش کرتے ہوئے یہ بات ذہن نشین کرادی تھی کہ ایک عورت کی زندگی کا بنیادی مقصد اپنی نئی نسل کی درست تعلیم اور تربیت ہے۔ اس کے لیے ہمیں پہلے خود کو تیار کرنا پڑتا ہے۔ میری دونوں بہنیں شادی کے اوّلین سالوں میں ماں بن گئی تھیں اور اب ان کے ماشاءاللہ کئی کئی بچے تھے۔ شادی کے بعد میری بھی یہی خواہش تھی کہ میں جلد ماں بن جاؤں۔ اگرچہ احسن نے ایسا کوئی اشتیاق ظاہر نہیں کیا تھا مگر بچے انہیں بھی بہت پسند تھے۔ اپنے بھائیوں کے بچوں سے وہ بہت محبت کرتے تھے۔ احسن تمام بچوں کے پسندیدہ چاچو تھے اور وہ آتے یا ہم ان کے ہاں جاتے تو احسن اپنے بھتیجے بھتیجیوں میں گھرے رہتے تھے۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ ایسی کوئی خبر ملی تو وہ بھی بہت خوش ہوں گے۔ پھر وہ کوئی احتیاط بھی نہیں کرتے تھے اس سے مجھے لگا کہ انہیں بھی بچوں کی آرزو ہے بس وہ منہ سے نہیں کہتے ہیں۔ شروع دنوں میں مصروفیت زیادہ تھیں اس لیے اس بارے میں سوچنے کا موقع کم ملتا تھا۔ مگر جب ایک مہینے بعد معمول کی زندگی شروع ہوئی تو مجھے اکثر بچے کا خیال آنے لگا۔

دوسرے مہینے تک ہنی مون پیریڈ گزر گیا۔ اگرچہ احسن کی دیوانگی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ان کی محبت میں اب بھی وہی والہانہ پن اور شدت تھی۔ مگر اب وہ دیر سے آنے لگے تھے۔ شادی اور پھر ہنی مون کے سلسلے میں جو چھٹیاں ہوئی تھیں ان کی تلافی بھی کرنا تھی۔ وہ پہلے پانچ چھ بجے تک آتے تھے اور پھر یہ وقت بڑھ کر سات آٹھ ہو گیا اور جب سرفراز چچا نے ہمارے ہاں آنا ہوتا تو ان کے ساتھ ہی آتے تھے۔ اسی طرح پہلے وہ آرام سے گیارہ بجے تک جاتے تھے مگر اب وہ ناشتا کر کے دس بجے تک روانہ ہو جاتے تھے۔ صبح کا وقت جو پہلے ہم ذرا گپ شپ کر لیتے تھے۔ وہ وقت بس ناشتے اور تیاری میں نکل جاتا تھا اور پھر رات کو جب آتے تو اتنا تھکے ہوتے تھے کہ بس کھانا کھایا کچھ باتیں ہوئیں یا میرے پاس آئے اور سو گئے۔ میں ان سے جو بات کرنا چاہتی تھی وہ رہ ہی جاتی تھی۔ ان کی تھکن محسوس کر کے میں چپ ہو جاتی۔ پھر یہ معمول بن گیا تھا اور میں تنہائی محسوس کرنے لگی تھی۔ گھر میں صفائی اور کپڑے دھونے کے لیے کام والی آتی تھی۔ کھانا میں خود بناتی تھی۔ دو آدمیوں کا کھانا ہی کتنا ہوتا ہے۔ اکثر میں دوپہر میں کچھ نہیں بناتی تھی اور بس رات کے بچے ہوئے سے گزارا کر لیتی۔

یہاں ٹی وی تھا مگر مجھے ٹی وی کی عادت نہیں تھی۔ احسن کو اخبار اور رسائل سے دلچسپی نہیں تھی پھر بھی انہوں نے میری خاطر لگا دیئے۔ مگر ان سے بھی کتنا وقت گزرتا۔ باہر جانے کا یہاں بھی وہی حساب تھا کہ احسن کے ساتھ اور عبائے میں جاتی تھی۔ اکیلے میں کبھی نہیں گئی۔ احسن مذہبی خیالات رکھتے تھے مگر ان میں وہ سختی نہیں تھی جو میرے گھر والوں میں تھی کہ عورت کو گھر سے اکیلے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی کسی نہ کسی مرد کا ہونا لازمی تھا۔ صرف چھٹی والا دن ایسا ہوتا جب احسن میرے پاس ہوتے مگر اس دن کی اپنی مصروفیات ہوتی ہیں۔ کہیں نہ کہیں آنا جانا ہوتا یا کوئی ہمارے ہاں آجاتا۔ وہ کام نمٹائے جاتے جو کام والے دنوں میں نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے مجھے وقت کم ہی ملتا تھا۔ ایک چھٹی والے دن میں نے تنہائی کی شکایت کی تو وہ بولے۔ ''تم باہر چلی جایا کرو۔ گھر کی جو شاپنگ کرنی ہے کر لیا کرو اس طرح تمہاری بھی آؤٹنگ ہو جائے گی۔''

''اکیلے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں تو اس میں کیا ہے۔ بہت سی عورتیں تو مکمل پردہ کرتی ہیں وہ بھی اکیلی آتی جاتی ہیں۔ تم کہو تو تمہیں ڈرائیونگ سکھا دوں کار لے دوں گا آس پاس تم خود جا سکو گی۔''

''آپ مجھے ڈرائیونگ سکھائیں گے؟'' میں خوش ہو گئی کیونکہ جب چھوٹی سی تھی تب سے مجھے ڈرائیو کا شوق تھا۔ ہمارے گھر گاڑی تھی جب میری شادی ہوئی تو دو گاڑیاں تھیں۔ بابا سے تو نہیں لیکن بھائیوں سے کہا کہ مجھے ڈرائیونگ سکھا دیں اور انہوں نے بابا سے چھپ کر ایک دو بار کوشش بھی کی۔ کسی میدان میں لے جا کر اسٹیئرنگ میرے حوالے کر دیا۔ مگر کم عمری تھی اور ڈر بھی لگ رہا تھا اس لیے یہ تجربہ کامیاب نہیں رہا مگر مجھے یہ حسرت بھی نہیں رہی کہ میں

نے کوشش نہیں کی اور دو تا کاموں کے بعد بھائی نے کہہ دیا کہ میں ڈرائیونگ نہیں سیکھ سکتی اس لیے جب احسن نے کہا تو مجھے خیال آیا کہ اگر میں نے سیکھ لی تو اس بار گھر جا کر گاڑی چلا کر بھائی کو حیران کر دوں گی۔ احسن نے کہا۔

''کیوں نہیں سکھاؤں گا بلکہ آج کے دور میں تو یہ بہت ضروری ہو گیا ہے کہ خواتین بھی ڈرائیونگ سیکھیں۔''

میں راضی ہو گئی۔ احسن نے مجھے چھٹی والے دن ڈرائیونگ سکھانی شروع کر دی۔ ان کے پاس چھوٹی کار تھی اس پر مجھے آسانی سے ڈرائیونگ آ گئی اور ایک مہینے بعد میں خود کار ڈرائیو کرنے لگی تھی۔ نہ صرف عام گلیوں اور سڑکوں پر بلکہ رش والی جگہوں پر بھی آرام اور اعتماد سے ڈرائیو کر لیتی تھی۔ احسن میری سیکھنے کی رفتار سے خوش اور حیران تھے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ اتنی تیزی سے انہوں نے کسی مرد کو بھی ڈرائیونگ سیکھتے نہیں دیکھا ہے۔ دو مہینے بعد انہوں نے مجھے جدید ماڈل کی چھوٹی نئی کار دلوادی اور ساتھ ہی ڈرائیونگ لائسنس بھی بنوا دیا۔ اکیلے باہر میں اسی وقت سے جانے لگی تھی جب احسن نے مجھے اجازت دی تھی مگر کار لینے اور ڈرائیونگ سیکھنے کے بعد مجھے آسانی ہو گئی کہ اب رکشوں میں دھکے کھانے نہیں پڑتے تھے۔ ٹیکسی میں اکیلے نہیں بیٹھتی تھی اور بعض اوقات موقع پر رکشا بہت دیر اور مشکل سے ملتا تھا۔ اب مجھے کہیں جانا ہوتا تو میں آرام سے کار نکالتی اور چلی جاتی تھی۔

جب خود سے نکلنا شروع کیا تو مجھے اپنے آس پاس دیکھنے کا موقع ملا۔ اس بلڈنگ میں کل سات فلور تھے۔ نیچے بڑی شاپس تھیں اور اوپر چھ فلور اپارٹمنٹس کے تھے۔ ہر فلور پر آمنے سامنے تین تین اپارٹمنٹ تھے۔ درمیان میں تقریباً دس فٹ چوڑی راہداری تھی اور اس کے ایک سرے پر لفٹ تھی اور لفٹ سے ذرا پہلے سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ جب میں احسن کے ساتھ آتی جاتی تھی تو ہم لفٹ استعمال کرتے تھے لیکن جب اکیلے نکلنا شروع کیا تو میں لفٹ سے گریز کرنے لگی کیونکہ لفٹ میں کسی بھی وقت کوئی دوسرا آ سکتا تھا اور مجھے اس مختصر سی جگہ کسی دوسرے اجنبی مرد کے ساتھ موجود ہونے کے خیال سے ہی خوف آتا تھا اس لیے میں دو منزل سیڑھیوں سے چڑھ اتر لیتی تھی۔ ہمارے فلیٹ کے برابر میں ایک معمر جوڑا رہتا تھا ان کے بچے بیرونِ ملک تھے اور انہوں نے ماں باپ کو یہاں فلیٹ لے کر دیا ہوا تھا۔ وہ کسی سے ملتے جلتے نہیں تھے۔ جب سے میں یہاں آئی تھی

بس چند ایک بار آمنا سامنا ہوا اور انہوں نے بہ مشکل ہی سلام دعا کی۔ بائیں طرف کا فلیٹ خالی تھا۔

سامنے کے تین فلیٹس میں سے ایک میں فیملی رہتی تھی مگر ان کے بچے اسلام آباد میں اپنے دادا دادی کے پاس تھے کیونکہ دونوں میاں بیوی کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازم تھے۔ صبح جاتے اور رات دیر سے آتے تھے وہ بھی کسی سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے تھے۔ دوسرا فلیٹ کسی ایسی فیملی کے پاس تھا جو بیرونِ ملک تھی اور جب آتی تو یہاں ٹھہرتی تھی ورنہ ان کا فلیٹ خالی رہتا تھا۔ مگر ان تین مہینوں میں، میں نے ایک بار بھی انہیں آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ درمیان والا فلیٹ جو ہمارے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ اس میں کوئی اکیلا شخص رہتا تھا اور میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ احسن نے بتایا تھا کہ وہ اکیلا رہتا ہے اور عام طور سے فلیٹ میں ہی پایا جاتا ہے اسے باہر آتے جاتے کم دیکھا گیا ہے۔ اتفاق سے ہمارا فلور ہی کچھ غیر آباد تھا ورنہ باقی تمام فلور آباد تھے اور پوری بلڈنگ میں مشکل سے چھ سات فلیٹ خالی تھے۔ ان میں سے تین ہمارے فلور پر تھے۔ ایک صبح میں کچن کا کچھ سامان لینے کے لیے نکل رہی تھی۔ شادی کے بعد میں برقع کی جگہ عبائے پہننے لگی۔ یہ بڑے اسٹائلش عبائے تھے جو احسن نے مجھے اپنی پسند سے لا کر دیئے تھے۔ یہ کام والے اور کسی قدر فٹنگ لیے ہوئے تھے جس سے جسمانی تناسب ظاہر ہوتا تھا۔ مگر بہت زیادہ بھی نہیں۔

شروع میں مجھے عادت نہ ہونے کی وجہ سے الجھن ہوئی اور میں نے احسن سے کہا بھی کہ میں اس قسم کے عبائے کی عادی نہیں آپ مجھے برقع لا دیں۔ مگر انہوں نے اصرار کیا کہ یہ مجھ پر اچھے لگتے ہیں اس لیے میں انہیں ہی پہننے کی عادت ڈالوں۔ اس لیے مجبوراً میں انہیں ہی پہننے لگی اور پھر مجھے سچ مچ عادت ہو گئی۔ اب میں آرام سے عبائے میں باہر آتی جاتی تھی۔ یہ برقع کی نسبت آسان بھی تھے۔

اس وقت بھی میں نے عبایا پہنا ہوا تھا۔ شادی کے چند مہینوں میں میرا بدن فطری طور پر کچھ بھر گیا تھا اور میں جو عبائے استعمال کرتی تھی وہ بری میں آئے تھے یا پھر شادی کے فوراً بعد احسن لائے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ میں خود اپنے لیے ذرا کھلے عبائے لے لوں۔ نارمل میں تو پتا نہیں چلتا تھا مگر اٹھتے بیٹھتے ہوئے یہ جسم سے لگتے تھے اور ساخت نمایاں ہوتی تھی۔

اس دن میں باہر نکلی اور دروازہ لاک کر کے چابی

نکالنے لگی تو وہ نیچے گر گئی اور میں جھک کر اٹھا رہی تھی کہ مجھے کچھ محسوس ہوا۔ مجھے لگا جیسے کوئی عقب سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں جلدی سے سیدھی ہو کر مڑی تو سامنے والے فلیٹ کے دروازے پر ایک کسی قدر طویل قامت آدمی کھڑا تھا۔ اس کے سیاہ گھنگریالے بال گردن تک آرہے تھے۔ رنگ سرخ و سفید، آنکھیں نیلی اور نہایت دلکش مردانہ نقوش تھے۔ اس نے پتلون شرٹ پہنی ہوئی تھی جس میں اس کی ورزشی جسامت نمایاں تھی۔ سب سے بڑھ کر اس کی ہلکی سرمئی آنکھوں میں ایک عجیب سا سحر تھا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا اور میں چند لمحے کو مبہوت رہ گئی تھی۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی مرد اس قدر خوب صورت اور پُرکشش ہو سکتا ہے۔ سچی بات ہے ایک عام عورت کی طرح میں نے بھی کبھی مردوں کی ظاہری خوبصورتی کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ حد یہ کہ احسن کے بارے میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کیسے ہیں۔ بس مجھے یہ پتا تھا کہ وہ میرے شوہر ہیں اور میرے لیے سب کچھ وہی ہیں۔ مگر جب اس شخص کو دیکھا تو جیسے میں اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی تھی۔ میرے انداز نے اسے بتا دیا کہ میں اس سے متاثر ہوئی تھی دوسری طرف اس کی آنکھوں میں میرے لیے ستائش اتنی نمایاں تھی کہ میں شرما کر ہوش میں آئی اور پھر تیز قدموں سے سیڑھی کی طرف چل پڑی۔

میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور اس کا ارتعاش جسم تک آیا ہوا تھا جو میری چال میں بھی لڑکھڑاہٹ کی صورت میں نمایاں تھا۔ سیڑھیوں تک آتے ہوئے مجھے شدید احساس ہو رہا تھا کہ اس کی نظریں میرے وجود کا طواف کر رہی ہیں۔ مجھے یوں دیکھ رہی ہیں کہ اس سے پہلے کسی مرد نے سوائے احسن کے مجھے یوں نہیں دیکھا تھا۔ دیکھا تو اس نے بھی نہیں تھا کہ میں سر سے پاؤں تک چھپی ہوئی تھی۔ نقاب سے صرف میری آنکھیں باہر تھیں اور جب میں کار تک جاتی تو سن گلاسز لگا کر آنکھیں بھی چھپا لیتی۔ مگر مجھے یوں لگا جیسے اس نے مجھے بے لباس دیکھ لیا ہو۔ بہ مشکل میں لڑکھڑاتے قدموں سے سیڑھیاں اتر کر اس کی نظروں سے اوجھل ہوئی تو رک کر خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ میرا دماغ مجھے یاد دلا رہا تھا کہ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں اور میرا سب کچھ میرے شوہر کی امانت ہے اور مجھے کسی بھی مرد سے چاہے وہ کتنا ہی حسین کیوں نہ ہو اس طرح متاثر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مگر دل تھا کہ قابو میں نہیں آرہا تھا۔

پھر مجھے یاد آیا کہ جب میں چابی اٹھانے کے لیے جھکی تھی تب بھی اس نے مجھے دیکھا تھا اور یہ احساس یاد کر کے میری حالت مزید خراب ہونے لگی۔ میں سیڑھیوں سے اتری اور عقب میں موجود پارکنگ تک آئی جہاں کار کھڑی تھی۔ میں اندر بیٹھ کر گہری سانسیں لینے لگی اور میں نے چہرے سے نقاب ہٹا دیا تھا کیونکہ چہرے پر پسینا آرہا تھا۔ میں رومال سے اسے صاف کرنے لگی۔ گرمی تھی مگر باہر نکلنے سے پہلے میں نے پانی پیا تھا اس کے باوجود حلق یوں خشک ہو رہا تھا جیسے میں نے نہ جانے کب سے پانی نہ پیا ہو۔ میرے ذہن سے بالکل نکل گیا تھا کہ میں کس مقصد کے لیے گھر سے نکلی تھی۔ بس مجھے اس شخص کی نظریں یاد تھیں۔ عجیب بات تھی کہ مجھے برا نہیں لگا تھا کہ اس نے مجھے اس طرح کیوں دیکھا ورنہ اگر کوئی اور شخص مجھے اس طرح دیکھتا تو لازمی مجھے طیش آتا۔ مجھے اس پر نہیں بلکہ خود پر غصہ آنے لگا کہ مجھے اس پر غصہ کیوں نہیں آرہا تھا؟

کچھ دیر بعد میرا دل اور جسم تو قابو میں آ گیا مگر اب بھی اس شخص کا خیال اور اس کی نظروں کا احساس میرے اندر سے نہیں جا رہا تھا۔ میرا موڈ بدل گیا اور میں نے شاپنگ کا ارادہ بدل دیا۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ میری حالت پھر نہ خراب ہو جائے اور میں تماشا بن جاؤں۔ یہاں تو میں گھر کے پاس تھی۔ مگر مجھے اب اوپر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں پھر اس سے سامنا نہ ہو جائے اور میرا خود پر قابو نہ رہے۔ نہ جانے کتنی دیر میں کار میں بیٹھی رہی اور پھر اس وقت چونکی جب سامنے موجود ایک شخص نے ٹکٹکی باندھ کر مجھے گھورنا شروع کیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میرا چہرہ کھلا تھا۔ میں نے جلدی سے نقاب کیا اور آنکھوں پر سن گلاس لگا لیا۔ اس وقت مجھے اس شخص پر اتنا شدید غصہ آیا کہ میرا دل کیا کہ کار اسٹارٹ کر کے اس پر چڑھا دوں۔ اس کے بعد مجھے حیرت ہوئی کہ ایک ہی کام دو افراد نے کیا۔ ایک پر مجھے ذرا غصہ نہیں آیا اور دوسرے پر اتنا غصہ آیا۔

اس شخص کی آنکھوں کی ہوس تھی اور اس کی آنکھوں میں ستائش تھی مگر ساتھ ہی ایک ایسا حاکمانہ انداز بھی تھا جیسے مجھے اپنی مرضی سے دیکھنا اس کا استحقاق ہو۔ شاید اسی چیز نے میری حالت بری کر دی تھی۔ میں کار سے اتر کر اوپر کی طرف بڑھی تو ایک بار پھر میرے قدم لرزنے لگے تھے۔ مگر جب اوپر آئی اور راہداری کو خالی پایا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ شاید وہ اپنے فلیٹ میں چلا گیا تھا یا پھر کہیں باہر گیا

تھا مجھے تو ہوش ہی نہیں تھا کہ کسی کو آتے جاتے دیکھتی۔ میں نے ذرا اونچی ایڑی کی سینڈل پہنی ہوئی تھی جب میں چلتی تو اس کی ایڑی بجتی تھی۔ میں ذرا تیز قدموں سے اپنے فلیٹ کے دروازے تک آئی اور چابی نکال کر لاک کھول رہی تھی کہ عقب سے بہت دھیمی سی اور جیسے گونجتی سرگوشی میں آواز آئی۔ ''آپ خوب صورت ہیں...... با خدا بہت خوب صورت ہیں۔''

شکر ہے تالا کھل گیا تھا ورنہ اس سرگوشی نے میرے اندر جو حشر برپا کیا تھا اس کا اثر میرے پورے وجود پر آیا تھا۔ نہ جانے میں کیسے دروازہ کھول کر اندھا دھند اندر آئی اور کیواڑ دھڑ سے بند کر کے نزدیک موجود کاؤچ پر ڈھیر ہو گئی۔ پتا نہیں اسے کیسے پتا چلا کہ میں آگئی ہوں اور اس نے عین اس وقت دروازہ کھول کر وہ جملہ کہا۔ اف اس کی آواز اس کی آنکھوں سے کم نہیں تھی۔ اتنی تاثر اور احساس سے بھرپور کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ نہ جانے کتنی دیر میرا جسم بے اختیار کانپتا رہا اور میں شاید روتی رہی تھی کیونکہ جب میری اتنی ہمت ہوئی کہ میں اٹھ کر پانی پی سکوں تو مجھے سب دھندلا نظر آرہا تھا۔ فریج سے یخ پانی کی پوری بوتل حلق سے اتار کر میں واش روم میں آئی اور منہ دھویا تو میرے حواس کچھ بحال ہوئے تھے اور میں پہلی بار اس قابل ہوئی کہ اس واقعے پر غور کر سکوں۔

ابتدائے جوانی سے آج تک میرے ذہن میں کبھی کسی لڑکے یا مرد کا خیال نہیں آیا۔ حد یہ کہ میں نے دوسری لڑکیوں کی طرح کبھی خواب بھی نہیں دیکھے اور نہ ہی جاگتے ہوئے سپنوں میں کھوئی کہ میرا ہونے والا شریک سفر ایسا ہوگا اور نہ ہی مجھے کبھی شادی کے بعد کی زندگی کا خیال آیا۔ پھر میری شادی ہوئی اور اب میں اپنے شوہر سے پوری طرح مطمئن تھی۔ احسن سے محبت کرتی اور خود کو پوری طرح ان کی امانت سمجھتی۔ تب ایک شخص کی صرف ایک نظر اور ایک جملے نے میرا ایسا حال کیوں کیا؟ میرا ردعمل فطری کیوں نہیں تھا اس کی بجائے میرے ردعمل نے مجھے ہی حیران کر دیا تھا۔ میں ایسی بے حال کیوں ہوئی جیسے میں کوئی نوعمر لڑکی ہوں اور اسے کسی نے محبت کی نظر سے دیکھ لیا اور یہ بات اسے اچھی بھی لگی ہو۔ بلکہ شاید نوعمر لڑکی کی بھی وہ حالت نہ ہوتی جو میری ہوئی تھی۔ شاید اس لیے کہ میں شادی شدہ تھی اور ان تمام نزاکتوں سے شناسا تھی جو ایک مرد اور عورت کے درمیان ہو سکتی ہیں۔

میرا شعور میری اس کیفیت کو پسند نہیں کر رہا تھا مگر میرا لاشعور اس کے خلاف تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس سارا دن اس شخص کے بارے میں سوچتی رہی اور اس دن میں نے لاتعداد غلطیاں کیں۔ چائے کا پانی رکھ کر دو بار بھولی اور پانی خشک ہو گیا۔ شام میں کھانا بناتے ہوئے کام خراب ہوئے اور کھانا بھی ٹھیک سے نہیں بنا۔ اتفاق سے آج سرفراز چچا نے ہمارے ساتھ ہی کھانا تھا۔ امی نے مجھے اس وقت سے کھانا بنانے کی ذمے داریاں سونپی تھیں جب میں صرف بارہ برس کی تھی اور رفتہ رفتہ کچن کے مختلف کام کرتے اور ڈشیں بناتے ہوئے میں شادی تک سب کاموں میں طاق ہو گئی تھی۔ احسن اور سرفراز چچا کو میرے ہاتھ کا کھانا بہت پسند آیا تھا اس لیے آج جب انہوں نے کھانا شروع کیا تو ذرا حیران ہوئے تھے۔ کیونکہ اس بار کھانے میں وہ ذائقہ نہیں تھا مگر انہوں نے کچھ کہا نہیں۔ میں خود ہی شرمندہ ہوتی رہی اور جب سرفراز چچا کے لیے قہوہ بنا کر لائی تو ان سے معذرت کر لی۔

''چچا جان میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے آج کھانا ٹھیک سے نہیں بن سکا۔''

وہ تو پریشان ہو گئے۔ ''بیٹا کیا ہوا طبیعت کو...... زیادہ خراب تھی تو احسن کو کال کر دیتیں وہ آکر ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔''

''نہیں ایسی خراب نہیں تھی بس سر میں درد تھا اور سستی ہو رہی تھی۔''

''احتیاط کیا کرو بیٹے، آپ یہاں اکیلے ہوتے ہو ایسی کوئی بھی بات ہو تو احسن یا مجھے فوراً کال کیا کرو۔'' انہوں نے زور دے کر کہا۔

''جی اچھا چچا جان۔'' میں نے کہا۔

''بلکہ ایسا کرو کہ سارے دن کے لیے ملازمہ رکھ لو، اکیلی ہوتی ہو تمہارا دل بھی بہلا رہے گا اور خدانا خواستہ کوئی مسئلہ ہوا تو اکیلی نہیں ہوگی۔ وہ ہمیں بتا سکے گی۔''

اس شام جب احسن ابو کے ساتھ آئے تو ان کا رویہ کچھ عجیب سا تھا۔ انہوں نے آکر معمولی سے لہجے میں مجھ سے سلام دعا کی اور پھر کمرے میں چلے گئے۔ میں اپنی الجھن میں پڑی تھی اس لیے اس وقت زیادہ توجہ نہیں دی میں تو خود ان سے نظر نہیں ملا پا رہی تھی۔ اس کے باوجود میں نے محسوس کر لیا تھا۔ سرفراز چچا لاؤنج میں بیٹھے تھے اور میں وہیں کھانا بنا رہی تھی۔ ان سے بات کرتی رہی۔ احسن اندر سے اس

وقت نکلے جب میں نے کھانا لگا دیا اور ان کو آواز دی۔ کھانے کی میز پر بھی وہ سر جھکائے کھاتے رہے اور مجھ سے بس ایک، دو باتیں ہی کیں۔ جب میں نے سرفراز چچا کو طبیعت خرابی کا بتایا تب بھی وہ کمرے میں تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ چچا جان کے جانے کے بعد مجھ سے پوچھیں گے کہ آج کھانا ٹھیک سے کیوں نہیں بنا میں نے سوچ لیا تھا کہ ان سے بھی وہی طبیعت خرابی کا بہانہ کروں گی۔

مگر جب چچا جان کے جانے کے بعد میں کمرے میں آئی تب بھی احسن نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ اس کی بجائے وہ ٹی وی دیکھتے رہے۔ رات میں عام طور سے وہ ایک آدھ گھنٹا ٹی وی پر نیوز چینل دیکھ لیتے تھے اور ہمارے ہاں ٹی وی بس اتنا ہی چلتا تھا۔ میں مضطرب تھی کہ احسن مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہے ہیں۔ سچی بات ہے میں ان سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد احسن نے میری خاموشی محسوس کر لی اور بولے۔ ''کیا بات ہے آج چپ چپ سی ہو؟ طبیعت ٹھیک ہے نا؟''

میں اندر سے خود کو سنبھال رہی تھی مگر ان کی بات پر رہ نہ سکی اور پھوٹ کر رونے لگی تو وہ بوکھلا گئے۔ ''کیا ہوا مہرو .....کوئی بات، ہے خدانا خواستہ گھر میں کوئی مسئلہ ہے؟''

''نہیں، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' میں نے انکار کیا تو وہ بولے۔

''اگر گھر والے یاد آ رہے ہیں تو کچھ دن وہاں رہ آؤ۔''

میں نے چونک کر انہیں دیکھا اور پوچھا۔ ''آپ رہ لیں گے میرے بغیر؟''

''ہاں رہ ہی لوں گا۔'' وہ میری طرف دیکھے بغیر بولے تو مجھے حیرت ہوئی کیونکہ جب میں شادی کے بعد رہنے گئی تھی تو احسن بھی ساتھ ہی گئے تھے اور مجھے ساتھ ہی لے کر آئے تھے۔ انہوں نے اس وقت صاف کہہ دیا تھا کہ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اب وہ کہہ رہے تھے کہ میں چاہوں تو امی بابا کے پاس رہ آؤں۔ شادی کے چند مہینے بعد شاید سب ہی شوہر ایسا کرتے ہیں۔ شروع میں وہ جو دعوے کرتے ہیں چند مہینے بعد ان سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی محبت میں کمی آ جاتی ہے بلکہ یہ فطرت کا اصول ہے کہ کوئی بھی جذبہ اور عمل تا دیر ایک سا نہیں رہتا ہے۔ اس میں لازمی کمی آتی ہے۔ مگر ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ آج ان کا رویہ گزشتہ روز سے مختلف تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ تبدیلی تو میرے اندر آئی تھی۔ شاید اس وجہ سے مجھے احسن کا رویہ بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ میں نے سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے آپ مجھے ایک ہفتے کے لیے بھیج دیں۔''

''میں دیکھتا ہوں کہ کون سی فلائٹ سے جلد ٹکٹ مل جائے گا۔'' احسن جلدی سے بولے۔ ''آج کل رش ہے اس لیے شاید ایک دو دن لگیں۔''

اب میں بھی چاہ رہی تھی کہ ذرا اس ماحول سے نکلوں۔ جہاں سامنے ایک ساحر موجود تھا اور اس نے چند لمحوں میں میری پُرسکون زندگی کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ درحقیقت احسن کی موجودگی میں بھی میں اس کے خیال سے پیچھا چھڑا نہیں پا رہی تھی۔ اسی لیے میں مجوب بھی ہو رہی تھی کہ اپنے شوہر کے پاس ہوتے ہوئے بھی دوسرے فرد کی سوچیں میرے دماغ میں آ رہی تھیں۔ سرفراز چچا کے جانے کے بعد ہم بیڈروم میں تھے اور مسلسل شرمندگی سے تنگ آ کر میں غسل کے بہانے واش روم میں آ گئی۔ اس بڑے سے اور بہترین فلکچر سے آراستہ باتھ روم میں ایک طرف دیوار پر بڑا سا شیشہ لگا ہوا تھا۔ یہ شاور کے دوسری طرف تھا اور اس میں آدمی اپنے آپ کو پورا دیکھ سکتا تھا۔ اس روز پہلی بار شاور لیتے ہوئے میں نے خود کو غور سے دیکھا۔ کیا مجھ میں واقعی ایسی کشش تھی کہ ایک مرد جو خود اس قدر خوبرو اور پُرکشش تھا میری طرف یوں متوجہ ہو، مجھے اس قدر والہانہ انداز میں دیکھے اور بلاخوف وخطر میری خوب صورتی کی تعریف کرے، جب کہ اس نے صحیح معنوں میں مجھے دیکھا ہی نہیں تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں آئینے میں خود کو اپنے شوہر نہیں بلکہ ایک غیر مرد کے نقطۂ نظر سے دیکھ رہی ہوں۔ اس سے پہلے احسن نے میری کتنی ہی والہانہ تعریف کی اور مجھ سے کہا کہ میں خود کو دیکھوں لیکن میں نے کبھی اس بات پر عمل نہیں کیا۔ مجھے یہ بات اچھی ہی نہیں لگی تھی۔ اللہ نے عورت کا ستر ایسا رکھا ہے کہ خود اس سے بھی چھپا ہوا ہے۔ ہمارے دین میں میاں بیوی کو بھی ایک دوسرے کے ستر کی پردہ پوشی کا خیال رکھنے کو کہا گیا ہے۔ مگر آج ایک اجنبی نے مجھے دیکھا اور میری تعریف کی تو میں خود کو یوں آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ یہ خیال آیا تو میں اندر سے کٹ کر رہ گئی۔ میں شریف عورت ہوں یہ مجھے کیا ہو رہا تھا۔ میری آنکھیں ایک بار پھر برسنے لگیں تھیں۔ نہ جانے میں کتنی دیر شاور تلے کھڑی رہی حتیٰ کہ احسن نے دروازہ بجایا۔ ''کیا ہے کتنے لمبے باتھ کا ارادہ ہے؟''

''آتی ہوں۔'' میں نے جلدی سے آنکھیں صاف کیں مگر جب باہر آئی تو احسن نے غور سے دیکھا۔

''تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔''

''سر میں درد ہے۔'' میں نے وہی بہانہ کیا۔''شام میں کم ہو گیا تھا مگر اب پھر بڑھ گیا ہے۔''

''ایسا کرو کوئی پین کلر لے کر سو جاؤ۔'' احسن نے کہا اور پھر خود دوا اور پانی بھی لا کر دیا۔ سر میں درد نہیں تھا مگر میں نے دوا لے لی اور لیٹ گئی تاکہ احسن مطمئن ہو جائیں۔ احسن بھی دوسری کروٹ پر لیٹ کر سو گئے۔ ہماری شادی کے بعد کم ہی ایسا ہوا تھا کہ احسن یوں مجھ سے پہلے سو گئے ہوں ورنہ وہ اکثر میرے بعد سوتے تھے۔ میں شروع سے نیند کی پکی تھی۔ لیٹتی اور ذرا دیر میں سو جاتی۔ مگر اس رات مجھے بہت دیر سے نیند آئی۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر وہ نظریں اور وہ لہجہ گھومتا رہا تھا۔ جب احسن نے مجھے اپنے گھر جانے کو کہا تو میں اسی لیے مان گئی کہ میں اس جگہ سے دور چلی جاؤں گی جہاں یہ شخص میرے گھر کے عین سامنے موجود تھا۔ مجھے تو اس کا نام بھی نہیں معلوم تھا۔

اگلے روز صبح احسن کا رویہ ویسا ہی تھا وہ زیادہ بات نہیں کر رہے تھے اور نہ ہی میری طرف زیادہ دیکھ رہے تھے۔ میرا دل پھر دھڑک اٹھا کہ کیا وہ جان گئے تھے کہ کل کیا ہوا تھا؟ مگر وہ کیسے جان سکتے تھے؟ یہ سب تو میرے اندر ہوا تھا۔ اس وقت احسن کام پر تھے اور کسی نے دیکھا بھی نہیں تھا جو انہیں بتا سکتا اور دیکھ بھی لیا تھا تو کیا بتاتا۔ بہ ظاہر تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ احسن کے جانے کے بعد میرے اندر پھر خوف سے آنے لگے۔ مجھے خیال آیا کہ وہ شخص یہاں سے کچھ ہی دور ہے۔ اگرچہ درمیان میں دیواریں تھیں میں اپنے گھر میں محفوظ تھی۔ مگر پھر بھی مجھے اس جادوگر شخص سے خوف آ رہا تھا۔ یہ سچ ہے کہ جب میں اس کے بارے میں سوچتی تو مجھے لگتا کہ وہ عام آدمی ہے اس میں کوئی ایسی چیز ہے جو دوسروں کو اپنے ٹرانس میں لے لیتی ہے۔ بے شک اس کی شخصیت نے مجھے بے خود کر دیا تھا مگر یہ کام میں نے کسی اندرونی جذبے سے متاثر ہو کر نہیں کیا تھا۔

کام کرنے والی عام طور سے گیارہ بجے آتی تھی۔ اس لیے گیارہ بجنے میں کچھ دیر پہلے کال بیل بجی تو میں نے یہ سوچ کر پوچھے بغیر دروازہ کھول دیا کہ وہی ہوگی۔ مگر دروازہ کھولتے ہی میں جیسے منجمد ہو گئی تھی۔ سامنے وہی کھڑا تھا۔ میرے بالکل سامنے چند فٹ کے فاصلے پر اور پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی جرأت کرے گا کہ میرے گھر تک آ جائے گا۔ میں گرمی کی مناسبت سے لان کے ہلکے سوٹ میں تھی اور دوپٹا تھا۔ کسی قدر فٹنگ والی ہاف سلیو شرٹ تھی۔ دوپٹا میرے شانوں پر تھا۔ اس کی نگاہیں میرے چہرے سے شروع ہوئیں اور میرے پورے وجود کو ٹٹولتی ہوئی پاؤں تک گئی تھیں۔ میں ان نظروں کو پوری شدت سے محسوس کر رہی تھی مگر میرا بدن یوں شل ہو گیا تھا کہ میں اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ اپنا ہاتھ ہلا کر دوپٹا تک ٹھیک نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی نظریں واپس پلٹیں اور دوبارہ اسی طرح پورے وجود کو ٹٹولتی ہوئی چہرے تک آئیں اور میری آنکھوں میں دیکھا تو اس کی آنکھوں میں میرے لیے بے پناہ ستائش تھی۔ اس نے پھر اسی دھیمی اور گونجتی آواز میں کہا۔''میں نے ٹھیک کہا تھا نا آپ بہت خوب صورت ہیں۔ یہ آپ کے حسن کو خراج کے لیے.....''

اس نے ہاتھ آگے کیا تو اس میں ایک گلاب کی کلی تھی۔ مگر میں تو انگلی بھی نہیں ہلا پا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جس نے میرا ذہن ماؤف کر دیا تھا۔ اس نے پھر کہا۔''جب میں نے آپ کو دیکھا تو مجھے لگا کہ آپ سے زیادہ حسین اور دلکش عورت اس روئے زمین پر اور کوئی نہیں ہوگی۔ آپ کا ایک ایک انگ جیسے دست خاص سے تراشا ہوا ہے، آپ کے نقوش جیسے سبک ہوا نے ترتیب دیئے ہیں۔ آپ کو دیکھنا ہی میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔''

جواب میں، میں ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ آج بھی اس نے پینٹ شرٹ پہنی ہوئی تھی اور شرٹ کے کھلے گریبان سے اس کا کشادہ سینہ جھلک رہا تھا۔ اس کے پاس سے عجیب انوکھی اور مسحور کر دینے والی خوشبو آ رہی تھی۔ گلاب کی کلی تھاما اس کا ہاتھ بھرا تھا۔ آستین الٹی ہوئی تھی اور کلائی سے ہلکے بال جھلک رہے تھے۔ پھر میں نے خود کو کہتے پایا۔''آپ نے مجھے کب دیکھا میں تو پردے میں تھی۔''

''پردہ عام لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔'' اس نے کہا اور ذرا جھک کر بولا۔''مجھ جیسے لوگوں کے لیے نہیں، آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ پردے میں بھی میں نے آپ کو کیسے دیکھا۔ بالکل ایسے جیسے رات شاور لیتے ہوئے آپ نے خود

کو آئینے میں دیکھا۔''
اس وقت کوئی میرے دو ٹکڑے کر دیتا تب بھی میرے بدن سے ایک قطرہ خون نہ نکلتا۔ میرا دل رکنے سا لگا تھا اور مجھے لگا جیسے میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔ میرا سر چکرانے لگا تھا اور آنکھوں کے آگے اس کا وجود لہرا رہا تھا پھر شاید میں گرنے لگی تھی کہ اس نے بڑھ کر مجھے سنبھال لیا۔ میں نے چاہا کہ وہ مجھے نہ چھوئے مگر میں اسے نہ روک سکی۔ اس نے بازوؤں میں لے کر مجھے اٹھایا اور اندر لے جانے لگا۔ میں اسے روکنا چاہتی تھی مگر روک نہیں سکی۔ اس وقت مجھے لگا کہ اگر وہ مجھے اندر بیڈ تک لے گیا تو شاید وہ سب ہو جائے جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں تو اسے روکنے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو یہ بھی کم نہیں تھا کہ میں ایک غیر مرد کی بانہوں میں تھی۔ پھر مجھے احسن کا خیال آیا اور میں تڑپ گئی مگر اس کے بازوؤں سے نہ نکل سکی۔ اسی لمحے کال بیل بجی اور میں جیسے تھم گئی۔ چند لمحے کو میں بالکل بے ہوش سی ہو گئی تھی اور جب دوبارہ کال بیل بجنے پر میں چونکی تو میں نے خود کو لاؤنج میں کاؤچ پر لیٹے پایا اور وہ وہاں نہیں تھا۔ میں نے ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھا مگر وہ مجھے کم از کم لاؤنج میں نظر نہیں آیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے جسم کے ایک ایک ریشے سے توانائی خارج ہو چکی ہو۔ مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ تیسری بار کال بیل بجی تو میں بہ مشکل لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھی اور دروازے تک آئی۔ میرا خیال تھا کہ دروازہ کھلا ہوگا مگر وہ بند تھا۔ اس بار میں نے پوچھا۔
''کون ہے؟''
''میں ہوں بی بی جی۔'' کام والی کی آواز آئی۔
میں نے دروازہ کھولا تو وہ میری حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ ''کیا ہوا بی بی جی آپ تو بالکل پیلی ہو رہی ہو۔''
میں نے اپنا چکراتا سر تھام لیا۔ ''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''
وہ مجھے سہارا دے کر اندر لائی اور بستر پر لٹا کر سوالات کرنے لگی۔ میں نہ جانے کیا جواب دے رہی تھی کیونکہ میں سوچ رہی تھی کہ یہ جو سب ہوا کیا حقیقت میں ہوا یا میں نے کوئی خواب دیکھا تھا؟ اس نے مجھے بتایا کہ میں نے شاور لیتے ہوئے خود کو دیکھا تو اسے کیسے پتا چلا؟ نہیں یہ میرا خواب و خیال تھا۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جو بات صرف مجھے پتا تھی وہ اسے کیسے معلوم ہو سکتی تھی۔ کام والی نے کہا۔ ''بی بی جی آپ لیڈی ڈاکٹر کو دکھائیں، شاید اللہ نے خوشخبری دی ہو۔''
میں چونکی۔ ''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''
اس نے اصرار کیا۔ ''آپ کو نہیں پتا بی بی جی، ان دنوں عورت ایسا ہی محسوس کرتی ہے۔ آپ ضرور ڈاکٹر کے پاس جائیں۔''
''مجھے پانی لا دو۔'' میں نے اپنا سر سہلاتے ہوئے کہا۔ اس نے مجھے پانی لا کر دیا۔ میں جیسے جیسے بہتر ہو رہی تھی مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے خواب ہی دیکھا ہے اور میرے اندر کی خلش مٹتی جا رہی تھی۔ میں اٹھ کر کچن تک آئی اور چائے کا پانی رکھا۔ اس دوران میں کام والی نے صفائی شروع کر دی تھی۔ میں اسے دیکھنے آئی کہ لاؤنج میں آتے ہی ٹھٹک گئی۔ دروازے کے پاس ریک کے اوپر وہی گلاب کی کلی رکھی تھی جو وہ شخص مجھے دے رہا تھا۔ مجھے لگا میرا سر پھر چکرا رہا ہے۔ تو وہ سب حقیقت میں ہوا تھا۔ میں نزدیک کاؤچ پر بیٹھ گئی ورنہ کھڑی نہ رہ پاتی۔ یہ گلاب کی کلی اس حقیقت کا ناقابلِ تردید ثبوت تھی کہ وہ سچ مچ آیا تھا اور اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں اٹھایا تھا لیکن پھر وہ کہاں چلا گیا۔ اسی دوران میں تو کال بیل بجی تھی۔ وہ کام والی کی نظروں میں آئے بغیر کیسے جا سکتا تھا؟ اپنی الجھن دور کرنے کے لیے میں نے کام والی کو آواز دے کر بلایا اور اس سے پوچھا۔ ''یہ تم لائی ہو؟''
''نہیں بی بی جی میں نہیں لائی۔'' اس نے انکار کیا۔
''اچھا پھر احسن لائے ہوں گے۔'' میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا کیونکہ وہ ذرا عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ''رات میری طبیعت خراب تھی تو دینا بھول گئے ہوں گے۔''
مگر شاید یہ میرا احساس تھا ورنہ اسے ذرا بھی پروا نہیں تھی کہ گلاب کی کلی کہاں سے آئی؟ وہ تو سوال کا جواب دے کر چلی گئی تھی۔ میں ہی اپنے اندرونی احساسات کے تحت اسے صفائی دے رہی تھی۔ وہ اپنے کاموں میں لگ گئی۔ یہ سوچ کر میری حالت پھر خراب ہونے لگی کہ مجھے سچ مچ کسی اجنبی شخص نے چھوا تھا۔ مجھے اپنا آپ برا لگ رہا تھا۔ میں جا کر کمرے میں لیٹ گئی۔ میرا دل تو رونے کو چاہ رہا تھا مگر میں کام والی کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ اتفاق سے اس دن کپڑے کم تھے اس لیے جب اس نے صفائی کی تو

میں نے اس کی چھٹی کر دی۔ ''کپڑے کل آ کر دھو لینا۔''

''ٹھیک ہے بی بی جی۔'' وہ خوش ہو گئی پھر اسے خیال آیا۔ ''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کھانے کو کچھ بنا دوں۔''

''نہیں میرا دل نہیں چاہ رہا ہے ویسے فریج میں رکھا ہوا ہے۔'' میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا ورنہ فریج میں پکا ہوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں ایک وقت بس اتنا بناتی تھی کہ وہ ایک دن چل جائے اگلے دن بچ نہ جائے اور اگر بچ جاتا تو اسے کام والی کو دے دیتی تھی۔ مجھ سے اور احسن سے بھی ایک دن کا رکھا نہیں کھایا جاتا تھا۔ کام والی کے جانے کے بعد میں نے دروازے کو اندر سے لاک کیا۔ زنجیر چڑھائی اور پھر کنڈی بھی چڑھا دی۔ اس کے باوجود مجھے خوف تھا کہ کہیں وہ شخص پھر نہ آجائے اور میں اس کے سامنے پھر بے بس نہ ہو جاؤں۔ میں سوچ رہی تھی کہ وہ کیا تھا اسے کیسے علم ہوا کہ میں نے خود کو آئینے میں دیکھا تھا اور اس نے جو تشبیہ دی تھی اسے سوچ کر ہی میں اندر سے کٹنے لگی تھی۔ جب وہ مجھے اندر لے کے جا رہا تھا تو کال بیل بجنے پر وہ میری اور کام والی کی نظروں میں آئے بغیر باہر کیسے نکلا؟ جب میں ہوش میں آئی اور دروازہ کھولا تو کام والی نے پورا گھر صاف کیا تھا اور اگر وہ کہیں چھپا ہوتا تو لازمی نظروں میں آتا۔ شاید وہ کسی جگہ چھپ گیا تھا اور جب کام والی مجھے سہارا دے کر میرے کمرے تک لائی تو وہ خاموشی سے باہر نکل گیا ہوگا۔ اس وقت بھی مجھے لگا کہ وہ گھر میں موجود ہے۔ میں نے گھوم کر پورا گھر دیکھا ایک ایک جگہ چیک کی اور اس کے بعد مجھے اطمینان نہیں ہوا تو میں نے گھبرا کر اللہ کو یاد کیا۔ ''اے اللہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میری عزت و آبرو کی حفاظت کر جو میرے پاس میرے شوہر کی امانت ہے۔ تو جانتا ہے کہ میں ایسی عورت نہیں ہوں جو اپنے شوہر کی امانت میں خیانت کروں۔''

یہ دعا کر کے مجھے ذرا سکون ملا تھا مگر گھر میں اکیلی ہونے کا اطمینان کرنے کے باوجود جب تک شام کو احسن نہیں آ گئے میں سہمی رہی اور ذرا سی آہٹ پر اچھل پڑتی تھی۔ احسن آئے اور مجھے دیکھ کر حیران ہوئے۔ تھے۔ انہوں نے بھی کام والی کی طرح کہا۔ ''مہرو تمہیں کیا ہوا ہے تمہارا رنگ پیلا پڑ گیا۔''

شادی کے بعد پہلی بار ایسا ہوا کہ میں خود ان سے لپٹ گئی۔ میں رو دی تھی۔ ''احسن مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے پلیز آپ مجھے چھوڑ کر مت جایا کریں۔ ورنہ کسی دن میں مر جاؤں گی۔''

انہوں نے پوچھا۔ ''ایسا کیوں کہہ رہی ہو کوئی بات ہوئی ہے؟''

میں نے ان کے سینے میں منہ چھپا لیا کہ کہیں میرے تاثرات وہ بات نہ کہہ دیں جو میری زبان کسی صورت نہیں کہہ سکتی تھی۔ میں نے صرف نفی میں سر ہلایا تو انہوں نے محبت سے کہا۔ ''تم اصل میں بھرے پرے گھر سے آئی ہو اور یہاں بالکل اکیلی ہوتی ہو اس لیے تمہیں ایسا لگ رہا ہے لیکن شاید جلد یہ تنہائی دور ہو جائے اور کوئی چھوٹا موٹا کھلونا آجائے تمہارا دل بہلانے کے لیے۔'' احسن کا لہجہ معنی خیز ہو گیا

ان حالات میں بھی میں شرما گئی اور خوش ہو گئی۔ ''سچ کہہ رہے ہیں؟''

''ہاں نا۔'' وہ بولے۔ میرا خیال تھا کہ وہ پھر شوخی آمیز بے باکی پر اتر آئیں گے۔ مگر خلاف توقع انہوں نے مجھے خود سے الگ کیا اور بولے۔ ''میں نے کل صبح کی سیٹ بک کرا دی ہے اور شاہد (میرے بڑے بھائی) کو اطلاع دے دی ہے وہ تمہیں ملتان ایئرپورٹ لینے آئے گا۔''

میں نے سکون کا سانس لیا اور پوچھا۔ ''میں کتنے دن ای کے ہاں رہوں؟''

دس منٹ میں کینسر

سائنسدان نے دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے ایک ایسا سستا اور ہاتھ میں تھامنے والا آلہ تیار کر لیا ہے جو کسی بھی قسم کی بیماری مثلاً ٹی بی، ملیریا، ایچ آئی وی انفیکشن یا کینسر کا صرف دس منٹ میں سراغ لگا سکتا ہے۔ q.poc مشین کی قیمت صرف 500 پاؤنڈ ہے۔ یہ مشین ٹیومرز یا رسولیوں کا انتہائی گہرائی تک تجزیہ کر سکتی ہے اور امراض کی جینیاتی شناخت کا پتا چلا سکتی ہے۔ جس کے بعد مریض کے لیے بہترین قسم کی دواؤں کا انتخاب آسان ہو جاتا ہے۔

مرسلہ: انیلہ نعمان خان، کراچی

''جتنے دن تم چاہو۔'' وہ بولے میں پھر حیران ہوئی میرا خیال تھا کہ وہ ایک دو دن کی بات کریں گے۔ اگرچہ پہلے میں نے ایک ہفتے کا کہا تھا اور وہ چپ ہو گئے تھے مگر مجھے لگا کہ وہ مجھے جلد واپس بلا لیں گے۔ میں نے پھر پوچھا۔

''آپ رہ لیں گے میرے بغیر؟''

''ہاں رہ لوں گا۔'' انہوں نے پھر آنکھیں چرائیں اور عجیب سے انداز میں ہنس کر بولے۔ ''اب تو ہماری شادی کو پانچواں مہینا ہے۔''

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ کی دیوانگی اتنی جلدی ختم ہو جائے گی۔'' میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ کیا اور پھر شرمندہ ہو گئی۔ ''سوری میں آپ کو جتا نہیں رہی تھی۔''

''نہیں تم نے ٹھیک کہا۔'' وہ آہستہ سے بولے پھر کہا۔ ''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے چل کر ڈاکٹر کو دکھاتے ہیں اور باہر سے ہی کھانے کو کچھ لے آئیں گے۔''

''نہیں ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے منع کیا مگر انہوں نے اصرار کیا۔

''چلو نا، اس طرح تمہاری آؤٹنگ بھی ہو جائے گی۔''

میرا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر اس خیال سے تیار ہو گئی کہ کل صبح میں چلی جاؤں گی اور جانے سے پہلے میں احسن کی کوئی بات ٹالنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ میرا خیال رکھ رہے تھے۔ میں تیار ہوئی عبایا پہنا اور احسن کے ساتھ باہر آئی۔ میں سامنے والے دروازے کی طرف نہیں دیکھنا چاہ رہی تھی مگر باہر آتے ہی اس طرف نظر اٹھ گئی۔ دروازہ بند تھا اس کے باوجود مجھے اس قدر خوف آیا، یوں لگا جیسے دروازے کے پیچھے وہ خود موجود ہے۔ احسن کی موجودگی بھی مجھے اطمینان دینے سے قاصر تھی۔ بلکہ مجھے یہ فکر لاحق ہوگئی کہ اگر وہ باہر نکل آیا تو میری حالت پھر خراب ہو جائے گی اور اس بار احسن بھی یہ سب دیکھ لیں گے۔ وہ مرد تھے اور مجھ پر شک کر سکتے تھے۔ اس لیے میں تیز قدموں سے لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔ احسن دروازہ لاک کر کے پیچھے آئے اور بولے۔ ''کہاں، تو تم باہر نہیں جا رہی تھیں اور کہاں اب اتنی جلدی ہے۔''

''بس بند جگہ پر دل گھبرا رہا ہے میں چاہتی ہوں ہم جلدی سے باہر نکل جائیں۔''

میں احسن سے بات کر رہی تھی اور میرا دھیان ان کی طرف ہی تھا اس لیے میں اسے آتے نہیں دیکھ سکی لیکن جب احسن کا ہاتھ لفٹ کا بٹن دباتے دباتے رک گیا تب میں نے سر اٹھایا اور اسے لفٹ کی طرف آتے دیکھا۔ میرا دل سچ مچ رک گیا اور یوں لگا جیسے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ گرنے سے بچنے کے لیے میں نے پشت دیوار سے ٹکائی اور نظریں جھکاتے ہوئے سختی سے فرش پر گاڑ دیں۔ اگر اس وقت لفٹ کا فرش پھٹتا اور میں اس میں گر جاتی تب بھی مجھے گوارہ تھا مگر اس شخص کے ساتھ ایک ہی جگہ ہونا میرے لیے کیسا عذاب بن گیا تھا یہ میں ہی جانتی تھی۔ اوپر سے احسن بھی ساتھ تھے۔ وہ مجھ سے آگے تھے اور وہ شخص ان کے دائیں طرف موجود تھا۔ جب لفٹ چلی تو وہ غیر محسوس انداز میں سرک کر پیچھے آیا اور مجھے ایک بار پھر محسوس ہوا کہ وہ مجھے ٹٹولتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

میرے بدن میں تھرتھری چھوٹ گئی تھی۔ میں نے ہاتھ سختی سے اپنے ہینڈ بیگ پر باندھ لیے اور منہ دوسری طرف کر لیا آنکھیں بھی بند کر لیں اس کے باوجود اس احساس سے پیچھا نہیں چھوٹا تھا۔ یہ اچھی کوالٹی کی تیز رفتار لفٹ تھی اور دو فلورز سیکنڈوں میں گزر جاتے ہیں مگر مجھے ایسا لگا جیسے لفٹ میں وقت تھم گیا ہو وہ گزر کر نہیں دے رہا تھا اور نہ جانے کب لفٹ رکی۔ احسن نے مجھے دوسری بار آواز دی تو میں چونکی پھر انہوں نے کہا۔ ''کیا ہوا تم جواب کیوں نہیں دے رہیں؟ لفٹ کب کی رکی ہوئی ہے۔''

تب میں نے چونک کر دیکھا لفٹ واقعی رکی ہوئی تھی دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ شخص اب لفٹ میں نہیں تھا۔ میں نے دیوار سے جدا ہو کر باہر قدم نکالا۔ میری حالت اس وقت بھی اچھی نہیں تھی دل بے طرح دھڑک رہا تھا اور جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ مگر جسم قابو میں تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ کہیں آس پاس ہوا تو میں پھر خود پر قابو نہ رکھ سکوں گی مگر اللہ کا شکر ہے وہ کہیں نہیں تھا۔ کار میں بیٹھتے ہی میں نے احسن سے کہا۔ ''پلیز اے سی آن کر لیں اور پہلے کہیں سے مجھے پینے کے لیے کچھ ٹھنڈا لا دیں۔''

احسن نے پہلی بار مجھے دیکھا اور فکرمندی سے بولے۔ ''کیا ہوا تمہیں اتنا پسینا کیوں آ رہا ہے۔''

میرے چہرے کا نقاب تک پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ ''پتا نہیں میرا دل گھبرا رہا ہے۔''

احسن نے کار ایک کولڈ ڈرنک اسپاٹ پر روکی اور میرے لیے یخ بستہ ٹن لے آئے۔ اسے پی کر مجھے سچ مچ

بہت سکون ملتا تھا۔ میری حالت بہتر ہوئی تو ہم پہلے ایک ریستوران گئے۔ مجھے یہاں کا ماحول پسند تھا کیونکہ یہاں میزیں ایسے رکھی تھیں کہ ایک میز پر بیٹھے لوگ دوسری میز پر بیٹھے لوگوں کو نہیں دیکھ سکتے تھے اور میں یہاں آرام سے نقاب اتار کر بیٹھ سکتی تھی۔ جب ویٹر آتا تو نقاب کر لیتی اور اس کے جانے کے بعد دوبارہ اتار دیتی۔ احسن نے پہلی بار مجھ سے پوچھا۔ ''مہرو تمہیں کیا ہو رہا ہے تمہاری طبیعت خراب ہے یا دل گھبرا رہا ہے؟''

''پتا نہیں، شاید دونوں باتیں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''سر بھی چکرا رہا ہے اور دل بھی گھبرا رہا ہے۔''

''ابھی یہاں سے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔'' احسن نے کہا اور کھانے کا پوچھنے لگے۔ میں نے مینو بک دیکھی اور انہیں بتانے لگی۔ انہوں نے ویٹر کو بلا کر آرڈر کیا۔ اب میں خود کو مطمئن اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی اس لیے میں نے ٹھیک سے کھایا۔ کھانے کے بعد ہم نکلے تو میں نے ڈاکٹر کے پاس جانے سے انکار کیا مگر احسن اصرار کر کے لے گئے۔ اتفاق سے یہ لیڈی ڈاکٹر تھی اور اس نے میری کیفیت سن کر مجھے پریگنینسی ٹیسٹ کرانے کو کہا۔ میں جانتی تھی ایسی کوئی بات نہیں ہے مگر میں اسے یا احسن کو تو نہیں بتا سکتی تھی اس لیے میں چپ رہی۔ اس نے مجھے لکھ کر دیا اور ساتھ ہی طاقت اور منرلز کی کچھ دوائیں بھی لکھ دیں۔ جب باہر آئے تو میں نے احسن سے کہا۔

''میں امی کی طرف جا رہی ہوں وہیں یہ ٹیسٹ کرا لوں گی۔''

''ہاں اب تو وقت بھی نہیں ہے۔'' احسن نے کہا۔ ''لیکن دوائیں میں لے دیتا ہوں تم باقاعدگی سے استعمال کرنا۔''

راستے میں رش بہت تھا۔ دو تین جگہوں پر جہاں میڈیکل اسٹور تھے وہاں گاڑی پارک کرنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ احسن پریشان ہو گئے تو میں نے کہا۔ ''ہمارے فلیٹس کے نیچے بھی تو ایک میڈیکل اسٹور ہے وہاں سے مل جائیں گی۔''

''ہاں اس کا تو میں بھول ہی گیا تھا۔'' احسن نے کہا۔

ہم بلڈنگ تک آئے اور احسن نے پارکنگ میں گاڑی روک دی۔ ''تم چلو میں دوائیں لے کر آتا ہوں۔''

''نہیں میں آپ کے ساتھ ہی جاؤں گی۔'' میں نے انکار کیا۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ شخص پھر نہ آن موجود ہو، نہ

جانے اسے کیسے اطلاع مل جاتی تھی کہ میں کہاں ہوں اور وہ آن موجود ہوتا تھا۔ اس لیے میں اکیلے جاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ احسن کی موجودگی سے مجھے یہ ڈھارس ہوئی تھی کہ اگر میں بے خود بھی ہوگئی تو وہ مجھے سنبھال لیں گے۔ کوئی غیر مجھے ہاتھ نہیں لگائے گا۔ مگر احسن نے کہا۔

''کم آن یار اتنی گرمی میں گاڑی میں بیٹھی رہو گی شاباش اوپر جاؤ میں جب تک دوائیں لے کر آتا ہوں۔'' احسن نے کہتے ہوئے مجھے چابی پکڑا دی اور میں مجبوراً گاڑی سے اتر آئی۔ احسن دکانوں کی طرف چلے گئے تھے اور میں لرزتے قدموں سے بلڈنگ کی انٹرنس میں آئی۔ میں نے سوچ لیا کہ سیڑھیوں سے جاؤں گی۔ مگر جب سیڑھیوں تک آئی تو وہاں تاریکی تھی۔ حالانکہ میں نے کبھی وہاں تاریکی نہیں دیکھی تھی۔ مگر اس وقت اندھیرا تھا اور اوپر کہیں کسی فلور پر ہلکی سی روشنی جھلک رہی تھی۔ مگر درمیان میں نہ صرف تاریکی تھی بلکہ اس تاریکی کو دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے اس میں کوئی عفریت چھپا ہوا میرا انتظار کر رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں تاریکی میں جاؤں اور وہ مجھے دبوچ لے۔ ڈر کر میں پیچھے ہٹی اور لابی میں آئی۔ دن میں یہاں ایک گارڈ ہوتا تھا مگر وہ شام کو چلا جاتا اور اس کے بعد انٹرنس کا گیٹ بند کر دیا جاتا۔ تمام لوگ جو یہاں رہتے تھے ان کے پاس گیٹ کی چابی تھی اور وہ اس کی مدد سے اندر جا سکتے تھے۔

مگر ابھی میں آئی تو گیٹ کھلا ہوا تھا۔ میں اتنی خوفزدہ ہوئی تھی کہ واپس باہر جانے لگی مگر جب گیٹ تک آئی تو اسے بند پایا۔ اندر سے یہ صرف ہینڈل گھمانے سے کھل جاتا تھا۔ میں نے اسے گھمانا چاہا تو وہ سخت نکلا گھوم ہی نہیں رہا تھا۔ میرا خوف بڑھ گیا کہ میں یہاں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ آنے جانے کا یہی ایک واحد راستہ تھا۔ میں نے ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور تب میری نظر لفٹ کی طرف گئی۔ وہاں روشنی تھی۔ اس وقت یہاں سے نکلنے کا واحد راستہ یہی لفٹ تھی۔ اگرچہ مجھے اکیلے لفٹ میں جاتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا مگر اس وقت جو ڈر تھا وہ اس خوف پر حاوی ہو گیا تھا میں بہر صورت اپنے گھر کی محفوظ پناہ گاہ میں جانا چاہتی تھی۔ اس لیے لفٹ کی طرف بڑھی اور ساتھ ہی پلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی کہ کوئی یا وہ شخص آس پاس تو نہیں ہے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ وہ نظر آیا تو میں بلا تکلف چلانا شروع کر دوں گی۔ چاہے بعد میں اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔ مگر وہ یا کوئی بھی نظر نہیں آیا۔

میں لفٹ تک آئی اور اس کا بٹن دبایا۔ لفٹ اوپر تھی وہ نیچے آنے لگی۔ میں ابھی تک آس پاس دیکھ رہی تھی۔ اس لیے جب دروازہ کھلا تب بھی میری توجہ اس طرف نہیں تھی۔ پھر وہی احساس ہوا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے اور میں چونکی تو لفٹ میں اسے موجود پایا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے اور سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں ایک بار پھر شل ہو گئی۔ اسے دیکھ کر چلانے اور مزاحمت کرنے کے تمام خیالات میرے ذہن سے جیسے اڑ گئے تھے۔ میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر میرے پاؤں زمین میں گڑ گئے اور پھر اس نے ہاتھ سے اندر آنے کا اشارہ کیا تو میں جیسے کھنچی چلی گئی تھی۔ میرے اندر آتے ہی وہ گھوم کر عقب میں آیا اور اس نے بٹن دبا کر لفٹ بند کر دی۔ میں سہم کر دیوار سے لگ گئی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ مگر اس کی نظریں ایک لمحے کو میرے وجود سے نہیں ہٹی تھیں۔ لفٹ اوپر جا رہی تھی۔

''آپ بہت خوب صورت ہیں ...... بہت حسین ہیں۔'' اس نے مخصوص گونجتی آواز میں کہا تو میرے بدن میں تھرتھری سی چھوٹ گئی تھی۔

''پلیز۔'' میں نے بہت ہمت کر کے کہا۔ ''مجھے جانے دیں۔''

''میں جانے دوں گا۔'' اس نے سرگوشی کی۔ وہ ایسی آواز میں بولتا تھا جو سرگوشی لگتی تھی مگر جیسے دل و دماغ میں گونجتی تھی۔ ''مگر پہلے میں آپ کو دیکھنا چاہوں گا۔''

مجھ پر طاری لرزہ بڑھ گیا تھا کیونکہ جیسے ہی اس کے منہ سے یہ لفظ ادا ہوئے میں ان کے معنی سمجھ گئی تھی۔

''نہیں۔'' میں نے ایک بار پھر مشکل سے کہا۔ ''میں شریف عورت ہوں ...... سوائے شوہر کے کسی نے مجھے نہیں دیکھا۔''

''میں نے دیکھا ہے۔'' اس نے دعویٰ کیا۔

اس وقت نہ جانے مجھ میں کہاں سے اتنی ہمت آ گئی۔ میں نے کہا۔ ''اگر تم نے دیکھ لیا ہے تو پھر اب دیکھنے کی بات کیوں کر رہے ہو؟''

''وہ سب میں نے خیال میں دیکھا ہے اب میں سچ مچ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''نہیں۔'' میں نے کہا تو یک دم اس کی آنکھیں خوفناک ہو گئیں اور اس کا لہجہ بدل گیا۔ اس بار وہ غصے سے بولا تھا۔

''تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔ میری طرف دیکھو۔''

میں جو کوشش کر رہی تھی کہ اس کی طرف نہ دیکھوں مگر اس نے اس انداز میں کہا کہ مجھے اس کی طرف دیکھنا ہی پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہی مجھے لگا جیسے میں ڈوب رہی ہوں۔ میرے حواس گم ہونے لگے اور پھر اس نے سرگوشی نما آواز میں کہا۔ ''یہ اتار دو۔''

اس نے نام نہیں لیا مگر میں سمجھ گئی کہ وہ عبایا کی بات کر رہا ہے اور میں کسی معمول کی طرح اس کے حکم پر عبایا اتارنے لگی۔ اوپر اسکارف تھا جو شانوں کو بھی کور کر رہا تھا اس لیے دوپٹے کی ضرورت نہیں تھی۔ عبایا اترا تو میں صرف سوٹ میں تھی اور وہ بے باکی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے پھر ٹٹولنے والی نظروں کا احساس ہوا مگر میں بے بس تھی کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لمحے لفٹ رکی تو ہلکا سا جھٹکا لگا اور مجھے لگا جیسے میں ڈوبتے ڈوبتے ابھر گئی ہوں۔ میں نے اتارا ہوا عبایا اپنے سامنے کر لیا۔ ''نہیں۔'' اس نے تیز سرگوشی میں کہا۔ ''ہٹاؤ اسے۔''

لفٹ اب نیچے جا رہی تھی شاید اس نے نیچے جانے والا بٹن دبا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں پھر سے ڈوبنے والی کیفیت میں آ گئی۔ میں نے عبایا گرا دیا۔ وہ کچھ دیر مجھے گہری نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ ''اب یہ اتارو۔''

اس بار بھی میں اس کا مفہوم جان گئی۔ مجھ پر ایک بار پھر لرزہ طاری ہو گیا۔ میرا ذہن شدت سے انکار کر رہا تھا مگر میرا جسم اس کے قابو میں تھا۔ میرے ہاتھ اس کے حکم کی تعمیل کرنے جا رہے تھے۔ نہ جانے وہ کیا چیز تھا جس نے مجھے یوں اپنے بس میں کر لیا تھا۔ یہ اس کی شخصیت کا کمال تھا۔ لیکن نہیں وہ کوئی جادوگر یا ساحر تھا جس نے اپنے عمل سے مجھے قابو کیا تھا۔ ایسے میں جب کوئی سہارا نظر نہیں آیا تو میں نے اس ہستی کو پکارا جو ہر انسان کا آخری اور حقیقی سہارا ہے میں نے اس سے فریاد کی کہ مجھے اس شخص سے بچا جو فرشتے کے لبادے میں شیطان تھا۔ اسی لمحے لفٹ کو پھر جھٹکا لگا اور میں ایک لمحے کو سنبھلی۔ میرے اندر کسی نے کہا۔ ''مہرو اب یا کبھی نہیں۔''

میں نے ہمت کی اور جھپٹ کر اس کے پاس سے ہاتھ بڑھا کر لفٹ کا بٹن دبا دیا اور اس کا دروازہ کھلنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے روکے گا مگر خلافِ توقع وہ ایک طرف ہوا میں اپنا عبایا اور اسکارف لفٹ میں چھوڑ کر باہر نکل آئی۔ عقب میں لفٹ کا دروازہ بند ہو رہا تھا اور اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''آج بچ گئیں لیکن کب تک؟''

میں یوں دیوانہ وار سانس لے رہی تھی جیسے نہ جانے کب سے میری سانس رکی ہوئی تھی اور میں اب سانس لے رہی تھی۔ مجھے اردگرد کا پتا نہیں تھا اسی لمحے سیڑھیوں کی طرف سے احسن نمودار ہوئے اور انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا اور جھپٹ کر میرے پاس آئے۔ ''مہرو یہ کیا ہوا؟...... تمہارا عبایا کہاں ہے؟''

میں یہ سوچے بغیر کہ میں کہاں ہوں جھپٹ کر ان سے لپٹ گئی اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔ آخری احساس بس یہ تھا

جلال الدین احسن

(م 740ھ/40-1339ء)

مدورا کا پہلا سلطان۔ اس کے ابتدائی حالات بہت کم معلوم ہیں۔ وہ پنجاب کے قصبہ کیتھل کا رہنے والا تھا۔ 725ھ/1324ء میں صوبہ معبر میں نائب اقطاع کے عہدے پر فائز تھا۔ سلطان محمد بن تغلق نے اسے صوبیدار مقرر کر دیا۔ تھوڑے عرصے بعد ہی اس نے 735ھ/35-1334ء میں جلال الدین احسن شاہ کا لقب اختیار کر کے مدورا میں جو قدیم پانڈیا سلطنت کا صدر مقام تھا۔ اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ سلطان محمد تغلق نے اسے اس کی غداری کی سزا دینے کے لیے جنوب کی طرف چڑھائی کی جو ہیضہ پھوٹ پڑنے کی وجہ سے رک گیا۔ اس وبا سے سلطان محمد تغلق کی فوج کا دسواں حصہ ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد سلطان دہلی کو ہاتھ سے نکلے ہوئے صوبے پر دوبارہ قبضہ نہ ہو سکا۔ تقریباً پانچ سال حکومت کرنے کے بعد اس کے ایک عامل نے اسے قتل کر دیا۔ اگرچہ جلال الدین احسن مدورا کا پہلا خود مختار سلطان تھا لیکن اس نے کسی حکمران خاندان کی بنیاد نہ رکھی۔ جلال الدین کی اولاد میں دو لڑکیاں تھیں جن میں سے ایک کی سلطان غیاث الدین سے اور دوسری کی شادی ابن بطوطہ سے ہوئی تھی۔

مرسلہ: نعمت اللہ۔ کراچی

کہ احسن مجھے سنبھالتے ہوئے پکار رہے تھے۔ پھر مجھے ہوش آیا تو میں اپنے فلیٹ میں اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور احسن متفکر سے پاس بیٹھے تھے مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ تیزی سے پاس آئے۔ ''اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟''

''بہت کمزوری۔'' میں نے نقاہت سے کہا۔ ''پلیز پانی دیں۔''

انہوں نے مجھے سہارا دے کر گلاس سے پانی پلایا۔

میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے محسوس کیا کہ وہ فکر مند تو تھے لیکن اس سے زیادہ وہ پُرتجسس تھے کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا تو میں خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ میں پھوٹ کر رو دی اور ہچکیوں کے دوران میں انہیں سب بتا دیا کہ گزشتہ ایک ہفتے سے میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا اور مجھ پر کیا گزر رہی تھی۔ احسن ساکت سے سب سنتے رہے انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ اس وقت وہ خاموش رہے جب آخر میں، میں نے سب کہہ دینے کے بعد ان سے کہا۔ ''احسن میں نے آپ سے کچھ نہیں چھپایا ہے ایک ایک لفظ سچ بولا ہے لیکن خدا گواہ ہے اپنی کیفیت سے مجھے نفرت ہوئی اور میں نے ہمیشہ خود کو آپ کی امانت سمجھا ہے۔ اللہ گواہ ہے عملی طور پر اس میں سے ایک ذرّے کی خیانت بھی نہیں ہوئی ہے۔''

احسن میری طرف نہیں دیکھ رہے تھے پھر وہ اٹھ کر کمرے سے چلے گئے اور میں رونے لگی۔ شاید میں نے ان کو بتا کر اپنی ساری کشتیاں جلا دی تھیں۔ اب یہ ان پر تھا کہ مجھے معاف کرتے یا اس ناکردہ گناہ کی سزا دیتے۔ احسن ساری رات کمرے میں نہیں آئے اور میں ساری رات روتی رہی۔ صبح فلائٹ دس بجے کی تھی۔ احسن سات بجے کمرے میں آئے اور بولے۔ ''تیار ہو جاؤ فلائٹ سے ایک گھنٹا پہلے پہنچنا ہے۔''

میرا دل نہیں چاہ رہا تھا اب مجھے دوسرا خوف لاحق ہو گیا تھا۔ احسن کا رویہ عجیب سا تھا۔ وہ نہ تو میری طرف دیکھ رہے تھے اور نہ انہوں نے مجھ سے کوئی بات کی۔ انہوں نے میری طبیعت بھی نہیں پوچھی اور نہ ہی یہ کہ میں سفر کے قابل ہوں یا نہیں۔ وہ کہہ کر چلے گئے اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کر تیاری کرنے لگی۔ تیاری تو کل ہی کر لی تھی یعنی سامان اور کپڑے سوٹ کیس میں پیک کر لیے تھے اب ذاتی تیاری تھی میں نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور باہر آئی تو احسن گھر میں نہیں تھے۔ شادی کے بعد پہلی بار ایسا ہوا کہ وہ مجھے بتائے بغیر کہیں چلے گئے تھے۔ جیسے تیسے تیار ہو کر میں باہر آئی اور ایک کپ چائے بنا کر پی کہ سر درد سے پھٹ رہا تھا اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد احسن آئے۔ انہوں نے میری دواؤں کا شاپر بھی میرے ہینڈ بیگ میں رکھا اور ناشتے کا پوچھا۔ میں نے کہا کہ دل نہیں چاہ رہا۔

''ٹھیک ہے تم طیارے میں ناشتا کر لینا۔'' وہ بولے۔

میرا دل پھر رونے کو چاہ رہا تھا مگر میں نے خود پر قابو رکھا۔ پتا نہیں احسن کے دل میں کیا تھا اور وہ مجھ سے کھل کر کچھ کہہ کیوں نہیں رہے تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے ہم گھر سے نکل گئے۔ جب ایئرپورٹ کے پاس پہنچے تو میں نے ہمت کر کے پوچھا۔ ''کل آپ کہاں چلے گئے تھے؟''

''اسے دیکھنے جو سامنے والے فلیٹ میں رہتا ہے۔''

میں فکر مند ہو گئی۔ ''آپ نے اس سے جھگڑا تو نہیں کیا احسن وہ بہت خطرناک آدمی لگ رہا ہے جیسے کوئی جادوگر ہو وہ کوئی علم جانتا ہے۔''

احسن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا مگر انہوں نے صرف اتنا کہا۔ ''وہ گھر پر نہیں تھا یا اس نے جان کر دروازہ نہیں کھولا۔''

میرا خیال تھا کہ وہ گھر پر ہی تھا اور اس نے جان بوجھ کر دروازہ نہیں کھولا۔ وہ جس قسم کا شخص تھا اسے یقیناً معلوم ہو گیا ہو گا کہ باہر کون ہے؟ احسن مجھے ایئرپورٹ کے لاؤنج تک چھوڑ کر چلے گئے بورڈنگ کارڈ تیار تھا اور کچھ دیر بعد مسافر طیارے میں جانے لگے۔ وقت پر پرواز ملتان کے لیے روانہ ہوئی اور ایک گھنٹے بعد میں ملتان ایئرپورٹ پر تھی وہاں شاہد اور زاہد بھائی دونوں لینے آئے تھے۔ انہوں نے اور گھر آنے پر سب نے کہا کہ میں بہت کمزور اور صورت سے بیمار لگ رہی ہوں۔ خاص طور سے امی بہت پریشان ہو گئی تھیں۔ ''مہرو یہ تجھے کیا ہوا ہے تو خوش تو ہے نا؟''

''امی بہت خوش ہوں۔'' میں نے زبردستی مسکرا کر کہا۔ ''تین چار دن سے طبیعت خراب تھی۔ کل احسن ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے اور اس نے پریگنینسی ٹیسٹ کہا ہے۔ میں یہیں کرا لوں گی۔''

''اللہ خوشخبری دے۔'' امی نے خوش ہو کر کہا۔ ''تمہاری شادی کو پانچ مہینے ہو گئے ہیں اور اب تک تمہاری طرف سے خبر نہیں آئی اس لیے میں فکر مند تھی۔ تم لوگ کوئی احتیاط تو نہیں کر رہے ہو؟''

''نہیں امی۔'' میں شرمائی۔ ''ہم دونوں کو اولاد کی خواہش ہے۔''

میں نے احسن کو کال کر کے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دی مگر انہوں نے زیادہ بات نہیں کی۔ میں اندر سے اور بجھ گئی تھی اور سچی بات ہے مجھے اپنی ازدواجی زندگی خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔ کون شوہر ہوگا جو یہ باتیں برداشت کرے کہ اس کی بیوی کسی اجنبی سے اس حد تک متاثر ہو۔ اگرچہ اس میں میرا قصور نہیں تھا۔ امی اگلے دن ہی مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ اس نے ٹیسٹ لیا اور نتیجہ اگلے دن بتانے کا کہا تھا۔ اس نے بھی وہی کہا کہ میں کمزور ہو رہی ہوں اور مجھے طاقتور غذا اور منرلز کی ضرورت ہے۔ کیونکہ دوائیں میں ساتھ لائی تھی اس نے انہیں ہی کافی قرار دیا۔ احسن نے واپس آنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا مگر میں نے گھر میں کہہ دیا کہ میں ایک ہفتے کے لیے آئی ہوں اس لیے میری واپسی کی نشست بک کرا دیں۔ میرا ٹکٹ ریٹرن تھا۔ امی ابا اور سب نے اصرار کیا کہ میں کچھ دن اور رک جاؤں مگر میں ہفتے پر ہی بضد رہی تو مجبوراً ایک ہفتے بعد کی فلائٹ میں سیٹ او کے کرا دی۔

اتفاق سے اگلے دن گھر میں مرد دیر سے آئے اور پھر اس سے اگلے دو دن یہی سلسلہ جاری رہا اس لیے میں ڈاکٹر کے پاس رپورٹ لینے نہیں جا سکی تھی۔ امی کے گھر آنے کے پانچویں دن مجھے یہ موقع ملا اور میں امی کے ساتھ رپورٹ لینے گئی تو ڈاکٹر نے خوشخبری سنائی۔ ''مبارک ہو آپ اُمید سے ہیں۔''

''سچ۔'' میں خوش ہو گئی اور امی تو خوشی سے کھل اٹھی تھیں۔ انہوں نے اسی وقت رقم نکال کر کلینک کے اسٹاف میں بانٹی۔ مگر جب میں واپس آ رہی تھی اور مجھے احسن کا خیال آیا تو میں بجھ سی گئی۔ پتا نہیں انہیں یہ خبر بھی خوش کر سکتی تھی یا نہیں۔ اس لیے میں نے انہیں کال کر کے اطلاع دینے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور امی کے پوچھنے پر یہی کہا کہ میں خود جا کر انہیں یہ خبر سنانا چاہتی تھی۔ دو دن میں اور امی کے پاس رہی اور اس دوران میں مجھے یہی دھڑکا لگا رہا کہ احسن کی طرف سے کوئی کال نہ آئے جس میں وہ مجھے موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے آنے سے منع کر دیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا اور میں لاہور واپس پہنچ گئی۔ میں نے روانہ ہونے سے پہلے کال کی تھی اور احسن مجھے لینے آئے تھے۔ میں ایئر پورٹ پر ان کو دیکھ کر حیران رہ گئی کیونکہ ان کا شیو بڑھا ہوا تھا اور چہرہ

ستا ہوا تھا۔ اپنے گھر میں وہ واحد فرد تھے جو کلین شیو تھے اگرچہ روزے نماز کے پابند تھے۔

''آپ کو کیا ہوا آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' وہ بولے۔ ''پچھلے ایک ہفتے میں، میں بہت تکلیف سے گزرا ہوں۔''

''میری وجہ سے نا؟'' میں روہانسی ہو گئی اگر ایئر پورٹ نہ ہوتا تو شاید رو دیتی۔ مگر گاڑی میں بیٹھتے ہی میرے آنسو بہنے لگے تھے۔ احسن نے وہاں سے گاڑی نکالی اور سڑک پر آتے ہوئے بولے۔

''تمہاری وجہ سے نہیں۔''

''پھر کس کی وجہ سے؟''

''شاید اپنی وجہ سے۔'' انہوں نے گہری سانس لی۔ ''مہرو تم جانتی ہو میں اپنے گھر والوں سے ذرا مختلف ہوں۔ مطلب میں شیو کرتا ہوں اور سچی بات ہے دینی اقدار کا اتنا خیال نہیں رکھتا۔ لیکن اللہ گواہ ہے میں نے جان بوجھ کر اس کے حرام کیے ہوئے کو حلال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میرا پیشہ بھی ایسا ہے کہ میرا واسطہ زیادہ تر کرپٹ لوگوں سے پڑتا ہے اور ان میں عورتیں بھی ہوتی ہیں۔''

''میں جانتی ہوں۔'' میں نے ان کی بات سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''میری کلائنٹس میں آج تک جو عورتیں آئیں میں نے کبھی ان کی طرف توجہ نہیں دی۔ مہرو تم جانتی ہو کہ میں حسن پرست ہوں لیکن مجھے صرف تمہارے حسن سے سروکار رہا ہے۔ میں نے کبھی غیر عورتوں کے بارے میں نہ سوچا اور نہ ہی ان کی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے دین پر عمل نہیں کیا لیکن ابا جی سے اور دوسروں سے اس کے بارے میں جانا بہت کچھ ہے اور یہ ان ہی لوگوں کی تربیت تھی جو میں بھٹکنے

سے محفوظ رہا۔ کیونکہ میرے پاس آنے والی عورتیں نہ صرف بہت حسین اور دلکش بلکہ آزاد خیال بھی ہوتی ہیں۔ کئی نے مجھے ڈھکے چھپے انداز میں پیشکش بھی کی مگر میں ان کی ترغیب میں نہیں آیا مگر آج سے نو دن پہلے.....''

''نو دن پہلے کیا؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''نو دن پہلے میرے دفتر میں ایک عورت آئی۔ میرے کمرے میں آنے تک اس نے برقع پہنا ہوا تھا مگر اندر آتے ہی اس نے بے تکلفی سے برقع اتار دیا اور اس کے نیچے اس نے بہت ہی فیشن ایبل اور کھلی ہوئی ڈریسنگ کی ہوئی تھی۔ مہرو وہ بہت حسین تھی۔ ایسی کہ میں تمہاری جیسی بیوی کا شوہر ہوتے ہوئے بھی دنگ رہ گیا۔ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ پھر مجھے ہوش آیا اور میں نے اس سے آنے کی وجہ دریافت کی۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے شوہر سے طلاق لینا چاہتی ہے کیونکہ اس کی اپنے شوہر سے نہیں بنتی ہے۔ میں نہیں لفظوں میں اس کی ادائیں اور باتیں نہیں بتا سکتا۔ میں نے فوراً اس کا کیس لے لیا اور فیس تک کا نہیں پوچھا جو ہم وکیلوں کا پہلا اصول ہے۔ جانے سے پہلے اس نے کھل کر پیشکش کی کہ اگر میں نے اسے طلاق دلوادی تو وہ نہ صرف میری فیس ادا کرے گی بلکہ اس کی ایک رات صرف میرے لیے مخصوص ہوگی۔''

احسن کی بات سن کر میرے اندر ایک ایسی آگ بھڑکنے لگی تھی جس کی تپش مجھے جلا رہی تھی مگر میں زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ پتا نہیں احسن مجھے یہ سب کیوں بتا رہے تھے؟ میں نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔ ''پھر وہ آپ کے پاس آئی؟''

''نہیں۔'' احسن بولے۔ ''اللہ نے مجھے اس گناہ سے بچایا لیکن مہرو میں نے دل میں ارادہ تو کر لیا تھا میں نے اسے ان نظروں سے تو دیکھا جن نظروں سے دیکھنے کا حق صرف تم کو ہے۔''

اس بار مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ ''تب آپ مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہیں بدلہ لینے کے لیے؟''

''نہیں۔'' وہ گہری سانس لے کر بولے۔ ''بدلہ کس بات کا۔ جب ہم بھائی جوان ہو رہے تھے تو ابا جی قرآن کی ایک آیت بار بار سناتے تھے کہ نیک مردوں کے لیے نیک عورتیں اور بدکار مردوں کے لیے بدکار عورتیں ہیں۔ ابا جی کا مقصد ہمیں سمجھانا تھا کہ جوانی میں ہمارے قدم غلط راہوں کی طرف نکلے تو ہمارے مقدر میں بدکار عورتیں آئیں گی۔ جب تم میری زندگی میں آئیں تو میں نے خود کو اچھا انسان اور مسلمان سمجھا کہ اللہ نے جسے ایسی اچھی اور نیک بیوی سے نوازہ ہے لیکن......''

''میں اچھی نہیں نکلی۔'' میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''نہیں تم اچھی نکلیں اور تم نے مجھے بھی برائی سے بچا لیا۔ مہرو یہ تمہارا قصور نہیں تھا یہ میرے گناہ کی نیت تھی جس کا وبال تم پر آیا۔ اب میں اس آیت مبارکہ کا مطلب سمجھا۔ اللہ نے تمہارے توسط سے مجھے بتایا کہ اگر میں گناہ گار بنوں گا تو میں تم کو گناہ گار بننے سے نہیں روک سکوں گا اور اگر میں نیکوکار بنوں گا تو تم خود بہ خود سیدھے راستے پر رہو گی، کوئی انسان یا شیطان تمہیں بہکا نہیں سکے گا۔ اب تم سمجھ گئی ہو گی کہ پچھلا ایک ہفتہ مجھ پر کیوں اتنا سخت گزرا۔''

''ہاں میں سمجھ گئی۔'' میں نے روتے ہوئے ان کے شانے پر سر رکھ دیا۔ ''آپ مجھے قصوروار نہیں سمجھ رہے ہیں لیکن میں ایک بار پھر آپ سے معافی مانگتی ہوں۔''

''میں نے تمہیں معاف کیا اور اب تم بھی مجھے معاف کر دو۔''

میں روتے ہوئے بولی۔ ''ایسی باتیں نہ کریں۔ میرا سب کچھ ہیں، میرے شوہر ہیں اور شوہر بیویوں سے معافی نہیں مانگتے۔ آپ نے ارادے سے توبہ کر لی تو اللہ نے معاف کر دیا ہوگا اس کے بعد میں کون ہوتی ہوں۔''

احسن نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھا۔ ''اس کے باوجود میں تمہارا شکر گزار ہوں۔''

گھر قریب آیا تو میرے اندر پھر وہی خوف اٹھا اور میں نے کہا۔ ''احسن یہاں وہ شخص؟''

''وہ اس وقت تھانے میں ہے اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں۔'' احسن نے کار روکتے ہوئے کہا۔ ''اور تم جانتی ہو اس کی بیوی کون تھی وہی عورت جو میرے پاس طلاق کا کیس لے کر آئی تھی۔ یہ شخص صرف اوباش نہیں بلکہ سفلی علوم اور جادو ٹونے کا ماہر بھی ہے۔ ابھی اس کے اور کرتوت سامنے آرہے ہیں۔ ورنہ صرف قتل کا یہ کیس اسے تختہ دار پر پہنچانے کے لیے کافی ہے۔''

میں نے اطمینان کا بہت طویل سانس لیا اور سوچا کہ جب میں ان کو باپ بننے کی خبر سناؤں گی تو ان کے دل میں اگر کوئی گرہ باقی رہ گئی ہوگی تو وہ بھی انشاءاللہ کھل جائے گی۔ میری جنت میں گھس آنے والا شیطان دفع ہو گیا تھا۔